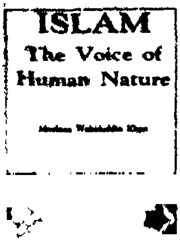
الرسالہ

Al-Risala

January 1997 • No. 242 • Rs. 7

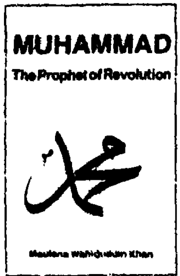
DEC

معیار پسند ہونا اچھا ہے
مگر یہ اچھا نہیں کہ آدمی
معیار سے کم پر راضی ہونے کے لیے تیار نہ ہو۔



**ISLAM:
THE VOICE OF
HUMAN NATURE**

22×14.5cm, 64 pages
ISBN 81-85063-74-5
Rs. 30



**MUHAMMAD:
THE PROPHET OF
REVOLUTION**

22×14.5cm, 228 pages
ISBN 81-85063-00-1
Rs. 85



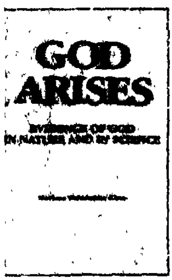
**GOD-ORIENTED
LIFE**

22×14.5cm, 186 pages
ISBN 81-85063-97-4
Rs. 70



**WOMAN IN
ISLAMIC SHARI'AH**

22×14.5cm, 150 pages
Rs. 65 (Paperback)
Rs 185 (Hardbound)



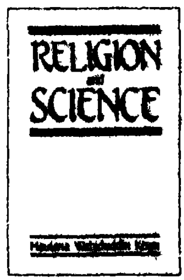
GOD ARISES

22×14.5cm, 271 pages
ISBN 81-85063-14-1
Rs. 85



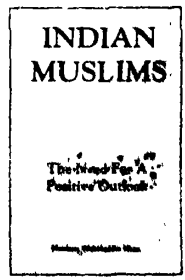
ISLAM AS IT IS

22×14.5cm, 114 pages
ISBN 81-85063-95-8
Rs. 55



**RELIGION AND
SCIENCE**

22×14.5cm, 96 pages
Rs. 45



INDIAN MUSLIMS

22×14.5cm, 192 pages
Rs. 65 (Paperback)
Rs. 175 (Hardbound)

'INTRODUCTION TO ISLAM' SERIES

In this 'Introduction to Islam' series Maulana Wahiduddin Khan—a famous Islamic thinker and scholar and President of the Islamic Centre, New Delhi—has presented the fundamental teachings of Islam in a simple way. The complete series is as follows:

1. The Way to Find God (20 pages; Rs. 12)
2. The Teachings of Islam (46 pages; Rs. 15)
3. The Good Life (38 pages; Rs. 12)
4. The Garden of Paradise (38 pages; Rs. 15)
5. The Fire of Hell (44 pages; Rs. 15)

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam—the true religion of submission to God. In the first pamphlet it is shown that the true path is the path that God has revealed to man through His prophets. The second pamphlet provides an introduction to various aspects of the Islamic life under forty-five separate headings. Qur'anic teachings have been summarized in the third pamphlet in words taken from the Qur'an itself. In the fourth pamphlet the life that makes man worthy of paradise has been described and in the last pamphlet the life that will condemn him to hell-fire.

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013 Tel. 461 1128 Fax: 11-4697333

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

جنوری ۱۹۹۶، شمارہ ۲۴۲

فہرست

AL-RISALA (Urdu)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4611131 Fax: 91-11-469783
Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)
Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi
Distributed in UK and USA by:

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 7117, Fax: 0121-773 7771

MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

روزہ کیا ہے

روزہ ضبطِ نفس کی (self-discipline) [illegible] ہے۔ [illegible] روزہ دار [illegible] خود اپنے ارادہ اور فیصلہ سے کھانا پینا چھوڑ دیتا [illegible] وقت آتا ہے تو دوبارہ وہ خود اپنے ارادہ اور فیصلہ سے کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے۔ [illegible] اپنے آپ کو خود انضباطی کی زندگی گزارنے کے لئے تیار کرتا ہے۔ سال کے ایک مہینے میں کھانے پینے کے معاملہ میں روزہ داری کر کے وہ اپنے آپ کو اس قابل بناتا ہے کہ سال کے بقیہ مہینوں میں وہ اپنے ہر معاملہ میں روزہ دارانہ زندگی گزار سکے۔

کائنات میں انسان کے سوا بے شمار چیزیں ہیں۔ یہ تمام کی تمام مکمل طور پر خدا کے تحت ہیں۔ ہر چیز اپنے اختیار کو ترک کر کے خدا کے قانون کی پابندی کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے کہ انسان اطاعت کی اس روش کو خود اپنے ارادہ سے اپنے لئے اختیار کرے۔ وہ خود اپنے فیصلہ سے اپنے آپ کو خدا کا پابند بنا لے۔

اسی خود اختیار کردہ پابندی کی تربیت کے لئے روزہ کا نظام مقرر کیا گیا ہے۔ روزہ کوئی سالانہ رسم نہیں، وہ ایک سالانہ تربیت ہے۔ روزہ وقتی طور پر بھوک پیاس برداشت کرنے کا نام نہیں۔ روزہ مستقل طور پر صبر و برداشت کی زندگی گزارنے کا ایک سبق ہے۔

روزہ میں آدمی کے سامنے کھانا اور پانی ہوتا ہے مگر بھوک پیاس کے باوجود وہ ان کو نہیں لیتا۔ اسی طرح یہ مطلوب ہے کہ آدمی کو خدا کی مرضی کے خلاف چلنے کا موقع ہو مگر خواہش کے باوجود وہ ایسے راستہ پر نہ جائے۔ آدمی کے لئے گھمنڈ کرنے کا امکان پوری طرح موجود ہو، مگر جاننے کے باوجود وہ گھمنڈ کو چھوڑ کر تواضع کا طریقہ اختیار کر لے۔ آدمی کے لئے بے انصافی کے دروازے کھلے ہوئے ہوں مگر طبیعت کے تقاضے کے باوجود وہ زیادتی اور بے انصافی سے دور رہے۔

انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اس دنیا میں خود عائد کردہ پابندی کی ایک زندگی گزارے۔ روزہ میں یہ پابندی کھانے پینے کے معاملہ میں ہوتی ہے اور بقیہ زندگی میں یہ پابندی اخلاق اور سلوک کے معاملہ میں۔

اللہ کی پکار

سنن ابن ماجہ کی ایک روایت روزہ کے بارہ میں ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند باتوں کی خبر دی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ رمضان کا مہینہ جب آتا ہے تو اللہ کی طرف سے ایک پکارنے والا پکارتا ہے کہ اے خیر کے طالب آگے بڑھ اور اے شر کے طالب رک جا۔ ینادی مناد، یا باغی الخیر اقبل ویا باغی الشر

(مشکاۃ المصابیح ۶۱۱/۱)

ان الفاظ میں ایک نفسیاتی حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ رمضان کے مہینہ میں جب آدمی روزہ رکھتا ہے تو اس کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ اس کی مادی قوتوں میں اضمحلال ہوتا ہے، اور اس کی روحانی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اس طرح فطری طور پر اس کے اندر یہ طلب ابھرتی ہے —— نیکی کی طرف بڑھنے کی اور برائیوں سے دور بھاگنے کی۔

روزہ آدمی کی شخصیت کے حیوانی پہلو کو دباتا ہے۔ وہ اس کے اندر چھپے ہوئے احساسات کو بیدار کرتا ہے۔ اس طرح آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ اعلیٰ انسانی منزل کی طرف تیز رفتاری کے ساتھ اپنا سفر طے کر سکے۔

روزہ ایک شدید تجربہ ہے۔ وہ آدمی کے معمولات کو توڑ دیتا ہے۔ آدمی کے صبح و شام غیر معمولی حالات میں بسر ہونے لگتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں کمزوری آتی ہے۔ جسم ٹوٹنے لگتا ہے۔ بے آرامی اور بے سکونی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

روزہ کا یہ پہلو آدمی کو موت اور آخرت کی یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔ موت کے بعد آدمی کے اوپر مجبوری اور بے بسی کی جو کلی حالت پیش آنے والی ہے، روزہ گویا جزئی طور پر اسی بھوک اور بے بسی کی پیشگی یاددہانی ہے۔ روزہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ آنے والے دن کی آفت کو اس سے پہلے محسوس کرے جب کہ وہ بالکل سامنے آ چکا ہو۔ وہ موت سے پہلے موت کے بعد کی تیاری کرنے میں لگ جائے۔

روزہ کیا ہے

روزہ خود انضباطی (self-discipline) کی [illegible] ہے۔ روزہ کے دنوں میں آدمی خود اپنے ارادہ اور فیصلے سے کھانا پینا چھوڑ دیتا [illegible] وقت آتا تو دوبارہ وہ خود اپنے ارادہ اور فیصلے سے کھاتا [illegible] اور پانی پیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو خود انضباطی کی زندگی گزارنے کے لئے تیار کرتا ہے۔ سال کے ایک مہینہ کھانے پینے کے معاملہ میں روزہ دار بن کر وہ اپنے آپ کو اس قابل بناتا ہے کہ سال کے بقیہ مہینوں میں وہ اپنے ہر معاملہ میں روزہ دار کی زندگی گزار سکے۔

کائنات میں انسان کے سوا بے شمار چیزیں ہیں۔ یہ تمام کی تمام مکمل طور پر خدا کے تحت ہیں۔ ہر چیز اپنے اختیار کو ترک کر کے خدا کے قانون کی پابندی کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے کہ انسان اطاعت کی اس روش کو خود اپنے ارادہ سے اپنے لئے اختیار کرے۔ وہ خود اپنے فیصلہ سے اپنے آپ کو خدا کا پابند بنا لے۔

اسی خود اختیار کردہ پابندی کی تربیت کے لئے روزہ کا نظام مقرر کیا گیا ہے۔ روزہ کوئی سالانہ رسم نہیں، وہ ایک سالانہ تربیت ہے۔ روزہ وقتی طور پر بھوک پیاس برداشت کرنے کا نام نہیں۔ روزہ مستقل طور پر صبر و برداشت کی زندگی گزارنے کا ایک سبق ہے۔

روزہ میں آدمی کے سامنے کھانا اور پانی ہوتا ہے مگر بھوک پیاس کے باوجود وہ ان کو نہیں لیتا۔ اسی طرح یہ مطلوب ہے کہ آدمی کو خدا کی مرضی کے خلاف چلنے کا موقع ہو مگر خواہش کے باوجود وہ ایسے راستہ پر نہ جائے۔ آدمی کے لئے گھمنڈ کرنے کا امکان پوری طرح موجود ہو، مگر چاہنے کے باوجود وہ گھمنڈ کو چھوڑ کر تواضع کا طریقہ اختیار کرلے۔ آدمی کے لئے بے انصافی کے دروازے کھلے ہوئے ہوں مگر طبیعت کے تقاضے کے باوجود وہ زیادتی اور بے انصافی سے دور رہے۔

انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اس دنیا میں خود عائد کردہ پابندی کی ایک زندگی گزارے۔ روزہ میں یہ پابندی کھانے پینے کے معاملہ میں ہوتی ہے اور بقیہ [illegible] اخلاقی سلوک کے معاملہ میں۔

اندر کی پکار

سنن ابن ماجہ کی ایک روایت روزہ کے بارہ میں ہے۔ اس میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں کی خبر دی ان میں سے ایک یہ ہے کہ رمضان کا مہینہ جب آتا ہے تو اللہ کی طرف سے ایک پکارنے والا پکارتا ہے کہ اے خیر کے طالب آگے بڑھ اور اے شر کے طالب رک جا: وینادی مناد، یاباغی الخیر اقبل ویاباغی الشر اقصر (مشکاۃ المصابیح ۱/۶۱۱)

ان الفاظ میں ایک نفسیاتی حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ رمضان کے مہینہ میں جب ایک آدمی روزہ رکھتا ہے تو اس کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ اس کی مادی قوتوں میں اضمحلال پیدا ہوتا ہے، اور اس کی روحانی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اس طرح فطری طور پر اس کے اندر ایک طلب ابھرتی ہے ـــــ نیکی کی طرف بڑھنے کی اور برائیوں سے دور بھاگنے کی۔

روزہ آدمی کی شخصیت کے حیوانی پہلو کو دباتا ہے۔ وہ اس کے اندر چھپے ہوئے لطیف احساسات کو بیدار کرتا ہے۔ اس طرح آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ اعلیٰ انسانی اقدار کی طرف تیز رفتاری کے ساتھ اپنا سفر طے کر سکے۔

روزہ ایک شدید تجربہ ہے۔ وہ آدمی کے معمولات کو توڑ دیتا ہے۔ آدمی کے صبح و شام غیر معمولی حالات میں بسر ہونے لگتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں کمزوری آتی ہے۔ جسم ٹوٹنے لگتا ہے۔ بے آرامی اور بے سکونی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

روزہ کا یہ پہلو آدمی کو موت اور آخرت کی یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔ موت کے بعد آدمی کے اوپر مجبوری اور بے بسی کی جو کلی حالت پیش آنے والی ہے، روزہ گویا جزئی طور پر اسی مجبوری اور بے بسی کی پیشگی یاد دہانی ہے۔ روزہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ آنے والے دن کو اس سے پہلے محسوس کرے جب کہ وہ بالکل سامنے آچکا ہو۔ وہ موت سے پہلے موت کے بعد کی تیاری کرنے میں لگ جائے۔

اخلاقی پرہیزگاری

حدیث میں رمضان کو شہر الصبر کہا گیا ہے (مشکاۃ المصابیح ۱/۶۱۱) یعنی صبر کا مہینہ۔ اس مہینہ میں آدمی کو اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے منفی جذبات پر کنٹرول رکھے تاکہ دوسروں کی اس دنیا میں کامیاب زندگی گزار سکے۔ آدمی کے منفی جذبات ہی اس کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اور روزہ اسی سب سے بڑے انسانی مسئلے کے حل کی ایک معتدل تدبیر ہے۔

اس بات کو حدیث میں اس طرح کہا گیا ہے کہ ہر چیز کی ایک زکاۃ ہوتی ہے، اور جسم کی زکاۃ روزہ ہے (مشکاۃ المصابیح ۱/۶۳۹) یہاں زکوٰۃ سے مراد پاکی ہے۔ یعنی ہر چیز کو پاک کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ اور جسم کو پاک کرنے کے لئے روزہ کا طریقہ مقرر کیا گیا ہے۔ روزہ کی حیثیت جسم انسانی کے لئے غسل جیسی ہے۔ پانی کا غسل جسم کے ظاہری حصہ کو پاک کرتا ہے، اور روزہ جسم کے باطنی حصہ کو پاک کرنے والا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جب تم میں سے کسی کو کھانے کے لئے بلایا جائے اور وہ روزہ دار ہو تو اس کو یہ کہہ دینا چاہئے کہ میں روزہ دار ہوں (إذا دعي أحدكم إلى طعام وهو صائم فليقل إني صائم) مشکاۃ المصابیح ۱/۶۴۱)

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کا روزہ کا دن ہو تو وہ نہ بری بات بولے اور نہ شور کرے۔ اگر کوئی شخص اس کو گالی دے یا اس سے لڑائی کرنے پر آمادہ ہو تو اس کو یہ کہہ دینا چاہئے کہ میں روزہ دار ہوں۔ (مشکاۃ المصابیح ۱/۶۱۱)

روزہ کا مقصد یہ ہے کہ آدمی عمل پرہیز کی حالت اپنے آپ پر طاری کرے۔ اس طرح اس کے اندر ایک قسم کی پرہیزی فکر ابھرتی ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے کہ دنیا میں مجھے پرہیز والی زندگی گزارنا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی اسے کھانے کی کوئی چیز پیش کرے تو وہ فوراً کہہ دیگا کہ میں روزہ دار ہوں۔ کوئی اس کو برا کہے یا اس کے ساتھ اشتعال انگیزی کرے تو اس کے جواب میں وہ مشتعل نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اس کا دل اس کے اندر سے کہہ رہا ہوگا کہ تم نے تو روزہ رکھ کر پرہیز والی

[illegible] اللہ کے حضور [illegible] سکے ہو۔

[illegible] آدمی کے اندر یہ مزاج بناتا ہے کہ وہ غیر انسانی باتوں سے پرہیز کرے۔ [illegible] کے قول و عمل سے اپنے آپ کو دور رکھے۔ وہ اخلاقی پرہیز کے ساتھ دنیا میں [illegible] رہے۔

پرہیزگاری ہی موجودہ دنیا میں ہر قسم کی دینی اور دنیوی ترقی کی واحد ضمانت ہے۔ اس دنیا میں آدمی کو امتحان کے لئے بسایا گیا ہے۔ اس لئے یہاں طرح طرح کی آزمائشی ترغیبات بکھیر دی گئی ہیں تاکہ اس کے ذریعہ آدمی کو جانچا جائے، اور یہ دیکھا جائے کہ کون آزمائش میں پورا اترا، اور کون آزمائش میں ناکام ہو گیا۔

سب سے پہلے آدمی کا اپنا نفس ہے۔ آدمی کے نفس کے اندر بہت سے ناپسندیدہ جذبات پیدائشی طور پر موجود ہیں۔ مثلاً حسد، غصہ، نفرت، بغض، خود غرضی، مفاد پرستی، خود بینی، مصلحت پرستی اور انانیت وغیرہ۔ جب کوئی موقع آتا ہے تو یہ جذبات ابھرتے ہیں اور آدمی کو اپنی طرف کھینچ لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ آزمائش کی گھڑی ہوتی ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی اسی پرہیزگاری کے اصول پر عمل کرے جس کی تربیت ایک اضافی کورس کے ذریعہ رمضان کے مہینہ میں اس کو دی گئی ہے۔

اسی طرح شیطان بار بار آدمی کو بہکاتا ہے۔ انسانی پروپگنڈے اس کو غلط سمت میں لے جانا چاہتے ہیں۔ عمومی رواج آدمی کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ان تمام مواقع پر آدمی گمراہی کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت جو آدمی پرہیزگاری کا اصول اختیار کرکے اپنے کو انحراف سے بچالے وہ کامیاب ہے، اور جو شخص ایسا نہ کرسکے وہ دنیا میں بھی ناکام ہے اور آخرت کی طویل تر زندگی میں بھی ناکام۔

پرہیز ایک مستقل اصول ہے۔ اور روزہ اسی پرہیز کے اصول کا ایک سبق ہے۔ روزہ دار وہی ہے جس کا روزہ اس کو پرہیزگارانہ زندگی گذارنے کے قابل بنادے۔

روزہ اور دعا

قرآن کی سورہ بقرہ میں رمضان کے روزے کے احکام بیان کرتے ہوئے ان کے درمیان دعا کا ذکر ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ: اور جب میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں تو میں قریب ہوں۔ پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب کہ وہ مجھے پکارتا ہے۔ تو چاہئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں، تاکہ وہ ہدایت پائیں۔ (البقرہ ۱۸۶)

یہ قرینہ بتاتا ہے کہ روزہ اور دعا کے درمیان خاص تعلق ہے۔ روزہ دار انسان عین اسی وقت ایک دعا گو انسان ہوتا ہے۔ روزہ دعا کے ساتھ خصوصی مناسبت رکھتا ہے۔

دعا کیا ہے۔ دعا تڑپتے ہوئے دل کی پکار ہے۔ وہ نفسیاتی سوز کا ایک شعوری اظہار ہے۔ روزہ یہی تڑپ اور یہی سوز وگداز پیدا کرتا ہے۔ روزہ آدمی کے اندر انابت کی وہ کیفیت پیدا کرتا ہے جس سے آدمی کے اندر سچی دعا ابلنے لگے۔

شام کو روزہ کی تکمیل کے وقت جب آدمی یہ کہتا ہے کہ خدایا، میں نے تیرے حکم سے روزہ رکھا، اور تیرے حکم سے میں نے افطار کیا، تو یہ صرف کچھ الفاظ نہیں ہوتے۔ یہ دراصل ایک روحانی تجربہ ہوتا ہے جو لفظوں میں ڈھل جاتا ہے۔ اسی طرح مہینہ بھر روزہ آدمی کے اندر عجز وگداز کی کیفیات پیدا کرتا ہے اور اس کے تحت آدمی بار بار خصوصی دعاؤں کا تجربہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ روزہ کا مہینہ پورا ہو جاتا ہے، اس وقت خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کی زبان سے نکل جاتا ہے کہ خدایا، تو میرے بقیہ تمام مہینوں کو روزہ کے اس مبارک مہینہ کے تابع کر دے۔ خدایا، میں نے تیرے حکم کی تعمیل کر دی، اب تو بھی میری دعاؤں کو قبول کر لے۔

روزہ گویا دعا کی تیاری ہے۔ روزہ آدمی کو تیار کرتا ہے تاکہ وہ حقیقی طور پر دعا کے قابل ہو سکے۔ وہ مطلوب کیفیات کے ساتھ خدا کو پکار سکے۔

خدا اپنے ہر بندے سے قریب ہے، ہر چیز سے زیادہ قریب۔ خدا اپنے بندے سے

اتنا قریب ہے کہ وہ اس کی پکار کو [illegible] اور اس کا جواب دیتا ہے۔ قرآن میں خدا

[illegible] بندے کے لیے [illegible] ہر شخص [illegible] وہ اپنے رب کو براہ راست

[illegible] وہ اپنے رب سے براہ راست اپنا معاملہ کر سکتا ہے۔

خدا ہر شخص اپنے بندوں کے قریب ہے۔ مگر یہ قربت کسی بندے کے لئے [illegible]

اس وقت بنتی ہے جب کہ اس پر بندگی کے حقیقی تجربات گزریں۔ جب اس پر احتیاج کی حالت

طاری ہو۔ [illegible] آدمی کو اسی موافق دعا کے تجربے سے گزارتا ہے۔ وہ قربت خداوندی کی کیفیات

پیدا [illegible] ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دعا احساس بندگی کے تحت نکلنے والے الفاظ کا نام ہے، اور روزہ

اسی احساس بندگی کو پیدا کرنے کی سالانہ تربیت۔ پانی کو نعمت کے طور پر محسوس کرنا

اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ آدمی کو پیاس لگے اور ٹھنڈا پانی اس کی رگوں کو تر کر دے۔

جس آدمی پر پیاس کا تجربہ نہ گزرے وہ پانی کی نعمت کا احساس بھی نہیں کر سکتا۔

روزہ آدمی کے اندر پیاس پیدا کرتا ہے تاکہ جب وہ پانی پیئے تو وہ پانی کی نعمت پر

پورا شکر ادا کر سکے۔ روزہ آدمی کو احتیاج کی حالت کا احساس دلاتا ہے، تاکہ جب اس کی

احتیاج پوری ہو تو وہ بھرپور کیفیات کے ساتھ کہہ سکے کہ خدایا، تیرا شکر ہے کہ تو نے میری

ضرورتوں کی تکمیل کا اتنا اعلیٰ انتظام فرمایا۔

ہمدردی کا مہینہ

ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رمضان کا مہینہ ہمدردی کا مہینہ ہے (شهر المواساة) (۱/۴۳) یعنی لوگوں کی مدد کرنے اور لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا مہینہ۔ یہ مہینہ گویا ہمدردی ہے جس کو انسانیت کا مہینہ کہا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کے مہینہ میں بہت زیادہ صدقہ کرتے تھے۔ اس مہینہ میں کوئی بھی سوال کرنے والا آپ کے یہاں سے خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا تھا۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ روزہ کے مہینہ میں جو شخص کسی کو کھلائے تو وہ اس کے لئے مغفرت کا ذریعہ ہوگا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی روزہ دار کو کھلائے گا تو وہ بھی اس روزہ کے ثواب میں شریک ہو جائے گا (۶۲۱)

روزہ کے مہینہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آدمی بھوک پیاس کا ذاتی تجربہ کرتا ہے۔ یہ تجربہ امیر اور غریب دونوں کو یکساں طور پر ہوتا ہے۔ یہ تجربہ صرف ایک بار وقتی طور پر نہیں ہوتا بلکہ مسلسل ایک مہینہ تک ہر روز اس کو اس خصوصی کورس سے گزارا جاتا ہے۔

اس طرح روزہ ہر آدمی کو یہ تجربہ کراتا ہے کہ انسانی ضرورتیں کیا ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ پیاس کیا ہے اور بھوک کیا چیز ہے۔ جو لوگ عام حالات میں بھوک پیاس کو محسوس نہیں کرپاتے وہ بھی رمضان کے مہینہ میں ذاتی طور پر اس کا تجربہ کر لیتے ہیں۔ اس طرح روزہ ہر آدمی کو ایک سطح پر پہنچا دیتا ہے۔ امیر آدمی بھی کچھ دیر کے لئے اس حالت پر پہنچ جاتا ہے جس حالت پر ایک غریب آدمی جی رہا تھا۔

اس طرح ہر آدمی کی انسانیت جاگ اٹھتی ہے۔ ہر آدمی دوسروں کے احساس میں شریک ہو جاتا ہے۔ ہر آدمی کے اندر یہ جذبہ ابھر آتا ہے کہ وہ دوسروں کی ضرورت میں ان کے کام آسکے۔ وہ بقدر استطاعت دوسروں کی مدد کرے۔ اس طرح روزہ ایک دوسرے کی ہمدردی اور ایک دوسرے کی مدد کا ایک عام جذبہ پیدا کر دیتا ہے جو رمضان کے بعد بھی مہینوں تک باقی رہتا ہے۔ یہاں تک کہ سال بھر پورا ہو کر پھر دوسرا رمضان آجاتا ہے جو دوبارہ آدمی کے اندر یہی انسانی جذبات ابھار دے۔

دو فرحتیں

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: للصائم فرحتان. یفرحھما۔ اذا افطر فرح و اذا لقی ربہ فرح بصومہ۔ یعنی روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں جن سے وہ خوش ہوگا۔ جب وہ افطار کرتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اور جب وہ اپنے رب سے ملے گا تو اپنے روزہ کے انعام پر خوش ہوگا (فتح الباری ۴/۱۴۱، صحیح مسلم بشرح النووی ۸/۳۱)

روزہ دار دن بھر بھوکا پیاسا رہتا ہے۔ اس کے بعد شام کو جب وہ افطار کرتا ہے اور کھانا اور پانی اس کے جسم میں داخل ہوتا ہے تو قدرتی طور پر اس کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ پھر موت کے بعد آخرت میں جب یہ روزہ دار اللہ سے ملے گا اور اللہ اس کی روزہ داری کے بدلے میں اس کو جنت میں داخل کرے گا تو اس وقت مزید اضافہ کے ساتھ اس کو کامل خوشی حاصل ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ روزہ دنیا کی زندگی کی علامت ہے اور افطار آخرت کی زندگی کی علامت۔ دنیا میں مومن کو ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا ہے اور قربانیوں کو برداشت کرنا ہے۔ لذتوں سے محروم ہو کر اس کو خدا کی اطاعت کرنا ہے۔ مگر آخرت کا معاملہ اس سے مختلف ہوگا۔ وہاں اس کے لئے خوشیاں ہی خوشیاں ہیں اور وہاں اس کے لئے آرام ہی آرام۔ اس طرح روزہ علامتی طور پر مومن کی دنیا کا تعارف ہے، اور افطار علامتی طور پر مومن کی آخرت کا تعارف۔

دنیا کی زندگی، مومن کے لئے فاقہ کی زندگی ہے، اور آخرت کی زندگی، مومن کے لئے اکل و شرب کی زندگی۔ دنیا میں مومن کے لئے ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں ہیں، اور آخرت میں مومن کے لئے انعام ہی انعام۔

روزہ آدمی کو احساس دلاتا ہے کہ دنیا میں اسے قربانیوں کی حد تک جا کر اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ اور افطار کی صورت میں اس کو یہ تجربہ کرایا جاتا ہے کہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جبکہ اس کا خدا اس طرح کی قدر دانی کرے گا کہ اس کو ابدی جنتوں میں داخل کر دے گا جہاں ہر قسم کی لامحدود خوشیاں اور لذتیں بھی ہوں گی، اور اسی کے ساتھ ان سے بہرہ اندوز ہونے کی مکمل آزادی بھی۔

داعی کی ذمہ داری

قرآن (البقرہ ۱۴۳) میں امت محمدی کو امت وسط کہا گیا ہے۔ فرمایا کہ اور اس طرح ہم نے تم کو بیچ کی امت بنا دیا، تاکہ تم گواہ ہو لوگوں کے اوپر اور رسول تمہارے اوپر گواہ ہو (وکذلک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا)

وسط کے معنی درمیان کے ہیں۔ مثلاً ایک لائن میں ایک، دو، تین لکھا جائے تو دو اس کا درمیانی عدد ہوگا۔ قرآن میں نماز عصر کو صلاۃ وسطی کہا گیا ہے۔ کیوں کہ وہ رات کی دو نمازوں اور دن کی دو نمازوں کے درمیان ہے (لانھا وسط بین صلاتی اللیل وصلاتی النھار) لسان العرب ۷/۴۳۰

اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوت و شہادت کے اعتبار سے امت محمدی کا رول ایک درمیانی رول ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے اس کو خدا کا دین ملا۔ اب اسے قیامت تک نیابۃً امر دین کو اہل عالم تک پہنچاتے رہنا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوام عالم کے درمیان ہے (ھم وسط بین النبی صلی اللہ علیہ وسلم وبین الامم) تفسیر الطبری ۲/۸

اس اعتبار سے گویا مسلمان کی حیثیت ایک قسم کے درمیانی آدمی (middle-man) کی ہے۔ ایسا آدمی اپنا درمیانی کردار اسی وقت ادا کر سکتا ہے جب کہ وہ طرفین کے نزدیک قابل اعتماد ہو۔ اسی لیے قرآن میں پیغمبر کے بارہ میں آیا ہے کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا رہا ہوں اور میں تمہارے لیے ناصح اور امین ہوں (ابلغکم رسالات ربی وانا لکم ناصح امین) الاعراف ۶۸

یعنی خدا کی نسبت سے امین اور انسانوں کی نسبت سے ناصح۔ ناصح کا مطلب خیر خواہ ہے۔ نصح کا لفظ غش (بدخواہی) کا ضد ہے۔ نصیحت کی تشریح میں ابن الاثیر نے کہا کہ یہ مخاطب کے لیے بہتری چاہنا ہے (ھی ارادۃ الخیر للمنصوح لہ)۔ النابغہ کا شعر ہے کہ میں نے بنو عوف سے ان کی خیر خواہی کی بات کہی مگر انھوں نے اس کو قبول نہیں کیا :

نصحتُ بنی عوف فلم یتقبّلوا (لسان العرب ۲/۶۱۶-۶۱۵)

امین کا لفظ خائن کا ضد ہے۔ یعنی امانت دار۔ یہاں امین کا مطلب یہ ہے کہ میں عین وہی بات تم کو بتا رہا ہوں جو مجھ کو خدا سے ملی ہے۔ میں نے اس میں کچھ بھی فرق نہیں کیا ہے۔ خدا نے اپنے دین کا

جو علم مجھے عطا کیا ہے، پوری امانت داری کے ساتھ عین وہی علم میں تم کو پہنچا رہا ہوں۔

مخاطب قوم کے لیے ناصح بننے کا معیار قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ داعی اپنی مدعو قوم سے کسی بھی قسم کے اجر کا طالب نہ ہو۔ پیغمبر نے اپنی قوم سے کہا: یا قوم لا اسئلکم علیہ اجراً (ھود ۵۱) یہ بے حد اہم بات ہے۔ کیوں کہ داعی اگر اپنے مدعو سے کسی بھی قسم کا اجر چاہے تو اس کی خیر خواہانہ حیثیت مشتبہ ہو جائے گی۔

امین ثابت ہونے کا معیار یہ ہے کہ داعی اپنے مدعو سے وہی کہے جو اس کو خدا کی طرف سے ملا ہے۔ اس میں کسی بھی قسم کی کمی یا بیشی یا تبدیلی نہ کرے۔ قرآن میں ہے کہ پیغمبر نے اپنی قوم سے کہا: انی رسول من رب العالمین حقیق علی ان لا اقول علی اللہ الا الحق (الاعراف ۱۰۵) مجھ پر واجب ہے کہ میں خدا پر نہ لگاؤں مگر وہی بات جو واقعہ ہے۔ یعنی خدا کی طرف سے ٹھیک ٹھیک پیغام رسانی کروں۔

امین اور ناصح —— یہ دو لفظ داعی کی پوری شخصیت کو بتاتے ہیں۔ داعی کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ دین خدا کے معاملہ میں پوری طرح امین بنے، اور مدعو کی نسبت سے وہ پوری طرح اس کا خیر خواہ ثابت ہو۔ ان دونوں ذمہ داریوں میں سے کسی ایک میں بھی اگر کمی واقع ہو تو دعوت کا عمل حقیقی طور پر انجام پانا ناممکن ہو جائے گا۔

دین خدا کے معاملہ میں امین بننے کے لیے اس کو ایسا ذہن بنانا ہے جو ہر قسم کے تعصب سے پاک ہو، تاکہ وہ دین کو اس کی صحیح صورت میں سمجھ سکے۔ اور مدعو یا خدا کے بندوں کے معاملہ میں اس کو انتہائی حد تک صابر و شاکر بننا ہے تاکہ لوگوں کی طرف سے زیادتی کا تجربہ ہو تب بھی وہ خیر خواہی اور ہمدردی کی روش سے نہ ہٹے۔ وہ لوگوں کے ردعمل سے بے نیاز ہو کر ان کی اصلاح و نجات کا حریص بنا رہے۔

زکوٰۃ کا مسئلہ

اسلام کی ایک اہم تعلیم زکاۃ ہے۔ قرآن میں اس کو دین قیم کا ایک رکن قرار دیا گیا ہے (البینہ ۵) اور اس کو تطہیر و تزکیہ کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ (التوبہ ۱۰۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من كنز مالا فلم يؤد زكاتها فويل له۔ یعنی اس آدمی کے لئے خرابی ہے جو مال کو جمع کرے۔ اور اس کی زکاۃ ادا نہ کرے۔ (ابن ماجہ، کتاب الزکاۃ) خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا کہ زکاۃ مال کا حق ہے: فان الزكاة حق المال (فتح الباری ۱۲/۲۸۸)

قرآن میں بہت سی آیتیں ہیں جن میں زکاۃ کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک آیت میں زکوٰۃ کے خرچ کی تفصیلی مدیں بتائی گئی ہیں:

انما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله وابن السبيل فريضة من الله والله عليم حكيم (التوبہ ۶۰)

صدقات تو فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں اور ان کارکنوں کے لئے جو صدقات کے اوپر مقرر ہیں اور ان کے لئے جن کی تالیف قلب مطلوب ہے۔ اور گردنیں چھڑانے میں اور قرضداروں کے قرضہ میں، اور اللہ کے راستہ میں اور مسافر کی امداد میں۔ یہ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ علیم وحکیم ہے۔

زکوٰۃ ایک عبادت ہے۔ ادائگی کے اعتبار سے وہ اسی طرح ایک شخصی عمل ہے جس طرح نماز ایک شخصی عمل ہے۔ البتہ اسلام میں عبادات کو اجتماعی زندگی سے جوڑ دیا گیا ہے تاکہ اس کا فائدہ پورے سماج تک وسیع ہو سکے۔ یہی معاملہ زکوٰۃ کا بھی ہے۔ زکوٰۃ ایک فرد اپنے مال سے نکالتا ہے مگر اس کے خرچ کی مدیں اس طرح مقرر کی گئی ہیں کہ اس کا فائدہ پورے سماج کو اور تمام انسانیت کو پہنچ سکے۔

سورہ توبہ کی اس آیت میں "صدقات" کا لفظ ہے۔ اکثر علماء نے اس سے زکوٰۃ مراد لی ہے تاہم کچھ علماء کی رائے یہ ہے کہ قرآن نے جب زکوٰۃ کا لفظ چھوڑ کر یہاں صدقات کا لفظ استعمال کیا ہے

تو ہمیں اس سے زکوٰۃ سمیت تمام مالی عطیات کو مراد لینا چاہئے۔

آیت میں کل آٹھ مدوں کا ذکر ہے مگر ان میں ایک فرق ہے۔ ابتدائی چار مدوں کا ذکر ل (لئے) کے حرف کے ساتھ ہے اور بعد کی چار مدوں کا ذکر فی (میں) کے حرف کے ساتھ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی ۴ مدوں میں شخصی تملیک مراد ہے۔ یعنی انفرادی طور پر کسی کو دینا۔ اور بقیہ چار مدوں میں شخصی تملیک کے ساتھ اجتماعی مد بھی شامل ہے۔ مثلاً ابن السبیل (مسافر) کو شخصی طور پر بھی صدقات کی رقم دی جاسکتی ہے اور مسافر خانہ جیسی تعمیر میں بھی اس کو خرچ کیا جاسکتا ہے جس سے مسافروں کو فائدہ پہنچے۔

سبیل اللہ (اللہ کے راستہ) کی نوعیت متعین کرنے میں علماء کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے۔ علماء کی ایک تعداد کا کہنا ہے کہ اس میں بھی تملیک ضروری ہے۔ یعنی کسی فرد واحد ہی کو دیا جائے گا نہ کسی اجتماعی مد میں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ انفرادی تملیک اور اجتماعی مد دونوں میں دینا جائز ہے۔

سبیل اللہ سے کیا مراد ہے، اس میں بھی علماء میں اختلاف ہوا ہے۔ ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد (بمعنی قتال) ہے۔ دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ نہیں، اس میں تمام امور خیر شامل ہیں۔ مثلاً حج، طلب علم، وغیرہ (ملاحظہ ہو تفسیر کبیر امام رازی)

آیت کے الفاظ سے واضح ہے کہ سبیل اللہ کو جہاد (بمعنی قتال) سے مخصوص کرنا صرف استنباطی ہے، وہ خود الفاظ قرآن سے براہ راست طور پر نہیں نکلتا۔ بعض احادیث کی بنیاد پر علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ سبیل اللہ کا تعلق صرف قتال سے نہیں ہے بلکہ وہ ایک عام حکم ہے۔

مثال کے طور پر صحیح البخاری (کتاب الدیات، باب القسامہ) کی ایک روایت پر گفتگو کرتے ہوئے ابن حجر العسقلانی نے لکھا ہے کہ بعض علماء نے اس کو ظاہر الفاظ پر محمول کیا ہے۔ چنانچہ قاضی عیاض نے بعض علماء کی رائے نقل کی ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کو مصالح عامہ میں خرچ کرنا جائز ہے انھوں نے اپنی رائے کے حق میں اس حدیث سے اور کچھ دوسری حدیثوں سے استدلال کیا ہے۔

وقد حمله بعضهم على ظاهره۔ فحكى القاضي عياض عن بعض العلماء جواز صرف الزكاة في المصالح العامة واستدل بهذا الحديث وغيره (فتح الباری ۱۲/۲۴۴)

مزید تفصیل کے لئے سورۃ التوبہ آیت ۶۰ کے تحت حسب ذیل تفسیروں میں دیکھا جا سکتا ہے:

۱-	التفسیر الکبیر، الرازی	م	۶۰۶ھ
۲	الجامع لاحکام القرآن ، القرطبی	م	۶۷۱ھ
۳	البحر المحیط ، ابو حیان	م	۷۴۰ھ
۴	روح المعانی، آلوسی	م	۱۲۷۰ھ

قرآن و حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سبیل اللہ کا لفظ سبیل دین کے معنی میں ہے۔ نہ کہ سبیل قتال کے معنی میں۔ اس میں ہر وہ دینی کام شامل ہے جس کے لئے مالی اعانت کی ضرورت ہو۔

جہاد کے معنی صرف کوشش کے ہیں نہ کہ قتال کے۔ چنانچہ ہر دینی کام کے لئے کوشش کرنا جہاد ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے بڑا جہاد دعوت دین میں کوشش کرنا ہے (وجاھدھم بہ جھاداً کبیراً) اس لحاظ سے سبیل اللہ کی مد میں دعوت دین اور اشاعت اسلام کا کام خصوصی اہمیت کے ساتھ شامل ہوگا۔

اصل یہ ہے کہ دین کا اظہار ہر حال میں اور ہمیشہ مطلوب ہے۔ البتہ زمانہ کے حالات کے اعتبار سے اس کی ترجیحات میں فرق ہو سکتا ہے۔ مثلاً قدیم مکہ جیسے حالات ہوں تو سبیل اللہ سے مراد سب سے زیادہ دعوت اور اشاعت اسلام کا کام ہوگا۔ اور اگر فریق ثانی کی عملی جارحیت کے نتیجہ میں دفاع کی ضرورت پیش آجائے تو دفاع میں خرچ کرنے کی اہمیت وقتی اعتبار سے بڑھ جائے گی۔ وغیرہ

موجودہ زمانہ میں اسلام کو مختلف طاقتوں کی طرف سے چیلنج درپیش ہے۔ یہ چیلنج جنگی نہیں ہے بلکہ علمی ہے۔ آج اسلام کا سب سے بڑا دفاعی مسئلہ علم کے میدان میں پیش آرہا ہے۔ اس لئے اسلام کے علمی دفاع کے محاذ پر زکوٰۃ کی مد سے خرچ کرنا دوگونہ اہمیت کا حامل ہے۔ ایک یہ کہ وہ دعوت اسلام کا کام ہے، دوسرے یہ کہ وہ اسلام کا دفاعی کام بھی ہے۔

حدیث میں ہے کہ قیامت تک میری امت میں ایسا گروہ ہوگا جو جہاد کرتا رہے گا۔ اس کی تشریح امام بخاری نے یہ کی ہے کہ وھم اھل العلم (اور وہ اہل علم ہیں فتح الباری

بشرح صحیح البخاری ۱۳/ ۳۰۶۔

حقیقت یہ ہے کہ علم کی راہ سے اسلام کی اشاعت کرنا یا اسلام کا دفاع کرنا سبیل اللہ کا سب سے بڑا کام ہے۔ اور صدقات (زکوٰۃ) کی رقم کا اس مد میں خرچ کیا جانا، خاص طور پر موجودہ زمانہ میں، اس کی سب سے اہم مد ہے۔

یہ ایک معلوم بات ہے کہ دین کے اکثر مسائل میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کی مدوں کے معاملہ میں بھی علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خود دور اول میں صحابہ و تابعین کے درمیان کثرت سے اختلاف پایا جاتا تھا۔ یہی ابتدائی اختلاف بعد کے علماء تک منتقل ہو گیا۔ علماء ہی نے لکھا ہے کہ یہ اختلاف امت کے لئے عین رحمت ہے۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے دین میں توسع کی صفت پیدا ہو گئی ہے۔ اور اس بنا پر ہمارے لئے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ہم بدلتے ہوئے حالات میں شرعی احکام کو ازسرنو منطبق کر سکیں۔ اور ہر دور کے حالات میں اس کے موافق کوئی نہ کوئی حکم یا کسی نہ کسی کا قول پالیں۔ یہ دین اسلام کی ابدیت اور ہمہ گیریت کا ایک یقینی ثبوت ہے۔

خلاصۂ کلام

قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کو کن مدوں میں خرچ کیا جائے۔ یہ کل آٹھ مدیں ہیں ــــ فقراء، مساکین، عاملین زکوٰۃ، مؤلفۃ القلوب، رقاب، غارمین، سبیل اللہ ابن السبیل (التوبہ ۶۰)

ان میں سات مدیں حاجاتی مدیں ہیں، اور ایک مد (سبیل اللہ) وہ ہے جس کو تحریکی مد کہا جا سکتا ہے۔ حاجاتی مد سے مراد وہ مد ہے جو شخصی ضرورت سے تعلق رکھتی ہے۔ مختلف اسباب کے تحت کوئی شخص کبھی وقتی طور پر اور کبھی مستقل طور پر معاشی اعتبار سے ضرورت مند بن جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو زکوٰۃ کے فنڈ سے مالی مدد فراہم کی جانی چاہئے۔

سبیل اللہ کی مد ایک تحریکی مد ہے۔ یعنی اسلام کو ایک دینی مشن اور فلاح انسانیت کی ایک اسکیم کی حیثیت سے جاری کرنا اور اس سلسلہ میں جو ضرورتیں پیش آتی ہیں، ان کو مالی تعاون دینا۔ یہ سبیل اللہ (اللہ کے راستہ) میں خرچ کرنا ہے۔ بقیہ مدیں اگر انسانی ضرورت سے تعلق

رکھتی ہیں تو اس مد کا تعلق خود اسلام کی اپنی ضرورت سے ہے۔ سبیل اللہ کی یہ مد زکوٰۃ کی آٹھ مدوں میں سے ایک اہم مد ہے۔

تحریکی مد سے مراد ہے ــــ دعوہ ورک، اسلام کی مشنری ضرورتیں، اسلام کی اشاعتی مہم، اسلام کے خلاف اعتراضات کا جواب، اسلام کو طاقت ور نظریہ کی حیثیت سے پیش کرنا، اسلام پر حملوں کا دفاع۔ یہ تمام مدیں وہ ہیں جو اسلام کو بطور ایک عالمی مشن کے اٹھانے کی صورت میں پیش آتی ہیں۔ اور وہ اسلام کی نظریاتی برتری کو مسلسل قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔

یہ ایک نہایت اعلیٰ کام ہے اور اس میں بے حد ثواب ہے۔ یہ وہ کام ہے جس کو قرآن میں خدا کی نصرت (الصف ۱۴) کہا گیا ہے اور اس کے لئے محنت کرنے کو جہاد کبیر (الفرقان ۵۲) بتایا گیا ہے۔ یعنی خدا کے دین کو پھیلانے کے لئے اور اس کو دنیا میں اونچا کرنے کے لئے اپنی طاقتوں کو لگانا۔ اس کام میں اہل اسلام کو ہر طرح تعاون پیش کرنا چاہئے۔ اس کی خصوصی اہمیت کی بنا پر زکوٰۃ فنڈ کا ایک حصہ اس کے لئے خاص کر دیا گیا ہے تاکہ ہر حال میں اور ہر دور میں اس کو مالی تعاون ملتا رہے اور وہ مسلسل جاری اور قائم رہے۔

(۲۸ جنوری ۱۹۹۶)

۲۲ اکتوبر کو صبح ساڑھے دس بجے دوبارہ ڈاکٹر لیونارڈو کے ساتھ فلارنس دیکھنے کے لئے نکلا۔ ہم لوگ اس پہاڑی پر گئے جس کو یہاں سبس ٹیس (S. Sebastieus) کہا جاتا ہے۔ یہ ایک نہایت خوبصورت مقام ہے۔ اس کو سیاحوں کے اعتبار سے ڈولپ کیا گیا ہے۔ یہاں سے فلارنس کا بیشتر حصہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ آفاقی انداز کا ایک خوبصورت منظر تھا۔ یہاں مختلف ملکوں کے سیاح مرد اور عورت نظر آئے۔ سینٹ سیبس ٹیس ایک مسیحی تھے جن کو ۲۸۸ میں مذہبی بنیاد پر قتل کر دیا گیا۔

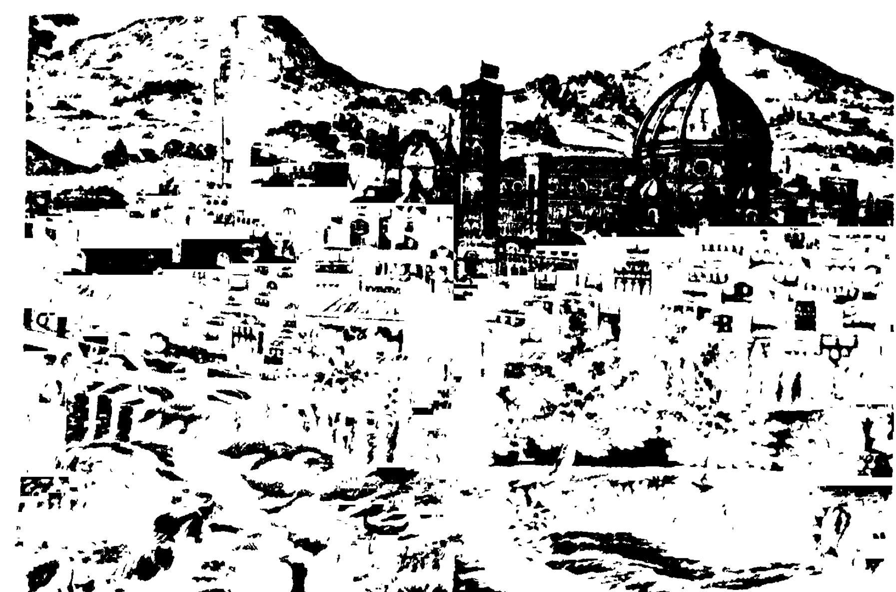
یہاں سے فلارنس کا پھیلا ہوا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سورج کی آفاقی ٹارچ اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی تھی۔ بمبئی کی طرح کثیر منزلہ عمارتیں کہیں نظر نہیں آئیں۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ یہ لوگ اپنی تاریخی روایات کو قائم رکھنے کے معاملہ میں نہایت حساس ہیں۔ چنانچہ یہاں وہ ملٹی اسٹوری بلڈنگیں نہیں بناتے۔

جگہ جگہ فلارنس کے چرچ ابھرے ہوئے نظر آئے۔ اتنے میں ایک چرچ سے گھنٹہ کی مخصوص آواز سنائی دینے لگی۔ پوچھنے پر میرے اطالوی ساتھی نے بتایا کہ چرچ کے گھنٹے مختلف مواقع پر بجائے جاتے ہیں۔ مثلاً عبادت کے لئے۔ کسی کی موت کے اعلان کے لئے یا کسی تقریب کے لئے۔ ہر ایک کے لئے الگ الگ آوازیں مقرر ہیں۔ جب چرچ سے گھنٹہ کی آواز سنائی دیتی ہے تو آواز کے فرق سے لوگ جان لیتے ہیں کہ کس بات کا اعلان کیا جا رہا ہے۔

تمام چرچوں میں صرف ایک ٹاور دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ آجکل نئی مسجدوں میں ایک مینار بنانے کا رواج بڑھ رہا ہے۔ یہ غالباً چرچ کو دیکھ کر پیدا ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان کثرت سے یورپ کے شہروں میں گئے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ چرچ میں عام طور پر ایک ٹاور ہوتا ہے۔ یہ بات انھیں تصور توحید کے مطابق نظر آئی۔ اور انھوں نے اس کو اپنے حسب حال پاکر اسے اختیار کر لیا۔

یورپ کے ایک نوجوان ڈاکٹر سے گفتگو ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے یہاں تقریباً صد فی صد لو میرج ہوتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بیشتر شادیاں تفریق پر ختم ہو جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد دونوں اکیلے کی زندگی گزارتے ہیں۔ انھوں نے مختلف وجہیں بیان کیں۔ مثلاً یہ کہ حقیقت

میں وہ محبت نہیں ہوتی۔ بلکہ سطحی کشش سے قریب ہوکر دونوں شادی کر لیتے ہیں۔ وغیرہ۔
میں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ مرد فطری طور پر غلبہ کا رجحان رکھتا ہے۔ شادی کے بعد ابتدائی کچھ دنوں تک اس کا یہ رجحان دبا رہتا ہے۔ مگر جلد ہی یہ رجحان ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اب شوہر چاہتا ہے کہ وہ گھر میں غالب ممبر کی حیثیت سے رہے۔ دوسری طرف عورت فیمنسٹ تحریکوں کے زیر اثر (نہ کہ فطرت کے زیر اثر) عورت اور مرد کی مساوات (gender equality) کے نظریہ کے مطابق رہنا چاہتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ٹکراؤ شروع ہوتا ہے جو بالآخر تفریق اور طلاق پر ختم ہوتا ہے۔ انھوں نے میرے نقطۂ نظر سے کامل اتفاق کیا۔
پھر میں نے کہا کہ اس سلسلہ میں دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ شادی سے پہلے جب ایک نوجوان کسی لڑکی کو پسند کرتا ہے تو ابتدائی تاثر کے تحت وہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ میرے لئے پرفکٹ عورت ہے۔ مگر اس دنیا میں کوئی چیز پرفکٹ نہیں۔ اور اسی طرح کوئی عورت (یا مرد) بھی پرفکٹ نہیں۔ جلد ہی مرد کے اوپر یہ حقیقت کھل جاتی ہے۔ اب وہ اپنی پسندیدہ خاتون کو کم تر سمجھ کر اس سے بے رغبت ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے سے دور



ہو جاتے ہیں۔

اس مسئلہ کا حل طلاق یا دوسرا نکاح نہیں ہے۔ بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ آپ یہ جانیں کہ اس دنیا میں کوئی بھی چیز آئیڈیل یا پرفکٹ نہیں۔ یہاں ہر معاملہ میں ہمیں غیر آئیڈیل یا غیر پرفکٹ کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کرتے ہوئے زندگی گزارنا ہے۔ گویا کامیاب زندگی کا راز ایڈجسٹمنٹ میں ہے نہ کہ ناکام طور پر کامل کو تلاش کرنے میں جو کبھی ملنے والا نہیں۔ انھوں نے میری اس بات سے بھی مکمل اتفاق کیا۔

۲۲ اکتوبر کو ظہر کی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو مروجہ نیت کے بجائے یہ الفاظ میری زبان پر آگئے: یا اللہ میں تجھ سے امید رکھتا ہوں کہ جب میں مرکر آخرت کی دنیا میں پہنچوں تو میرے بارہ میں تو کہہ دے کہ یہ میرا بندہ ہے جو میرے لئے سجدہ کرکے اور میرے لئے رکوع کرکے یہاں آیا ہے۔۔۔

نماز کے بعد اپنے ساتھی کے ہمراہ شہر کی بڑی مناسٹری میں پہنچا۔ یہاں کے وسیع ہال میں انسانوں کا ہجوم تھا۔ لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ اس غیر معمولی ہجوم کو دیکھ کر خیال آیا کہ جب اتنے سارے لوگ امن کے خواہش مند ہیں تو دنیا میں امن قائم کیوں نہیں ہوتا۔ دل نے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں ہی نہیں جو دنیا میں بدامنی پھیلائے ہوئے ہیں۔ گویا امن پسند لوگ آپس میں امن کی باتیں کر رہے ہیں۔

اس طرح کی تمام کانفرنسیں، خواہ وہ ملکی ہوں یا بین اقوامی وہ سب نو پرابلم انسانوں کے اجتماع کے ہم معنی ہوتی ہیں۔ ہماری دنیا کے جو پرابلم انسان ہیں وہ یہاں آتے ہی نہیں۔ پھر امن کی باتوں کا کوئی عملی نتیجہ نکلے تو کیوں کر نکلے۔ اسی احساس کے تحت پچھلے چند سال سے میں 'پرابلم انسانوں' کے اپنے اجتماعات میں جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اور ان کی اپنی بھیڑ میں جاکر انھیں امن کا پیغام دے رہا ہوں۔ مگر جو لوگ اس راز کو نہیں سمجھتے وہ مجھ پر عجیب عجیب الزامات عائد کرتے ہیں۔

یہاں ایک نوجوان نے مجھ سے نصیحت لکھنے کے لئے کہا۔ میں نے اس کی ڈائری میں یہ الفاظ لکھ دئے ــــــــ حقیقت پسند بنو اور کامیابی تمہارے لئے یقینی ہو جائے گی،

۱۹۹۵ میں یروشلم میں ایک انٹر ریلیجس کانفرنس تھی۔ اس میں یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر میں نے اس میں شرکت کی۔ اور وہ مقالہ پیش کیا جو الفصل بین القضیتین کے عنوان سے الرسالہ نومبر ۱۹۹۵ میں شائع ہوچکا ہے۔ اس کانفرنس میں کئی عربوں کو بھی دعوت نامہ بھیجا گیا تھا مگر وہ اس میں شریک نہیں ہوئے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک یروشلم (قدس) جانا یروشلم کے اوپر یہودیوں کے ناجائز قبضہ کو تسلیم کرنے کے ہم معنی ہے۔ ان میں سے کچھ عرب فلارنس کی کانفرنس میں موجود تھے۔

ایک مجلس میں ایک عرب شیخ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ قدس کی کانفرنس میں گئے تھے میں نے کہا کہ کیوں نہ جاتا (لم لا) پھر اس موضوع پر ان سے گفتگو ہوئی۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ اللہ نے آپ کو ایک موقع دیا تھا کہ آپ وہاں جائیں اور اس مقام پر اللہ کے لئے سجدہ کریں۔ جہاں رسول اللہ نے اور تمام دوسرے نبیوں نے سجدہ کیا۔ مگر آپ نے اس سے انکار کیا کہ آپ کا شمار ان مقدس ساجدین میں کیا جائے۔ آپ لوگوں نے ایک سنہرا موقع کھو دیا:

ان اللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ ھیأ لکم الفرصۃ لکی تسجدوا حیث سجد الانبیاء کلھم ولکنکم رفضتم ان تکونوا مع ھٰؤلاء الساجدین المقدسین۔ انکم واللّٰہ فقدتم فرصۃ ذھبیۃ۔

جسٹس کھنہ اردو زبان جانتے ہیں اور اقبال کے اشعار بڑے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ایک بار کھانے کی میز پر انھوں نے اقبال کا ایک اردو شعر سنایا۔ پاس ہی ایسٹرڈم سے آئے ہوئے سوامی چت بھاشانند بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مکمل طور پر گیروے لباس میں ملبوس تھے۔ دور تک بھی مجھے یہ گمان نہیں تھا کہ وہ اردو جانتے ہوں گے۔ مگر جیسے ہی جسٹس کھنہ نے شعر سنایا، سوامی جی نے جیب سے قلم کاغذ نکالا اور جسٹس کھنہ سے دوبارہ پوچھ کر اس کو اردو رسم الخط میں لکھنے لگے۔

۱۹۴۷ سے پہلے کے ہندستان میں پیدا ہونے والے ہندو عام طور پر اردو زبان جانتے تھے۔ بلکہ بہت سے فارسی سے بھی واقف تھے۔ جسٹس کھنہ نے بتایا کہ شہنشاہ ایران جب دہلی آئے تو اس وقت کے راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے ان کے استقبالیہ جلسہ میں فارسی زبان میں

تقریر کا جس سے شاہ بہت خوش ہوئے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ جس زمانہ میں ہمارے ملک کے ہندو مسلم کلچر سے اتنا زیادہ قریب تھے، اسی زمانہ میں کچھ نام نہاد مسلم رہنماؤں کو مسئلہ ملت کے حل کی یہ الٹی تدبیر سوجھی کہ ہندوؤں سے کٹ کر اپنا علیحدہ ملک بنائیں اور ہندوؤں کو ہمیشہ کے لئے اسلام اور مسلمانوں سے دور کر دیں۔

سوڈان کے مسلمان اپنے سر پر سفید عمامہ باندھتے ہیں۔ مجھے یہ عمامہ پسند آیا۔ ان کا عمامہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ میں نے چھوٹا عمامہ استعمال کرنا شروع کیا۔ کانفرنس میں سوڈان کے شیخ اسحاق سکوتہ بھی شریک تھے۔ ان کو یہ انداز پسند آیا۔ اور انھوں نے اپنی طرف سے ایک سفید عمامہ مجھے بطور ہدیہ پیش کیا۔ اس کو لیتے ہوئے میں نے کہا : هذه جيدة مباركة وسوف تكون لي شرفاً وكرامة

سوڈان کے لوگ سیاہ فام ہوتے ہیں۔ مگر ان کا قومی لباس سفید پگڑی ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں جب عرب اس علاقے میں داخل ہوئے تو اس کو انھوں نے بلاد السودان (سیاہ فام لوگوں کا ملک) کہا۔ اسی سے اس ملک کا نام سودان یا سوڈان پڑ گیا۔ سوڈان براعظم افریقہ کا سب سے بڑا ملک ہے۔ یہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ تاہم جنوبی سوڈان میں عیسائی کافی تعداد میں آباد ہیں۔

سوڈان میں اسلام کے تیزی کے ساتھ پھیلنے کا سبب یہ تھا کہ کئی غیر مسلم راجاؤں نے اسلام قبول کر لیا۔ مثلاً کنبورد اور زرا کاسی وغیرہ۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے افریقہ میں اسلام کی اشاعت کے تحت لکھا ہے کہ اس زمانہ کی تبلیغی سرگرمیوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ مسلم آبادی میں اضافہ ہوتا، اگر وہ مہلک قسم کی باہمی لڑائیاں نہ ہوتیں جن میں ایک مسلم حکومت دوسری مسلم حکومت کی تباہی کا سبب بن گئی:

the propagandist activities... would have contributed to the more rapid growth of a Muhammadan population, had it not been for the internecine wars that caused one Muhammadan state to work the destruction of another. (*The Preaching of Islam*, p. 324)

یہاں کئی بدھسٹ آئے ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ بدھسٹ سے بات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ سچائی کی دریافت کا آخری درجہ سکون ہے۔ جب آدمی سچائی کو دریافت کرتا ہے تو اس کو کامل ذہنی سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ یہی سکون وہ چیز ہے جس کو دوسرے مذاہب میں جنت کہا گیا ہے۔

میں نے کہا کہ ذہنی سکون کا تعلق دریافت حقیقت سے نہیں ہے بلکہ اس بات سے ہے کہ آدمی نے کیا دریافت کیا ہے۔ مثلاً ایک ایسا نظریہ جس میں حساب وکتاب (accountability) کا کوئی تصور نہ ہو۔ جس میں موت کو خاتمہ کے ہم معنی سمجھا گیا ہو۔ ایسے نظریہ کی دریافت آدمی کے اندر ذہنی سکون لا سکتی ہے۔ مگر ایسا مذہب جس میں یہ مانا گیا ہو کہ مرنے کے بعد انسان کے قول وعمل کا حساب لیا جائے گا، وہ کبھی وہ چیز نہیں دے سکتا جس کو آپ ذہنی سکون کہہ رہے ہیں۔ کیوں کہ حساب کا تصور اس کو مستقل طور پر اس احساس کے تحت بے چین رکھے گا کہ معلوم نہیں آخرت کی جانچ میں میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

میں نے کہا کہ کسی نظریہ کو آپ اس بنا پر برحق نہیں کہہ سکتے کہ وہ آدمی کو ذہنی سکون دے رہا ہے۔ صداقت کو جانچنے کا یہ معیار درست نہیں۔ اس کے بجائے یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ نظریہ بجائے خود معقول ہے یا نہیں۔ میں نے کہا کہ تمام متعلق حقائق یہ بتاتے ہیں کہ موت پر خاتمہ کا نظریہ درست نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کا کوئی ثبوت ہے کہ زندگی ایک دور مسلسل کا نام ہے۔ یعنی جینا پھر مرنا، پھر جینا پھر مرنا۔ یہ صرف ایک مفروضہ ہے نہ کہ کوئی ثابت شدہ حقیقت۔

اس کے برعکس موت کے بعد سزا وجزا کا نظریہ انتہائی معقول ہے۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں بنتی کہ یہ مانا جائے کہ آخر کار ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب کہ ظالم کو سزا ملے اور حق پرست کو انعام دیا جائے۔

ایک اطالوی نوجوان سے بات ہو رہی تھی۔ میں نے مثبت سوچ کے بارہ میں کچھ باتیں بتائیں۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ پھر میں نے کہا کہ اپنی زندگی کے بارہ میں میرا اصول مختصر طور پر یہ ہے ——— سادہ زندگی، اونچی سوچ (simple living, high thinking) پھر میں نے کہا

کہ اس کو آپ اٹالین زبان میں لکھئے۔ انھوں نے ایک کاغذ پر حسب ذیل الفاظ لکھے :

Vivere sempli cemente, pensare alla grande

ایک اٹالوی لڑکی میرے پاس آئی۔ اس نے کہا کہ میں عربی کی طالب علم ہوں۔ اور پھر اس نے عربی میں بولنا شروع کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ روم کی یونیورسٹی میں عربی زبان کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ اس شعبہ میں سو سے زیادہ طالب علم ہیں۔ تاھم زیادہ تعداد لڑکیوں کی ہے۔ یعنی ستر فیصد۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگ عربی زبان کیوں پڑھ رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہمارا ملک عرب دنیا سے بہت قریب ہے۔ ہمارے اور عرب دنیا کے بیچ میں صرف بحر متوسط حائل ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم عربوں کی زبان اور ان کے کلچر کو جانیں۔

میں نے سوچا کہ دنیوی مقاصد کے لئے لوگ دوسروں کی زبان اور ان کے کلچر کے بارہ میں معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ مگر یہی چیز دعوتی مقصد کے لئے مسلمانوں میں پیدا نہ ہو سکی۔

کیرالا کے ایک عیسائی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا نام فادر نیتیا (Fr. Nithya) بتایا۔ وہ روم میں رہتے ہیں اور ایک مسیحی عالمی ادارہ میں سکریٹری ہیں۔ وہ نہایت باصلاحیت معلوم ہو رہے تھے۔ مسیحی افراد نے بے شمار اعلیٰ قسم کے ادارے کھول رکھے ہیں۔ مسیحیت سے تعلق رکھنے والوں کو وہ ان اداروں میں باعزت جگہیں دیتے ہیں۔ اس طرح وہ باصلاحیت نوجوانوں کو اپنے ساتھ لینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہمارے یہاں اس قسم کے ادارے نہیں۔ اس لئے اپنی قوم کے باصلاحیت نوجوانوں کو ہم اسلامی خدمت کے کام میں مصروف بھی نہ کر سکے۔

ایک صاحب سے امن کے موضوع پر بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ امن کے حصول کے لئے واحد قابل عمل فارمولا صرف ایک ہے، وہ یہ کہ صورت موجودہ کو مان لیا جائے،

The only workable formula for peace is to accept the status quo.

انھوں نے کہا کہ پھر تو آپ ظلم کو ابدی لائسنس دے رہے ہیں۔ کیوں کہ صورت موجودہ کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ظلم کو ختم کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ بلکہ ظلم کو اسی حالت میں باقی رہنے دیا جائے جیسا کہ وہ ہے۔

میں نے کہا کہ ظلم کو ختم کرنے کے لئے جہاں جہاں اقدام کیا گیا ہے کیا وہاں ظلم ختم ہوگیا۔ مثلاً روس میں ظلم کو ختم کرنے کے نام پر خونیں انقلاب لایا گیا۔ مگر اس نے روس میں ظلم کا خاتمہ نہیں کیا۔ مصر میں ظلم کو ختم کرنے کے لئے شاہ فاروق کو اور پاکستان میں ظلم کو ختم کرنے کے لئے ذوالفقار علی بھٹو کو ختم کیا گیا۔ مگر دوبارہ ان کے خاتمہ سے ظلم کا خاتمہ نہیں ہوا۔ یہی تاریخ میں بار بار ہوا ہے۔

اصل یہ ہے کہ خاتمہ ظلم کے نام پر ٹکراؤ کرنے سے امن نہیں آتا۔ بلکہ اس چیز کو ٹالریٹ کرنے سے امن قائم ہوتا ہے جس کو آپ ظلم کا نام دے رہے ہیں۔ کیوں کہ دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایسا نظام قائم ہو جائے جو تمام لوگوں کو بالکل ٹھیک دکھائی دینے لگے۔ آپ کوئی بھی نظام بنائیں کچھ ایسے لوگ ہمیشہ باقی رہیں گے جن کو وہ غیر منصفانہ دکھائی دے گا۔

ظلم ختم کرنے کی واحد قابل عمل صورت یہ ہے کہ اس سے براہ راست ٹکراؤ نہ کرتے ہوئے ان دائروں میں کام کیا جائے جہاں ٹکراؤ کئے بغیر کام کرنے کا موقع حاصل ہے۔ اس کی ایک اچھی مثال جدید جاپان میں ملتی ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپان عظیم ظلم کا شکار ہوا۔ امریکی غلبہ کی صورت میں جنگ کے بعد بھی یہ ظلم بدستور باقی رہا۔ مگر جاپان نے "ظالم" سے ٹکراؤ کا راستہ چھوڑ کر پر امن دائرہ میں اپنا عمل شروع کر دیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ الجیریا پر لکھئے۔ وہاں بہت ظلم ہو رہا ہے۔ اب تک ساٹھ ہزار آدمی مارے جا چکے ہیں اور دکھ کی بات یہ ہے کہ مرنے والے بھی مسلمان ہیں۔ اور مارنے والے بھی مسلمان۔ میں نے کہا کہ الجیریا (اور اس قسم کے دوسرے ملکوں میں) صرف ایک ہی فارمولا قابل عمل ہے۔ اور وہ وہی ہے جو آج بھی سعودی عرب اور دوسرے پٹرول کے ملکوں میں بالفعل پوری طرح رائج ہے۔ وہ فارمولا یہ ہے کہ "پولٹیکل اقتدار کو چیلنج نہ کرو، اس کے بعد تم کو ہر قسم کی آزادی حاصل رہے گی"۔

انھوں نے کہا کہ الجیریا میں وہاں کی حکومت جو کچھ کر رہی، کیا اس کو آپ حقوق انسانی کی خلاف ورزی نہیں سمجھتے۔ میں نے کہا کہ الجیریا سے لیکر کشمیر تک ہر جگہ کے بارہ میں میری رائے یہ ہے کہ وہ حقوق انسانی کی خلاف ورزی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ عقل انسانی کی خلاف ورزی کا مسئلہ

ہے۔ ان مقامات نام نہاد اسلام پسند جو کچھ کر رہے ہیں وہ سراسر بے عقلی ہے، اور بے عقلی کا انجام ہمیشہ یہی ہوا کرتا ہے۔

ایک عیسائی پروفیسر نے کہا کہ ہمارا نظام آپ کے اسلام سے زیادہ بہتر ہے۔ کیوں کہ ہمارا نظام فریڈم کے اصول پر قائم ہے۔ ہم ہر ایک کو فکر وعمل کی آزادی دیتے ہیں۔ جب کہ اسلام جبر کے اصول پر قائم ہے۔ دیکھئے، ہم ہر جگہ پیس کانفرنس کرتے ہیں، اور مسلمان ہر جگہ گن کلچر چلا رہے ہیں۔

You see, we are holding peace conferences, while Muslims are engaged in gun culture everywhere.

میں نے ان صاحب کو ایک وقتی جواب دیا۔ اس کے بعد جب میں اپنے کمرہ میں آیا اور اس پر سوچنا شروع کیا تو میرے دل نے کہا کہ جہاں تک اصول اسلام کا تعلق ہے، ان کا اعتراض بلاشبہہ غلط ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان عملاً اسلام کے نام پر جو کچھ کر رہے ہیں وہ تو بظاہر ایسا ہی ہے، یہ لوگ غیر مسلموں کو یہ موقع دے رہے ہیں کہ وہ اسلام پر مذکورہ قسم کے شبہات وارد کریں۔

پھر مجھے قرآن کی آیت یاد آئی جس میں اہل اسلام کو یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ: رَبَّنَا لا تجعلنا فتنة للقوم الظالمين (یونس ۸۵) اس آیت کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ: اے ہمارے رب، ان کو ہمارے اوپر غلبہ نہ دے کہ وہ فخر وناز میں مبتلا ہو جائیں اور یہ گمان کرنے لگیں کہ وہ ہم سے بہتر ہیں۔ فتنہ یہاں منکرین کا اپنے انکار کے اوپر فخر کرنا ہے۔ (یقول: لاتظهرهم علينا فيعجبوا ويظنوا أنهم خير منا، فالفتنة ههنا إعجاب الكفار بكفرهم) لسان العرب ۱۳/ ۳۱۷

یہ آیت براہ راست طور پر موجودہ زمانہ کے ان مسلمانوں پر صادق آتی ہے جو اپنے آپ کو انقلابی اسلام کا نمائندہ بتاتے ہیں۔ ان کے نام نہاد انقلابی اقدامات نے اسلام کو بدنام کرنے کے سوا کوئی اور کارنامہ انجام نہیں دیا۔

انڈیا کے کئی لوگ اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ کھانے کی میز پر ایک بار ایسا ہوا کہ ایک سوامی جی نے گوشت، مچھلی، انڈا ہر چیز لینے سے انکار کر دیا۔ اس میز کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے

ان کی بحث شروع ہوگئی۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ سوامی جی، آپ گوشت، مچھلی، انڈا کیوں نہیں کھاتے۔ سوامی جی نے کہا کہ ہم جان مارنے کو سب سے بڑا گناہ سمجھتے ہیں۔ اور یہ غذائیں جان مار کر حاصل کی جاتی ہیں۔ انھوں نے ایک بھارتی ودوان کا مشہور مقولہ دہرایا کہ احساس کو مارنا گناہ ہے اور احساس کو زندگی دینا نیکی ہے:

Killing of a sensation is sin and vice versa.

میز پر بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ سوامی جی، سائنٹفک دور میں تو اب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہر چیز میں زندگی ہے۔ دودھ، سبزی، پانی، حتی کہ ہوا میں بھی زندگی ہے۔ آپ کے لئے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اس دنیا میں رہنا ممکن ہی نہیں۔ اگر آپ اس اصول کے مطابق رہیں تو آپ کسی دوسری جان کو تو قتل نہیں کریں گے۔ البتہ خود اپنے آپ کو قتل کریں گے۔ اب آپ کو فیصلہ کرنا ہے کہ آپ خودکشی کو ترجیح دیتے ہیں یا، آپ کے الفاظ میں، قتل احساس کو۔ سوامی جی مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

کھانے سے فراغت کے بعد سوامی اگنی ویش سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ یہاں کا کھانا آپ کو کیسا لگا۔ انھوں نے کہا کہ میں تو ٹھیک سے کھا نہ سکا۔ میں نے کہا کہ آپ تو اکثر باہر کے ملکوں میں جاتے ہیں۔ پھر آپ دوسرے ملکوں کے کھانے کے عادی نہیں ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ میں تو ہر جگہ اپنے کسی ہندستانی کے یہاں ٹھہر جاتا ہوں۔ وہ مجھے ہندستانی بھوجن کھلا دیتا ہے۔ مگر یہاں فلارنس میں ایسا کوئی ہندستانی نہیں ملا۔

ہمارے علما رکا حال بھی یہی ہے۔ وہ باہر جاتے ہیں تو اپنے حلقہ کے کسی مسلمان کے یہاں ٹھہرنا پسند کرتے ہیں۔ وہاں ان کو اپنی پسند کا کھانا اور اپنی پسند کا ماحول مل جاتا ہے۔ مگر اس ذوق کی بنا پر ان کے بیرونی اسفار بڑی حد تک بے فائدہ ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسری قوموں سے ان کا اختلاط نہیں ہوتا۔ ان کے نرم اور گرم سے وہ آشنا نہیں ہوتے۔ ان کی تلخیوں کو وہ نہیں چکھتے، چنانچہ بیرونی ملکوں میں جانے کے باوجود عملاً وہ وہاں کے حقیقی حالات سے بے خبر رہتے ہیں۔ اپنے سے مختلف ذوق اور مختلف سوچ کے لوگوں سے اختلاط (انٹرایکشن) بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کبھی ذہنی ارتقا نہیں ہو سکتا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص لوگوں کے ساتھ اختلاط کرتا ہے اور ان کی اذیتوں کو سہتا ہے وہ اس شخص سے بہتر ہے جو لوگوں کے ساتھ اختلاط نہیں کرتا اور لوگوں کی اذیتوں کو برداشت نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں پر یہی حدیث صادق آتی ہے۔

یہاں بہت سے ملکوں کے لوگ آئے ہیں۔ مسلم بھی اور غیر مسلم بھی۔ اکثر ان سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ جاپان سے بھی کئی لوگ آئے ہیں۔ جاپانی وفد کے قائد کا نام یہ ہے:

Most Ven. Kojun Handa
Chief Priest. Jourakuji Temple
Ueda-city. (Tel. 0268-38-2040, Fax 0268-38-8545)

ان سے دیر تک گفت گو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ جاپان میں ۹۰ فیصد بودھ ہیں۔ دوسرے نمبر پر شنٹو مذہب کے لوگ ہیں۔ اور تیسرے نمبر پر عیسائی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان ہمارے ملک میں بہت کم ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سو سال پہلے تک مسلم ملکوں سے جاپان کا کوئی ربط ہی نہیں تھا۔

ایک صاحب ملے۔ انھوں نے بتایا کہ میں مسلم ہوں اور قفقاز سے آیا ہوں، وہ انگریزی یا عربی دونوں میں سے کوئی زبان نہیں جانتے تھے۔ اس لئے ان سے زیادہ گفتگو نہیں ہوسکی۔ انھوں نے مجھ کو دیکھ کر سوالیہ انداز میں کہا: پاکستان؟ میں نے کہا کہ انڈیا۔ پھر انھوں نے کہا:

Kashmir, Bombay, You?

ان کا مطلب غالباً یہ تھا کہ کیا آپ کشمیر یا بمبئی سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ میں دہلی سے آیا ہوں۔ اس کے بعد گفت گو ختم ہوگئی۔

ایک نوجوان سے میں نے کہا کہ زندگی میں اصل اہمیت صحیح آغاز کی ہوتی ہے۔ اگر آپ صحیح آغاز کو پالیں تو یقیناً آپ صحیح انجام تک بھی پہنچ جائیں گے۔ اس نے کہا کہ مجھے کوئی مختصر نصیحت لکھ دیجئے۔ میں نے لکھا: no beginning, no end یعنی اگر آغاز نہیں تو انجام بھی نہیں۔

فلارنس کی کانفرنس کا انتظام کیمونٹی آف سینٹ ایجی ڈیو نے کیا تھا۔ یہ لوگ دنیا کے مختلف حصوں میں پسماندہ طبقہ کی فلاح کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ دنیا میں امن کے قیام کے لئے مستقل کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، اس معاملہ میں وہ لوگ

پوری طرح سنجیدہ ہیں۔ امن کے مقصد کے تحت وہ دنیا کے مختلف حصوں میں بڑے پیمانہ پر امن کانفرنسیں کر رہے ہیں۔ ان کے بعض ذمہ داروں سے میں نے کہا کہ آپ لوگوں کی کوششوں میں ایک کمی ہے۔ اور اس کمی کی بنا پر آپ کی کوششوں کا زیادہ نتیجہ نہیں نکل رہا ہے۔

میں نے کہا کہ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن کو نو پرابلم پیپل کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے وہ جن کو میں پرابلم پیپل کہتا ہوں۔ نو پرابلم پیپل وہ سنجیدہ لوگ ہیں جو اپنے مزاج کے اعتبار سے امن پسند لوگ ہیں۔ وہ ٹکراؤ کو پسند نہیں کرتے۔ اس طرح گویا کہ وہ پہلے ہی سے ٹھیک ہیں۔ اس کے مقابلہ میں پرابلم پیپل وہ لوگ ہیں جن کے مزاج میں شدت ہے۔ جو ٹکراؤ کے طریقہ میں یقین رکھتے ہیں۔ جو موجودہ زمانہ کی بے امنی کا اصل سبب ہیں۔

میں نے کہا کہ اب تک آپ لوگوں نے زیادہ تر نو پرابلم پیپل سے ربط قائم کیا ہے۔ انہیں میں سے کچھ لوگوں کو بلا کر آپ امن کانفرنس کر لیتے ہیں۔ بلاشبہ اس کا بھی ایک فائدہ ہے۔ مگر آپ کو اپنی کوششوں کے دائرہ کو پرابلم پیپل تک بھی پھیلانا ہوگا۔ جب تک آپ پرابلم پیپل کو اعتدال پر نہ لائیں امن کی فضا دنیا میں قائم نہیں ہو سکتی۔

میں نے مزید کہا کہ اس کا ایک عملی تجربہ میں خود انڈیا میں کر چکا ہوں۔ پچھلے پچاس سال سے انڈیا میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑے ہو رہے تھے۔ مسلمانوں کو ہندوؤں سے سخت شکایات تھیں۔ اس معاملہ میں مسلم رہنماؤں نے قیام امن کی جو کوششیں کیں وہ سب نو پرابلم ہندو کی سطح پر چلتی رہیں۔ مگر ۵۰ سالہ کوشش کے باوجود اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

۱۹۹۲ میں ہندوؤں کا تشدد مسلمانوں کے خلاف انتہا پر پہنچ گیا جب کہ انھوں نے تاریخی بابری مسجد کو ڈھا کر وہاں ایک مندر بنا دیا۔ اس وقت سے میں نے نئی پالیسی اختیار کی۔ اب میں نے پرابلم ہندوؤں کو اپنا مخاطب بنایا۔ ان لوگوں سے تعلقات بڑھائے۔ ان کے اپنے جلسوں میں جا کر ان کو امن اور انسانیت کا پیغام دینا شروع کیا۔

پالیسی کی یہ تبدیلی انتہائی نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ چند سال کی کوششوں کے نتیجہ میں فضا بدل گئی۔ چنانچہ آج انڈیا میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امن قائم ہو چکا ہے۔ پرابلم

ہندوستان میں تخریب کا طریقہ چھوڑ کر بھائی چارہ کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ دونوں فرقوں میں لمبی مدت سے جاری غیر معتدل فضا ختم ہو گئی ہے اور دونوں کے درمیان امن کی حالت قائم ہو گئی ہے۔ فرقہ وارانہ جھگڑے تقریباً معدوم ہو گئے ہیں۔ اس معاملہ میں یہی واحد طریقہ ہے جو نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہے۔

۲۲ اکتوبر کی شام کو کانفرنس کا افتتاحی اجلاس فلارنس کے قدیم شاہی محل میں کیا گیا تھا۔ صدیوں پرانا محل نہایت وسیع اور شاندار ہے۔ اس کا غیر معمولی طور پر بڑا ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔

جب میں قیام گاہ سے روانہ ہو کر یہاں پہنچا تو محل کے باہر انسانوں کا ہجوم تھا۔ خصوصی مہمانوں کو دیکھ کر وہ لوگ تالیاں بجا کر ان کا استقبال کرتے تھے۔ میں قریب پہنچا تو راستہ کے دونوں طرف کھڑے ہوئے لوگوں نے پرجوش طور پر تالیاں بجانا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو ابل پڑے۔ مجھے آخرت کا لمحہ یاد آ گیا جب کہ میں مر کر وہاں پہنچوں گا۔ میرے دل نے کہا، کیا آخرت میں بھی کوئی میرے لئے تالیاں بجائے گا۔ کیا وہاں بھی کوئی ہوگا جو میری آمد پر خوشی کا اظہار کرے۔ دنیا کی تالیاں کتنی زیادہ بے قیمت ہیں اگر آخرت میں کوئی تالیاں بجانے والا نہ ہو۔

افتتاحی اجلاس میں فلپائن کی خاتون صدر اکینو (Corazon C. Aquino) مہمان خصوصی کے طور پر شریک تھیں۔ میری سیٹ اسٹیج کے عین قریب اگلی صف میں تھی۔ اجتماع کی کارروائی کے دوران میرے دل میں خیال آیا کہ اگر اس وقت میں ایسا کروں کہ کود کر اسٹیج پر پہنچوں اور صدر اکینو سے کہوں کہ اسلام قبول کرو ورنہ تم جہنم میں جاؤ گی:

Accept Islam, otherwise you will go to hell.

تو کیا یہ دعوت کا عمل ہوگا۔ میرے دل نے کہا کہ نہیں۔ بلکہ یہ ایک مجنونانہ عمل ہوگا نہ کہ دعوت اور تبلیغ کا عمل۔ دعوت یہ نہیں ہے کہ آپ کسی نہ کسی طرح چیخ کر اپنی آواز دوسروں کے کانوں میں داخل کر دیں۔ دعوت کا معیار، قرآن کے الفاظ میں، یہ ہے کہ وہ قولاً بلیغاً فی انفسہم (النساء ۶۳) ہو نہ کہ کسی کو لفظی پتھر مارنا۔

۲۲ اکتوبر کی شام کو کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں دوسرے ممتاز افراد کے علاوہ خصوصی مہمان کی حیثیت سے فلپائن کی خاتون صدر اکینو اور کئی اہم شخصیتیں اسٹیج پر موجود تھیں۔ مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ آخری تقریر صدر اکینو کی تھی۔ انھوں نے تیار شدہ تقریر کو پڑھ کر سنایا۔ یہ انگریزی زبان میں تھی۔ ان کا انگریزی لہجہ نہایت عمدہ تھا۔ تاہم ان کی لمبی تقریر میں صرف ایک بات کی تفصیل تھی۔ فلپائن میں قدیم حکمراں مارکوس کے مظالم اور ان کے شوہر (Benigno S Aquino) کا قتل ہونا اور اس کے بعد خود خاتون کا صدر کے عہدہ پر پہنچنا۔

تاہم اس تقریر میں ایک بات نہایت سبق کی تھی۔ اکینو کے خاندان پر مارکوس نے سدید مظالم کیے۔ حتی کہ ۱۹۸۳ میں ان کے شوہر کو قتل کر دیا گیا۔ مگر انھوں نے کہا کہ ہم نے مسیح اور گاندھی کی تعلیم کے مطابق یہ طے کر لیا تھا کہ ہمیں تشدد کے مقابلہ میں تشدد کا طریقہ اختیار نہیں کرنا ہے۔ چنانچہ میرے شوہر پر ظلم ہوا تو انھوں نے ہنگر اسٹرائک کر دی۔ ان کے قتل کے بعد فلپائن کے عوام کی بڑی تعداد میری حمایت پر آگئی۔ مگر میں نے ہمیشہ پر امن دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی سیاسی تحریک چلائی۔ یہاں تک کہ مارکوس کو مجبور ہو کر الکشن کرانا پڑا جس نے ۱۹۸۶ میں مجھ کو صدارت کے منصب پر پہنچا دیا۔ انھوں نے اپنے طریقہ کو یہ نام دیا برائی کا مقابلہ امن کے طریقوں سے:

resistance of evil by thc ways of peace

عجیب بات ہے کہ جس فلپائن میں سنگین مظالم کے باوجود اکینو نے اپنی سیاسی تحریک مکمل طور پر پر امن انداز میں چلائی۔ اسی فلپائن میں مسلم لیڈر تعداد کی قلت کے باوجود مظالم کا نام لے کر ۳۰ سال سے متشددانہ انداز میں اپنی تحریک چلا رہے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں وہ کامیاب تو نہیں ہوئے۔ البتہ فلپائن کے مسلمانوں کی مشکلات میں انھوں نے سو گنا زیادہ اضافہ کر دیا۔

فلپائن ایک مجمع الجزائر ہے۔ اس میں سات ہزار سے زیادہ چھوٹے بڑے جزیرے شامل ہیں۔ اس کی آبادی تقریباً ۵ کروڑ ہے۔ اس میں پچاسی فیصد عیسائی ہیں۔ مسلمان مجموعی آبادی میں تقریبا پانچ فیصد ہیں۔ تاہم اس کے ایک حصہ میں مسلمان زیادہ بڑی تعداد

میں آباد ہیں۔ ان کو موروز کہا جاتا ہے۔ یہ نام ان کو اسپینیوں نے دیا تھا۔

فلپائن کا جنوبی حصہ ملایا کے قریب ہے۔ چنانچہ اس حصہ میں ملایا کے علاقہ سے مسلمان جانا شروع ہوئے۔ ان کے اثر سے جنوبی حصہ کے کئی جزائر میں اسلام پھیل گیا۔ مثلاً سولو (Sulu) منڈاناو (Mindanao) پالاوان (Palawan) وغیرہ۔ اس دوران ایک طاقت ور سردار (datu) مسلمان ہوگیا۔ حتی کہ اس علاقہ میں مسلم راجہ کی سلطنت قائم ہوگئی۔

مگر سولھویں صدی کے وسط میں اسپینی آگئے۔ یہاں ان کا غلبہ قائم ہوگیا۔ اسپینی غلبہ کے بعد اسلام کی اشاعت کا عمل رک گیا۔ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ اسپینی اگر ایک صدی کے بعد آتے، یا اگر ان کا محرک صرف اقتصادی ہوتا تو آج پورے فلپائن میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی:

Had they come a century later or had their motives been strictly commercial, Filipinos today might be a predominantly Muslim people. (14/241)

فلپائن کے جنوبی علاقہ کے بارہ میں مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ یہاں ان کی اکثریت ہے۔ جب کہ حکومت کے اعداد و شمار کے مطابق ان کی تعداد نصف سے کچھ کم ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اس علاقہ میں علیٰحدہ مسلم حکومت قائم کرنے کی تحریک اٹھی۔ یہ صدر مارکوز کا زمانہ تھا جن کی صدارت ۱۹۶۶ سے ۱۹۸۶ تک رہی ہے۔ مارکوز کا کہنا تھا کہ مسلمان اگر پولٹیکل انڈپنڈنس کا مطالبہ نہ کریں تو ہم ان کو تمام دوسری آزادیاں دینے کے لئے تیار ہیں۔ مگر مسلم لیڈر راضی نہیں ہوئے۔ اس کے نتیجہ میں حکومت نے ان پر سخت ترین مظالم کئے۔ آخر کار اب مسلمان مجبور ہوکر خاموش ہورہے ہیں۔

افتتاحی اجلاس میں شیخ مصطفیٰ بن احمد العلوی (رئیس جمعیۃ علماء المغرب والسنغال) نے بھی تقریر کی۔ انھوں نے عربی میں لکھی ہوئی ایک تقریر پڑھی۔ اس میں اسلام کو امن و سلامتی کے مذہب کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا۔

ایران کے ایک صاحب سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ وہ تہران یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔ ان کی تعلیم امریکہ میں ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ نہایت عمدہ انگریزی بول رہے تھے۔

۲۳ اکتوبر کی صبح کو ناشتہ کی میز پر ہم لوگ ساتھ تھے۔ میں نے پوچھا کہ کچھ اسکالرس نے لکھا ہے کہ اسلامی فلسفہ نام کی کوئی چیز موجود نہیں:

There is no Islamic philosophy, in the true sense of the word.

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اسلامی فلسفہ کی اساس مقدس متن (ٹکسٹ) پر ہے۔ یہ فلسفہ کے بنیادی تصور کی نفی ہے۔ کیوں کہ فلسفہ اپنے صحیح مفہوم کے اعتبار سے وہ ہے جو عقل انسانی پر مبنی ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ اسلامی فلسفہ تو نہیں ہے، البتہ مسلم فلسفہ ضرور ہے۔ میں نے کہا کہ وہ لوگ دوبارہ یہ کہیں گے کہ مسلمانوں میں جو فلسفی پیدا ہوئے، وہ اپنے اسلامی عقیدہ سے آزاد نہ تھے۔ ان کا فلسفہ بھی بنیادی طور پر اسلامی عقیدہ ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ انھوں نے اس کو مانتے ہوئے کہا کہ ہاں، انھوں نے فلسفہ کو اسلامائز کیا۔

پھر میں نے کہا کہ مگر خود مغرب کے فلاسفہ کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو وہ بھی کہیں نہ کہیں جا کر اپنے مسیحی عقیدہ سے متاثر نظر آنے لگتے ہیں انھوں نے کہا کہ یہ بات بھی درست ہے۔ انھوں نے ہیگل کی مثال دی جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا فلسفہ مسیحی عقیدہ کا فلسفیانہ اظہار تھا۔

ناشتہ کے آخر میں میں نے چند جملے فارسی میں کہے۔ میں نے کہا: تنہا فارغ شد انھوں نے کہا: الحمد للہ۔ میں نے کہا اچھا چلیے۔ انھوں نے کہا چلیے۔ اور پھر ہم لوگ اپنے کمروں میں چلے گئے۔

۲۳ اکتوبر کو پانچ مختلف ہالوں میں پانچ الگ الگ پروگرام تھے۔ میں نے اس ہال کا انتخاب کیا جس میں افریقہ کا موضوع رکھا گیا تھا۔ اس کے چھ مقررین میں سے ایک احمد بن بیلا بھی تھے جو الجیریا کے سابق پریسیڈنٹ رہ چکے ہیں۔

اس پروگرام کو سننے کے لئے اندر پہنچا تو معلوم ہوا کہ مقررین اطالوی یا فرانسیسی زبان میں تقریر کریں گے۔ وہاں اتفاق سے عربی یا انگریزی میں ترجمہ کا انتظام نہ تھا۔ میرے گائڈ ایک خاتون کو لائے جو اطالوی زبان جانتی تھیں۔ وہ میرے قریب کی کرسی پر بیٹھ کر مجھے تقریر کا مفہوم بتا رہیں۔ اس کے بعد جب فرانسیسی تقریر شروع ہوئی تو ان کے لئے بھی مسئلہ پیدا ہو گیا۔ کیوں کہ

فرانسیسی نہیں جانتی تھیں۔ انھوں نے فوراً یہ کیا کہ معاون آلہ اپنے کان میں لگا لیا۔ اب وہ خود مقرر کی تقریر کا اطالوی ترجمہ سن رہی تھیں اور میرے لئے اس کا انگریزی ترجمہ کرتی جاتی تھیں۔

میں نے سوچا کہ انسان کا ذہن بھی کیسا عجیب ہے۔ وہ ہر مسئلہ کا فوری حل دریافت کر لیتا ہے۔ فطرت کے اس قیمتی عطیہ سے صرف وہ لوگ محروم رہتے ہیں جو مسئلہ پیش آنے کے بعد تدبیر تلاش نہ کریں بلکہ فریاد و ماتم میں لگ جائیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اس دنیا میں محرومی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔

کانفرنس کے تمام اجلاس کی ویڈیو ریکارڈنگ ہو رہی تھی اور عین اسی وقت وہ ہال میں رکھے ہوئے وی سی آر پر لوگوں کو دکھائی بھی جا رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ لمحہ لمحہ کی یہ تصویر کشی اور ریکارڈنگ اس حقیقت کا ایک علامتی اعلان ہے کہ اسی طرح خدا کے برتر انتظام کے تحت ہر انسان کی لمحہ بہ لمحہ ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔ یہ پورا ریکارڈ خدا کے خزانہ میں محفوظ ہے۔ آخرت میں وہ ہر شخص کے اعمال نامے کی صورت میں ہر ایک کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔

افریقی مقررین کی تقریریں سننے کے بعد میں نے ایک صاحب سے کہا کہ ہر مقرر نے صرف افریقہ کے مسائل بیان کئے۔ اور بیرونی طاقتوں کی شکایت کی کہ وہ ان مسائل کے حل میں ان کی مدد نہیں کر رہے۔ میں نے کہا کہ اس قسم کی تقریر کوئی تقریر نہیں ہے۔ یہ صرف وقت کا ضیاع ہے۔ کیونکہ آج ہر شخص اور ہر قوم خود اپنے آپ میں مشغول ہے۔ کسی کو یہ فرصت نہیں کہ وہ آپ کے پاس آئے اور آپ کے مسائل حل کرے۔

میں نے کہا کہ اس قسم کی تمام تقریریں غیر فطری ہیں۔ کیوں کہ اس دنیا میں پرابلم کبھی تنہا نہیں آتا۔ پرابلم کے ساتھ ہمیشہ مواقع بھی موجود ہوتے ہیں۔ اب حل یہ ہے کہ پرابلم کو نظر انداز کر کے مواقع کو استعمال کیا جائے۔ لوگ صرف دو چیز جانتے ہیں۔ پرابلم اور سولیوشن۔ حالانکہ یہاں ایک تیسری چیز بھی ہے۔ اور وہ مواقع (opportunities) ہیں۔ لوگ اپنے تناظر میں وجہ سے ہمیشہ پرابلم اور سولیوشن میں الجھے ہوتے ہیں۔ اگر وہ جانیں کہ یہاں ایک اور چیز بھی موجود ہے۔ تو وہ فوراً مواقع کو استعمال کر کے اپنے مسائل کو حل کر لیں اسی طرح جیسا کہ مشہور مقولہ ہے کہ When there is a will there is a way

میں کہتا ہوں کہ جہاں مسائل ہوں گے وہیں مواقع بھی ضرور موجود ہوں گے۔ یہ فطرت کا قانون ہے، اور فطرت کے قانون میں کوئی استثنا نہیں۔

اٹلی کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان سے میں نے کہا کہ کری ایٹو زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ کسی ایک ذہنی حالت پر نہ ٹھہریں۔ بلکہ اپنا ذہنی سفر برابر جاری رکھیں۔ ذہنی سفر برابر جاری رہنے کی پہچان یہ ہے کہ آپ ہر روز کوئی نئی چیز دریافت کر رہے ہوں۔ میں نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو چاہئے کہ ایک متلاشی کی زندگی گزاریں:

Live the life of a seeker.

پھر میں نے ان سے کہا کہ میری بات دہرائیے کہ میں نے کیا کہا۔ انھوں نے انگریزی میں اسے دہرایا۔ آخر میں میں نے کہا کہ میرے اس جملہ کا اٹالین زبان میں ترجمہ کیجئے۔ انھوں نے حسب ذیل ترجمہ لکھ کر دیا:

Vivi La Vita Del Cercatore

ایک مسیحی عالم نے صلیب کے فلسفہ پر لمبی گفتگو کی۔ انھوں نے صلیب کو سب کچھ بتایا۔ انھوں نے کہا کہ صلیب امن و سلامتی کا راستہ ہے:

Cross is the Way of peace.

میں نے کہا کہ صلیب کا امن سے کیا تعلق ہے، اس کو مثال سے واضح کیجئے۔ مگر وہ کوئی واضح مثال نہ دے سکے۔ اکثر لوگ بیانیہ انداز میں یا مدعیانہ اسلوب میں ایک بات کہتے ہیں۔ مگر جب مثال مانگی جائے تو مثال نہیں دے پاتے۔ آدمی جب بھی کوئی دعویٰ کرے تو اس کو جاننا چاہئے کہ اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اس کی تصدیق میں ایک حقیقی مثال (نہ کہ فرضی مثال) پیش کرے۔ مثال کے بغیر دعوئی بے دلیل رہتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ ایک شاعرانہ مضمون بندی ہے نہ کہ کوئی واقعی بات۔

کچھ عربوں سے بات ہوئی۔ میں نے کہا کہ آجکل اسلام کی دھوم بہت زیادہ ہے۔ مگر اسلام کی اسپرٹ غائب ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ اسپرٹ سے آپ کی کیا مراد ہے۔ میں نے کہا کہ مثلاً حدیث میں ہے کہ اکثروا ذکر ھادم اللذات۔ اس حدیث کے مطابق

ایمان و اسلام کی زندگی کا تقاضا ہے کہ آدمی بہت زیادہ موت کو یاد کرنے والا بن جائے۔ مگر آجکل میں دیکھتا ہوں کہ ہر جگہ بس زندگی کا چرچا ہے۔ موت کا تذکرہ کہیں نہیں۔

انھوں نے کہا کہ آپ ایسا کیوں کر کہتے ہیں۔ ہم سب لوگ موت کو یاد کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ موت کو یاد کرنے کی پہچان کیا ہے۔ وہ خود اس حدیث کے الفاظ میں موجود ہے۔ اس میں موت کو ھادم اللذات (لذتوں کو ڈھا دینے والی) کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موت کو یاد کرنے والا وہ ہے جس کے لئے موت کی یاد ہادم اللذات بن جائے۔ اس کے لئے دنیا کی چیزوں میں لذت نہ رہے۔ وہ دنیا کی لذتوں سے محظوظ نہ ہو سکے۔ دنیا کی ہر لذت اس کے لئے بے لذت بن گئی ہو۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔

فلارنس میں ایک مسیحی ادارہ ہے جس کے تحت مختلف تعلیمی اور رفاہی شعبے قائم ہیں۔ اس کے ڈائرکٹر فادر چیارونی (Chiaroni) ہیں۔ ادارہ کا پورا نام یہ ہے:

Parrocclic Madonna Della Tosse

اس ادارہ کی طرف سے مجھے دعوت دی گئی تھی کہ میں ان کے اجتماع میں اسلام کا تعارف پیش کروں۔ اس کے مطابق ۲۳ اکتوبر کی شام کو نماز مغرب کے بعد ہم لوگ وہاں کے لئے روانہ ہوئے۔ شام کا کھانا بھی انھیں کے یہاں تھا۔ ہم لوگ پہنچے تو کھانا میز پر رکھا جا چکا تھا۔ چنانچہ ہم لوگ سیدھے طعام گاہ میں چلے گئے۔

یہ ایک سادہ اور نہایت صاف ستھرے انداز کا ایک بڑا کمرہ تھا۔ کمرہ میں داخل ہوتے ہی پہلی چیز جس نے متوجہ کیا وہ اس کی ایک بڑی تصویر تھی جو فریم کرکے دیوار پر لگائی گئی تھی۔ یہ آئن سٹائن کی تصویر تھی۔ اس تصویر کے نیچے آئن سٹائن کا ایک قول اس طرح لکھا ہوا تھا ــــــ امن کو طاقت کے ذریعہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ امن صرف مفاہمت کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے:

Peace cannot be kept by force. It can only be achieved by understanding.

چوکور میز کے گرد ادارہ کے تمام ذمہ دار بیٹھ گئے۔ یہ تقریباً ۳۰ عورت اور مرد تھے۔ کھانا اور

کمرہ کا پورا ماحول انتہائی سادگی کے ساتھ انتہائی باقاعدگی اور سلیقہ مندی کا نمونہ تھا جس کی تصویر کشی لفظوں میں نہیں کی جاسکتی۔

مینرل واٹر پانی کی بوتل کے اوپر سرخ رنگ میں لکھا ہوا تھا پنا (PANNA) میں سمجھا کہ اس کا مطلب پانی ہے۔ اور ہندستان کا پانی اٹلی میں پنا بن گیا ہے۔ مگر یہ میری غلط فہمی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ پنا مختلف انداز میں کمپنی کا نام ہے۔ ورنہ اطالوی زبان میں پانی کو اکوا (acqua) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اکثر لوگ ایک مفروضہ اپنے ذہن میں قائم کر لیتے ہیں۔ اور پھر بلا تحقیق اس کے اوپر منزل در منزل عمارت بناتے چلے جاتے ہیں۔ حالاں کہ وہ سب کا سب بے بنیاد ہوتا ہے۔ جب ابتدائی مفروضہ ہی غلط ہو تو اس کی بنیاد پر گھڑی ہوئی کہانی کیوں کر درست ہو سکتی ہے۔

کھانے کے دوران مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ اٹلی کی آبادی میں کمی ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ذاتی سہولت کی خاطر برتھ کنٹرول کے طریقے اختیار کرتے ہیں۔ اکثر شادی شدہ جوڑے بچے کے بغیر زندگی گزارتے ہیں۔ کھانے پر ایک صاحب اپنی بیوی کے ساتھ تھے۔ انھوں نے تصویر دکھائی کہ انھوں نے کیرلا کے دو بچوں کو اڈاپٹ کیا ہے۔

اس کے نتیجہ میں کئی نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے اٹلی کے لوگ زیادہ کمائی کے لئے باہر جایا کرتے تھے۔ اب خود اٹلی باہر کے لوگوں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے کہ وہ اٹلی آئیں اور یہاں کام کریں۔ خاص طور پر چھوٹے کام یا مزدوری والے کاموں میں کارکنوں کی بہت قلت ہو گئی ہے۔

کھانے کے بعد ساڑھے نو بجے ہم لوگ ادارہ کے ہال میں جمع ہوئے۔ یہاں بہت سے مرد و عورت کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میری تقریر انگریزی میں تھی جس کا ترجمہ ساتھ ساتھ اطالوی زبان میں کیا جا رہا تھا۔ تمہیدی کلمات میں منتظمین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آج اسلام کے بارہ میں غلط فہمیاں بڑھ گئی ہیں۔ خاص طور پر یورپ میں یہ غلط فہمیاں اور زیادہ ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کے مذہب کو براہ راست طور پر جانیں۔

اس کے بعد میں نے بتایا کہ مسلم کون ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے قرآن کی آ

(ابراہیم ۲۴) کو پیش کرتے ہوئے بتایا کہ قرآن میں مومن کی مثال درخت سے دی گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن اپنے ماننے والے کو کیسا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مسلمان اس دنیا میں درخت کی مانند رہے۔ وہ خدا کی دنیا سے رزق لے کر ارتقا کرے۔ اور پھر ہر اعتبار سے اہل عالم کے لئے نفع بخش بن جائے۔

اس کے بعد میں نے ایک پیپر پیش کیا۔ یہ صرف احادیث کے ترجمہ پر مشتمل تھا۔ اس کا عنوان تھا ——— اپنے ماحول میں مسلم کا سلوک:

Behaviour of a Muslim in his environment

اس میں ۶۰ حدیثیں تھیں جو سب کی سب صحاح سے لی گئی تھیں۔ ترتیب یہ تھی کہ میں ایک حدیث پڑھتا تھا اور میرے پاس بیٹھے ہوئے ایک پروفیسر اس کا ترجمہ اٹالین زبان میں کرتے جاتے تھے۔

نصف حدیثیں سنانے کے بعد میں نے حاضرین سے کہا کہ اگر آپ پسند کریں تو ساری حدیثیں آپ کو سناؤں۔ اور اگر آپ کی رائے ہو تو حدیث سنانے کا سلسلہ یہیں روک دیا جائے اور اس کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ لوگوں نے کہا کہ نہیں، آپ تمام حدیثیں پہلے سنا دیں۔ اس کے بعد سوال وجواب ہوگا۔ چنانچہ میں نے تمام حدیثوں کے ترجمے سنائے۔ جن کی تعداد مجموعی طور پر ساٹھ تھی۔

اس کے بعد صدر جلسہ فادر چیارونی نے اعلان کیا کہ اب آپ لوگ مقرر سے سوالات کر سکتے ہیں۔ وہ آپ کے سوالات کا جواب دیں گے۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے پوچھا کہ سوال صرف پیپر کے دائرہ میں کیا جا سکتا ہے یا اس کے باہر کے سوالات بھی پوچھے جا سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو اختیار ہے کہ جو سوال چاہیں کریں۔ دو تین آدمیوں نے انگریزی میں سوال کیا اور بقیہ تمام لوگوں نے اٹالین زبان میں سوالات کئے۔ میں نے ہر ایک کا جواب انگریزی میں دیا۔ جس کا فوری ترجمہ کیا جاتا رہا۔

صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ کسی نے اب تک اسلام کو ہمارے سامنے اس طرح پیش نہیں کیا تھا۔ اب تک ہم اسلام کے بارہ میں وہی چند باتیں جانتے تھے جو میڈیا کے ذریعہ ہم تک پہنچی

تھیں۔ دوسرے مقامی لوگوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج ہم نے اسلام کو ازسر نو دریافت کیا ہے۔ ہماری اسلامی معلومات میں بہت اضافہ ہوا۔

پروگرام کے خاتمہ پر ایک صاحب ملے۔ انھوں نے بتایا کہ میں مسلمان ہوں اور مراکو (مغرب) سے یہاں آیا ہوں۔ انھوں نے اپنا نام اس طرح کاغذ پر لکھ دیا ـــــ صدیقی محمد (Sdaigui Mohamed) ان سے عربی میں بات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ فلارنس میں تقریباً پانچ ہزار مسلمان ہیں جو بیشتر افریقہ کے ہیں۔ یہاں شہر کے اندر ایک مسجد بھی ہے۔ یہ مسلمان زیادہ تر چھوٹے کام کرتے ہیں۔ تاہم یہاں ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

ایک خاتون نے پوچھا کہ اسلام میں عورت کا درجہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اسلام عورت اور مرد کو مکمل طور پر برابری کا درجہ دیتا ہے۔ دونوں میں عزت اور حقوق کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ صالح عورت کے لئے بھی اسی طرح جنت کی خوشخبری ہے جس طرح صالح مرد کے لئے۔

البتہ مقام کار (work place) دونوں کا اسلام میں الگ الگ رکھا گیا ہے۔ یہ ایک عملی بندوبست (arrangement) ہے نہ کہ امتیاز۔ میں نے مثال دی کہ ایک بزنس ہاؤس میں کچھ لوگ آفس کے اندر کام کرتے ہیں اور کچھ لوگ فیلڈ ورک میں مصروف ہوتے ہیں۔ ایک گروپ اندر کا کام سنبھالتا ہے اور دوسرا گروپ باہر کا کام۔ اس فرق کو کوئی امتیاز نہیں سمجھتا بلکہ صرف تقسیم کار سمجھتا ہے۔ اسی طرح اسلام میں عورت اور مرد کے مقام کار میں فرق رکھا گیا ہے۔ عورت بنیادی طور پر گھر کے کام کو سنبھالتی ہے اور مرد بنیادی طور پر باہر کا کام۔ مگر یہاں بھی یہ فرق صرف تقسیم کار کے معنی میں ہے نہ کہ امتیاز کے معنی میں۔

میں نے کہا کہ عورت کے بارہ میں مغربی تصور اور اسلامی تصور میں صرف یہ فرق ہے کہ مغربی تصور میں عورت اور مرد کو دو برابر کی شخصیت مانا گیا ہے۔ اور اسلام یہ کہتا ہے کہ عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کے لئے تکملہ (complementary) ہیں۔

ایک صاحب نے اسلامی فنڈ منٹلزم کے بارہ میں سوال کیا۔ میں نے کہا کہ مروجہ مفہوم میں فنڈ منٹلزم کو فناٹسزم کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے لیا جائے تو اسلام میں فناٹسزم نہیں ہے۔ اسلام ایک فطری مذہب ہے۔ اس میں انسانوں کو حد درجہ رعایت دی

گئی ہے۔ اسلام میں حکیمانہ انداز کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ کٹرپن، انتہا پسندی اور تشدد کے لئے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔

ایک صاحب نے پوچھا کہ گاندھی کے نظریہ اور اسلام کے نظریہ میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا کہ جہاں تک گاندھی کے مذہب کا تعلق ہے تو گاندھی ایک ہندو تھے اور ہندو مذہب الگ ہے اور اسلام الگ۔ مگر جہاں تک ان کے طریق کار کا تعلق ہے جس کو عدم تشدد (non-violent activism) کہا جاتا ہے تو وہ اسلام کے عین مطابق ہے۔ اسی لئے وقت کے تمام مسلم علماء نے اس طریق کار کو اختیار کیا اور سیاسی اعتبار سے گاندھی کو اپنا قائد بنالیا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامک ایکٹوزم بھی عین وہی ہے جس کو نان وائلنٹ ایکٹوزم کہا جاتا ہے۔

اس طرح کے مختلف سوالات کئے گئے۔ کسی نے بھی کراس کو سچن نہیں کیا۔ پوری گفتگو نہایت سنجیدہ اور افہام وتفہیم کے ماحول میں ہوئی۔

پروگرام کے خاتمہ پر میں نے ایک مسیحی نوجوان مسٹر سیرجیو (Sergio) سے پوچھا کہ اس بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے۔ نوجوان نے نہایت سادگی سے جواب دیا: آج آپ کو سن کر میں نے جانا کہ اب تک اسلام کے بارہ میں بہت کم جانتا تھا۔ اس پروگرام نے میرے اندر یہ خواہش جگادی کہ میں اسلام کے بارہ میں اور زیادہ معلومات حاصل کروں۔

ایک اور صاحب نے کہا کہ آپ نے جس سادگی اور وضاحت کے ساتھ اسلام کے بارہ میں بتایا وہ بہت انوکھا تھا۔ آپ کی بات خوب سمجھ میں آئی۔

موجودہ زمانہ کی نئی پیدا شدہ چیزوں میں سے ایک چیز یہ ہے کہ آج لوگ صرف اپنے خول میں رہنا کافی نہیں سمجھتے۔ ہر آدمی خارجی دنیا کے بارہ میں جاننا چاہتا ہے۔ اس معلوماتی خواہش کا تعلق تمام چیزوں سے ہے حتی کہ مذہب سے بھی۔ لوگ اپنے مذہب کو مانتے ہوئے دوسرے مذاہب کو جاننے کا شوق رکھتے ہیں۔ یہ ایک نیا امکان ہے جس کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

تاہم اس جدید امکان کو استعمال کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنی بات کو جدید انسان کے پسندیدہ اسلوب میں پیش کیا جائے۔ آج کا پسندیدہ اسلوب سائنٹفک

اسلوب ہے۔ مناظرانہ یا واعظانہ انداز آج پسند نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح ادبی یا قصائدی انداز بھی آج کے اعتبار سے غیر موزوں ہے۔ اس لئے جدید امکان کو استعمال کرنا صرف اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہم مخاطب کے اپنے اسلوب کے مطابق بات کہیں۔ ہمارا تیار کیا ہوا لٹریچر جدید انسان کو اپیل کرنے والا ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ سن کر بھی نہیں سنے گا۔ پڑھ کر بھی کچھ نہیں پائے گا۔

۲۴ اکتوبر کو ناشتہ کی میز پر جسٹس کھنہ (سابق جج سپریم کورٹ) سے مسٹر محمد علی جناح کے بارہ میں گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ مسٹر جناح انگریزوں کے ایجنٹ تھے۔ وہ فوراً بولے یہ مکمل طور پر نادرست بات ہے:

It is absolutely incorrect

انھوں نے کئی بڑے ہندوؤں کے تاثرات مسٹر جناح کے بارہ میں نقل کئے۔ انھوں نے کہا کہ جب وہ چنڈی گڑھ میں پنجاب ہائی کورٹ کے جج تھے تو مسٹر گاڈگل (گورنر پنجاب) نے ان سے کہا کہ مسٹر جناح کی پیشہ ورانہ دیانت داری (Professional integrity) مکمل طور پر ہر شبہ سے بالاتر تھی۔ اور اسی لئے وہ اپنے وقت میں انڈیا کے نمبر ایک قانون داں بن گئے۔

میں نے مسٹر جناح کے بارہ میں کئی تعلیم یافتہ ہندوؤں سے بات کی۔ میں نے محسوس کیا کہ بٹوارہ کی تلخی کے باوجود ہر ایک ذاتی اعتبار سے مسٹر جناح کا قدرداں تھا۔ مثلاً مسٹر ملکانی (وائس پریسیڈنٹ بھارتیہ جنتا پارٹی) کی زبان سے ایک بار میں نے مسٹر جناح کی تعریف سنی۔ میں نے کہا کہ مسٹر جناح تو ملک کے بٹوارہ کے ذمہ دار تھے، پھر بھی آپ ان کی تعریف کرتے ہیں۔ مسٹر ملکانی نے کہا: کچھ بھی ہو۔ وہ دَم دار تو تھا۔

فلارنس کے مختلف علاقوں میں بار بار جانے کا اتفاق ہوا۔ مگر وہاں کبھی ہارن کی آواز سنائی نہیں دی۔ حتی کہ پرشور انجن والی گاڑیاں بھی کہیں دکھائی نہیں دیں۔ آج میں نے دیکھا کہ ایک گاڑی مسلسل ہارن بجاتی ہوئی سڑک پر دوڑی چلی جا رہی ہے۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ یہ ایمبولنس کی گاڑی ہے۔ مغربی ملکوں میں ذاتی مقصد کے لئے کوئی ہارن نہیں بجاتا۔ یہاں صرف دو قسم کی گاڑیاں ہارن بجاتی ہیں۔ ایمبولنس کی گاڑی یا فائر بریگیڈ کی گاڑی۔

جسٹس کھنہ روزانہ صبح کو بی بی سی کا ٹی وی پروگرام دیکھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ چند دن

پچھلے برسوں میں آئرلینڈ اگرچہ سیاسی عدم استحکام کا شکار ہے۔ اس کے باوجود اقتصادی ترقی کی شرح (rate of growth) کے اعتبار سے آئرلینڈ یورپ میں سب سے آگے ہے۔

ایک ہندستانی جو برسوں سے یورپ میں رہتے ہیں، ان سے میں نے پوچھا کہ یورپ کے شہروں میں آپ نے سب سے نمایاں چیز کیا دیکھی۔ انھوں نے کہا کلینس۔ میں نے کہا کہ یہ صحیح ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ یورپ کے شہروں کی سب سے زیادہ ممتاز صفت وہاں کی ریاضیاتی صحت ہے جو ہر چیز اور ہر پہلو میں نظر آتی ہے:

The most striking feature of European cities is the mathematical precision which you see there in every thing and in every aspect.

ڈبلن کو اور اسی طرح یورپ کے دوسرے شہروں کو دیکھ کر بار بار میرے ذہن میں یہ سوال آتا تھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ دین باطل کے علمبرداروں میں ہر طرف سلیقہ مندی ہے۔ اور دین حق کے حاملین کے یہاں ہر طرف بدسلیقگی دکھائی دیتی ہے۔ میں برسوں سے اس پر غور کرتا رہا ہوں۔ آج ۲۳ اکتوبر کی صبح کو اس کا جواب میرے ذہن میں آیا۔ کم از کم ذاتی طور پر میں مطمئن ہو گیا کہ یہی اس سوال کا صحیح جواب ہے۔

جواب یہ ہے کہ اس فرق کا تعلق دین باطل یا دین حق سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق تمام تر اس ردعمل سے ہے جو جدید سائنسی انقلاب کے مقابلہ میں دونوں نے اختیار کیا۔ جدید سائنسی انقلاب جب ظاہر ہوا تو دین باطل کے علمبرداروں نے اس کو دل وجان سے قبول کر لیا۔ اس کے برعکس دین حق کے علمبرداروں نے اس کو اپنا دشمن سمجھا اور اس کو حقارت کے ساتھ رد کر دیا۔ دین باطل کے علمبرداروں کے یہاں ہر چیز میں جو نظم اور سلیقہ دکھائی دیتا ہے وہ ان کے مذہب کی دین نہیں ہے بلکہ تمام تر سائنس کی دین ہے۔ اسی طرح دین حق کے علمبرداروں کے یہاں جو بدنظمی اور بدسلیقگی نظر آتی ہے وہ بھی ان کے مذہب سے نہیں آئی ہے۔ وہ صرف اس کوتاہی کا نتیجہ ہے کہ سائنس کو اپنے لیے اجنبی یا خلاف اسلام سمجھ کر وہ اس سے دور ہو گئے۔

سائنس کیا ہے۔ سائنس نظم فطرت کا انکشاف ہے۔ سائنس خدا کی چھپی ہوئی نعمتوں کا ظہور ہے۔ سائنس خالق عالم کا تعارف ہے۔ سائنس حسن تخلیق کو دریافت کرکے اس کو انسانی دنیا

[illegible] سے [illegible]

[illegible]

[illegible] اسلام کے بارے میں تھا۔ اس کی صدارت [illegible]

[illegible] (Igor Man) [illegible]

[illegible]

[illegible] سے [illegible] اس سے اندازہ ہوا کہ [illegible] اسلام کے بارہ میں سننا چاہتے ہیں۔

پہلے مسٹر [illegible] نے مختصر تقریر اطالوی زبان میں کی۔ اس کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ یورپ کے ذہن میں اسلام کے بارے میں ایک خوف (fear) پایا جاتا ہے، وہ یہ کہ اسلام ایک تشدد کا مذہب ہے۔ اسلام ان [illegible] کو فروغ دیتا ہے۔ مقررین کو آج اسی سوال کا جواب دینا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اسلام اگر تشدد کا مذہب ہوتا تو وہ ساری دنیا میں پھیل نہیں سکتا تھا۔ اور اگر سیاسی طاقت کے زور پر پھیلتا تو سیاسی طاقت کے کمزور ہوتے ہی وہ ختم ہو جاتا۔

شیخ احمد محمد زبارہ نے اپنی عربی تقریر میں قرآن کی کئی آیتیں پیش کیں اور کہا کہ اسلام تمام آسمانی مذاہب کی تصدیق کرتا ہے (انّ الاسلام یُقِرُّ الادیان السماویۃ کلہا)

شیخ مصطفیٰ العلوی کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام عدل اور سلامتی کا دین ہے۔ (الاسلام دین العدل والسلام) پروفیسر [illegible] کی انگریزی تقریر ایرانی اسلام پر تھی۔ انھوں نے کہا کہ نوجوانی کی عمر میں ہم لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اسلام سارے مسائل کا حل ہے۔ اسی لیے ہم لوگ شاہ کی حکومت کے خلاف ہو گئے تاکہ اس کو ختم کرکے اپنے خوابوں کا اسلام قائم کر سکیں۔ مگر انقلاب کے بعد ایران میں نئے مسائل پیدا ہو گئے۔ مثلاً یہ سوال پیدا ہو گیا کہ کیا دور جدید میں سنگسار کرنا اور ہاتھ کاٹنا جیسی سزائیں دی جا سکتی ہیں۔ جلسہ کے آخر میں [illegible] نے ایرانی پروفیسر سے کہا کہ آپ نے تو صرف مسائل بیان کیے۔ حالانکہ مقرر کی حیثیت سے آپ سے توقع کی گئی تھی کہ آپ مسائل کا حل بتائیں گے۔

[illegible] جنگ اور امن کا عنوان تھا: اسلام اور امن (Islam and Peace)
[illegible] بہت متاثر ہوئے۔ آپ کی تقریر بہت واضح اور حقائق پر مبنی تھی۔ اس کو سن کر [illegible] سکتے ہیں کہ انقلاب کے بعد ایران کا اسلام [illegible] امام خمینی [illegible] ایران کے مسائل کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ ہمارا انقلاب ابھی [illegible] اپنی تکمیل کو نہیں پہنچا۔ مگر عجیب بات ہے کہ انقلاب کے ۲۰ سال بعد آج بھی ایرانی [illegible] بے اطمینانی میں مبتلا رہے ہیں۔ واضح ہو کہ ایران میں "اسلامی انقلاب" جنوری ۱۹۷۹ میں آیا تھا۔

تقریروں کے بعد سوال وجواب کا وقفہ تھا۔ لوگوں نے مختلف قسم کے سوالات کئے۔ ایک عرب نوجوان نے میری تقریر پر بولتے ہوئے کہا کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ مگر امن محض امن کی باتیں کرنے سے قائم نہیں ہو سکتا۔ امن کے قیام کی دو لازمی شرطیں ہیں: رفع الظلم وتحقیق الحق۔ یعنی ظلم کو ختم کرنا اور حق کو قائم کرنا۔ پہلے ہم کو ظلم کا خاتمہ کرکے حق کو غالب کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی امن قائم ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا کہ تشدد یا خوف کے ماحول میں کوئی بھی کام نہیں کیا جا سکتا۔ امن کی ضرورت اس لئے ہے کہ امن سے کام کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ رفع ظلم یا اقامت حق کے لئے بھی اسی وقت کوئی مؤثر کوشش کی جا سکتی ہے جب کہ ماحول میں امن وامان کی فضا موجود ہو۔

جاپان کے ایک بدھسٹ نے میری تقریر پر سوال کیا کہ آپ نے کہا ہے کہ اسلام میں جارحانہ جنگ نہیں ہے۔ البتہ دفاعی جنگ ہے۔ مگر دفاعی جنگ سے آپ کی کیا مراد ہے۔ آجکل کے زمانہ میں ہر ملک میں ڈیفنس منسٹری ہوتی ہے۔ ایک ملک ڈیفنس کے نام پر دوسرے ملک سے جنگ چھیڑ دیتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے اپنی تقریر میں کہا ہے کہ "دفاعی جنگ صرف ضرورۃً ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دفاعی جنگ بھی صرف اس وقت کی جاتی ہے جبکہ جنگ سے بچنے کی تمام کوشش ناکام ہو جائے۔ دشمن آپ کے اوپر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ آپ کے لئے جوابی کارروائی کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔ گویا دفاع مجبورانہ جنگ کا نام ہے اور جارحیت رضاکارانہ جنگ کا نام۔

ایک بین مذہبی کانفرنس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے روم (اٹلی) کا سفر کیا۔ یہ کانفرنس ... اکتوبر ۱۹۹۶ کو تھی۔ اس موقع پر دو مقالے پیش کیے اور لوگوں کے سوالات کے جواب دیے۔ اس کانفرنس میں ۸۰ ملکوں کے لوگوں نے شرکت کی۔ اس کی روداد ان شاء اللہ الرسالہ میں سفرنامہ کے ذیل میں شائع کردی جائے گی۔

- انگریزی اخبار اخترلیہ سہلا کے نمائندہ مسٹر عمران احمد شاہ نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۶ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر فتوی اور قضا سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ سیاسی فتوے دینا اسلام کا اکسپلائٹیشن ہے نہ کہ اسلام کی تعمیل۔

۱- مالب (ہریانہ) میں ایک نئی مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۶ کو وہاں ایک افتتاحی جلسہ تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور وہاں مسجد کی اہمیت پر ایک تقریر کی۔ خلاصہ یہ تھا کہ مسجد دینی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس ادارہ کو اگر موثر طور پر زندہ کیا جائے تو وہ اصلاح ملت کا اہم ذریعہ بن جائے۔

۱- سوادھیائے تحریک کے زیر اہتمام ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۶ کو بمبئی میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ جس میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے شرکت کی۔ اور انسانی فلاح کے موضوع پر خطاب کیا۔ بمبئی میں اس کے علاوہ بھی کئی پروگرام ہوئے۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ الرسالہ میں سفرنامہ کے تحت شائع کردی جائے گی۔

۱- صدر اسلامی مرکز نے اکتوبر ۱۹۹۶ کے آخری ہفتہ میں حیدرآباد کا سفر کیا۔ وہاں جامعہ ریاض البنات اور جامعہ ریاض الاسلام اور مدینہ ایجوکیشنل سنٹر میں خطابات کے پروگرام ہوئے۔ اس سفر کی روداد ان شاء اللہ سفرنامے کے تحت شائع کردی جائے گی۔

۱- ۲۶ اکتوبر ۱۹۹۶ کو دہلی کے سیاسی لیڈر نے کچھ صحافیوں پر جارحانہ حملہ کیا تھا۔ اس موضوع پر نیشن اینڈ دی ورلڈ (انگریزی) کے نمائندہ نے ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ بتایا گیا کہ یہ واقعہ جمہوری روایات اور دستور ہند کے سراسر خلاف تھا۔ اگر بالفرض کسی صحافی نے کوئی زیادتی کی تھی تو مذکورہ لیڈر کو خود حملہ کرنے کے بجائے پولیس کو بلانا چاہیے تھا۔ ایک سوال کے

جواب میں کہا گیا کہ اس مسئلہ کا حل ایک نیا قانون بنانا نہیں ہے بلکہ لوگوں کے ذہن کو درست کرنا ہے۔

۷۔ جمعیت محمدیہ ٹرسٹ کے زیر اہتمام ویلب اکیڈمی (نئی دہلی) میں ۲۶ اکتوبر ۱۹۹۶ کو ایک جلسہ ہوا۔ اس کا عنوان تھا: حالات حاضرہ اور صحافتی ذمہ داریاں، مسلم مسائل کے تناظر میں۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ مسلمانوں کو یہ شکایت اپنے دماغ سے نکال دینا چاہیے کہ ہندو پریس مسلمانوں کے بارہ میں متعصب ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہندو پریس ہو یا مسلم پریس، دونوں تجارتی پریس ہیں۔ ہر ایک تجارتی مفاد کی بنیاد پر چلایا جاتا ہے نہ کہ تعصب یا غیر تعصب کی بنیاد پر۔

۸۔ بھارتیہ ودیا بھون (نئی دہلی) میں ۲۶ اکتوبر ۱۹۹۶ کو ایک سیمنار ہوا۔ اس کا عنوان تھا: اچھی حکومت کیسے بنتی ہے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ پہلے ہم کو اچھا سماج بنانا پڑے گا اس کے بعد ہی وہاں اچھی گورنمنٹ بن سکتی ہے۔

۹۔ ٹی وی ٹوڈے کی ٹیم نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۹۶ کو دور درشن کے لیے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ پورا انٹرویو اسلام پر تھا۔ اسلام کی تعلیمات کے مختلف پہلو قرآن و حدیث کی روشنی میں بتائے گئے۔ یہ انٹرویو کئی قسطوں میں دور درشن کے صبح کے پروگرام میں دکھایا جائے گا۔

۱۰۔ ڈولپنگ کنٹریز ریسرچ سنٹر (یو جی سی) کے تحت جہیز وغیرہ کے مسائل پر ایک ریسرچ کی جارہی ہے۔ اس سلسلہ میں ۲۹ اکتوبر ۱۹۹۶ کو مسز ناظمہ احمد نے ٹیلی فون پر اسلامی نقطۂ نظر جاننے کے لیے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ بتایا گیا کہ جہیز کی موجودہ شکل سراسر غیر اسلامی ہے۔ البتہ بلا مطالبہ اور غیر نمائشی طور پر سادہ قسم کی کچھ ضروری چیزیں دے دی جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

۱۱۔ ایک نئی کتاب زیر طبع ہے جس کا نام دین انسانیت ہے۔ اس میں اسلام کو امن اور رحمت اور انسانیت کے دین کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

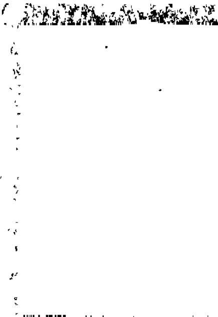
جس میں کلکتہ کے دورہ کے تعلق سے رپورٹ ... ہے
... میں کہ صدر اسلامی مرکز دہلی تشریف لا رہے ہیں ... اس کے مطابق ...
... اسلام کے پیغام کو بہترین شکل میں پھیلایا جائے۔

- ہندستان ٹائمز نئی دہلی کے نامہ نگار مسٹر ... نے ۳۰ اکتوبر ... کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بعض مذہبوں کے آئندہ الکشن سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ الکشن سیاست کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری سیاست نیشنل اشوز سے ہٹ کر ذیلی اشوز کی طرف چلی گئی ہے۔ یہ ایک خطرناک علامت ہے۔ ضرورت ہے کہ الکشن سیاست کو دوبارہ نیشنل اشوز کی طرف لایا جائے۔

-۱۴ انگریزی اخبار ہندو کی خاتون نمائندہ اسماء عرشی نے یکم نومبر ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر تعدد ازدواج سے تھا۔ اس سلسلہ میں انھیں اسلام کا قانون بتایا گیا۔ ایک سوال یہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں اس کا ریلیونس باقی ہے۔ جواب دیا گیا کہ اس اجازت کا تعلق زمانہ سے نہیں ہے بلکہ عورتوں کے سرپلس ہونے سے ہے۔ اور وہ ایک غیر زمانی ظاہرہ ہے۔

-۱۵ ڈاکٹر رجنی پانی (ڈائرکٹر ساؤتھ ایشین سنٹر، لانگ آئیلنڈ یونی ورسٹی) نے ۲ دسمبر کو دو امریکن اسکالر کے ساتھ صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی۔ یہ لوگ اسلامی تصوف پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ ان کو اس موضوع پر ضروری معلومات دی گئیں اور کچھ انگریزی کتابیں مزید مطالعہ کے لیے دی گئیں۔

-۱۶ ۹ جنوری ۱۹۹۷ کو بمبئی (چوہان اڈیٹوریم) میں ایک خصوصی فنکشن ہوا۔ اس میں بمبئی کے تعلیم یافتہ اور صنعت کار طبقہ کے لوگ شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور مذہبی رواداری کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اور بعض دوسرے پروگراموں میں شرکت کی۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ الرسالہ میں سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔



Size 22x14.5cm,
2?0 pages
Rs. 40



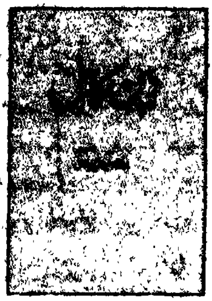
Size 22x14.5cm,
112 pages
Rs. 25

Size 22x14.5cm,
144 pages
Rs. 30

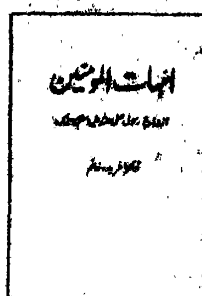


Size 22x14.5cm,
[illegible] pages
Rs. [illegible]

Size 22x14.5cm,
292 pages
Rs. 50

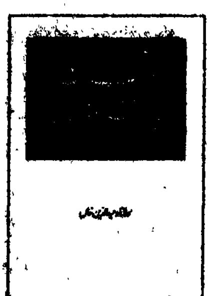


Size 22x14.5cm,
368 pages
Rs. 60



Size 22x14.5cm,
56 pages
Rs. 20

Size 22x14.5cm,
208 pages
Rs. 40



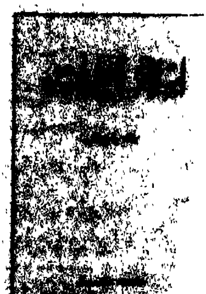
Size 22x14.5cm,
24 pages
Rs. 5



Size 22x14.5cm,
344 pages
Rs. 70



Size 22x14.5cm,
152 pages
Rs. 25



Size 22x14.5cm,
144 pages
Rs. 25

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333

Rs.	[illegible]
200/-	تذکیر القرآن جلد اول
200/-	تذکیر القرآن جلد دوم
45/-	اللہ اکبر
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
30/-	اسلامی زندگی
35/-	احیاء اسلام
[illegible]	رازِ حیات
[illegible]	صراطِ مستقیم
[illegible]	خاتونِ اسلام
[illegible]	سوشلزم اور اسلام
[illegible]	اسلام اور عصرِ حاضر
[illegible]	الربانیہ
[illegible]	کاروانِ ملت
30/-	حقیقتِ حج
25/-	اسلامی تعلیمات
25/-	اسلام دورِ جدید کا خالق
35/-	حدیثِ رسول
[illegible]	سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)
—	سفرنامہ (ملکی اسفار)
[illegible]	میوات کا سفر
30/-	قیادت نامہ
25/-	راہِ عمل
70/-	تعبیر کی غلطی
20/-	دین کی سیاسی تعبیر
20/-	امہات المومنین
7/-	عظمتِ مومن
4/-	اسلام ایک عظیم جدوجہد
3/-	طلاق اسلام میں

8/-	[illegible]
12/-	مطالعہ سیرت
80/-	ڈائری جلد اول
55/-	کتابِ زندگی
[illegible]	اقوالِ حکمت
65/-	[illegible]
8/-	تعمیر کی طرف
20/-	تبلیغی تحریک
25/-	تجدیدِ دین
35/-	عقلیاتِ اسلام
—	مذہب اور سائنس
8/-	قرآن کا مطلوب انسان
5/-	دین کیا ہے
7/-	اسلام دینِ فطرت
7/-	تعمیرِ ملت
7/-	تاریخ کا سبق
5/-	فسادات کا مسئلہ
5/-	انسان اپنے آپ کو پہچان
5/-	تعارفِ اسلام
5/-	اسلام پندرہویں صدی میں
8/-	راہیں بند نہیں
7/-	ایمانی طاقت
7/-	اتحادِ ملت
7/-	سبق آموز واقعات
10/-	زلزلۂ قیامت
8/-	حقیقت کی تلاش
5/-	پیغمبرِ اسلام
7/-	آخری سفر
7/-	اسلامی دعوت
12/-	خدا اور انسان
10/-	حل یہاں ہے
8/-	سچا راستہ
7/-	دینی تعلیم
7/-	حیاتِ طیبہ
7/-	باغِ جنت
50/-	فکرِ اسلامی

7/-	[illegible]
10/-	[illegible]
7/-	[illegible]
45/-	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
8/-	[illegible]
10/-	سیرتِ رسول
1/-	ہندستان آزادی کے بعد
7/-	مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
4/-	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ
2/-	منزل کی طرف
85/-	الاسلام یتحدی (عربی)

ہندی

8/-	سچائی کی تلاش
4/-	انسان اپنے آپ کو پہچان
4/-	پیغمبرِ اسلام
10/-	سچائی کی کھوج
8/-	آخری سفر
8/-	اسلام کا پریچے
8/-	پیغمبرِ اسلام کے جیون ساتھی
7/-	راستے بند نہیں
8/-	جنت کا باغ
7/-	بھوتک واد اور اسلام
9/-	اتہاس کا سبق
8/-	اسلام ایک سوابھاوک مذہب
8/-	اجول بھوشیہ
8/-	پوتر جیون
3/-	منزل کی اور

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible] Orientated Life	7[illegible]
[illegible] and Science	4[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	20[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	25[illegible]
[illegible] of Hell	[illegible]
[illegible] Know Thyself	[illegible]
[illegible]hammad: The Ideal Character	[illegible]
[illegible] Movement	25/-
[illegible]gamy and Islam	7/-
[illegible] of the Prophet Muhammad	75/-
Islam: The Voice of Human Nature	30/-
Islam: Creator of the Modern Age	55/-
[illegible] Between [illegible] and Western [illegible]	95/-
[illegible] the Qur'an	165/-
[illegible] in Islamic [illegible]	65/-
[illegible] in Islam	20/-
[illegible]	7/-
[illegible] of the Qur'an	75/-
[illegible] Life of the Prophet Muhammad	75/-

آڈیو کیسٹ

[illegible]/-	حقیقتِ ایمان
[illegible]/-	حقیقتِ نماز
[illegible]/-	حقیقتِ روزہ
[illegible]/-	حقیقتِ زکوٰۃ
[illegible]/-	حقیقتِ حج
[illegible]/-	سنتِ رسول
[illegible]/-	میدانِ عمل
[illegible]/-	رسول اللہ کا طریقِ کار
[illegible]/-	اسلامی دعوت کے جدید امکانات
[illegible]/-	اسلامی اخلاق
[illegible]/-	اتحادِ ملت
[illegible]/-	تعمیرِ ملت
[illegible]/-	نصیحتِ لقمان

AL-RISALA BOOK CENTRE
Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013, Tel. 4611128, Fax 4697333

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risala

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market, Near DESU,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
E-mail: risala.islamic.@axcess.net.in.

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 8137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY
MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

مارچ ۱۹۹۷، شمارہ ۲۴۴

فہرست	صفحہ

ضروری اعلان

- الرسالہ ہندی کی اشاعت بھوپال سے شروع ہو گئی ہے۔
- الرسالہ کے پرانے شمارے صرف ایک روپے میں۔
تفصیل صفحہ ۵۰ پر دیکھیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے) یہ آیت قرآن میں ایک سو چودہ بار آئی ہے۔ اس تکرار سے اس کی خصوصی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کوئی بھی دوسری آیت نہیں جو قرآن میں اتنی زیادہ بار آئی ہو۔ بندے کے لیے کسی کام کا سب سے بہتر آغاز یہ ہے کہ وہ اپنے کام کو اپنے رب کے نام سے شروع کرے، وہ ہستی جو تمام رحمتوں کا خزانہ ہے۔ اس کے نام سے کسی کام کا آغاز کرنا گویا اس سے یہ دعا کرنا ہے کہ تو اپنی بے پایاں رحمتوں کے ساتھ میری مدد پر آجا۔ یہ بندے کی طرف سے اپنی بندگی کا اعتراف ہے اور اسی کے ساتھ اس کی کامیابی کی الٰہی ضمانت بھی۔

"میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں" کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ کی یاد سے اپنے کام کا آغاز کر رہا ہوں، یہ کلمہ اپنی روح کے اعتبار سے اس حقیقت کا حامل ہے کہ: السعی منی والاتمام من اللہ اس طرح بندہ ہر کام کے موقع پر یہ کلمہ ادا کر کے اس حقیقت کو تازہ کرتا ہے کہ وہ کسی کام کو شروع کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ کام کو اس کے آخری تکمیل تک پہنچانے کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہے وہ سب اللہ کے اختیار میں ہیں، بندے کے اختیار میں آغاز ہے اور اللہ کے اختیار میں تکمیل۔

اس اعتبار سے یہ کلمہ دراصل ایک دعا ہے۔ بندہ اپنے ہر کام کے آغاز میں اس دعائیہ کلمہ کو ادا کر کے خدا سے یہ التجا کرتا ہے کہ اے میرے رب میں نے تیرے اعتماد پر ایک کام شروع کر دیا ہے۔ تو میرے اعتماد کی تکمیل فرما اور میرے حق میں وہ اسباب مہیا فرما دے جس کے ذریعہ میں اپنے اس کام کو مکمل کر سکوں۔ اللہ کے ساتھ اس کی رحمٰن و رحیم کی صفت کا ذکر کرنا گویا کہ یہ کہنا ہے کہ اے اللہ جب تو رحمتوں اور برکتوں والا ہے تو میں تجھ سے یہی امید کرتا ہوں کہ تو ضرور میری دعا قبول فرمائے گا۔

جو کام اللہ کے نام سے شروع نہ کیا جائے وہ گویا صحیح آغاز سے محروم تھا اور جو کام صحیح آغاز سے محروم ہو وہ کبھی صحیح تکمیل تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔

حکیمانہ جواب

امام ابن جوزی (م ۵۹۷ھ) کے زمانہ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک سنی اور ایک شیعہ میں جھگڑا ہوا۔ سنی کا دعویٰ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ زیادہ افضل تھے۔ شیعہ حضرت علیؓ کی افضلیت ثابت کر رہا تھا۔ نزاع بڑھی تو یہ طے ہوا کہ اس معاملہ میں ابن جوزی کو حکم بنایا جائے۔ ایک دن جب کہ ابن جوزی منبر پر تقریر کر رہے تھے اس وقت فریقین میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور ان سے پوچھا کہ: من افضل الصحابۃ (یعنی صحابہ میں افضل کون ہے)

ابن جوزی نے جواب دیتے ہوئے کہا: افضل صحابۃ رسول اللہ الذی بنتہ فی بیتہ (یعنی اصحاب رسول میں زیادہ افضلیت والا وہ ہے کہ جس کی بیٹی اس کے گھر میں تھی) امام ابن جوزی نے یہ جواب دیا اور اس کے فوراً بعد مسجد سے باہر چلے گئے تاکہ اس جملہ کی تشریح نہ کرنی پڑے۔

ابن جوزی کا یہ جواب ایسا تھا کہ دونوں فریق مطمئن ہو گئے کہ فیصلہ اس کے عقیدہ کے مطابق ہوا یعنی سنی یہ سمجھا کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ زیادہ افضل وہ ہے جس کی بیٹی رسول اللہؐ کے گھر میں تھی۔ چوں کہ حضرت ابوبکر کی صاحبزادی حضرت عائشہ رسول اللہؐ کے نکاح میں تھیں اس لیے حضرت ابوبکر افضل ہیں۔ دوسری طرف شیعہ نے مذکورہ جملہ کا یہ مطلب لیا کہ زیادہ افضل وہ ہے جس کے گھر میں رسول اللہؐ کی صاحبزادی تھیں اور چوں کہ آپؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ حضرت علی کے نکاح میں تھیں اس لیے حضرت علی زیادہ افضل ہوئے۔

یہ جواب کا وہی طریقہ ہے جس کو ٹالنے والا جواب (evasive reply) کہا جاتا ہے۔ اس وقت اگر امام ابن جوزی ایسا جواب دیتے جو واضح طور پر کسی ایک فریق کے حق میں ہوتا تو دوسرا فریق غصہ ہو کر لڑنے لگتا اور پھر شیعہ سنی فساد کی نوبت آجاتی۔ مگر امام ابن جوزی نے مذکورہ قسم کا ذومعنی جواب دے کر مسلمانوں کو آپس کے جنگ و جدل سے بچالیا۔

اسی کا نام حکمت کلام ہے۔ کبھی آدمی کو صاف اور واضح جواب دینا پڑتا ہے اور کبھی اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ مبہم انداز میں بات کو بیان کیا جائے۔ حکیم وہ ہے جو ان دونوں کے فرق کو سمجھے اور اپنے کلام میں اس کی رعایت کر سکے۔

اسلام کے سفیر

ام حرام بنت ملحان ایک صحابیہ ہیں۔ ان کا نکاح حضرت عبادہ بن الصامت انصاری سے ہوا۔ انھوں نے اپنے شوہر کے ساتھ بیرونی ملکوں کا سفر کیا۔ اور اب قبرص (Cyprus) میں ان کی قبر ہے۔ ان کی قبر کو وہاں قبر المرأۃ الصالحۃ کہا جاتا ہے (حیات الصحابہ ۱/۵۹۲) حضرت خالد بن الولید کی قبر حمص (شام) میں ہے، حالاں کہ وہ مکہ میں پیدا ہوئے تھے۔

یہی معاملہ بیشتر اصحاب رسول کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت صحابہ کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ لیکن آج اگر آپ مکہ اور مدینہ جائیں تو وہاں آپ کو بہت کم صحابہ کی قبریں ملیں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات عرب سے نکل کر بیرونی ملکوں میں پھیل گئے۔ ان میں اکثر کی وفات ایشیا اور افریقہ کے مختلف ملکوں میں ہوئی اور وہیں ان کی قبریں بنیں۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آخری زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو مدینہ کی مسجد میں جمع کیا اور ان سے کہا کہ اللہ نے مجھ کو تمام دنیا کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ تو تم لوگ اختلاف نہ کرو۔ بلکہ تم ملکوں اور شہروں میں جاؤ اور ہر جگہ کے لوگوں تک میری طرف سے میرا پیغام پہنچا دو (فادّوا عنی) سیرت ابن ہشام ۴/۲۷۹

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی تعلیم تھی جس کی بنا پر اصحاب کرام عرب سے نکل کر بیرونی ملکوں میں پھیل گئے۔ باہر کے ملکوں میں جا کر وہ تجارت کرتے تھے یا محنت سے اپنی روزی کماتے تھے اور لوگوں تک اس پیغام کو پہنچاتے تھے جو ان کو پیغمبر آخر الزماں کے ذریعہ ملا تھا اس طرح ہر شخص اسلام کا سفیر بن گیا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلام زمین کے چاروں طرف پھیل گیا اور تمام آباد دنیا میں اسلام کے نشانات دکھائی دینے لگے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان معاشی اسباب کے تحت ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ اس طرح دوبارہ یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ ہر جگہ اسلام کے سفیر کا کام انجام دے سکیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان کا یہ سفر صرف معاشی سفر نہ رہے گا بلکہ پورے معنوں میں دعوتی سفر بن جائے گا۔ اس طرح اسلام کی عالمی اشاعت پھر اسی طرح ہونے لگے گی جس طرح وہ دور اول میں ہوئی تھی۔

خدمت میں عزت

پٹنہ کے جناب محمد منہاج اختر، ایم اے (پیدائش ۱۹۷۹) سے یکم جنوری ۱۹۹۷ کو ملاقات ہوئی۔ وہ ایک تاجر ہیں اور پٹنہ میں رہتے ہیں (Tel. 654462)

انھوں نے بہار کا ایک واقعہ بتایا۔ ایک باپ کے دو لڑکے تھے۔ ایک لڑکے نے تعلیم کی طرف رخ کیا۔ محنت کرتے کرتے وہ ڈاکٹر بن گیا۔ اس کے بعد اس نے پریکٹس کرلی اور الگ گھر لے کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہنے لگا۔ دوسرا لڑکا تعلیم حاصل نہ کرسکا۔ وہ جاہل رہ گیا۔ آخرکار لوگوں کے مشورہ سے اس نے بستی کے اندر حجامت کی دکان کرلی۔

ڈاکٹر بیٹے کو آبادی کے اندر معزز حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس کے مقابلہ میں حجام بیٹا لوگوں کے درمیان ایک غیر معزز فرد بن کر رہ گیا۔ کچھ لوگوں نے ان کے والد سے کہا کہ حجام بیٹا آپ کے ساتھ رہتا ہے۔ اس بنا پر آپ کو اکثر لوگ فلاں حجام کا والد کہنے لگے ہیں۔ آپ اپنے اس بیٹے کو گھر سے نکال دیجئے۔ اس کے بعد لوگ خود ہی آپ کو "ڈاکٹر صاحب کے والد" کہنا شروع کر دیں گے۔ اور پھر آپ کو سماج کے اندر باعزت جگہ حاصل ہو جائے گی۔ مذکورہ شخص نے جواب دیا۔ میں خود اس کو پسند نہیں کرتا کہ مجھ کو حجام کا والد کہا جائے اور یقیناً اب تک میں اس کو گھر سے نکال چکا ہوتا۔ مگر مجبوری یہ ہے کہ گھر کا خرچ وہی چلاتا ہے۔ اگر میں اس کو گھر سے نکال دوں تو گھر کا کام چلنا ہی مشکل ہو جائے گا۔

یہ خدمت کا کرشمہ ہے۔ خدمت (service) اپنے اندر معجزاتی تاثیر رکھتی ہے۔ آپ خواہ کچھ بھی ہوں، اگر آپ لوگوں کی خدمت کرنے لگیں، لوگوں کی حاجتوں میں ان کے کام آئیں، ماحول کے اندر آپ کی تصویر یہ بن جائے کہ آپ سے لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں تو آپ کسی مزید کوشش کے بغیر خود لوگوں کے درمیان عزت اور برتری کا مقام حاصل کرلیں گے۔

خدمت کرنا لوگوں کا دل جیتنا ہے۔ اور جو آدمی لوگوں کا دل جیت لے وہ سب کچھ پالیتا ہے، اس کے بعد کوئی اور چیز پانے کے لیے باقی نہیں رہتی۔

بااصول زندگی

مومن ایک بااصول انسان ہوتا ہے۔ اس کے معاملات اصولوں کے تحت ہوتے ہیں نہ کہ محض مفاد کے تحت۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اس لیے کرتا ہے کہ باعتبار اصول اس کو ایسا ہی کرنا چاہیے نہ یہ کہ اس کی خواہش یا اس کا فائدہ تقاضا کرتا ہے کہ ایسا کیا جائے۔

مومن کے کہنے اور کرنے میں فرق نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے وہی کرتا ہے۔ اور جو کرتا ہے وہ وہی ہوتا ہے جو اس نے کہا ہے۔ اس کی زندگی اس کمزوری سے مکمل طور پر پاک ہوتی ہے جس کو قول و عمل کا تضاد کہا جاتا ہے۔

اس بنا پر مومن سے معاملہ کرنا نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ صاحب معاملہ کو پیشگی طور پر یہ یقین ہوتا ہے کہ مومن جو قول دے گا وہ لازمی طور پر اس کی تعمیل کرے گا۔ وہ وہی بات کہے گا جس کو اسے فی الواقع کرنا ہے۔ اور جو کام کرنے کے لیے وہ سنجیدہ نہیں ہے اس کو وہ اپنی زبان سے بھی نہیں دہرائے گا۔

مومن کی شخصیت کا یہ پہلو اس کے پورے وجود کی شناخت بن جاتی ہے۔ اس کا چہرہ اصول پسندی کی روشنی سے منور ہوتا ہے۔ اس کی باتوں میں اصول پسندی کی خوشبو بسی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کا کردار سرتاپا اصول پسندی کا کردار ہوتا ہے۔ جب بھی کسی انسان کو اس سے سابقہ پیش آتا ہے تو ہر تجربہ میں اس کو اصول پسندی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ خواہ وہ چھوٹا تجربہ ہو یا کوئی بڑا تجربہ۔

عام لوگ اپنے ذاتی فائدوں کی خاطر جیتے ہیں۔ اِس کے برعکس مومن محکم اصولوں کے تحت جیتا ہے۔ ایک عام انسان اگر مسٹر انٹرسٹ ہوتا ہے تو مومن اس کے بجائے مسٹر پرنسپل۔ انسان تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ اشرف مخلوق ہے۔ اس اعتبار سے وہی شخص انسان کہے جانے کے قابل ہے جو بااصول ہو۔ جو شخص بے اصولی کی زندگی گزارے وہ دراصل انسان ہی نہیں، اگرچہ وہ بظاہر انسان کی صورت میں دکھائی دیتا ہو۔

اصول پسند انسان ہی حقیقی معنوں میں انسان ہے۔ اور اسی حقیقی انسان کا دوسرا نام مومن ہے۔

یہ فرق کیوں

ہر پیغمبر کے زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ جو لوگ پچھلے پیغمبر کو مانتے تھے، انھوں نے اپنے زمانہ کے پیغمبر کا انکار کر دیا۔ پچھلے پیغمبر کو ماننے والوں کے ساتھ وہ دوستی اور تعاون کا معاملہ کرتے تھے۔ مگر معاصر پیغمبر کے ساتھ انھوں نے اپنے آپ کو وابستہ نہیں کیا۔ وہ معاصر پیغمبر کو اپنا تعاون دینے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی کا پیغمبر سماجی روایات میں شامل ہو چکا تھا۔ اس کے نام پر ادارے قائم تھے۔ سماج میں ان کا یہ درجہ بن چکا تھا کہ ان کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنے میں سماجی عزت حاصل ہوتی تھی۔ پچھلے پیغمبر کے نام پر سرگرم ہونے سے سماج میں حیثیت بلند ہوتی تھی۔

معاصر پیغمبر کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ معاصر پیغمبر لوگوں کی نظر میں ابھی ثابت شدہ پیغمبر نہیں بنا تھا۔ اس کی حیثیت ایک نزاعی شخصیت کی تھی۔ نہ کہ مسلّمہ شخصیت کی۔ پچھلے پیغمبر کو پانے کے لیے صرف سماج کا ساتھ دینا کافی تھا۔ جب کہ نئے پیغمبر کو ماننے کے لیے ضروری تھا کہ آدمی کے اندر وہ نگاہ ہو جو سماجی روایات سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔

ان دونوں گروہوں کو تقلیدی ذہن اور انقلابی ذہن کے الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ہر زمانہ میں بیشتر لوگ تقلیدی ذہن کے ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر زمانہ میں پچھلی قائم شدہ شخصیتوں کے نام پر بھیڑ اکٹھا رہتی ہے۔ مگر نئی شخصیت غیر قائم شدہ ہونے کی بنا پر صرف انھیں غیر معمولی افراد کو متاثر کر پاتی ہے جو انقلابی ذہن کے حامل ہوں۔ جو خارجی چیزوں سے اوپر اٹھ کر حقیقت کی سطح پر باتوں کو دیکھیں اور گہری بنیادوں پر آزادانہ فیصلہ کر سکیں۔

خدا کو وہ ایمان مطلوب نہیں ہے جو عوامی رواج یا سماجی تقلید کے زیر اثر بنا ہو۔ خدا کو وہ ایمان مطلوب ہے جو اس طرح حاصل ہو کہ وہ آدمی کی اپنی دریافت بن جائے۔ یہ وہ ایمان ہے جس میں آدمی درمیانی پردوں کو پھاڑ کر براہ راست خدا کو پالیتا ہے، وہ ظواہر سے گزر کر اصل حقیقت تک براہ راست پہنچ جاتا ہے۔

ان میں سے ایک معرفت ہے اور دوسرا صرف تقلید۔

اختلاف

اختلاف ایک پرچۂ امتحان ہے۔ کسی سے آپ کا اختلاف پیدا ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ اللہ نے آپ کو ایک نازک آزمائش میں ڈال دیا تاکہ یہ جانے کہ آپ سچے مومن ہیں یا سچے مومن نہیں ہیں۔

اختلاف کو اختلاف کے دائرہ میں رکھنا سچے اہل ایمان کا طریقہ ہے۔ جو لوگ اختلاف کو تخریب کاری کے درجہ تک پہنچا دیں وہ بلا شبہہ ایمان و اسلام سے نکل گئے۔

آدمی جب اختلاف کو اختلاف کے دائرہ میں رکھے تو اس کا امکان ہوتا ہے کہ تبادلۂ خیال کے دوران دونوں میں سے کسی کے اوپر سچائی کھل جائے اور اس طرح جو بھٹکے ہوئے مسافر کی مانند تھا وہ دوبارہ صحیح راستہ پر آجائے۔

مگر جب ایک آدمی اختلاف کو تخریب کاری تک پہنچا دے تو اس کے بعد گمراہی کے گڑھے میں گرنے کے سوا کوئی انجام اس کے لیے باقی نہیں رہتا۔ ایسے آدمی کا دماغ منفی سوچ کا کارخانہ بن جاتا ہے۔ وہ دلیل اور الزام تراشی کے فرق کو سمجھنے کی اہلیت کھو دیتا ہے۔ وہ منصفانہ اختلاف کی حد سے گزر کر ظالمانہ اختلاف کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کی پکڑ کے احساس سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ صرف اپنی انا کو رہنما بنا لیتا ہے۔ اب اس کا مقصد حق کو قائم کرنا نہیں ہوتا بلکہ صرف اپنی ذات کو قائم کرنا اس کا اول و آخر مقصد بن جاتا ہے۔ وہ خدا کی رحمت سے دور ہو کر پوری طرح شیطان کی گرفت میں آجاتا ہے۔

اختلاف پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ مگر اختلاف کو تخریب کاری بنانا سراسر ظالمانہ فعل ہے جو لوگ اختلاف کو تخریب کاری بنائیں ان کے لیے سخت خطرہ ہے کہ وہ خدا کی شدید پکڑ میں آجائیں عین ممکن ہے کہ آخرت میں ان سے کہہ دیا جائے کہ آج تم نے دنیا کی زندگی میں شیطان کو اپنا رہنما بنایا۔ اب آخرت کی خدائی نعمتوں میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔

اختلاف کے وقت عدل پر قائم رہنا آدمی کے لیے جنت کا دروازہ کھولتا ہے اور اختلاف کے وقت عدل و انصاف سے ہٹ جانا آدمی کو جہنم کے دروازے پر پہنچا دیتا ہے۔

بوسٹر کا رول

فردوسی کا شاہنامہ فارسی زبان کا ایک مشہور رزمیہ ہے۔ اس میں ایران کے رستم اور دوسری شخصیتوں کا پر فخر تذکرہ ہے۔ رستم کے سلسلہ میں فردوسی نے کہا کہ یہ میں ہوں جس نے رستم کو رستم بنایا ورنہ وہ ایران کے ایک قصبہ کا ایک معمولی پہلوان تھا:

منش کردہ ام رستم پہلواں   وگرنہ یلے بود درسیستاں

فردوسی نے اپنے شعر میں جو بات ذاتی فخر کے طور پر کہی ہے وہ درحقیقت فطرت کا ایک قانون ہے۔ جس طرح والی بال کے کھیل میں ایک بوسٹر ہوتا ہے اور ایک وہ جو والی مارتا ہے، بوسٹر کا کام ہے بال کو آگے بڑھانا اور والر کا کام ہے اس کو لے کر والی مارنا، اس طرح والی بال کا کھیل جاری رہتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح زندگی کے نظام میں خود خدا کے نقشۂ تخلیق کے مطابق ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو بڑھاوا دے اور اس طرح وہ اس کو آگے پہنچا دے۔

یہ اصول اتنا عام ہے کہ پیغمبر تک اس سے مستثنیٰ نہیں۔ مثال کے طور پر حضرت یوسفؑ مصر میں ایک غلام کی حیثیت سے داخل ہوئے پھر وہ جیل میں پہنچا دیے گئے۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ انھیں مصر کی حکومت میں اعلیٰ ترین منصب حاصل ہوگیا۔ ان کی یہ ترقی اللہ کے منصوبہ کے تحت تھی۔ تاہم ظاہری طور پر مصر کے بادشاہ نے ان کے لیے بوسٹر (بڑھانے والا) کا رول ادا کیا۔

یہی بات ہر اس شخص کے سلسلہ میں نظر آتی ہے جس کو کسی حیثیت سے کوئی نمایاں مقام حاصل ہوا۔ اس حیثیت سے مطالعہ کیا جائے تو ہر آدمی کے پیچھے کوئی بوسٹر دکھائی دے گا۔ انسانی تاریخ میں شاید ہی کوئی شخصیت ہو جس کے آگے بڑھنے میں کسی بوسٹر کا دخل شامل نہ ہو۔

اس معاملہ میں بوسٹر کو کسی تعلّی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ اس کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کی وجہ سے فلاں شخص آگے بڑھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بوسٹر اگر غیر جانبدارانہ طور پر غور کرے تو وہ خود بھی پائے گا کہ اس کی اپنی ذات کے معاملہ میں بھی کسی بوسٹر کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ بوسٹر کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس نے جو کچھ کیا وہ اس کا ذاتی کارنامہ نہ تھا بلکہ یہ دراصل خدا تھا جس نے اس کو اپنی ایک منشا کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔

توازن قائم رکھئے

کھلاڑی ایک کھیل دکھاتے ہیں جس کو ٹائٹ روپ واکنگ (tight-rope walking) کہا جاتا ہے۔ اس میں یہ ہوتا ہے میدان میں دو کھمبا گاڑ کر اس کے اوپر ایک موٹی رسّی تان دی جاتی ہے۔ اس رسّی کے اوپر ایک لڑکا پاؤں رکھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ میں ایک لمبا بانس ہوتا ہے۔ اس بانس کے ذریعہ توازن (بیلنس) قائم کرتے ہوئے وہ تنی ہوئی رسّی پر چلتا ہے یہاں تک کہ وہ اِس سرے سے اُس سرے تک پہنچ جاتا ہے۔

یہ صرف ٹائٹ روپ کھلاڑی کی بات نہیں۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو ایسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ ایک آدمی جب زمین پر چل رہا ہوتا ہے تو ہر آن وہ گویا کہ ٹائٹ روپ واکر ہی ہوتا ہے۔ اگر وہ چلتے ہوئے دائیں طرف کچھ زیادہ جھک جائے تو وہ دائیں طرف گر جائے گا۔ اور اگر وہ بائیں طرف زیادہ جھک جائے تو وہ بائیں طرف گر جائے گا۔ آدمی دونوں طرف توازن قائم کرتے ہوئے چلتا ہے، اسی لیے وہ کامیابی کے ساتھ راستہ طے کر پاتا ہے۔ ورنہ وہ زمین پر اِدھر یا اُدھر گر پڑے۔

یہی معاملہ پوری زندگی کا ہے۔ اس دنیا میں انسان کی پوری زندگی ٹائٹ روپ واکنگ کی زندگی ہے۔ یہاں اس کو مختلف اور متضاد تقاضوں کے درمیان توازن قائم کرتے ہوئے چلنا پڑتا ہے۔ اسی توازن کو برقرار رکھنے کا نام کامیابی ہے اور اسی توازن کے بگڑ جانے کا نام ناکامی۔

خاندانی زندگی میں آدمی کو مختلف رشتہ داروں کے درمیان توازن قائم کرنا پڑتا ہے۔ سماجی زندگی میں آدمی کو مختلف گروہوں کے درمیان توازن قائم کرنا پڑتا ہے۔ بین اقوامی زندگی میں لیڈروں کو مختلف ملکوں اور مختلف حکومتوں کے درمیان توازن قائم کرنا پڑتا ہے۔ توازن کے اس مسئلہ سے انسانی زندگی کا کوئی بھی گوشہ خالی نہیں۔

اس توازن کو کامیابی کے ساتھ برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی سوچی سمجھی زندگی گزارے۔ وہ ہر آن محتاط رہے۔ وہ ہر لمحہ اپنا محاسبہ کرتا رہے۔ وہ اپنے تعصبات کے خول سے باہر آکر جینا سیکھے۔ وہ اپنی ذات کا لحاظ کرنے کے ساتھ دوسروں کا لحاظ کرنے والا بھی بنے۔ جو لوگ اس طرح دوطرفہ رعایت کی زندگی گزاریں وہی اس دنیا میں کامیابی کا درجہ حاصل کریں گے۔

ماضی اور حال

ایک باپ کے پاس ایک زرخیز زمین تھی اس نے اس میں کچھ بیج بوئے اور اپنے بیٹوں سے کہا کہ میں تو شاید زندہ نہ رہوں لیکن بیس سال بعد تم یہاں پھل دار درختوں کا ایک باغ دیکھو گے اور اس سے فائدہ اٹھاؤ گے۔ ۲۰ سال گزرنے کے بعد بیٹوں نے اس زمین کو دیکھا، وہاں صرف چٹیل میدان تھا وہاں نہ کوئی درخت تھا اور نہ پھل۔

بیٹوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ باپ نے نادانی کے تحت پتھروں کے ٹکڑوں کو بیج سمجھ لیا تھا۔ باپ نے زمین میں پانی دیا اور کچھ چیز بکھیری، مگر وہ بیج نہیں تھے، پتھر کے ٹکڑے تھے۔ ظاہر ہے کہ درخت کا باغ بیج سے نکلتا ہے نہ کہ پتھر کے ٹکڑوں سے۔

اگر کسی قوم کو آپ دیکھیں کہ اس کے رہنما ماضی میں سو سال تک بڑی بڑی تحریکیں اٹھاتے رہے۔ وہ قوم کے سامنے خوشنما الفاظ بولتے رہے اور اس کو بڑی بڑی امیدیں دلاتے رہے۔ مگر حال میں وہ قوم اس طرح داخل ہوتی ہے کہ اس کی حیثیت صرف ایک تباہ حال گروہ کی ہے۔ اس کا کوئی بھی معاملہ درست نہیں۔ کسی بھی پہلو سے اس کے قدموں کے نیچے وہ مستحکم زمین نہیں۔ جس پر قومیں کھڑی ہوتی ہیں۔

ایسی حالت میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ماضی کے رہنماؤں نے درخت کے بیج نہیں بوئے تھے بلکہ بیج کے نام پر پتھر کے ٹکڑے بکھیرے تھے اور پتھر کے ٹکڑے کبھی کسی قوم کے لیے لہلہاتے ہوئے باغ نہیں بنتے۔

حال ہمیشہ ماضی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جیسا ماضی ویسا حال۔ کوئی فرد یا کوئی گروہ اگر ایسے حال کا وارث بنے، جس میں اس کے لیے کچھ نہ ہو تو ایسے فرد یا گروہ کو اغیار کے ظلم اور سازش کی شکایت نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ وہ ماضی میں کوئی حقیقی عمل نہ کر سکا۔ اس لیے حال میں کوئی حقیقی نتیجہ بھی اس کے حصہ میں نہیں آیا۔

ماضی کے لیے اپنی کوتاہی کا اعتراف حال میں عمل کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ ایسا آدمی ازسرِنو عمل کر کے حال میں وہ چیز پالیتا ہے جس کو وہ ماضی میں نہ پاسکا تھا۔

شملہ کا سفر

اندرا گاندھی میموریل ٹرسٹ کے زیر اہتمام شملہ میں ۵ - ۶ جولائی ۱۹۹۴ کو ایک کانفرنس ہوئی۔ اس دو روزہ کانفرنس کا موضوع تھا:

Redefining the good society

اس کانفرنس کی دعوت پر شملہ کا سفر ہوا۔ یہ شملہ کے لئے میرا پہلا سفر تھا۔ ذیل میں اس سفر کی مختصر روداد درج کی جاتی ہے۔

۴ جولائی ۱۹۹۴ کو صبح ۵ بجے گھر سے روانگی ہوئی۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ مگر فضا میں اجالا پھیل چکا تھا۔ جو لبتیاں رات کے اندھیرے میں گم تھیں وہ صبح کی روشنی میں نمایاں ہوتی جارہی تھیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ آفاقی ماحول خاموش زبان میں کہہ رہا ہے کہ جھوٹ اور سچ کا معاملہ بھی یہی ہے۔ جھوٹے پروپگنڈوں کا طوفان تھوڑی دیر کے لئے حقیقت کو چھپا سکتا ہے۔ مگر خود فطرت کے نظام کے تحت یقینی ہے کہ سچائی کا آفتاب طلوع ہو اور جھوٹے پروپگنڈوں کا اس طرح خاتمہ کر دے جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

منتظمین نے سفر کا انتظام ہمالین کوئن اکسپرس سے کیا تھا۔ نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو انسانوں کی ایک بھیڑ آتی اور جاتی نظر آئی۔ ریلوے کی طرف سے لاؤڈ اسپیکر پر ٹرینوں کے بارہ میں مختلف اعلان کیا جارہا تھا۔ ہمالین کوئن کے بارہ میں بتایا گیا کہ وہ اپنے سمے پر ٹھیک ۶ بجے روانہ ہوگی۔ البتہ آج خلاف معمول اس کی روانگی کا انتظام پلیٹ فارم نمبر ا سے کیا گیا تھا۔

پلیٹ فارم پر پہنچے تو "اے سی فرسٹ" کی دو اسپیشل بوگی سامنے نظر آئی۔ یہ کانفرنس کے شرکاء کے لئے مخصوص کی گئی تھی۔ میری کیبن میں میرے علاوہ پی آر چاری (IAS) تھے۔ اس طرح کے کیبن میں عام طور پر چار مسافر ہوتے ہیں۔ مگر اس میں صرف ہم دو آدمی تھے۔ بوگی کے اندر کھانے وغیرہ کے تمام انتظامات ہوائی جہاز کے فرسٹ کلاس کے معیار پر کئے گئے تھے۔

راستہ میں ٹائمس آف انڈیا (۴ جولائی ۱۹۹۴) پڑھا۔ اس میں ایک رپورٹ بہتر زندگی (Living Better) کے زیر عنوان تھی۔ ڈاکٹر رانی راؤ نے لکھا تھا کہ ریسرچ سے معلوم ہوا ہے کہ چلانا

ایک صحت مند عمل ہے۔ چلّانے کو روکنا نہیں چاہئے۔ کیوں کہ ذہنی تناؤ کو ختم کرنے کے لئے چلانا بہت ضروری ہے :

Crying is very crucial for relieving tension. It should not be suppressed.

میرے ہم سفر مسٹر پی آر چاری نے کہا کہ ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے میرا تجربہ ہے کہ جو جلوس جوشیلے نعرے لگاتا ہوا آرہا ہے وہ خطرناک نہیں ہے۔ البتہ جو جلوس خاموش مظاہرہ کر رہا ہو وہ زیادہ خطرناک ہے۔ کیوں کہ نعرہ باز جلوس تو اپنا ٹنشن خود ہی نکال رہا ہے۔ جب کہ خاموش جلوس کے ٹنشن کو نکالنا آپ کی ہوشیاری پر منحصر ہے۔

باہر دونوں طرف سرسبز مناظر تھے جن کے درمیان سے ہماری ٹرین گذر رہی تھی۔ کیبن میں مسٹر پی آر چاری تھے جو اپنے تجربات سنا رہے تھے۔ اس طرح سفر بہت آسانی کے ساتھ طے ہوتا رہا۔ اس طرح کے مواقع پر میں خود بہت کم بولتا ہوں۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ میں سوال کرتا رہتا ہوں اور اس طرح دوسرے کو بولنے کا موقع دیتا ہوں۔ یہی میں نے مسٹر چاری کے ساتھ کیا۔ اکثر میرا سوال یہ ہوتا ہے کہ اپنا کوئی خاص انبھو بتائیے۔ آپ کی زندگی کی خاص دریافت کیا ہے۔ ان سے بھی میں نے اسی قسم کے سوالات کئے۔ انھوں نے اپنے کئی قصے بتائے۔

مسٹر چاری (آئی اے ایس) اس سے پہلے کلکٹر تھے، پھر وہ سکرٹری کے عہدہ تک پہنچ گئے۔ اب انھوں نے انتظامی سروس سے پیشگی ریٹائرمنٹ لے لیا ہے۔ کیبن میں چوں کہ صرف ہم دو آدمی تھے، ان سے کافی باتیں ہوئیں۔ انھوں نے ایک بڑا سبق آموز تجربہ بتایا۔

انھوں نے بتایا کہ ۳۰ سال پہلے وہ مدھیہ پردیش کے ضلع چھتر پور میں کلکٹر تھے۔ وہاں ان کا کلکٹریٹ کا آفس راجہ کے قدیم محل میں تھا۔ جون ۱۹۶۵ کا واقعہ ہے، وہ اپنے دفتر میں کام کر رہے تھے کہ داخلیس پر پولیس افسر کا یہ پیغام ملا کہ شہر کے ہندوؤں کی ایک بھیڑ کلکٹریٹ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم کلکٹر کو ایک میمورنڈم پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ لوگ بپھرے ہوئے ہیں اور آپ کے خلاف اشتعال انگیز نعرے لگا رہے ہیں۔ آپ اجازت دیں کہ ہم فورس کو استعمال کرکے انھیں یہیں روک دیں۔ اگر وہ کلکٹریٹ تک پہنچ گئے تو وہ ضرور تشدد کریں گے۔

مسٹر چاری نے بتایا کہ میں نے پولیس افسر کی رپورٹ پر اعتماد نہیں کیا۔ بلکہ اپنا آدمی بھیجا کہ

جاکر معلوم کرو کہ حقیقی صورت حال کیا ہے۔ آدمی نے بتایا کہ پولیس افسر کی رپورٹ تو درست ہے۔ البتہ وہ لوگ سخت دھوپ سے پسینہ پسینہ ہو رہے ہیں اور پیاس کی وجہ سے ان کے گلے اتنے سوکھ گئے ہیں کہ نعرہ لگانا بھی ان کے لئے مشکل ہو رہا ہے۔ مسٹر چاری نے فوراً اپنے ڈپٹی کلکٹر سے کہا کہ بہت سی بڑی بڑی ناند منگواؤ اور اس میں ٹھنڈا پانی بھر کر کلکٹریٹ کے سامنے کے میدان میں رکھوا دو۔ اور وہاں پینے کے لئے بہت سے کونڈے بھی رکھ دو۔

فوراً اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ کچھ دیر کے بعد جب جلوس والے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ٹھنڈا پانی وہاں بڑی مقدار میں موجود ہے۔ تمام لوگ پانی پر ٹوٹ پڑے۔ ہر ایک نے جی بھر کر پانی پیا۔ اس کے بعد اپنے آپ تمام لوگ ٹھنڈے ہو گئے۔ جلوس کے لیڈر کلکٹر صاحب کے دفتر میں آکر ان سے ملے۔ مگر انھوں نے نہ سخت کلامی کی اور نہ کوئی تشدد کیا۔ بلکہ کلکٹر سے معافی مانگ کر ہنستے ہوئے چلے گئے۔

مسٹر چاری نے یہ واقعہ مجھ سے ٹرین میں بیان کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس کو ان کے حوالے سے کانفرنس کی صدارتی تقریر میں دہرایا۔ مسٹر چاری نے بعد کو بتایا کہ کانفرنس کے ایک ڈیلی گیٹ (مسٹر پی این دھر) ان سے پوچھ رہے تھے کہ یہ واقعہ ہے یا افسانہ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے اعلیٰ ترین دماغ بھی مثبت انداز میں سوچنے سے کس قدر عاجز ہیں۔

ایک صاحب نے زمانہ کا فرق بتاتے ہوئے کہا ہے کہ جب ریلوے ٹرین ایجاد ہوئی تو کہا جانے لگا کہ تاریخ ٹرین کے ذریعہ سفر کرتی ہے:

History travels by train.

اب زمانہ کی تیز رفتاری بہت زیادہ بڑھ چکی ہے۔ چنانچہ آج کہا جاتا ہے کہ تاریخ فیکس مشینوں کے ذریعہ سفر کرتی ہے:

History travels by Fax machines.

ایک ہم سفر نے کہا کہ ہم لوگوں کی سوچ زمانہ کی رفتار کے مطابق نہیں۔ ہم نے ہندی زبان کو پہلے نیشنل لینگویج کہا۔ مگر وہ ناکام ہو گیا۔ اب ہم ہندی کو لنک لینگویج کا نام دے رہے ہیں۔ پہلے ہم نے ریجنل زبانوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اب ہندی کو لنک لینگویج کہہ کر ہم ریجنل زبانوں کی اہمیت کا اعتراف کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے اندر دور اندیشی کی کمی ہماری ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی ہے۔

ہماری سوچ زمانہ سے بہت پیچھے ہے۔

دن میں گیارہ بجے ہماری ٹرین کالکا پہنچی۔ یہاں سے ہمارا قافلہ گاڑیوں کے ذریعہ آگے روانہ ہوا۔ ریلوے اسٹیشن سے پہلے ہم لوگ ہوٹل شوالک لے جائے گئے۔ یہاں کچھ دیر آرام کرنا تھا۔ میں نے غسل کیا۔ پھر مسٹر انور جعفری (بھوپال) سے تبادلہ خیال کرتا رہا۔ آخر میں ہوٹل کی طعام گاہ میں لمبی میز پر سب لوگوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ یہیں ظہر کی نماز پڑھی۔

ہوٹل شوالک میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ میرے ایک دوست فرقہ پرستی کے بہت مخالف ہیں۔ چنانچہ انھوں نے انگریزی میں ایک میگزین نکالا ہے جس کا نام ہے ــــــ فرقہ پرستی سے لڑو (Combat Communalism) میں نے کہا کہ زیادہ بہتر یہ تھا کہ وہ اخوت کو فروغ دو (Promote Brotherhood) کے نام سے اپنا میگزین نکالتے۔

میں نے کہا کہ وہ لوگ جن کو فرقہ پرست کہا جاتا ہے، وہ کوئی بھیڑیوں کی مانند ہم سے الگ نوع نہیں ہیں۔ وہ بھی ہماری ہی طرح کے انسان ہیں۔ ان کے اندر بھی وہی فطرت ہے جو ہمارے اندر ہے۔ البتہ ان کی فطرت پر کچھ عارضی پردے پڑ گئے ہیں۔ آپ حکمت سے ان پردوں کو ہٹا دیجئے۔ اور پھر آپ دیکھیں گے کہ وہ بھی آپ ہی کی طرح شریف انسان بن گئے ہیں۔

ڈیڑھ بجے کالکا سے شملہ کے لئے روانگی ہوئی۔ میں جس کار میں تھا اس میں میرے ساتھ جسٹس آر ایس پاٹھک بھی تھے۔ وہ چیف جسٹس آف انڈیا رہ چکے ہیں۔ انٹرنیشنل کورٹ میں وہ دو سال تک رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے بہت سے واقعات بتائے۔ راجیو گاندھی کی حکومت کے زمانہ میں شاہ اردن کی دعوت پر وہ چار روز کے لئے اردن بھی جا چکے ہیں۔ جسٹس پاٹھک سے میں نے کہا کہ آپ نے انڈیا کے اندر اور انڈیا کے باہر بہت کچھ دیکھا ہے۔ آپ اپنا کوئی انوکھا واقعہ (incident) بتائیے۔ مگر اس وقت انھوں نے ایسا کوئی واقعہ نہیں بتایا۔ انھوں نے مسکرا کر کہا کہ پھر بتائیں گے۔

جسٹس آر ایس پاٹھک نے بتایا کہ جب وہ انٹرنیشنل کورٹ میں پہنچے اور پہلا فیصلہ لکھا تو میرا فیصلہ رد کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ میں نے اسی عام زبان میں لکھا تھا جس کا میں ہندستان کی عدالت میں عادی ہو چکا تھا۔ یعنی ایک فریق کی جیت اور دوسرے فریق کی ہار کا اعلان۔ مگر

انٹرنیشنل کورٹ کے فیصلوں میں یہ زبان نہیں چلتی۔ وہاں فریقین کی سماعت کے بعد جج جب فیصلہ دیتا ہے تو اس کو وہ ایسی زبان میں لکھتا ہے کہ جیتنے والا تو اس میں فاتح نظر آئے مگر ہارنے والا بھی اپنے کو مفتوح نہ سمجھے۔

کالکا سے شملہ کا سفر بذریعہ روڈ طے ہوا۔ یہ سفر تقریباً تین گھنٹہ کا تھا۔ پورا راستہ سرسبز وادیوں کے درمیان سے گزرا۔ میں نے سوچا کہ یہ مناظر کتنے حسین ہیں۔ ان کو دیکھ کر جی چاہنے لگتا ہے کہ انھیں کے درمیان زندگی گزاری جائے۔ مگر جب آدمی یہاں شہر بساتا ہے تو طرح طرح کی آلودگی بہت جلد اس کے حسن کو غارت کر دیتی ہے۔ اور اگر شہر نہ بسایا جائے تو انسان جیسی مخلوق کے لئے ان کے درمیان زندگی گزارنا ممکن نہیں۔ کیسا عجیب عجز ہے جس سے انسان اس دنیا میں دوچار ہے۔ شاید یہی مطلب ہے اس آیت کا کہ ـــــ لقد خلقنا الانسان فی کبد۔

ہماری کار کے ڈرائیور گردپال سنگھ تھے۔ ان سے میں نے گاڑی چلانے کی بابت سوالات کئے۔ انھوں نے کہا کہ گاڑی چلاتے ہوئے ہم کو ہر وقت سجگ رہنا پڑتا ہے۔ اگر ہم آپ ٹھیک چل رہے ہیں، دوسرا غلط آ گیا تو اس سے بھی ہمیں کو بچاؤ کرنا پڑتا ہے۔

دوسری بات انھوں نے میدانی سفر اور پہاڑی سفر کے بارہ میں بتائی۔ انھوں نے کہا کہ میدان میں تو سڑک دور تک دکھائی دیتی ہے۔ وہاں آپ گاڑی کو تیز بھی دوڑا سکتے ہیں۔ مگر پہاڑی سڑکوں پر آپ ۳۰۔۳۵ کیلو میٹر فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں جا سکتے۔ یہاں بار بار موڑ آتا ہے۔ آپ کو پتہ نہیں ہوتا کہ موڑ کے ادھر کیا ہے۔ اس لئے ہم کو سلو چلنا پڑتا ہے، ورنہ ٹکراؤ کا بہت ڈر ہے۔ راستہ میں کئی جگہ گاڑیاں الٹی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ شاید وہی لوگ ہیں جنھوں نے پہاڑی سڑک پر بھی اپنی گاڑی اس طرح دوڑانی شروع کر دی تھی جیسے کوئی شخص میدانی سڑک پر گاڑی دوڑاتا ہے۔

ایک جگہ لینڈ سلائڈ ہوا تھا۔ مٹی اور پتھر بہت بڑی مقدار میں اوپر سے گر کر سڑک پر ڈھیر ہو گئے تھے۔ تاہم یہ سڑک کافی چوڑی ہے۔ اس لئے ملبہ آدھی سڑک تک پھیلا۔ وہ پوری سڑک پر پھیل کر سواریوں کے لئے رکاوٹ نہ بن سکا۔

سڑک کے ذریعہ تقریباً ڈھائی گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ہم ' بادلوں ' کے اندر داخل ہو گئے۔ شملہ ۲۲۰۰ میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ اس لئے یہاں موسم بالکل بدل جاتا ہے۔ یہاں آتے ہی ہم بادلوں کی اونچائی پر پہنچ جاتے ہیں۔

زمین پر جس طرح کبھی کبھی کہر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح یہاں ہر طرف بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ سے سڑک پر کسی قدر اندھیرا ہو گیا تھا۔ اس طرح بادلوں کے درمیان چلتے ہوئے ہم شملہ میں داخل ہو گئے۔

شملہ میں میرا قیام ہوٹل ہالی ڈے ہوم (کمرہ نمبر ۳۰۶) میں تھا۔ میدانی ہوٹلوں کی طرح اس سے ملحق لان اور گارڈن نہیں ہیں۔ پہاڑوں کے اوپر جو ہوٹل بنائے جاتے ہیں وہ عام طور پر ایسے ہی ہوتے ہیں۔

یہاں ایک سرکاری افسر سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ جب میں طالب علم تھا تو میرے بہت سے دوست تھے۔ پھر جب میں جونیئر افسر کی پوسٹ پر تھا تب بھی میرے دوستوں کی تعداد کافی تھی۔ مگر جب میں ترقی کرکے اعلیٰ افسر بن گیا تو میرے دوست بہت کم ہو گئے۔ میں نے پوچھا کہ اس کی وجہ آپ کے خیال سے کیا ہے۔ انھوں نے فوراً کہا کہ رقابت (rivalry) اسی کو مذہب کی اصطلاح میں حسد کہا جاتا ہے۔

حسد کا مرض اس دنیا میں بہت زیادہ عام ہے۔ بلکہ شاید کوئی بھی شخص اس جذبہ سے خالی نہیں۔ دوسرا آدمی جب تک آپ کو اپنے سے کم یا برابر دکھائی دے، آپ کے احساسات اس کے بارہ میں نارمل رہتے ہیں۔ مگر جب آپ کو محسوس ہو کہ دوسرا شخص عہدہ یا مال یا شہرت میں آپ سے آگے بڑھ گیا ہے تو فوراً آپ کے اندر اس کے خلاف جلن پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ اس کی کاٹ کرنے لگتے ہیں تاکہ اس کو غلط بتا کر اپنے اس جذبہ کو تسکین دیں کہ اب بھی آپ اس سے بلند ہیں۔

یہ نفسیاتی کمزوری کبھی شعوری طور پر آدمی کے اندر آتی ہے لیکن زیادہ تر آدمی کے دماغ میں غیر شعوری طور پر داخل ہو جاتی ہے۔ بطور خود آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے اندر کسی کے خلاف بغض اور حسد نہیں۔ حالاں کہ آپ مکمل طور پر حسد کی ذہنیت کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں۔

شملہ ہماچل پردیش کا صدر مقام ہے۔ وہ ہمالیہ کے اوپر ۲۲۰۰ میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ وہ ہندستان کے چند انتہائی مشہور پہاڑی مقامات میں سے ایک ہے۔ دہلی سے اس کا فاصلہ تقریباً ۳۰۰ کیلو میٹر ہے۔

شملہ کو ۱۸۱۴-۱۶ میں انگریزوں نے بسایا تھا۔ اس وقت اس کا مقصد برطانی فوجی دستوں کو وہاں رکھنا تھا۔ بعد کو وہ گرمیوں کا موسم گزارنے کے لئے ایک مقبول پہاڑی مقام بن گیا۔ ۱۸٦۵ سے ۱۹۳۹ تک وہ گرمیوں کے لئے ملک کی راجدھانی رہا۔

جب تک میں نے شملہ کو نہیں دیکھا تھا، شملہ ایک افسانوی شہر معلوم ہوتا تھا۔ مگر دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بھی دوسری بستیوں کی طرح ایک بستی ہے۔ کسی زمانہ میں یہاں فطرت کا حسن ہوگا۔ صحت بخش ہوا لوگوں کو ملتی ہوگی۔ سکون کا ماحول نظر آتا ہوگا۔ مگر آج وہ شملہ کہیں موجود نہیں۔ اس کے راستوں میں چلتے ہوئے میرا احساس یہ تھا کہ یہ گویا مکانوں کا ایک جنگل ہے جس میں کچھ انسان نما مخلوق ہر طرف بھیڑ لگائے ہوئے ہے۔ پچاس سال پہلے کا شملہ اب یہاں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

جیسے ہی ہماری گاڑی شملہ کے اندر داخل ہوئی، اس سے میری دلچسپیاں ختم ہوگئیں۔ میں دن اور گھنٹے گننے لگا کہ کب یہاں سے واپسی ہوگی۔ مجھ کو فطرت کا ماحول پسند ہے۔ مگر آج کے شملہ کے لئے فطرت کا حسن ایک قصۂ ماضی بن چکا ہے۔

دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو ہندستان پر برطانیہ کی حکومت قائم تھی۔ اس نے ہندستان کو بھی جنگ میں شریک کر دیا۔ مہاتما گاندھی کو اس سے اختلاف تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ہندستان ایک عدم تشدد کا ملک ہے۔ اس کو تشدد کے معاملہ میں فریق نہیں بننا چاہئے۔

وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے بذریعہ ٹیلی گرام مہاتما گاندھی کو شملہ آنے کی دعوت دی تاکہ اس مسئلہ پر گفتگو کی جاسکے۔ مہاتما گاندھی فوراً ٹرین سے سفر کر کے شملہ پہنچے۔ لوئی فشر کی رپورٹ کے مطابق، مہاتما گاندھی نے شملہ میں کہا کہ میں خدا سے پوچھتا ہوں کہ وہ اس قسم کی متشددانہ چیزوں کو ظہور میں آنے کی کیوں اجازت دیتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عدم تشدد ناکام ہوگیا اور خدا بھی ناکام ہوگیا:

non-violence had failed, God had failed. (p. 350)

مگر اس تبصرہ کی کوئی حقیقت نہ تھی ۔دوسری عالمی جنگ ہٹلر نے چھیڑی تھی۔ یہ جنگ کامیاب نہ ہو سکی۔ ایک سرکش انسان نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتے ہوئے جنگ چھیڑی۔ مگر خدا نے اس جنگ کی آگ کو بجھا دیا۔ اس کو زیادہ بڑھنے کا موقع نہیں دیا۔

۱۹۷۱ میں بنگلہ دیش کی جنگ کے بعد پاکستان کے ۹۰ ہزار فوجی گرفتار ہو کر ہندستان لائے گئے۔ اس وقت ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے وزیراعظم تھے۔ وہ اپنے فوجیوں کو چھڑا کے لے جانے کے لئے ہندستان آئے۔ مسز اندرا گاندھی سے ان کی بات چیت بھی شملہ میں ہوئی۔ آخر کار وہ اتفاق نامہ طے پایا جس کو شملہ ایگریمنٹ کہا جاتا ہے۔ اس میں طے پایا تھا کہ دونوں ملک اپنے اختلافات کو (بشمول جموں وکشمیر) دوطرفہ گفت گو کی بنیاد پر پر امن طریقہ پر حل کریں گے (کلاز ۲)

اس ایگریمنٹ کی رو سے پاکستان نہ کشمیر کے مسئلہ پر جنگ چھیڑ سکتا تھا اور نہ ہندستان کے خلاف وہ گوریلا وار شروع کرا سکتا تھا جو ان کی مدد سے ۱۹۸۹ سے جاری ہے۔ ۱۹۹۲ کے پاکستانی الکشن میں جماعت اسلامی پاکستان نے اس کو اپنا اشو بنایا۔ اس نے کہا کہ شملہ ایگریمنٹ ہمارے لئے کشمیر کے حصول میں رکاوٹ ہے۔ کشمیر جنگ کے بغیر نہیں مل سکتا اور اس ایگریمنٹ نے ہم کو جنگ چھیڑنے سے روک دیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں ووٹ دو تاکہ ہم اس ایگریمنٹ کو ختم کر کے انڈیا سے جنگ کریں اور کشمیر کو دوبارہ حاصل کریں۔ اس زمانہ میں ان کا نعرہ ہوتا تھا :

ٹوٹے شملہ کی زنجیر   لینا ہے اب تو کشمیر

مگر پاکستانی قوم جماعت اسلامی کے اس نعرہ سے متاثر نہیں ہوئی۔ الکشن ہوا تو امیر جماعت قاضی حسین احمد صاحب سمیت جماعت کے تمام لیڈر بری طرح ہار گئے۔

برطانی دور میں شملہ گرمی کے لئے ملک کی راجدھانی سمجھا جاتا تھا۔ آزادئ ہند کی بہت سی گفت گوئیں شملہ میں ہوئیں۔ شملہ سے بہت سی تاریخی یادیں وابستہ ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے آخر میں شملہ میں ایک کانفرنس ہوئی۔ لارڈ ویویل اس وقت برطانیہ کے وائسرائے تھے۔

کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے اونچے لیڈر اس میں شریک ہوئے۔

اس بات چیت میں برطانی حکومت کی طرف سے جو نقشہ پیش کیا گیا، اس میں مسلانوں اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو برابر کا تناسب دیا گیا تھا:

The plan provided for equal proportion of Moslems and Caste Hindus in the Viceroy's Council. (p. 114)

مگر مسٹر جناح کے انکار کی وجہ سے یہ منصوبہ منظور نہ ہو سکا۔ کیوں کہ برطانیہ کی پالیسی یہ تھی کہ مسلم لیگ کی رضامندی کے بغیر کوئی منصوبہ نہ طے کرے۔ مسٹر جناح نے ایک اخباری بیان میں کہا:

We could settle the Indian problem in ten minutes, if Mr. Gandhi would say, 'I agree that there should be Pakistan; I agree that one-fourth of India, composed of six provinces — Sind, Baluchistan, the Punjab, the Northwest Frontier Province, Bengal, and Assam — with their present boundaries. constitute the Pakistan State. (p. 413)

شملہ میں ہر طرف نیچے اونچے راستے ہیں۔ اس لئے شہر کے اندر مال برداری کا کام جزئی طور پر سواریوں کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ یہاں بے شمار مزدور ہیں جو ہر وقت یہ کام کرتے رہتے ہیں۔ ایک عجیب منظر بار بار یہ دکھائی دیا کہ ایک مزدور کوکنگ گیس کے دو بھرے ہوئے سلنڈر اپنی پیٹھ پر باندھے ہوئے ہے، اور جھکی ہوئی حالت میں اس کو لے کر چل رہا ہے۔ اس میں اتنا اور اضافہ کر لیجئے کہ اس قسم کی پرمشقت مزدوری کرنے والے زیادہ تر کشمیری لوگ نظر آئے۔

۱۹۸۹ سے پہلے کشمیر میں سیاحوں کی مسلسل آمد کی وجہ سے کشمیریوں کے لئے روزی کمانا بہت آسان تھا۔ اس کے بعد وہاں سیاحوں کی آمد رک گئی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ کشمیری لوگ مجبور ہیں کہ وہ باہر جا کر سخت محنت کے ذریعہ اپنی روزی حاصل کریں۔

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہندستان کی مصیبتوں کے اصل ذمہ دار دو ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح، اور جواہر لال نہرو۔ مسٹر جناح کی فرقہ وارانہ سیاست نے ملک کو ہندو مسلم نفرت سے بھر دیا۔ پاکستان کے لوگ کہتے ہیں کہ ہندو ہمارا ازلی دشمن ہے، زیادہ صحیح طور پر انھیں کہنا چاہئے کہ جناح کی تفریقی سیاست نے ہندوؤں اور مسلانوں کو ازلی طور پر ایک دوسرے کا

دشمن بنادیا۔

اس کے بعد جواہرلال نہرو کی سوشلسٹ اقتصادیات نے ہندستان کو تباہ کر دیا۔ اس نے ملک کو بے شمار نقصانات پہنچائے۔ انھیں میں سے ایک عام نقصان یہ ہے کہ اس اسکیم نے قوم کی قوم کو کاہل (Lethargic) بنادیا۔ اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ پہلے دہلی میں کوکنگ گیس کا یہ حال تھا کہ بار بار ٹیلی فون کرنے کے بعد وہ کئی دن پر آتی تھی۔ اب لبرلائزیشن کے بعد یہ حال ہے کہ ایک ٹیلی فون کیجئے، اور اسی دن گیس کا سلنڈر آپ کے گھر پہنچ جائے گا۔

۴۷ ۱۹ کے بعد ہریانہ، پنجاب، ہماچل پردیش اور راجستھان کے علاقہ میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے تھے۔ اس وقت مسلمانوں کو دوبارہ اس علاقہ میں جمانے کے لئے سب سے زیادہ جس نے کام کیا وہ بلاشبہ جمعیۃ علماء ہند ہے۔

یہ کام کس طرح انجام دیا گیا، اس کی ایک مثال مولانا ممتاز احمد قاسمی ہیں۔ ۱۹۶۳ میں دارالعلوم سے فراغت کے بعد انھوں نے ارادہ کیا تھا کہ طب کی تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ وہ دہلی آکر مولانا محمد میاں صاحب سے ملے۔ وہ چاہتے تھے کہ مولانا محمد میاں ان کے لئے حکیم عبدالحمید صاحب کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیں تاکہ طبیہ کالج میں آسانی سے ان کا داخلہ ہو جائے۔ مولانا محمد میاں نے ان کی بات سننے کے بعد کہا کہ اگر تم میرا مشورہ مانو تو میں تم کو ایک اور زیادہ بہتر کام بتاتا ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ دیکھو، یہ ہماچل پردیش کے ایک گاؤں سے خط آیا ہے کہ یہاں ایک عالم بھیجئے۔ میری رائے ہے کہ تم وہاں چلے جاؤ۔

مولانا ممتاز احمد قاسمی اللہ کے بھروسہ پر روانہ ہو گئے۔ یہ شملہ کے قریب ایک گاؤں تھا۔ وہاں کی مسجد میں آکر وہ مقیم ہو گئے۔ مگر شروع میں یہ حال تھا کہ اتنے مسلمان نہیں ملتے تھے کہ باجماعت نماز قائم ہو سکے۔ ایک روز جمعہ کا دن تھا۔ مسجد میں صرف دو آدمی تھے۔ تیسرے کی تلاش میں وہ باہر نکلے۔ ایک جاہل مسلمان گھاس کا گٹھر باندھ کر کھڑا ہوا تھا۔ مولانا ممتاز صاحب نے اس سے مسجد چلنے کے لئے کہا۔ اس نے کہا کہ تم مولویوں کو اور تو کوئی کام نہیں۔ پھر وہ بولا کہ اگر تم میرا یہ گھاس کا گٹھر اٹھالو تو میں تمہارے ساتھ مسجد چلنے کے لئے تیار ہوں۔ مولانا ممتاز صاحب نے فوراً دونوں ہاتھوں سے گھاس کا گٹھر اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ اب وہ دیہاتی مسلمان مسکرانے

لگا اور مسجد میں آکر نماز میں شریک ہو گیا۔ آج یہ گاؤں کافی ترقی کر چکا ہے۔ اب وہاں نہ صرف مدرسہ اور مسجد آباد ہیں۔ بلکہ وہاں کے مسلمان تعلیم اور اقتصادیات میں بھی کافی آگے بڑھ چکے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد مولانا ممتاز صاحب شملہ منتقل ہو گئے۔

ہماچل پردیش پہلے پنجاب کا ایک حصہ تھا۔ ۱۹۴۷ میں یہاں جو قتل و خون ہوا اس وقت بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ علاقہ اب ہمیشہ کے لیے ناقابل رہائش ہو چکا ہے۔ مگر آج دوبارہ یہاں مسلمان معتدل حالات میں آباد ہو رہے ہیں۔ ہماچل پردیش اور پنجاب کے ہر حصہ میں مسلمان دوبارہ نظر آنے لگے ہیں۔

پنجاب کے بہت سے مقامات پر مسلمانوں کی جائدادیں اور ان کی مسجدیں دوبارہ ان کو حاصل ہو گئی ہیں۔ اس سلسلہ کی تازہ خبر یہ ہے کہ پنجاب کے شہر مکتسر میں ایک بڑی مسجد تھی جو ۱۹۴۷ کے ہنگامہ میں سکھوں کے قبضہ میں چلی گئی تھی۔ رپورٹ کے مطابق "بابا ٹھاکر سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے مکتسر کی اس جامع مسجد کو آپسی بھائی چارہ کے فروغ کے لئے مسلمانوں کے حوالے کر دیا ہے۔ وہاں سے سکھوں کے جھنڈے اور شری گورو گرنتھ صاحب کو بھی ہٹا دیا گیا ہے۔ یہ مسجد ۱۹۴۷ کے بعد گوردوارہ کے طور پر استعمال کی جا رہی تھی۔ اور مقامی شری گورو سنگھ سبھا اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ تقریباً ۱۵ سال پہلے سردار کرتار سنگھ بھنڈراں والا نے اس مسجد میں سکھوں کا جھنڈا نصب کیا تھا۔ (اخبار نو، نئی دہلی۔ ۱۵-۲۱ جولائی ۱۹۹۴)

فساد خواہ کتنا ہی بڑا ہو، بہت جلد اس کی حد آجاتی ہے، اور آخر کار جس چیز کو فتح اور بقا حاصل ہوتی ہے وہ امن ہے۔ فساد ایک وقتی حادثہ ہے اور امن ایک دیرپا حقیقت۔

۴ جولائی کی شام کا وقت ہے۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا ہے۔ میں اپنے ہوٹل کے کمرہ میں ہوں اور شیشہ کے اُس پار دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ قریب میں کچھ درخت کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دور بھورے رنگ کے بادلوں میں ہر چیز ڈوبی ہوئی ہے۔ دیکھنے سے پہلے شملہ ایک پراسرار مقام محسوس ہوتا تھا۔ لیکن دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ بعض ظاہری فرق کے ساتھ وہ بھی دوسرے شہروں کی طرح ایک شہر ہے۔ کسی پہلو سے اگر شملہ زیادہ ہے تو کسی اور پہلو سے وہ کم ہے۔ اسی طرح ہمارے عام شہر اگر کسی سے کم نظر آتے ہیں تو کسی اور پہلو

سے وہ زیادہ دکھائی دیں گے۔

کانفرنس ۵ جولائی ۱۹۹۴ کو راشٹرپتی نواس (وائسریگل لاج) کے ایک ہال میں شروع ہوئی۔ افتتاحی اجلاس میں سب سے پہلے ایک مرد اور ایک عورت نے مل کر گیتا (سنسکرت) کا ایک حصہ ترنم کے ساتھ پڑھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ کسی بھی مذہبی کتاب کی تلاوت میں وہ شان پیدا نہیں ہوتی، جو قرآن کی تلاوت میں پائی جاتی ہے۔ دوسری مذہبی کتابوں اور قرآن کو اگر ایک ساتھ پڑھا جائے تو صرف لفظی تلاوت ہی قرآن کی برتری ثابت کرنے کے لئے کافی ہو جائے گی۔

اس کے بعد مسز سونیا گاندھی نے افتتاحی خطبہ انگریزی میں پڑھا۔ اس کانفرنس میں تمام اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ اور اس کی تمام کارروائیاں از اول تا آخر انگریزی میں ہوئیں۔

شملہ کی اس کانفرنس کا افتتاح پرائم منسٹر نرسمہا راؤ کرنے والے تھے۔ مگر وہ کسی وجہ سے نہ آسکے۔ ان کا پیغام مرکزی وزیر ڈاکٹر من موہن سنگھ نے پڑھ کر سنایا۔ ان کے علاوہ مسز سونیا گاندھی، مسٹر نٹور سنگھ اور ہماچل پردیش کے گورنر اور چیف منسٹر اور بہت سی اعلیٰ شخصیتیں اس میں شریک ہوئیں۔

اس طرح کی مختلف کانفرنسوں میں شرکت کے بعد میرا احساس یہ ہے کہ ہمارے ملک میں باشندوں کے اعتبار سے دو ملک پائے جاتے ہیں۔ ایک لوور انڈیا، اور دوسرے اپر انڈیا۔ لوور انڈیا ۹۹ فیصد لوگوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد ایک فیصد انگریزی دانوں کی سطح پر ایک اپر انڈیا ہے۔ یہاں ہر چیز بقیہ ملک سے مختلف ہے۔ یہ تقریباً وہی تقسیم ہے جو برطانوی دور میں انگریزوں اور غیر انگریزوں کے درمیان پائی جاتی تھی۔

راشٹرپتی نواس کے بڑے ہال (ball room) کی ۲۵۰ کرسیاں سب کی سب بھری ہوئی تھیں۔ بہت سے لوگ کناروں پر کھڑے ہوئے تھے۔ ہال میں داخل ہونے کے بعد میں اپنی نشست کی طرف خاموشی سے بڑھ رہا تھا کہ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی ایک معمر خاتون نے میرا نام پوچھتے ہوئے کہا:

Sir, due to your impressive personality, I want to know your name.

ہال کے اندر تمام لوگ شاندار کپڑوں میں ملبوس تھے۔ میں اپنے سادہ کپڑے اور لمبی سفید

[illegible] ہندو قوم پیروں اور درویشوں سے بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ غالباً اسی طرح کے احساسات کے تحت مذکورہ خاتون نے میرے بارہ میں دریافت کیا۔

موجودہ وائسریگل لاج جون ۱۸۸۸ میں بن کر تیار ہوا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے وہ وائسرائے کی رہائش گاہ تھا۔ آزادی کے بعد اس کا نام راشٹرپتی نواس رکھا گیا اور وہ گرمیوں کے موسم میں ہندستانی صدر کی رہائش گاہ قرار پایا۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اکتوبر ۱۹۶۵ میں اس کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز کے حوالے کر دیا، اب اسی ادارہ کے دفاتر اس عمارت میں قائم ہیں۔ تاہم اب یہ عمارت جگہ جگہ سے خستہ ہو گئی ہے۔ اس کی دیکھ ریکھ (maintenance) کے لیے مرکزی حکومت سالانہ ۲۰ لاکھ روپیہ دیتی ہے۔ مگر وہ ناکافی ہے۔ اور اس کے منتظم مرنیال میری نے حکومت سے دو کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ کا مطالبہ کیا ہے۔

The viceregal lodge in Shimla which now houses the
Indian Institute of Advanced Studies

راشٹرپتی نواس (قدیم وائسریگل لاج)، جہاں یہ کانفرنس ہوئی، وہ بہت بڑا ہے اور عالی شان محل کی مانند ہے۔ اس میں تین سو سے زیادہ کمرے ہیں اور کئی بڑے بڑے ہال ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔
مسٹر نٹور سنگھ نے اپنی تقریر میں اس بلڈنگ کی تاریخی اہمیت بتاتے ہوئے کہا کہ ملک کی تقسیم کا

منصوبہ اسی عمارت کے ایک کمرہ میں مکمل کیا گیا تھا جو ہمارے اس ہال سے زیادہ دور نہیں ہے:

The partition plan (1947) was finalised here in a room not far from this one.

تاہم یہ سو سالہ عمارت اب کافی حد تک قابل مرمت ہو چکی ہے۔ اور عمارت کے ذمہ داروں کے پاس اتنا فنڈ نہیں کہ وہ اس کے شایان شان اس کی مرمت کر سکیں۔

اس کانفرنس کا بنیادی موضوع یہ تھا کہ گڈ سوسائٹی کیسے بنائی جائے۔ ایک صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ گڈ سوسائٹی کے بارہ میں فلسفی کا پرسپشن ایک ہے، اور کامن مین کا پرسپشن گڈ سوسائٹی کے بارہ میں دوسرا ہے۔ کیا یہاں اچھے سماج کا کوئی عالمی نظریہ پایا جاتا ہے:

Is there a universal definition of a good society.

اس طرح کے معاملات میں نظریاتی وحدت صرف مقدس کتاب کے ذریعہ لائی جا سکتی ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کے مباحثہ کے ذریعہ ایسے معاملات میں نظریاتی وحدت حاصل کرنا ممکن نہیں۔

مرکزی وزیر ڈاکٹر من موہن سنگھ نے حکومت کی جدید اقتصادی پالیسی (لبرلائزیشن) پر تقریر کی۔ تقریر کے بعد لوگوں نے ان پر سوالات کی بوچھار کر دی خاص طور پر خواتین نے۔ کیونکہ با روزگار خواتین زیادہ تر پبلک سکٹر میں ہیں اور پبلک سکٹر کے ختم ہونے سے عورتوں کے لئے روزگار کے مواقع بہت کم ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر من موہن سنگھ (وزیر مالیات) نے نہایت جرأت کے ساتھ سوالات کا سامنا کیا۔ ایک صاحب سے میں نے کہا کہ من موہن سنگھ کی ایک صفت میں نے یہ دیکھی کہ انھوں نے کسی سوال کا جواب ٹالنے والے (evasive) انداز میں نہیں دیا۔ انھوں نے کہا: جو آدمی ڈبل ٹاک نہیں کرتا وہ کبھی ٹالنے والا جواب (evasive reply) نہیں دے گا۔

ڈاکٹر من موہن سنگھ نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہم باہر پیسہ لانے کے لئے گئے تو ایک افسر نے ہم کو جواب دیا کہ ہز اکسیلنسی، آپ کے ملک سے جتنا پیسہ باہر جا رہا ہے اس کو ملک میں روک لیجئے۔ پھر باہر سے آپ کو پیسہ مانگنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

میں نے ڈاکٹر من موہن سنگھ سے کہا کہ میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ پہلے شخص

ہیں جو میرے خواب کو پورا کر رہے ہیں۔ ۱۹۵۰ میں جب جواہرلال نہرو نے سوشلسٹک پیٹرن آف سوسائٹی کا نعرہ دیا اس وقت سے میں اس کا مخالف رہا ہوں۔ میرے نزدیک ہندستان کے تمام اقتصادی مسائل کا سبب یہی ہے۔ آپ بہادرانہ طور پر اس کا خاتمہ کر رہے ہیں۔ جو لوگ آپ کی مخالفت کر رہے ہیں وہ سب سطحی سوچ کا شکار ہیں۔ آپ اس مہم کو جاری رکھئے، مستقبل میں لوگوں کی سمجھ میں آجائے گا کہ سوشلسٹ پالیسی کے مقابلہ میں لبرل پالیسی ہی زیادہ درست تھی۔

ہماچل پردیش کے چیف منسٹر راجہ ویربھدرا سنگھ نے اپنی تقریر میں ایک ہندو دعا کا ذکر کیا۔ اس کا انگریزی ترجمہ انھوں نے اس طرح سنایا:

Lead us from untruth to truth
Lead us from darkness to light.
Lead us from death to immortality.

ہم کو غیر سچائی سے نکال کر سچائی کا راستہ دکھا۔ ہم کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے آ۔ ہم کو موت سے نکال کر ابدیت میں لے آ۔

اس دعا کا آخری حصہ کس قدر مبہم ہے۔ موت خاتمۂ حیات نہیں، وہ بجائے خود ابدی زندگی کا آغاز ہے۔ موت اگلے مرحلۂ حیات میں داخلہ کا دروازہ ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ پولٹیکل سسٹم اور پولٹیکل کلچر کے درمیان بہت فرق ہے۔ ہمارے یہاں کہنے کے لئے ڈیموکریسی ہے۔ مگر ڈیموکریسی کی اسپرٹ ہمارے یہاں موجود نہیں۔ راستہ روکو، ریل روکو، یہ ڈیموکریسی ہو سکتی ہے۔ مگر یہ ڈیموکریٹک کلچر نہیں ہے۔

اصل یہ ہے کہ ڈیموکریسی کے ساتھ ڈیموکریسی کی روایات بھی ضروری ہیں۔ ہمارے یہاں ڈیموکریسی تو آگئی۔ لیکن ڈیموکریسی کی روایات قائم نہیں ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں ڈیموکریسی عملاً انارکی بن کر رہ گئی ہے۔

ایک صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ مغربی طرز فکر آج بھی ہمارے سماج پر غلبہ حاصل کئے ہوئے ہے:

Western framework of thinking is dominating our society

ٹھیک اسی قسم کی باتیں پاکستان کا روایت پسند طبقہ بھی پاکستان میں دہرا رہا ہے۔ دونوں نے اولاً مغرب کو برا بتا کر اس کے سیاسی غلبہ سے نجات حاصل کی۔ مگر اس کے بعد صرف یہ ہوا کہ دونوں ہی نے دوبارہ مغرب کے تہذیبی غلبہ کو مزید شدت کے ساتھ قبول کر لیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مذہب کی ترقی رک جانے کا ایک سبب یہ ہے کہ مذہب میں سوال یا شبہ کو امر ممنوع سمجھا جاتا ہے، حالاں کہ شبہ ثبوت کا آغاز ہے:

Doubt is the beginning of proof.

میں نے کہا کہ آپ اگر مذہب کے بجائے اہل مذہب کا لفظ بولیں تو مجھے اس سے اتفاق ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، وہ تو غور و فکر اور تحقیق کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اسی بنا پر دور اول میں مسلمانوں نے علم و تحقیق کے میدان میں غیر معمولی ترقیاں کیں۔ مگر مسلمانوں کی موجودہ نسلوں میں فکری زوال کی بنا پر ضرور ایسا ہے کہ وہ سوال اور تنقید سے بھڑکتے ہیں۔ اور اس کی قیمت انھیں اس صورت میں مل رہی ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان علم و فکر کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے ہو گئے ہیں۔

ایک ہندو جرنلسٹ سے موجودہ جرنلزم پر گفتگو ہوئی۔ میں نے ہندستانی جرنلزم کی سطحیت کی شکایت کی۔ انھوں نے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ اصل یہ ہے کہ ہمارے قومی مزاج سے آجکل محنت نکل گئی ہے۔ اس کا اثر جرنلزم پر بھی پڑا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آجکل تحقیقی صحافت (investigative journalism) نام ہے دو رپورٹ پڑھ کر ایک آرٹیکل لکھ دینے کا۔ اور اگر آپ نے تین رپورٹ پڑھ لی تو آپ ایوارڈ کے مستحق بن جائیں گے۔

ایک صاحب کیمونزم سے متاثر تھے۔ ان سے گفتگو ہوئی مگر انھوں نے کیمونسٹ فکر کی غلطی کا اعتراف نہیں کیا۔ کیمونسٹ روس کی ناکامی کے بارہ میں انھوں نے کہا کہ کیمونسٹ سسٹم کے ٹوٹنے کو اس معنی میں نہیں لیا جا سکتا کہ تاریخ نے اشتراکی طرز معیشت کو رد کر دیا ہے:

The collapse of communism should not be regarded as history's rejection of the socialist pattern.

میں نے کہا کہ یہ دلیل صحیح نہیں۔ میں نے کہا کہ ایک شخص اگر یہ کہے کہ لوگوں کے اندر خوف خدا

آجائے تو سماجی برائیاں مٹ جائیں گی تو اس نظریہ کی صحت کو اس سے جانچا جائے گا کہ خوف خدا
آنے کے بعد سماجی برائی مٹی یا نہیں۔ مگر اشتراکیت کی بنیاد فکری تبدیلی پر نہیں ہے بلکہ پیداوار
اور تقسیم کے خارجی نظام کی تبدیلی میں ہے۔ اس لئے اگر خارجی نظام بدلنے کے باوجود سماجی
برائیاں نہ مٹیں تو اس سے اشتراکی نظریہ رد ہو جائے گا۔ اول الذکر کو جانچنے کا معیار فکری تبدیلی
ہے اور ثانی الذکر کو جانچنے کا معیار خارجی ڈھانچہ کی تبدیلی۔ چوں کہ سوویت یونین میں خارجی ڈھانچہ
کی تبدیلی کے باوجود سماجی برائیاں ختم نہیں ہوئیں، اس لئے سوویت یونین کی ناکامی خود
اشتراکیت کی ناکامی کے ہم معنی قرار پائے گی۔

ایک صاحب نے مہاتما گاندھی کا یہ قول دہرایا کہ دنیا میں آدمی کی ضرورت کے لئے
بہت کچھ ہے۔ مگر آدمی کی حرص کے لئے بہت زیادہ نہیں:

There was enough in the world for every ones's need but not for everyone's greed.

یہ بات بالکل درست ہے۔ موجودہ دنیا آزمائش کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس لئے
یہاں اتنا ہی سامان رکھا گیا ہے جو آزمائش کے لئے ضروری ہو۔ انسان کی خواہشات کی لامحدود
تکمیل کے لئے آخرت کی دنیا ہے۔ جو لوگ موجودہ دنیا میں اپنی آزمائش میں پورے اتریں گے
وہ آخرت میں اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے لامحدود سامان پالیں گے۔

ایک صاحب نے کہا کہ اب دنیا بہت بدل چکی ہے۔ بیسویں صدی کے آخر میں خوش قسمتی
سے امپیریلزم اور نسل پرستی انسانیت کے ایجنڈے پر نہیں ہیں۔ اب ایک نئے ورلڈ کی باتیں ہو
رہی ہیں۔ ... طرف کی جا رہی ہیں:

Colonialism, imperialism and racialism are fortunately no longer on the agenda of humankind. There is much talk of a new world order

یہ بات درست ہے کہ مختلف تجربات کے بعد اب انسانی ذہن کسی نئی چیز کی تلاش میں
ہے۔ یہ نئی چیز مذہب کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ سیکولر نظریات سب کے سب ناکام ہو چکے ہیں۔
اس نے دین حق کے لئے دوبارہ نئے مواقع دے دئے ہیں۔ مگر دین حق کو نئی دنیا میں عظمت کا مقام

دینا ممکن کلچر کے ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ وہ صرف دلیل کے زور پر ہی ہو سکتا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ دین حق کو جدید انسان کے فکری استویٰ پر پیش کیا جائے۔ اگر ایسا ہو سکے تو دین حق کو دوبارہ تاریخ میں واپس سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔

دسمبر ۱۹۹۰ میں جے پور میں بھارتیہ جنتا پارٹی (BJP) کا ایک اجلاس ہوا۔ وہاں کچھ ہندوؤں نے یہ نعرہ لگایا: جو ہندو ہت میں بات کرے گا، وہی دیش پر راج کرے گا۔

کچھ اور ہندوؤں کو یہ نعرہ پسند نہیں آیا۔ انھوں نے اس کے خلاف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ حتیٰ کہ اگلے دن اجلاس ہوا تو انھوں نے نعرہ لگایا: جو راشٹر ہت میں بات کرے گا، وہی دیش پر راج کرے گا۔ (ہندستان ٹائمس، ستائیس اڈیشن، صفحہ ۲)

یہ واقعہ علامتی طور پر اس صورتحال کو بتا رہا ہے جو اس وقت ہندو قوم کے اندر موجود ہے۔ ان میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن کی نمائندگی اول الذکر نعرہ میں ہو رہی ہے، اور دوسرے وہ جن کی نمائندگی ثانی الذکر نعرہ میں پائی جاتی ہے۔ اس معاملہ کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اسی کو قرآن میں قانون دفع کہا گیا ہے (البقرہ ۲۵۱، الحج ۴۰) یہ فطرت کا نظام ہے کہ وہ ایک کو دوسرے کے ذریعہ دفع کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی مفسد یا انتہا پسند کبھی زیادہ تک یا بہت دور تک اپنا کام نہیں کر پاتا۔ جب بھی کوئی شخص یا گروہ ایسا اٹھتا ہے تو فطرت کی طاقتیں اس کا مقابلہ کرکے اس کو پیچھے دھکیل دیتی ہیں۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کے سیناروں کے بارہ میں میری رائے زیادہ اچھی نہیں۔ یہاں بھی میں نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا۔ میرا تجربہ ہے کہ یہ لوگ زیادہ تر خوبصورت الفاظ کے فرضی قلعے بناتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی ذاتی زندگی میں آخری حد تک پریکٹیکل ہوتے ہیں۔ مگر سینار میں آتے ہی وہ آئیڈیلسٹ بن جاتے ہیں۔ اسی لئے ان کی باتیں خوبصورت الفاظ بکھیرنے کے سوا کوئی اور نتیجہ ظاہر نہیں کر پاتے۔ خوبصورت الفاظ سے میری مراد کیا ہے، اس کی ایک مثال لیجئے۔ ایک صاحب نے اپنی تقریر میں انڈیا کی اقتصادیات پر بولتے ہوئے کہا:

We have to see that the economy becomes sound and we are able to integrate with the global economy.

بظاہر یہ الفاظ بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان الفاظ کے اندر کسی بھی درجہ میں کوئی عملی رہنمائی موجود نہیں۔ اور نہ اس طرح کے الفاظ سے ملک کا کوئی اقتصادی مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

ایک دانشور نے کہا کہ آپ کو اپنے سماجی حالات کو جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ کرنا ہوگا:

You will have to combine your social conditions to the modern technology.

یہ بھی اسی قسم کا ایک خوبصورت جملہ ہے۔ وہ سننے میں تو اچھا لگتا ہے مگر اس کے اندر ہمارے لئے کوئی عملی رہنمائی موجود نہیں۔

یہاں جن لوگوں نے تقریریں کیں، ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا انداز تھا۔ مگر مجھے سب سے زیادہ شری ارجن سنگھ (مرکزی وزیر) کا انداز پسند آیا۔ ان کے ہاتھ میں چند ٹائپ شدہ اوراق تھے۔ انھوں نے اس کو پڑھا نہیں۔ بس درمیان تقریر میں کبھی کبھی وہ اس یادداشت پر ایک نظر ڈال لیتے تھے، اور پھر برجستہ انداز میں اظہار خیال کرتے تھے۔ ان کے بولنے کا طریقہ یہ تھا کہ ٹھہر ٹھہر کر سنجیدہ لہجہ میں اپنے خیالات پیش کرتے تھے۔ نہ کبھی زور سے بولے اور نہ کبھی جوش دکھایا۔ شروع سے آخر تک یکساں سلجھا ہوا انداز رہا۔

چائے کا وقفہ ہے۔ لوگ ایک ہال کے اندر جمع ہیں۔ میں ایک کنارے کرسی پر بیٹھا ہوا ہوں۔ لوگ خوش ہیں۔ وہ شوق سے کھا پی رہے ہیں اور آپس میں تفریحی باتیں کر رہے ہیں۔ مگر میں ان کے ساتھ شریک نہیں۔ غمگین دل کے ساتھ میری زبان سے نکلا: آہ، کس طرح لوگوں کو بتایا جائے کہ یہ "چند دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات" کا معاملہ ہے۔ ان لوگوں کو حقیقت سے باخبر کرنے کی صورت صرف یہ تھی کہ مسلمان صبر و برداشت کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے داعیانہ کردار پر قائم رہتے وہ ہر قیمت پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نارمل تعلقات کو باقی رکھتے۔ وہ نفرت اور کشیدگی اور ضد کو ختم کر دیتے، خواہ اس کے لئے کوئی بھی قربانی دینی پڑے۔ اگر ایسا ہوتا تو دونوں فرقوں کے درمیان معتدل حالات میں انٹرایکشن ہوتا۔ اس کے درمیان بالکل فطری طور پر علم حقیقت لوگوں تک پہنچتا رہتا۔ اس کوتاہی کے ساتھ اگر مسلمانوں کا ایک ایک شخص تہجد گزار ہو جائے تب بھی اللہ کے یہاں وہ بری الذمہ ہونے والے نہیں۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو نے پرفخر انداز میں کہا کہ سیمٹک مذاہب میں یہ عقیدہ ہے کہ سچائی ایک

ہے۔ مگر ہندوازم میں اس قسم کا ریجڈ نظریہ نہیں۔ ہندوازم میں مانا گیا ہے کہ حقیقت کے مختلف روپ ہو سکتے ہیں۔ سبھی مذاہب اپنی اپنی جگہ پر سچے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ بات کہنے میں تو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ گہرائی کے ساتھ سوچیں تو آپ کو اس میں کئی خلا نظر آئے گا۔ مثلاً اس تصور میں اخلاقی ویلوز سب کی سب اضافی (relative) قرار پاتی ہیں۔ جب دو مختلف اخلاقی رویہ کو بیک وقت درست سمجھ لیا جائے تو اس کے بعد ایک اخلاقی معیار اور دوسرے اخلاقی معیار میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہندستان میں پائے جانے والے موجودہ غیر معمولی کرپشن کی۔

۶ جولائی کو میری صدارت میں جو اجلاس ہوا۔ اس میں لیڈ اسپیکر ڈاکٹر پی آر چاری (آئی اے ایس) تھے۔ پہلے میں نے مختصر طور پر تعارفی تقریر کی۔ اس کے بعد مسٹر چاری نے اظہار خیال کیا۔ اس کے بعد جن افراد نے بحث میں حصہ لیا ان کے نام یہ ہیں ـــــ مسٹر رائنا، ڈاکٹر چھوٹانی، ڈاکٹر برار، پروفیسر پی این دھر، پروفیسر رویندر کمار، پروفیسر رندھاوا، پروفیسر ریشپال، پروفیسر راؤ، مسٹر نلنی سنگھ، ڈاکٹر کرن بیدی، مسٹر نٹور سنگھ، مسٹر سریندر ناتھ۔ آخر میں میں نے مفصل طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور بتایا کہ پرامن سماج بنانے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔

مسٹر پی ایس چاری (آئی اے ایس) نے اپنی تقریر میں بتایا کہ پلاسی کی جنگ (۱۷۵۷) کے بعد جب بنگال اور اس کے آس پاس کے علاقہ پر انگریزوں کا سیاسی قبضہ ہو گیا تو ہیسٹنگز (Warren Hastings) کو اس کا پہلا گورنر جنرل بنایا گیا۔ ۱۷۷۸ تک وہ یہاں کا گورنر جنرل رہا۔ اس وقت یہاں کوئی انتظامی ڈھانچہ نہیں تھا۔ دیہاتوں میں زمیندار بے زمین لوگوں پر بہت ظلم کرتے تھے۔ ہیسٹنگز نے بنگال کو انتظامی یونٹوں میں تقسیم کیا اور ہر یونٹ کے لئے ایک انگریز کلکٹر بھیجا۔ ان انگریزوں کو اس نے کوئی تفصیلی قانون یا قاعدے نہیں بتائے۔ ان کو صرف ایک بنیادی ہدایت دیدی ـــــ تم ظالموں اور کسانوں کے درمیان کھڑے ہو جاؤ :

Thou shalt stand between the hand of oppression and the peasantry.

یہی سماجی انتظام کا خلاصہ ہے۔ سماجی حالات کو درست کرنے کے لئے ایک ہی کام کرنا ہے۔ مظلوموں کے خلاف ظالموں کا ہاتھ پکڑ لینا۔ اگر یہ چیز حاصل ہو جائے تو بقیہ حالات خود فطرت کے

زور پر درست ہو جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانہ میں مکہ میں جو حلف الفضول ہوا، اس کی روح بھی یہی تھی۔

میں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا، اس کا خلاصہ پیشگی طور پر تین صفحہ میں لکھ لیا تھا۔ اس کی کاپیاں منتظمین کی طرف سے کانفرنس میں تقسیم کی گئیں۔ یہ مقالہ انشاءاللہ انگریزی الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔ لوگوں کا تاثر بہت اچھا تھا۔ مسز انجنا سانیال نے کہا: آپ کا پیپر میں نے پڑھا۔ اور اس کی کاپی بھی اپنے پاس رکھ لی۔ وہ بہت سرل ہے اور فوراً سمجھ میں آجاتا ہے۔ اسی طرح کا تاثر جسٹس پاٹھک نے بھی بیان کیا۔

ڈاکٹر کرن بیدی بھی اس کانفرنس میں شریک تھیں۔ وہ انسپکٹر جنرل آف پولیس (آئی جی) ہیں۔ اور اس وقت دہلی جیل (پریزن) کی انچارج ہیں۔ کانفرنس کے بعد ایک ملاقات میں انھوں نے بتایا کہ میں آپ کے مضامین ہندی اور انگریزی اخباروں میں پڑھتی رہتی ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ جیل میں ہم آپ کے لکچر کا انتظام کریں۔ آپ وہاں آئیں اور ہمارے قیدیوں کے سامنے اسلام کی روشنی میں اخلاق اور انسانیت والی باتیں بتائیں۔

انھوں نے بتایا کہ میری ماتحتی میں اس وقت نو ہزار قیدی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ جیل کا ہر آدمی دھرم میں بشواس رکھتا ہے۔ اور اگر پہلے وہ ایسا نہیں تھا تو اب وہ ایسا ہو گیا ہے۔ جب میں پولیس افسر بنی تو میرے اندر روحانیت (spirituality) نہیں تھی۔ مگر جیل والوں کو دیکھ کر مجھے بھی دھرم اور روحانیت کے بارہ میں پڑھنا پڑا تاکہ میں ان کو بتا سکوں۔ انھوں نے ہر روز ایک گھنٹہ کے لئے جیل میں سرو دھرم سبھا شروع کر دیا۔ کیوں کہ جیل میں ہر مذہب کے لوگ موجود تھے۔ ان تجربات نے خود ان کے اندر بھی روحانیت پیدا کر دی۔

شملہ سے واپسی کے بعد ۱۰ جولائی کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر کرن بیدی کو مشہور میگ سیسے ایوارڈ (Magsaysay Award) دیا گیا ہے جو ۵۰ ہزار ڈالر پر مشتمل ہے۔ یہ ایک انٹرنیشنل ایوارڈ ہے۔ جب ان کو اس ایوارڈ کی خبر ملی تو وہ ناچ اٹھیں۔ انھوں نے کہا:

I am thrilled. It's God's grace.

ڈاکٹر کرن بیدی ایک بہادر اور دیانت دار خاتون ہیں۔ اخبار پڑھنے والے جانتے ہیں کہ

پچھلے دنوں انھیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر انٹرنیشنل سطح پر اعتراف کے بعد اب ان کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔ مشہور مثل ان کے اوپر صادق آئی کہ آدمی پہلے باہر پہچانا جاتا ہے، اس کے بعد اندر کے لوگ اس کو پہچانتے ہیں۔ چنانچہ پہلی بار ٹائمس آف انڈیا (۲۰ جولائی ۱۹۹۴) میں ان کے بارہ میں مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے:

Kiran Bedi as the ideal police officer.

مسز ملنی سنگھ ٹی وی کی دنیا میں کافی مشہور ہیں۔ وہ اپنے کیریئر میں نہایت کامیاب سمجھی جاتی ہیں۔ ایک عام آدمی ان کو کامیاب خاتون سمجھے گا۔ مگر ایک ملاقات میں انھوں نے نہایت افسردگی کے ساتھ اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ زندگی صرف پیسہ اور شہرت کا نام تو نہیں۔ میں جب زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچتی ہوں تو مجھے یہ ساری سرگرمیاں بےکار (futile) نظر آنے لگتی ہیں۔ مجھ کو جینے کے لئے بظاہر سب کچھ ملا ہوا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جیو تو کس کے لئے جیو۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے ساتھ جب تک آخرت کو نہ جوڑا جائے، زندگی کی معنویت سمجھ میں نہیں آتی۔ کچھ سطحی قسم کے لوگ اس کے بغیر خوش رہ سکتے ہیں مگر ایک سنجیدہ آدمی کبھی اس پر مطمئن نہیں ہو سکتا کہ زندگی بس اتنی ہے کہ ــــــ پیدا ہو، کھاؤ پیو اور مر جاؤ۔

ڈاکٹر محمود صاحب اور اقبال احمد صاحب عرصہ سے شملہ میں رہتے ہیں۔ ۴ جولائی کی رات کو ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ شملہ میں تقریباً تین ہزار مسلمان ہیں جن میں زیادہ تر لیبر کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں سات مسجدیں اور ایک مدرسہ بھی قائم ہے۔ ۱۹۴۷ تک شملہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ یہاں کی زمینیں زیادہ تر مسلمانوں کے پاس تھیں۔ مگر تقسیم کے بعد جب پنجاب میں مارکاٹ ہونے لگی تو یہاں کے مسلمان گھبرا کر یہاں سے بھاگ گئے۔ اس کے بعد پھر یہاں مسلمان دوبارہ جم نہ سکے۔

تقسیم کے نتیجہ میں جو بربادیاں پیدا ہوئیں ان کی گنتی کرنا مشکل ہے۔ تاہم سب سے بڑی برائی جو تقسیم نے پیدا کی ہے وہ نفرت ہے۔ تقسیم کی تحریک بظاہر اسلام کے نام پر اٹھائی گئی۔ مگر حقیقۃً یہ نفرت کا ایک ہنگامہ تھا۔ اولاً اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مستقل نفرت پیدا کی۔ اور اس کے بعد خود مسلمانوں اور مسلمانوں میں گہری نفرتیں جگا دیں۔ چنانچہ پاکستان

میں باہمی نفرت اور تشدد جتنا زیادہ پایا جاتا ہے اتنا کسی بھی دوسرے مسلم ملک میں نہیں۔
اسی بنا پر مسٹر مجید نظامی نے پاکستان کو ناپاکستان کہا ہے (نوائے وقت)

مجھ سے کہا گیا تھا کہ آپ ہوٹل کی روم سروس کو ٹیلی فون کر کے اپنا ناشتہ اور کھانا اپنے کمرہ میں منگا لیا کریں۔ مگر میں قصداً ڈائننگ ہال میں جا کر کھاتا تھا۔ کیوں کہ اس طرح لوگوں کا مطالعہ کرنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملتا ہے۔

جب میں لوگوں کو جوش اور انہماک کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو اکثر میں سوچنے لگتا ہوں کہ یہ لوگ آخر کیا باتیں کرتے ہیں۔ کیوں کہ میرے نزدیک تو یہ دنیا چپ ہو جانے کی جگہ ہے نہ کہ بولنے کی جگہ۔ اس دنیا کی ہر چیز آدمی سے کہہ رہی ہے کہ خدا کی عظمتوں کو پہچانو، اپنا احتساب کرو، اپنے حال پر غور کر کے اپنے مستقبل کا خاکہ بناؤ۔ مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ انھیں سوچنے کی فرصت نہیں۔ وہ صرف ایک چیز جانتے ہیں ـــــ بے محابا بولتے رہنا۔

۵ جولائی کی صبح کو ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کچھ لوگ میرے قریب کی لمبی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک صاحب نے دوسرے سے کہا: "۲۵ نکال دو، پھر دیکھو کہ کتنا بچا"۔ دوسرے نے کہا: دیکھو ان گدھوں کو، میرا پروموشن چار سال سے روک رکھا ہے۔ تیسرے نے کہا: ابھی سروس میں کیا رکھا ہے، فلاں کو دیکھو۔ چند سال پہلے ٹھیکہ داری شروع کی تھی۔ آج ماروتی کار میں گھوم رہا ہے۔

یہی حال ۹۹ فیصد لوگوں کا ہے۔ سنجیدگی اور گہرائی آج لوگوں سے اٹھ گئی ہے۔ سطحی باتوں کے سوا کسی اور چیز سے لوگوں کو دلچسپی نہیں۔

مسز اجنتا سانیال منتظمین کی ٹیم سے تعلق رکھتی تھیں۔ شملہ کے راستہ میں مجھ کو چکر آگیا، اور وہاں قیام کے دوران بھی چکر آتا رہا۔ موصوفہ نے میرے علاج اور آرام کا ہر طرح اہتمام کیا۔ وہ برابر میری خبر گیری کرتی رہتی تھیں۔ راشٹرپتی نواس میں ایک کمرہ انھوں نے میرے لئے خاص کرا دیا تھا کہ میں اس میں آرام کروں اور جب جی چاہے، کانفرنس میں آجاؤں۔

میں نے موصوفہ کا شکر ادا کیا تو انھوں نے کہا: مجھ کو تو بس آپ آشیرواد دیجئے کہ میں بھی چل سکوں سچائی پر جیسے کہ آپ چل رہے ہیں سچائی پر۔

شملہ کانفرنس کی میزبانی ہماچل پردیش سرکار نے اپنے ذمہ لی تھی۔ چنانچہ ہماچل پردیش کے گورنر اور چیف منسٹر اور دوسرے سرکاری افراد برابر اس کانفرنس میں ذاتی طور پر شریک رہے۔

ہماچل پردیش (نیز پنجاب اور چنڈی گڑھ) کے گورنر مسٹر سریندر ناتھ کی کرسی میری کرسی سے ملی ہوئی تھی۔ چنانچہ ان سے کافی باتیں ہوئیں۔ انھوں نے بتایا کہ گورنری کی میعاد پوری ہونے کے بعد وہ مذہبیات پر کام کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اسلام پر کئی کتابوں کے نام مجھ سے پوچھ کر نوٹ کئے۔ ۷ جولائی کی شام کو انھوں نے گورنر ہاؤس میں نہایت اہتمام کے ساتھ تمام شرکاء کانفرنس کو ڈنر دیا۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے تمام افراد خاندان کا مجھ سے تعارف کرایا۔ سب کے سب بہت خوش نظر آتے تھے۔

عجیب بات ہے کہ جب میں کانفرنس سے فارغ ہو کر دہلی واپس آیا تو یہاں خبر ملی کہ ۹ جولائی کی صبح کو ان کے تمام افراد خاندان (گورنر صاحب کو لے کر دس افراد) ہوائی جہاز کے حادثہ میں ہلاک ہو گئے۔ موصوف اپنی بیوی، لڑکی اور داماد، ان کے دو لڑکے، ایک بیٹا اور اس کی بیوی، اور ان کی دو لڑکی کے ساتھ شملہ سے چنڈی گڑھ جا رہے تھے۔ راستہ میں ان کا چھوٹا جہاز پہاڑی سے ٹکرا گیا اور جہاز کے عملہ سمیت تمام کے تمام مسافر ہلاک ہو گئے۔ اس واقعہ کی خبر پاکستانی اخبار (نوائے وقت ۱۰ جولائی ۱۹۹۴) میں اس سرخی کے ساتھ چھپی: بھارتی پنجاب کا ہندو گورنر خاندان سمیت طیارے کے حادثہ میں مارا گیا۔

پہاڑوں کے اوپر اس وقت گہرا کہر تھا۔ غالباً دھند (Poor Visibility) کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا۔ جس سرکاری جہاز پر یہ لوگ سفر کر رہے تھے اس کا نام سپر کنگ (super king) تھا۔ مگر فطرت کے مقابلہ میں نہ کوئی سپر ہے اور نہ کوئی کنگ۔

وزیر اعظم نرسمہا راؤ کے سامنے کانگرس پارٹی کے ایک شخص نے کہا کہ نرسمہا راؤ کو ابھی دس سال اور پرائم منسٹر کے عہدہ پر رہنا چاہئے۔ نرسمہا راؤ نے فوراً جواب دیا کہ یہ بہت بڑی بھول ہے کہ کسی کے لئے دس سال یا بیس سال کی اصطلاح میں سوچا جائے۔ دیکھئے پنجاب کے گورنر سریندر ناتھ کے ساتھ کیا ہوا:

It is a big mistake to think in terms of 10 or 20 years. See what happened to the Punjab governor Surrendra Nath.

شریمتی گایتری رے (Gayatri Ray) اندرا گاندھی میموریل ٹرسٹ میں اسسٹنٹ سکریٹری ہیں۔ وہی اس کانفرنس کی آرگنائزر تھیں۔ جب میں شملہ پہنچا تو وہ بار بار مجھ سے کہتی تھیں کہ یہاں جو لوگ جمع ہوئے ہیں وہ سب آپ کو خصوصی طور پر سننا چاہتے ہیں۔ اس لئے آپ خوب کھل کر اپنے خیالات رکھیں۔ ۶ جولائی کی شام کو مجھے اس کا موقع ملا۔ میں نے تفصیل کے ساتھ موضوع پر روشنی ڈالی۔ موضوع تھا: پرامن دنیا کی طرف (Towards a non-violent world)

شریمتی گایتری رے نے اپنا ایک عجیب قصہ سنایا۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۷۱ میں جب بنگلہ دیش کی جنگ ہوئی، اس وقت ان کے شوہر ہندستانی سفیر کی حیثیت سے ڈھاکہ میں مقیم تھے۔ پاکستانی فوج نے ان کو ہاؤس ارسٹ (خانہ قید) کر دیا۔ اتفاق سے انھیں دنوں وہ حاملہ تھیں۔ ڈاکٹری حساب کے مطابق، ۱۸ ستمبر کو ان کے یہاں ڈیلیوری ہونے والی تھی۔ وہ بہت پریشان ہوئیں انھوں نے پاکستانی حکام تک اپنی فریاد پہنچائی۔ مگر انھوں نے گھر سے نکل کر اسپتال جانے کی اجازت نہیں دی۔ البتہ ایک پاکستانی ڈاکٹر کو ان کی مدد کے لئے گھر پر بھیجا۔ لیکن انھوں نے پاکستانی ڈاکٹر کی مدد لینے سے انکار کر دیا۔

انھوں نے کہا کہ میں نے اپنے کمرہ میں بیٹھ کر بھگوان سے خوب پرارتھنا کی کہ وہ ان کی ڈلیوری کو روک دے۔ ان کی دعا قبول ہوئی۔ اور ڈیلیوری کی تاریخ ایک مہینہ کے لئے مؤخر ہوگئی۔ چنانچہ ان کی دہلی واپسی کے بعد ۲۱ اکتوبر ۱۹۷۱ کو ان کے یہاں بچہ پیدا ہوا۔

میڈیکل تحقیق کے مطابق، بچہ کی پیدائش ۲۸۰ دن میں ہو جانا ضروری ہے۔ مگر دعا نے اس کو ایک مہینہ تک کے لئے روک دیا۔ شاید یہی مطلب ہے اس حدیث کا کہ: لَا يَرُدُّ القَدَرَ إِلَّا الدُّعَاءُ (احمد)

یہاں جو وی آئی پی تھے وہ سب مجھ کو پہلے سے جانتے تھے۔ وہ اخباروں میں میرے مضامین پڑھے ہوئے تھے۔ ہر ایک بڑے شوق سے ملا۔ ہماچل پردیش کے گورنر مسٹر سریندر ناتھ نے کہا کہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد میں مذہب پر کام کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تمام مذہبوں کی تعلیمات بنیادی طور پر ایک ہیں۔ میں اس کے بارہ میں مزید تفصیلی اسٹڈی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے اس موضوع کی کتابیں بتائیے۔ میں نے کہا کہ اس موضوع پر مسلمانوں نے بہت کا

کتابیں لکھی ہیں۔ میں نے کئی انگریزی اور اردو کتابوں کے نام انھیں نوٹ کرائے۔

میں نے کہا کہ مسلم علماء اس نظریہ سے زیادہ اتفاق نہیں کرتے۔ البتہ غیر مسلم حضرات کو اس سے کافی دل چسپی ہے اور انھوں نے اس پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔

رشید طالب صاحب ایک کافی تجربہ کار صحافی ہیں۔ ایک ملاقات میں انھوں نے کہا کہ اوسط قاری کی پسند یا ناپسند اس اعتبار سے ہوتی ہے کہ کالم نگار اس کے اپنے خیالات کی تائید کرتا ہے یا تائید نہیں کرتا۔

The average reader approves or disapproves of a columnist depending on how far the columnist rationalises the reader's prejudices.

یہ صرف اخبار کے قاری کی بات نہیں ہے۔ یہی بیشتر انسانوں کی بات ہے۔ بیشتر لوگ صرف وہی باتیں سننا پسند کرتے ہیں جو ان کے مخصوص فکر کی تصدیق کرنے والی ہوں۔ اگرچہ اس مزاج کی یہ بھاری قیمت انھیں دینا پڑتا ہے کہ ان کا فکری ارتقاء رک جاتا ہے۔

مسٹر رشید طالب ایک لبرل مسلمان ہیں۔ وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ اس کانفرنس میں شریک تھے۔ وہ اس خیال کے حامی ہیں کہ اسلام میں نظر ثانی کی ضرورت ہے تاکہ اس کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق کیا جا سکے۔ انھوں نے تسلیمہ نسرین کے خلاف قتل کے فتوے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بد دین کے خلاف اسلام کی مقرر کی ہوئی سزا کیا جدید معیار انصاف کے مطابق ہے:

Is the Islamic punishment for apostasy fair by modern standards of justice?

میں نے کہا کہ یہ بات آپ اس مفروضہ پر کر رہے ہیں کہ تسلیمہ نسرین کے قتل پر جو لوگ انعام کا اعلان کر رہے ہیں وہ اسلام کے نمائندہ ہیں۔ حالاں کہ وہ ہرگز اسلام کے نمائندہ نہیں۔ یہ تو کچھ بے علم لوگوں کا شور وغل ہے۔ اس سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں۔ آپ قرآن پڑھیں تو آپ پائیں گے کہ مخالفوں کی اس قسم کی باتوں کا جواب دلیل سے دیا جا رہا ہے۔ یہی اسلام کا طریقہ ہے۔ پھر وہ کون سا جدید معیار ہے جس سے اسلام ٹکرا رہا ہے۔

۶ جولائی ۱۹۹۴ کو مسجد بابو گنج دیکھی۔ ۱۹۴۷ میں یہ مسجد نامکمل حالت میں تھی۔ تقسیم کے ہنگامہ میں یہاں کے مسلمان اس علاقہ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اس لئے مسجد بھی نامکمل حالت میں پڑی رہی۔ حالات

نارمل ہونے کے بعد دوبارہ مسلمان یہاں آنا شروع ہوئے۔ اب یہ مسجد آباد ہے اور تعمیری اعتبار سے مکمل ہوچکی ہے۔ اس کے اطراف میں مسلمانوں کے پانچ گھر ہیں۔ مسجد میں ایک مدرسہ ہے اور مختلف شعبے قائم ہیں۔ وہ ہماچل پردیش کے لئے اسلامی مرکز کا کام کر رہی ہے۔

اس دنیا میں وقتی نقصان ہر ایک کو پیش آتا ہے۔ مگر یہ قدرت کا قانون ہے کہ وقتی نقصان ہمیشہ وقتی نقصان رہے، وہ کسی کے لئے مستقل بربادی نہ بنے۔

بابو گنج کی مسجد کے پاس ایک صاحب پنڈت دیارام رہتے ہیں۔ یہاں کے مندر کا انتظام بھی وہی کرتے ہیں۔ پچھلے رمضان میں ایسا ہوا کہ رات کو جس وقت مسجد میں تراویح ہوتی، عین اسی وقت مندر میں لاؤڈ اسپیکر پر بھجن ہوتا۔ اس سے نمازیوں کو الجھن پیش آرہی تھی۔ آخر ایک روز ایک مسلمان نے پنڈت جی سے اس کا ذکر کیا۔ پنڈت جی نے فوراً کہا کہ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ انھوں نے اسی دن ہدایت کردی کہ تراویح کے وقت مندر کا لاؤڈ اسپیکر بند کر دیا جائے اور دوبارہ اس وقت کھولا جائے جب کہ تراویح ختم ہوچکی ہو۔

پنڈت دیارام مجھ سے ملنے کے لئے مسجد میں آئے۔ ان کی عمر ۷۲ سال ہوچکی ہے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ آپ نے ۱۹۴۷ سے پہلے کا زمانہ بھی دیکھا ہے اور ۱۹۴۷ کے بعد کا زمانہ بھی دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے دونوں میں کیا فرق پایا۔

پنڈت جی نے کہا کہ بہت زیادہ فرق ہے۔ اس وقت انسان کی قدر تھی۔ لوگ ایماندار تھے۔ ہم سکون کے ساتھ رہتے تھے۔ لاٹ صاحب (انگریز وائسرائے) سڑک پر صرف ایک گاڑی میں چلتے تھے۔ کل دہلی کے منسٹر صاحب آئے ہیں۔ جب وہ ایر پورٹ سے یہاں پہنچے تو میں نے ان کے موٹروں کے قافلہ کو گنا تو کل ۲۲ گاڑیاں ان کے ساتھ چل رہی تھیں۔

انھوں نے کہا کہ اب جو اختلاف اور لڑائی جھگڑا ہے وہ سب پالی ٹکس کی وجہ سے ہے۔ "ووٹ کے چکر میں سارے اختلافات پیدا ہوگئے"۔

انھوں نے بتایا کہ یہاں کے سیسل ہوٹل (Cecil Hotel) کالان اس وقت بہت اچھا ہوا کرتا تھا۔ اس کے گیٹ کے سامنے یہ بورڈ لگا رہتا تھا ــــــ کہ ہندستانی اور کتے اندر داخل نہ ہوں:

Indians and dogs are not allowed.

اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ کتے کی عادت ہے کہ وہ گھاس کو اپنے پنجے سے کریدتا ہے۔ اسی طرح بوٹ پہن کر جانے سے لان کی گھاس خراب ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ دونوں کو اندر جانے سے روکتے تھے۔ انگریز جو یہاں آتے تھے، وہ بوٹ پہن کر اس کے اندر نہیں جاتے تھے۔ ان کے پاس فوم جیسا چپل ہوتا تھا۔ وہ لان میں جاتے ہوئے یہی چپل پہن لیتے تھے۔ اس منظر کو پنڈت جی نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

ڈاکٹر جگدیش شرما شملہ ریڈیو کے پروگرام ایگزیکیٹو ہیں۔ وہ ریڈیو کے لئے انٹرویو چاہتے تھے۔ چنانچہ طے ہوا کہ ۷ جولائی کو صبح ساڑھے آٹھ بجے وہ میرے ہوٹل پر آئیں گے۔ مگر مجھ کو بالوگنج کی مسجد میں دیر ہوگئی۔ ہوٹل کے رسپشن میں ٹیلی فون کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ٹھیک وقت پر ہوٹل پہنچ چکے ہیں۔ جب ان کو بتایا گیا کہ اس وقت میں بالوگنج کی مسجد میں ہوں تو انھوں نے کہا کہ کوئی ہرج نہیں۔ میں وہیں آجاتا ہوں۔ چنانچہ وہ ریکارڈنگ کے سامان کے ساتھ مسجد میں آگئے۔ یہاں انھوں نے تفصیلی انٹرویو لیا (Tel. 3471-77301)

میں نے خاص طور پر اس پہلو پر زور دیا کہ سماجی اور قومی زندگی میں امن لانے کے لئے ضروری ہے کہ لوگ تحمل اور رواداری کے ساتھ رہنا سیکھیں۔ تحمل اور رواداری فطرت کا ایک قانون ہے۔ اس کے بغیر ایک پرامن گھر بھی نہیں بنایا جاسکتا، کجاکہ اس کے بغیر کوئی پرامن سماج بنایا جاسکے۔

انگریزی روزنامہ ٹریبون (The Tribune) کے پریس رپورٹر مسٹر سریش گری نے ۶ جولائی ۱۹۹۴ کی شام کو انٹرویو لیا (Tel. 01886-32088)

ایک سوال یہ تھا کہ شملہ کانفرنس کے بارہ میں آپ کا تاثر کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس طرح کی کانفرنس بجائے خود منزل نہیں ہوتی۔ یہ تو راستہ طے کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک مفید کانفرنس تھی۔ اس کانفرنس میں ٹاپ کے لوگ جمع ہوئے۔ انھوں نے اپنے علم اور تجربہ سے ایک دوسرے کو بہت کچھ دیا۔ خود میں نے یہاں کئی نئی باتیں سیکھیں۔ مجھے امید ہے کہ دو دن کا یہ اجتماع ملک کی تعمیر و ترقی کی طرف ایک مثبت قدم ثابت

ہوسکتا ہے۔

مولانا ممتاز احمد قاسمی اور گلزار محمد بھارتی (چیئرمین حج کمیٹی، ہماچل پردیش) نے بتایا کہ ۱۹۹۰ میں جب کہ ہماچل پردیش میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت تھی، اس کے کارکنوں نے ریاست میں بہت طوفان مچایا۔ انھوں نے مسلمانوں کے خلاف جگہ جگہ جلوس نکالے جس میں اشتعال انگیز نعرے لگائے گئے۔ مثلاً: مندر تو ایک بہانہ ہے، مسلمانوں کو دور بھگانا ہے۔ ہماچل پردیش کی کل آبادی ۵۵ لاکھ ہے۔ اس میں تقریباً دو لاکھ مسلمان ہیں۔ ریاست کے مسلمان سخت گھبرا اٹھے۔ یہاں تک کہ ان کا خیال ہو گیا کہ ریاست کو چھوڑ کر چلے جائیں۔

مولانا ممتاز صاحب اور گلزار محمد صاحب ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۰ کو راجہ ویر بھدر اسنگھ سے اُن کی رہائش گاہ (شملہ) پر ملے۔ اب وہ چیف منسٹر ہیں۔ مگر اس وقت وہ صرف ایم ایل اے تھے۔ مولانا ممتاز صاحب نے بتایا کہ جب انھوں نے ہماچل پردیش کے مسلمانوں کی حالت بتائی اور کہا کہ شاید آپ کو وہ دن دیکھنا پڑے کہ ہماچل پردیش میں ایک مسلمان بھی باقی نہ رہے، تو ویر بھدر اسنگھ رونے لگے۔ ان کی آواز رندھ گئی۔ انھوں نے کہا کہ تمام مسلمانوں کو شملہ میں میری کوٹھی پر لے آؤ۔ میں یہاں گیٹ پر بندوق لے کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ پہلی گولی میرے سینہ پر لگے گی، اس کے بعد وہ کسی مسلمان تک پہنچے گی۔

راجہ ویر بھدر اسنگھ نے اسی وقت خود اپنے ہاتھ سے ایک درخواست ٹائپ کی اور اس کو لے کر گورنر ہماچل پردیش کے یہاں پہنچے۔ ان کی باتیں سُن کر گورنر نے اسی وقت چیف منسٹر کو بلایا۔ اور پھر طے ہوا کہ ریاست کے تمام ایم ایل اے اپنے اپنے حلقہ میں جائیں اور مسلمانوں کو ڈھارس دلائیں کہ تم لوگ بے ڈر ہو کر رہو۔ تمہارے خلاف کوئی انتہا پسند کچھ بھی کرنے نہیں پائے گا۔ اس کے بعد حالات معتدل ہو گئے۔ یہاں تک کہ خود بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت ٹوٹ گئی۔ نئے الکشن میں راجہ ویر بھدر اسنگھ چیف منسٹر ہو گئے۔ حال ہی میں ان کی حکومت نے ریاست میں ایک سو اردو ٹیچر بھرتی کرنے کا اعلان کیا ہے۔

مولانا ممتاز احمد قاسمی نے بتایا کہ شملہ میں وشومیدھ یگیہ بڑے پیمانہ پر ۲۲ - ۲۵ مئی ۱۹۹۴ کو ہوا۔ انھوں نے اس کے انعقاد میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اس موقع کو

استعمال کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ انھوں نے ایک جگہ لے کر وہاں اسلامی کتابوں کا اسٹال لگایا۔ ہندی اور انگریزی کتابیں دہلی سے لاکر یہاں رکھی گئیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہندو بہت کثرت سے ہمارے اسٹال پر آئے۔ انھوں نے دیکھا۔ باتیں کیں اور بہت سے ہندوؤں نے کتابیں خریدیں۔ آنے والوں میں سے ایک ہندو نے حسب ذیل تاثرات ہندی زبان میں لکھے :

اسلام کو اپنی آتما سے تو جانا تھا، سمجھا تھا۔ پرنتو اس کا اتہاس یا کھیہ کتاب قرآن نہیں پڑھا تھا آپ کی یہ پردرشنی بہت اچھی لگی۔ تھا اس سے بہت اپیوگی کتابیں ملیں۔ ایسی پردرشنی ہر جگہ، ہر شہر میں کبھی کبھی ایسے موقعوں پر لگتی رہنا چاہئے تاکہ ایک دوسرے کے دھرم کو اچھی طرح سمجھا جاسکے۔

گیان چند شرما، بال وکاس پریوجنا ادھیکاری، گھماری، بلاسپور۔

مولانا ممتاز صاحب ۱۹۶۳ سے شملہ میں مقیم ہیں۔ وشو میدھ یگیہ (۲۲ ـ ۲۶ مئی ۱۹۹۴) کے بارہ میں انھوں نے بتایا کہ وہ بہت کامیاب رہا۔ دوسری ہندی کتابوں کے علاوہ ۵۵ عدد ہندی ترجمۂ قرآن لوگوں نے حاصل کئے۔

بک اسٹال پر یگیہ کے ایک بڑے مہاتما آئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو تو آپ کا یہ اسلامی بک اسٹال بہت اچھا لگا۔ اب بتائیے کہ آپ کو ہمارا یگیہ کیسا لگا۔ مولانا ممتاز صاحب نے کہا کہ ہم کو آپ کے یگیہ میں بہت بڑی کمی محسوس ہوئی۔ انھوں نے تعجب کے ساتھ پوچھا کہ وہ کیا —— مولانا ممتاز صاحب نے کہا : جیسے ہم نے یہاں ہندی زبان میں اسلامی لٹریچر لاکر رکھا ہے اسی طرح آپ کو بھی اردو میں ہندوازم پر لٹریچر یہاں رکھنا چاہئے تھا۔ سوامی جی اس جواب سے بہت متاثر ہوئے۔ اور کہا کہ آپ نے جو کہا سچ کہا۔

بالوگنج کی مسجد میں تین نمازیں پڑھیں —— مغرب، عشاء اور فجر۔ یہاں شام کو دیر تک نشست ہوئی جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوئے۔ یہ سلسلہ کئی گھنٹہ تک چلتا رہا۔

فجر کی نماز میں امام صاحب نے سورہ البروج پڑھی۔ اس میں یہ آیت تھی ... وَاللّٰهُ مِن وَرَائِهِم مُّحِيطٌ۔ فجر کے بعد میں نے اسی کو درس کا موضوع بنایا۔ میں نے کہا کہ اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان اس دنیا میں اکیلے نہیں ہیں۔ اللہ ان کے اور ان کے دشمنوں کے درمیان ہے۔ وہ دشمنان اسلام کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس میں ہمارے لئے بہت بڑی خوش خبری ہے۔ یہ آیت

ل ایمان کے لئے حوصلہ کی آیت ہے۔

مسلمانوں کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلم دانشوروں اور رہنماؤں نے دعوت کے لئے کوئی مثبت کام تو نہیں کیا۔ البتہ انھوں نے دعوت کے راستہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔

ہندستان میں ایسی قومی پالیسی اختیار کی گئی جس کے نتیجہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان گہری نفرتیں پیدا ہو گئیں۔ یورپ میں مختلف واقعات کے نتیجہ میں غیر مسلموں کے اندر شدید غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔

میں نے کہا کہ یہ میڈیا کا زمانہ ہے۔ اس لئے مسلم رہنماؤں اور دانشوروں کو اپنی کارروائیوں میں سخت احتیاط کرنی چاہئے۔ مثال کے طور پر، سلمان رشدی کے معاملہ میں تمام لوگوں نے جو موقف اختیار کیا اس کا مثبت نتیجہ تو کچھ نہیں نکلا۔ البتہ میڈیا کی رپورٹنگ کے نتیجہ میں وہ ساری دنیا میں اسلام کی بدنامی کا سبب بن گیا۔ اب مسلمان میڈیا کی شکایت کر رہے ہیں، حالاں کہ اس قسم کی شکایت غلطی پر مزید سادہ لوحی کا اضافہ ہے۔

ایک صاحب سے آر ایس ایس کے مسئلہ پر بات ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں آر ایس ایس کو مسلمانوں کے لئے کوئی خطرہ نہیں سمجھتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آر ایس ایس اپنی عمر پوری کرکے اب ختم ہو چکی ہے۔ اب وہ باعتبار ڈھانچہ زندہ ہے نہ کہ باعتبار تحریک۔

آر ایس ایس ۱۹۲۵ میں قائم ہوئی۔ اس وقت انڈیا زراعتی دور میں تھا۔ لوگوں کے پاس کافی وقت تھا۔ وہ صبح سویرے بڑی تعداد میں شاکھاؤں میں شریک ہوتے تھے۔ مگر اب انڈیا صنعتی دور میں پہنچ چکا ہے۔ اب لوگوں کے پاس اس قسم کی لگژری کے لئے وقت نہیں ہے۔ چنانچہ آپ آر ایس ایس کو قریب سے دیکھیں تو آپ پائیں گے کہ اس میں زیادہ بوڑھے لوگ ہیں۔ نوجوان طبقہ اب آر ایس ایس کی طرف رخ نہیں کر رہا ہے۔ آر ایس ایس کے رہنماؤں کی قدیم کتابوں میں خواہ جو الفاظ بھی لکھے ہوئے ہوں۔ مگر آر ایس ایس اب ایک ختم شدہ طاقت (spent force) ہے۔ وہ اپنے اندر یہ صلاحیت کھو چکی ہے کہ وہ کسی کے لئے خطرہ بن سکے۔

شملہ کی مال روڈ یہاں کی بہت خاص سڑک سمجھی جاتی ہے۔ مولانا ممتاز صاحب اور دوسرے [illegible]

ٹیچو لگا ہوا ہے۔ اس اسٹیچو میں ان کو اس طرح دکھایا گیا ہے کہ ان کا بایاں ہاتھ کمر سے لٹکا ہوا ہے۔ ور دایاں ہاتھ اس طرح اٹھا رکھا ہے کہ ہاتھ کی ایک انگلی (شہادت کی انگلی) اوپر آسمان کی طرف شارہ کر رہی ہے۔

مولانا ممتاز صاحب نے بتایا کہ ایک بار میں اپنے ایک ہندو واقف کار کے ساتھ اس سڑک سے گزر رہا تھا۔ ہم لوگ اس اسٹیچو کے سامنے پہنچے تو ہندو ساتھی نے کہا: ایک انگلی آسمان کی طرف ٹھاکر لالہ جی کیا کہہ رہے ہیں۔ مولانا ممتاز صاحب نے جواب دیا: وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ ایک ہے۔ ندو ساتھی نے یہ سنا تو ہنس کر بولا کہ یہاں بھی تم نے اپنے دھرم کی تبلیغ شروع کر دی۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر اگر دعوتی ذہن ہو تو کس طرح ہ ہر موقع پر اپنی بات کہنے کے مواقع پا سکتا ہے۔

یہاں ایک مسلم خاتون (عائشہ) نے مخصوص حالات میں ایک ہندو ڈاکٹر کیدار ناتھ سے شادی ی۔ چند سال پہلے ہندو ڈاکٹر کا انتقال ہو گیا۔ اپریل ۱۹۹۴ میں تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں کورہ مسلم خاتون کا انتقال ہو گیا۔ مرتے وقت خاتون نے وصیت کی کہ مجھ کو جلایا نہ جائے بلکہ مسلم ریقہ پر مجھ کو قبرستان میں دفن کیا جائے۔ خاتون کے داماد نے ایسا ہی کیا۔

مولانا ممتاز احمد قاسمی نے خاتون کے ہندو داماد سے کہا کہ "آپ سوچئے کہ وہ عورت س نے اپنی پوری زندگی آپ لوگوں کے ساتھ ہندو فیملی میں گزاری، پھر وہ کون سی طاقت تھی و موت کے وقت اس سے یہ کہلوا رہی تھی کہ مجھ کو دفنایا جائے، مجھ کو جلایا نہ جائے"۔

یہ سن کر مذکورہ ہندو گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے مولانا ممتاز صاحب سے کہا کہ مجھ و اسلامی لٹریچر دیجئے۔ میں اس کا مطالعہ کروں گا تاکہ اسلام کے بارہ میں واقفیت حاصل کروں۔

۔ جولائی کی صبح کو ہم لوگ شملہ کی جامع مسجد دیکھنے کے لئے نکلے۔ مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے ساڑھے نو بجے ہم لوگ ایک گلی میں پہنچے جہاں ایک دروازہ پر "جامع مسجد" کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوئے تو بہت سے کشمیری مزدور بیٹھے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے لئے مسجد گویا مفت جائے ہے۔ مسجد کے ذمہ دار بھی اس کو گوارا کئے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ اس طرح مسجد آباد رہتی ہے۔

اگر کشمیری مزدور یہاں نہ ہوں تو مسجد میں سناٹا نظر آئے۔

جامع مسجد کے امام مولانا محمد عالم ندوی ہیں۔ مولانا ندوی الرسالہ پڑھتے ہیں۔ ان سے دیر تک الرسالہ مشن کے بارہ میں بات ہوتی۔ انھیں کچھ شکوک تھے۔ خدا کے فضل سے گفتگو کے بعد ان کے شکوک رفع ہو گئے۔

جامع مسجد کے دروازہ پر گھڑی کی ایک دکان نظر آئی۔ یہ محمد لیسین کشمیری کی دکان تھی۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنے وطن واپس جانا چاہتا ہوں۔ مگر غالباً حالات کی بنا پر ابھی تک اس کا فیصلہ نہ کر سکے۔

چنڈی گڑھ کے انگریزی اخبار ٹریبون (The Tribune) کے شمارہ ۷ جولائی میں ایک مضمون تھا اس کا عنوان تھا:

Privitisation is no panacea

اس میں بتایا گیا تھا کہ انڈیا میں اس وقت پبلک سکٹر کے ۲۴۶ یونٹ ہیں۔ ان میں حکومت سے ۱۵۰ ہزار (150,000) کروڑ روپیہ لگایا ہے۔ مضمون میں پبلک سکٹر کی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا گیا تھا:

If the public sector failed in India, it was because of the command system imposed on it by politicians and the bureaucracy in their frantic search for power.

انٹلکچول کس طرح لوگوں کی سوچ کو بگاڑتا ہے اس کی یہ ایک مثال ہے۔ یہ مضمون پبلک سکٹر کو باقی رکھنے کی حمایت میں لکھا گیا ہے۔

روزگار میں لگی ہوئی خواتین کی سب سے بڑی تعداد پبلک سکٹر میں ہے۔ اس طرح کے اور بھی بعض طبقات ہیں جن کا مفاد پبلک سکٹر کو باقی رکھنے میں ہے۔ اس لئے پبلک سکٹر کی حمایت میں برابر مضامین چھپوائے جا رہے ہیں۔ مذکورہ اقتباس میں ذہن کو خراب کیا گیا ہے۔ پبلک سکٹر کی ناکامی کا سبب اقتصادی عمل سے محرک (incentive) کو ختم کر دینا ہے۔ مگر غیر متعلق طور پر اس کا ایک اور سبب نکال کر اس پر مضمون لکھا جا رہا ہے۔

۷ جولائی کی دوپہر کو شملہ سے واپسی ہوئی۔ شملہ سے کالکا تک کا سفر بذریعہ کار طے کرنا تھا۔ میں اور ڈاکٹر چارمی ایک گاڑی میں روانہ ہوئے۔ راستہ میں کچھ دیر کے لئے ہوٹل پائیں وڈ

(Hotel Pinewood) میں ٹھہرے۔ یہ ایک خوبصورت ہوٹل ہے جو پہاڑی کے دامن میں بنایا گیا ہے۔

راستہ میں ڈاکٹر چاری نے کئی سبق آموز باتیں بتائیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے چلیپور میں انگریز کلکٹر ہوا کرتا تھا۔ ایک بار شیعہ لوگوں نے آکر کلکٹر سے کہا کہ جس راستہ سے ہمارا تعزیہ گزرنے والا ہے وہاں ایک درخت کی شاخ سڑک کے اوپر آگئی ہے۔ ہم تعزیہ کی اونچائی کم نہیں کر سکتے۔ انگریز کلکٹر نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ ہم اس کو کٹوا دیتے ہیں۔ کلکٹر کے آدمیوں نے دیکھ کر کلکٹر صاحب سے کہا کہ یہ درخت تو پیپل کا درخت ہے۔ اس کی شاخ کاٹی جائے گی تو ہندو لوگ بگڑ جائیں گے۔ اب کلکٹر کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ آخر میں ایک تحصیلدار نے کہا کہ میری سمجھ میں ایک تدبیر آتی ہے۔ میں اس کو استعمال کرتا ہوں۔

تحصیل دار نے ایک ہاتھی والے کو پکڑا اور اس سے کہا کہ تم اس مسئلہ کو حل کرو۔ ہاتھی والے نے اپنا ہاتھی اس سڑک پر چلایا۔ ہاتھی درختوں کی پتیاں اور شاخیں توڑتا ہوا مذکورہ پیپل تک پہنچا۔ یہاں ہاتھی والے نے اپنے ہاتھی کو کچھ دیر روکا۔ ہاتھی نے اپنی سونڈ ادھر ادھر گھمائی۔ آخر کار اس نے مذکورہ شاخ توڑ کر گرادی۔ ہاتھی چوں کہ ہندوؤں کی نظر میں گنیش دیوتا کا روپ مانا جاتا ہے۔ اس لئے وہ ہاتھی کے عمل پر غصہ نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ شاخ راستہ سے ہٹ گئی۔ اور تعزیہ آسانی کے ساتھ اس سے گزر گیا۔ یہ سطریں واپسی میں ہوٹل پائن وڈ کے کمرہ نمبر ۱۰۳ میں بیٹھ کر لکھی گئیں۔

مسٹر چاری (سابق کلکٹر) نے کہا کہ مدھیہ پردیش میں ان کے چیف سکریٹری مسٹر ادتار تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ضلع کلکٹر کے پاس کسی معاملہ سے نپٹنے کے لئے اتنے زیادہ ذرائع ہوتے ہیں کہ فورس کا استعمال اس کے لئے ناکامی کے ہم معنی ہے:

Use of force means his failure.

میں اضافہ کروں گا کہ ہر آدمی کے پاس خدا کے دئے ہوئے اتنے زیادہ ذرائع ہیں کہ اس کے لئے طاقت کا استعمال اس کی ناکامی کا ثبوت ہے۔ آدمی کی عقل بے حساب طاقتوں کا خزانہ ہے۔ یہ کلکٹر کی پولیس فورس سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ معاملہ پیش آنے کی صورت میں آدمی اگر حواس باختہ

نہ ہو، اور وہ اپنی عقل کو صحیح طور پر استعمال کرسے تو وہ ہر چیز پر قابو پا سکتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی آدمی اپنی عقل کو کام میں لانے کے بجائے اپنے ہاتھ میں پتھر اٹھاتا ہے یا اپنے ہاتھ میں گن سنبھالتا ہے تو یہ اس کی ہار کی بات ہے نہ کہ جیت کی بات۔

شملہ سے کالکا تک کا سفر بذریعہ کار طے ہوا۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا، میں کار سک (car sick) ہوں چنانچہ مجھ کو دوبارہ چکر آنے لگا۔ اس کے بعد میں نے مسٹر چاری کو آگے کی سیٹ پر بٹھا دیا اور پیچھے کی سیٹ پر لیٹ گیا۔ لیٹنے کی وجہ سے بقیہ راستہ میں کافی سکون رہا۔

کالکا سے دوبارہ ہمالین کوئن کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ میری طبیعت چوں کہ ٹھیک نہیں تھی، اس لئے منتظمین نے ایک کیبن تنہا مجھ کو دیدیا۔ یہاں بھی دوبارہ لیٹے لیٹے سارا راستہ طے ہوا۔ ۷ جولائی ۱۹۹۴ کی رات کو گیارہ بجے ہم لوگ نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔

میں دہلی سے شملہ گیا، اور شملہ سے دوبارہ واپس آیا۔ اوپر کی سطریں اسی سفر کی مختصر روداد ہیں۔ یہ ایک جسمانی سفر تھا۔ اس طرح ہر آدمی ذہنی سفر کرتا رہتا ہے۔ بعض اوقات ذہنی سفر کی اہمیت جسمانی سفر سے زیادہ ہوتی ہے۔ مگر شاید ذہنی سفر کی روداد کو انسانی زبان میں قلم بند کرنا ممکن نہیں۔ ذہنی سفر کی روداد کو الفاظ کی صورت دینے کے لئے، ہمیں اگلے مرحلۂ حیات کا انتظار کرنا چاہئے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِتعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 90	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs. 170	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs. 250	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs. 400	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18

अल-रिसाला (الرسالہ ہندی)

الرسالہ فورم بھوپال کی جانب سے جلد الرسالہ ہندی کی اشاعت شروع ہوگئی ہے۔ پہلا شمارہ "یکساں سول کوڈ" نمبر ہے۔ جو حضرات الرسالہ ہندی جاری کروانا چاہیں وہ مندرجہ ذیل پتہ پر رابطہ قائم کریں:

The Manager, Al-Risala (Hindi)
C/o Cosmos Commercial Agency, Iqtadar Manzil,
Moti Masjid Square Kamla Park Road Bhopal-462001 M.P. Tel. 530928

معاون مدیر کی ضرورت

الرسالہ اردو کے لیے ایک معاون مدیر کی ضرورت ہے۔ امیدوار کو اردو زبان پر اچھی دسترس ہونا چاہیے۔ اسی کے ساتھ اس کے اندر عربی اور انگریزی کی بھی بقدرِ ضرورت صلاحیت موجود ہو۔ امیدوار کے اندر محنت اور لگن کی صفت ہونا ضروری ہے۔ امیدوار حضرات ضروری تفصیل کے ساتھ اپنی درخواستیں روانہ فرمائیں۔

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013 Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333

خصوصی اعلان

دفتر میں ماہنامہ الرسالہ کے پرانے متفرق شمارے (اردو اور انگلش دونوں زبانوں میں) بڑی تعداد میں جمع ہوگئے ہیں، جس کو افادۂ عام کی غرض سے نہایت ارزاں قیمت پر فراہم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ایک شمارہ کی قیمت ۲ روپے ہوگی۔ جبکہ ۱۰۰ یا اس سے زائد شمارے منگوانے کی صورت میں مزید ایک روپے کی تخفیف کردی جائے گی۔ یعنی ۱۰۰ روپے میں ۱۰۰ شمارے۔ نیز ڈاک خرچ بھی مکتبہ کے ذمہ ہوگا۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ بطورِ خود اور مقامی اصحابِ خیر کو ترغیب دے کر اس پروگرام میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔ تاکہ الرسالہ کے دعوتی اور تعمیری مشن سے وہ لوگ بھی آشنا ہو جائیں جو اب تک کسی وجہ سے آشنا نہ ہو سکے۔ (منیجر ماہنامہ الرسالہ)

جون ۱۹۹۷ شمارہ ۲۴۷

ایّھا الانسان

قرآن کا پیغام انسانیت کے نام

مولانا وحید الدّین خاں

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic.@axcess.net.in.

فہرست

اصل کوتاہی

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں ارشاد ہوا ہے ------ اے لوگو، اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ تاکہ تم دوزخ سے بچ جاؤ۔ وہ ذات جس نے زمین کو تمہارے لیے بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت بنایا۔ اور اتارا آسمان سے پانی اور اس سے پیدا کیے پھل، تمہاری غذا کے لیے۔ پس تم کسی کو اللہ کے برابر نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم جانتے ہو (البقرہ ۲۲-۲۱)

انسان اور انسان کے سوا جو کچھ زمین و آسمان میں ہے سب کا پیدا کرنے والا صرف خدا ہے۔ اس نے پوری کائنات کو نہایت حکمت کے ساتھ قائم کیا ہے۔ وہ ہر آن ان کی نگہبانی کر رہا ہے۔ اس لیے انسان کے لیے صحیح رویہ صرف یہ ہے کہ وہ خدا کو بغیر کسی شرکت کے خالق، مالک اور رازق تسلیم کرلے، وہ اس کو اپنا سب کچھ بنالے۔

مگر خدا چونکہ نظر نہیں آتا اس لیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی نظر آنے والی چیز کو اہم سمجھ کر اس کو خدائی مقام پر بٹھالیتا ہے۔ وہ ایک مخلوق کو جزئی یا کلی طور پر خالق کے برابر ٹھہرالیتا ہے۔ کبھی اس کو خدا کا نام دے کر اور کبھی خدا کا نام دیے بغیر۔

یہی انسان کی اصل کوتاہی ہے۔ پیغمبر کی دعوت یہ ہوتی ہے کہ آدمی صرف ایک خدا کو بڑائی کا مقام دے۔ اس کے علاوہ جس جس کو اس نے خدائی عظمت کے مقام پر بٹھا رکھا ہے اس کو عظمت کے مقام سے اتار دے۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنے آپ پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس کو ہر لمحہ مختلف چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جس کے سہارے وہ زمین پر اپنا وجود قائم رکھ سکے۔ انسان کو ایک ایسی زمین چاہیے جس کے اندر کشش ہو تاکہ وہ اس کے اوپر ٹھہر سکے۔ انسان کو ایک ایسی فضا چاہیے جس میں ہر لمحہ اس کے لیے آکسیجن کی سپلائی کا انتظام ہو۔ اس کو ایک ایسا سورج چاہیے جو مسلسل اس کو روشنی اور حرارت پہنچا رہا ہو۔ اس کی یہ ضرورت ہے کہ اس کی دنیا میں پانی کی نہایت وافر مقدار موجود ہو کیوں کہ پانی کے بغیر کسی قسم کی زندگی ممکن نہیں۔ اس کو مختلف قسم کی غذا درکار ہے جو اس کو مسلسل طاقت دیتی رہے۔

اس طرح کی بے شمار چیزیں خدا نے دنیا میں بھرپور مقدار میں فراہم کر دی ہیں۔ یہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ انسان صرف ایک خدا کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔

کائنات کی گواہی

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں ارشاد ہوا ہے کہ --- بے شک آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں اور رات اور دن کے آنے اور جانے میں، اور ان کشتیوں میں جو انسانوں کے کام آنے والی چیزیں لے کر سمندر میں چلتی ہیں۔ اور اس پانی میں جس کو اللہ نے آسمان سے اتارا، پھر اس سے مردہ زمین کو زندگی بخشی۔ اور اس سے زمین میں سب قسم کے جانور پھیلا دیے۔ اور ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان حکم کے تابع ہیں۔ ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں (البقرہ ۱۶۳-۱۶۴)

ہمارے سامنے پھیلی ہوئی کائنات اللہ کا ایک عظیم الشان تعارف ہے۔ زمین و آسمان کی صورت میں ایک اتھاہ کارخانہ کا موجود ہونا ظاہر کرتا ہے کہ ضرور اس کا کوئی بنانے والا ہے۔ طرح طرح کے ظاہری اختلاف اور تضاد کے باوجود تمام چیزوں کا حد درجہ ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنا ثابت کرتا ہے کہ اس کا خالق و مالک صرف ایک ہے۔ کائنات کی چیزوں میں نفع بخشی کی صلاحیت ہونا گویا اس بات کا اعلان ہے کہ اس کی منصوبہ بندی کامل شعور کے تحت بالارادہ کی گئی ہے۔

بے جان چیزوں میں قدرتی عمل سے جان اور تازگی کا آجانا بتاتا ہے کہ کائنات میں موت محض عارضی ہے۔ یہاں ہر موت کے بعد لازماً دوسری زندگی آتی ہے۔ ایک ہی پانی اور ایک ہی خوراک سے قسم قسم کے جانداروں کا ان گنت تعداد میں پایا جانا اللہ کی بے حساب قدرت کا پتا دیتا ہے۔ ہوا کا مکمل طور پر انسان کو اپنے گھیرے میں لیے رہنا بتاتا ہے کہ انسان پوری طرح اپنے خالق کے قبضے میں ہے۔ کائنات کی تمام چیزوں کا انسانی ضرورت کے تحت سدھا ہوا ہونا ثابت کرتا ہے کہ انسان کا خالق ایک بے حد مہربان ہستی ہے۔ وہ اس کی ضروریات کا اہتمام اس وقت سے کر رہا ہوتا ہے جب کہ اس کا وجود بھی نہیں ہوتا۔

انسان کا خدا ایک ہی خدا ہے۔ وہی اس قابل ہے کہ وہ انسان کی توجہات کا مرکز بنے۔ ہمارا وجود اور وہ سب کچھ جو ہم کو زمین پر حاصل ہے اس لیے ہے کہ ہمارا یہ خدا رحمتوں کا خزانہ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اس کو حقیقی معنوں میں اپنا معبود بنائے اور اپنی تمام امیدوں اور تمناؤں کو ہمیشہ کے لیے اسی کے ساتھ وابستہ کر دے۔

عقل والے

قرآن کی سورہ نمبر۳ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، اور رات دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں۔ جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر خدا کو یاد کرتے ہیں۔ اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں۔ وہ کہہ اٹھتے ہیں اے ہمارے رب تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے۔ پس ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب تو نے جس کو آگ میں ڈالا اس کو تو نے واقعی رسوا کر دیا۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک خاموش اعلان ہے۔ آدمی جب اپنے کان اور آنکھ سے مصنوعی پردوں کو ہٹاتا ہے۔ تو وہ اس خاموش اعلان کو سننے لگتا ہے۔ اس کو ناممکن نظر آتا ہے کہ ایک ایسی کائنات جس کے ستارے اور سیارے کھربوں سال تک بھی ختم نہیں ہوتے وہاں انسان اپنی تمام تمناؤں کو لیے ہوئے محدود مدت میں ختم ہو جائے۔ ایک ایسی دنیا جہاں درختوں کا حسن اور پھولوں کی لطافت ہے۔ جہاں ہوا، اور پانی اور سورج جیسی بے شمار بامعنیٰ چیزوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ وہاں انسان کے لیے غم کے سوا کوئی انجام نہ ہو۔ پھر یہ بھی اس کو ناممکن نظر آتا ہے کہ ایک ایسی دنیا جہاں یہ انتھاہ امکان رکھا گیا ہے کہ یہاں ایک چھوٹا سا بیج زمین میں ڈالا جائے تو اس کے اندر سے ہرے بھرے درخت کی ایک پوری کائنات نکل آئے وہاں آدمی نیکی کی زندگی اختیار کر کے بھی اس کا کوئی پھل نہ پاتا ہو۔ ایک ایسی دنیا جہاں ہر روز تاریک رات کے بعد روشن دن آتا ہے، وہاں صدیاں گزر جائیں اور عدل و انصاف کا اجالا اپنی چمک نہ دکھائے۔ ایک ایسی دنیا جس کی گود میں زلزلے اور طوفان سو رہے ہیں، وہاں انسان ظلم پر ظلم کرتا رہے، مگر کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ ہو۔

جو لوگ گہرائیوں میں اتر کر سوچتے ہیں۔ ان کے لیے ناقابل یقین ہو جاتا ہے کہ ایک بامعنیٰ کائنات بے معنیٰ انجام پر ختم ہو جائے۔ وہ حق کے داعی کو اس یقین کے ساتھ مان لیتے ہیں کہ اس کا پیغام نطق کی زبان میں عین اس بات کا اعلان ہے جو خاموش زبان میں پوری کائنات میں نشر ہو رہا ہے۔

قیامت میں

قرآن کی سورہ نمبر۶ میں ارشاد ہوا ہے ـــــ اے جنوں اور انسانوں کے گروہ کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر نہیں آئے جو تم کو میری آیتیں سناتے اور تم کو اس دن کے پیش آنے سے ڈراتے تھے۔ وہ کہیں گے ہم خود اپنے خلاف گواہ ہیں۔ اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکہ میں رکھا۔ اور وہ اپنے خلاف خود گواہی دیں گے کہ بے شک ہم منکر تھے۔ یہ اس وجہ سے کہ تمہارا رب بستیوں کو ان کے ظلم پر اس حال میں ہلاک کرنے والا نہیں کہ وہاں کے لوگ بے خبر ہوں (الانعام ۱۳۲-۱۳۱)

شیطان جب آدمی کو خوشنما ترغیبات کے ذریعہ اپنی طرف لے جاتا ہے تو وہ اپنے اس چیلنج کو صحیح ثابت کرنا چاہتا ہے جو اس نے آغاز تخلیق میں خدا کو دیا تھا کہ میں تیری مخلوق کے بڑے حصہ کو اپنا ہمنوا بنالوں گا (بنی اسرائیل ۶۱) اسی طرح جو لوگ اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کرتے ہیں ان کے سامنے بھی واضح مفادات ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ جنوں کے نام پر اپنے سحر کے کاروبار کو فروغ دیتے ہیں۔ یا اپنی شاعری اور کہانت کا رشتہ کسی جنّی استاد سے جوڑ کر عوام کے اوپر اپنی برتری قائم کرتے ہیں۔

قیامت میں جب حقیقتوں سے پردہ اٹھایا جائے گا تو یہ بات کھل جائے گی کہ جو لوگ بے راہ ہوئے یا جنھوں نے دوسروں کو بے راہ کیا انھوں نے کسی غلط فہمی کی بنا پر ایسا نہیں کیا۔ اس کی وجہ حق کو نظر انداز کرنا تھا نہ کہ حق سے بے خبر رہنا۔ وہ دنیوی رونقوں سے اوپر نہ اٹھ سکے۔ وہ وقتی فائدوں کو قربان نہ کر سکے۔ ورنہ خدا نے اپنے خاص بندوں کے ذریعہ جو ہدایت کھولی تھی وہ اتنی واضح تھی کہ کوئی شخص حقیقت حال سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر ان کی دنیا پرستی ان کی آنکھوں کا پردہ بن گئی۔ جاننے کے باوجود انھوں نے نہ جانا۔ سننے کے باوجود انھوں نے نہ سنا۔

آخرت میں وہ مصنوعی سہارے ان سے چھن جائیں گے جن کے بل پر وہ حقیقت سے بے پروا بنے ہوئے تھے۔ اس وقت ان کو نظر آجائے گا کہ کس طرح ایسا ہوا کہ حق ان کے سامنے آیا مگر انھوں نے جھوٹے الفاظ بول کر اس کو رد کر دیا۔ کس طرح ان کی غلطی ان پر واضح کی گئی۔ مگر خوب صورت تاویل کر کے انھوں نے سمجھا کہ اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے میں وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔

خدا کے یہاں بھول کی معافی ہے مگر خدا کے یہاں سرکشی کی کوئی معافی نہیں۔

انسان کی جانچ

قرآن کی سورہ نمبر، میں ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ (اے لوگو) ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر ہم نے تمھاری صورت بنائی، پھر فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ پس انھوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ خدا نے کہا کہ تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا۔ ابلیس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھ کو آگ سے بنایا ہے اور آدم کو مٹی سے۔ خدا نے کہا کہ تو اتر یہاں سے۔ تجھے یہ حق نہیں کہ تو اس میں گھمنڈ کرے پس نکل جا، یقیناً تو ذلیل ہے۔ ابلیس نے کہا کہ اس دن تک کے لیے تو مجھ کو مہلت دے جب کہ سب لوگ اٹھائے جائیں گے۔ خدا نے کہا کہ تجھ کو مہلت دی گئی۔ ابلیس نے کہا کہ چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، میں بھی لوگوں کے لیے تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا، پھر ان پر آؤں گا، ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے۔ اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے۔ اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائے گا۔ خدا نے کہا نکل یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ جو کوئی ان میں سے تیری راہ پر چلے گا تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا (الاعراف ۱۱ ـ ۱۸)

امتحان کی اس دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ کبھی کوئی شخص دولت و عزت میں دوسرے سے زیادہ حصہ پالیتا ہے۔ کبھی دو آدمیوں کے درمیان ایسا معاملہ پڑتا ہے کہ ایک شخص کے لیے دوسرے کو اس کا جائز حق دینا اپنے کو نیچے گرانا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کسی شخص کی زبان سے خدا ایک سچائی کا اعلان کراتا ہے اور وہ ان لوگوں کو اپنے سے برتر دکھائی دینے لگتا ہے جو اس سچائی تک پہنچنے میں ناکام رہے تھے۔ ایسے مواقع پر شیطان آدمی کے اندر حسد اور گھمنڈ کی نفسیات جگا دیتا ہے۔ "میں بہتر ہوں" کے جذبے سے مغلوب ہو کر وہ اپنے بھائی کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہی خدا کی نظر میں شیطان کے راستے پر چلنا ہے۔ جس شخص نے ایسے مواقع پر حسد اور گھمنڈ کا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے گویا کہ شیطان کی پیروی کی۔ اور جس نے ایسے مواقع پر شیطان کے پیدا کیے ہوئے جذبات کو اپنے اندر کچل ڈالا۔ اس نے صراطِ مستقیم کو پکڑ لیا جو اسے جنت تک پہنچا دے۔

روحانی لباس

قرآن کی سورہ نمبر ۷ میں ارشاد ہوا ہے —— اے بنی آدم، ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمہارے بدن کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور زینت بھی۔ اور تقویٰ کا لباس اس سے بھی بہتر ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ لوگ غور کریں۔ اے آدم کی اولاد، شیطان تم کو بہکا نہ دے جس طرح اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوا دیا، اس نے ان کے لباس اتروائے تاکہ ان کو ان کے سامنے بے پردہ کر دے۔ وہ اور اس کے ساتھی تم کو ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں، جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھتے۔ ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا دوست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے (الاعراف ۲۷ ـ ۲۶)

ظاہری لباس کی طرح انسان کو ایک اندرونی لباس بھی درکار ہے۔ یہ تقویٰ کا لباس ہے۔ تقویٰ کا لباس کیا ہے۔ یہ ہے —— اللہ کا خوف، حق کا اعتراف، اپنے لیے اور دوسروں کے لیے صرف ایک معیار رکھنا، اپنے کو بندہ سمجھنا۔ تواضع کو اپنا شعار بنانا، دنیا میں گم ہونے کے بجائے آخرت کی طرف متوجہ رہنا۔ آدمی جب ان چیزوں کو اپنائے تو گویا کہ وہ اپنے اندرونی وجود کو لباس پہناتا ہے اور اگر وہ اس کے خلاف رویہ اختیار کرے تو وہ اپنے اندرون کو ننگا کر دیتا ہے۔ ظاہری جسم کو کپڑے کا بنا ہوا لباس ڈھانکتا ہے اور باطنی جسم کو تقویٰ کا لباس۔

شیطان آدمی کو بہکاتا ہے۔ وہ خدا کے ممنوعہ درخت کو ہر قسم کے خیر کا سرچشمہ بتاتا ہے۔ وہ ایسے معصوم راستوں سے اس کی طرف آتا ہے کہ آدمی کا گمان بھی نہیں جاتا کہ ادھر سے اس کی طرف گمراہی آرہی ہوگی۔ شیطان آدمی کے نازک مقامات سے اس پر حملہ کرتا ہے۔ کبھی ایک بے حقیقت نظریہ کو خوبصورت الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ کبھی ایک جزئی حقیقت کو کلی حقیقت کے روپ میں اس کے سامنے لاتا ہے۔ کبھی معمولی چیزوں میں فوائد کا خزانہ بتا کر سارے لوگوں کو اس کی طرف دوڑا دیتا ہے۔ کبھی ایک بے فائدہ حرکت میں ترقی کا راز بتاتا ہے۔ کبھی ایک تخریبی عمل کو تعمیر کے روپ میں پیش کرتا ہے۔

شیطان ان لوگوں پر کامیاب ہوتا ہے جو خدا کی نشانیوں پر غور نہیں کرتے۔ جو دلائل کی زبان میں بات کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ جنھیں اپنے ذاتی رجحانات کے مقابلہ میں حق کے تقاضے کو ترجیح دینا گوارا نہیں ہوتا۔ جن کو ایسی سچائی، سچائی نظر نہیں آتی جس میں ان کے فائدوں اور مصلحتوں کی رعایت شامل نہ ہو۔

آنے والا وقت

قرآن کی سورہ نمبر ۷ میں ارشاد ہوا ہے —— اور ہر قوم کے لیے ایک مقررہ مدت ہے۔ پھر جب ان کی مدت آجائے گی تو وہ نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ اے بنی آدم، اگر تمہارے پاس تمہیں میں سے رسول آئیں جو تم کو میری آیات سنائیں تو جو شخص ڈرا اور جس نے اصلاح کر لی ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو لوگ میری آیات کو جھٹلائیں اور ان سے تکبر کریں وہی لوگ دوزخ والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر بہتان باندھے یا اس کی نشانیوں کو جھٹلائے۔ ان کے نصیب کا جو حصہ لکھا ہوا ہے وہ انھیں مل کر رہے گا۔ یہاں تک کہ جب ہمارے بھیجے ہوئے ان کی جان لینے کے لیے ان کے پاس پہنچیں گے تو ان سے پوچھیں گے کہ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے تھے کہاں ہیں۔ وہ کہیں گے کہ وہ سب ہم سے کھوئے گئے اور وہ اپنے اوپر اقرار کریں گے کہ بیشک وہ انکار کرنے والے تھے (الاعراف ۳۴-۳۷)

انسان کے لیے جنت یا دوزخ کا فیصلہ اس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ اس کے سامنے جب حق آیا تو اس نے اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ جب بھی کوئی حق ایسے دلائل کے ساتھ سامنے آجائے جس کی صداقت پر آدمی کی عقل گواہی دے رہی ہو تو اس کے اوپر گویا خدا کی حجت پوری ہو گئی۔ اس کے بعد بھی اگر وہ اس حق کو ماننے سے انکار کرتا ہے تو وہ یقیناً کبر کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے۔ اپنے آپ کو بڑا رکھنے کی نفسیات اس کے لیے رکاوٹ بن گئی کہ وہ حق کو بڑا بنا کر اس کے مقابلہ میں اپنے کو چھوٹا بنانے پر راضی کرلے۔ ایسے آدمی کے لیے خدا کے یہاں جہنم کے سوا کوئی انجام نہیں۔

انسان جب بھی حق کا انکار کرتا ہے تو وہ کسی اعتماد کے اوپر کرتا ہے۔ کسی کو دولت و اقتدار کا اعتماد ہوتا ہے۔ کوئی اپنی عزت و مقبولیت پر بھروسہ کیے ہوئے ہوتا ہے۔ مگر یہ انسان کی بہت بڑی بھول ہے۔ وہ آزمائش کی چیزوں کو اعتماد کی چیز سمجھے ہوئے ہے۔ قیامت کے دن جب یہ بے بنیاد سہارے اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے تو اس وقت اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ ہوگا کہ وہ محض سرکشی کی بنا پر حق کا انکار کرتا رہا۔ اگرچہ اپنے انکار کو جائز ثابت کرنے کے لیے وہ بہت سے اصولی الفاظ بولتا تھا۔

اصلاحی رویہ

قرآن کی سورہ نمبر ۷ میں ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ تم لوگ زمین کی اصلاح کے بعد اس میں بادبرپا نہ کرو (الاعراف ۵۶)

زمین کی اصلاح سے مراد اللہ کا وہ نظام ہے جو انسان کے سوا بقیہ دنیا میں قائم ہے۔ انسان خدا کے اس قائم کردہ نظام سے مطابقت کرکے رہنا ہے۔ اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس کے لاف روش اختیار کرے۔

زمین کو خدا نے خاموش عمل کی دنیا بنایا ہے۔ اس لیے یہاں شور وغل نہ مچاؤ۔ یہاں خدا نے صاف ہوا میں سانس لینے کا انتظام کیا ہے تم اپنی کثافت سے خدا کی ہوا کو خراب نہ کرو۔ نباتات اور حیوانات اپنے اپنے دائرہ میں کام کرتے ہیں، تم بھی اپنے دائرہ میں کام کرو، دوسرے کے دائرہ میں مداخلت نہ کرو۔ یہاں سارا کام حقیقت پسندانہ منصوبہ بندی کے تحت ہو رہا ہے، تم بھی ایسا ہی کرو اور جذباتیت یا جلد بازی کا رویہ نہ اختیار کرو۔

اس دنیا کی تمام چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی کرکے اپنا اپنا کام کر رہی ہیں تم بھی دوسروں سے ہم آہنگی کرکے زمین پر زندگی گزارو۔ اس دنیا میں ہر چیز دوسرے کے لیے نفع بخش بنی ہوئی ہے۔ تم بھی اپنے دوسرے بھائیوں کے لیے نفع بخشی کی حد تک خیر خواہ بن جاؤ۔

زمین کی اصلاح خدا کی طرف سے ہو چکی ہے۔ انسان کو اس کی اصلاح نہیں کرنا ہے۔ انسان کو صرف اس اصلاحی نقشہ کی پیروی کرنا ہے۔ اصلاح شدہ زمین کی طرح اس کو بھی اپنے معاشرہ کو اصلاح یافتہ بنالینا ہے۔

خدا کی زمین پر انسان کے لیے دو ممکن رویے ہیں ـــ اصلاحی رویہ اور مفسدانہ رویہ۔ اصلاحی رویہ یہ ہے کہ انسان شعوری طور پر اس درست نظام کی پیروی کرے جس کی پیروی بقیہ کائنات غیر شعوری طور پر کر رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں مفسدانہ رویہ یہ ہے کہ آدمی کائناتی نظام سے منحرف ہو جائے۔ وہ کائنات میں خدا کے قائم کردہ نظام اصلاح کو چھوڑ کر کوئی خود ساختہ رویہ اختیار کرلے۔ خدا کی اصلاح یافتہ زمین انسانی رہائش کے لیے بہترین جگہ بھی ہے اور اسی کے ساتھ انسانی عمل کے لیے بہترین نمونہ بھی۔

خدائی آواز

قرآن کی سورہ نمبر ۷ میں ارشاد ہوا ہے ------ اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا ہاں، ہم اقرار کرتے ہیں۔ یہ اس لیے ہوا کہ کہیں تم قیامت کے دن کہنے لگو کہ ہم کو تو اس کی خبر نہ تھی۔ یا کہو کہ ہمارے باپ دادا نے پہلے شرک کیا تھا اور ہم ان کے بعد ان کی نسل میں ہوئے۔ تو کیا تو ہم کو اس کام پر ہلاک کرے گا جو غلط کار لوگوں نے کیا، اور اس طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کر بیان کرتے ہیں تاکہ وہ رجوع کریں (الاعراف ۱۷۲-۱۷۴)

یہ اس معاملہ کا ذکر ہے جب کہ انسان کی فطرت میں خالق و مالک کا شعور اس طرح داخل کر دیا گیا کہ وہ اس سے جدا نہ ہو سکے۔ موجودہ زمانہ میں ایک اعتبار سے روس اور دوسرے اعتبار سے ترکی کا تجربہ بتاتا ہے کہ مکمل طور پر مخالف مذہب ماحول میں بھی انسان کی فطرت نہیں بدلتی۔

جانوروں میں جو چیز جبلّت کی صورت میں ہے وہی چیز انسان کے اندر فطرت کی صورت میں ہے۔ مگر جانور مجبور ہیں، جب کہ انسان مجبور نہیں۔ جانور کے برعکس انسان کا حال یہ ہے کہ شعور فطرت کی حد تک ہونے کے باوجود عمل کے معاملہ میں وہ پوری طرح آزاد ہے۔ جب بھی کوئی بات سامنے آتی ہے تو اس کی عقل اور اس کا ضمیر اندر سے اشارہ کرتے ہیں کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ مگر اس کے باوجود انسان کو اختیار ہے کہ وہ چاہے اپنی اندرونی آواز کی پیروی کرے چاہے اس کو نظر انداز کر کے من مانی کارروائی کرنے لگے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کا امتحان ہو رہا ہے اور اسی پر جنت اور جہنم کا فیصلہ ہونا ہے۔ جو شخص خدائی آواز پر کان لگائے اور وہی کرے جو خدا فطرت کی خاموش زبان میں اس سے کہہ رہا ہے وہ امتحان میں پورا اترا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔ فطرت کی یہ آواز ہر آدمی کے اوپر خدا کی دلیل ہے۔ اب کسی کے پاس نہ تو بے خبری کا عذر ہے اور نہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ماضی سے جو ہوتا چلا آرہا ہے وہی ہم بھی کرنے لگے۔ جب انسان پیدائش ہی سے خدا کا شعور لے کر آتا ہے اور ماحول کے علی الرغم اس کو ہمیشہ باقی رکھتا ہے تو اب کسی شخص کے پاس بے راہ ہونے کا کیا عذر ہے۔

خدا کی نعمتیں

قرآن کی سورہ نمبر۱۴ میں ارشاد ہوا ہے —— اللہ وہ ہے جس نے آسمان اور زمین بنائے اور آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس سے مختلف پھل نکالے تمہاری روزی کے لیے۔ اور کشتی کو تمہارے لیے مسخر کر دیا کہ سمندر میں اسی کے حکم سے چلے۔ اور اس نے دریاؤں کو تمہارے لیے مسخر کیا۔ اور اس نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کر دیا کہ برابر چلے جا رہے ہیں۔ اور اس نے رات اور دن کو تمہارے لیے مسخر کر دیا اور اس نے تم کو ہر چیز میں سے دیا جو تم نے مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو تم گن نہیں سکتے۔ بیشک انسان بہت بے انصاف اور بڑا ناشکرا ہے (ابراہیم ۳۴-۳۲)

موجودہ دنیا انتہائی حیرت ناک حد تک خدا کی گواہی دے رہی ہے۔ وسیع خلا میں ستاروں اور سیاروں کی گردش، پانی کے ذریعہ زمین پر زندگی اور رزق کی فراہمی، خشکی اور تری اور فضا پر انسان کو یہ قدرت ہونا کہ وہ ان میں اپنی سواریاں دوڑائے، دریاؤں اور پہاڑوں کے ذریعہ زمین کا انسان کے موافق ہو جانا۔ سورج اور چاند کے ذریعہ موسموں کا اور رات دن کا انتظام، سب کچھ اس سے زیادہ عظیم ہے کہ ان کو لفظوں میں بیان کیا جا سکے۔ انسان اور کائنات میں اتنی کامل مطابقت ہے کہ انسان کی ہر قابل قیاس یا ناقابل قیاس ضرورت پیشگی طور پر یہاں بافراط موجود ہے۔

یہ تمام چیزیں اتنی زیادہ عجیب ہیں کہ آدمی کو ہلا دیں اور اس کو عبدیت کے جذبہ سے سرشار کر دیں۔ اس کے باوجود ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ کائنات کو دیکھ کر آدمی کے اندر استعجاب کی کیفیت پیدا ہو۔ خالقِ کائنات کے تصور سے اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی پیدا ہوتے ہی کائنات کو دیکھتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے وہ اس کو ایک عام چیز معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس میں اسے کوئی انوکھا پن نظر نہیں آتا۔

مزید یہ کہ اس دنیا میں آدمی کو جب کوئی چیز ملتی ہے تو وہ بظاہر اس کو اسباب کے تحت ملتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس بنا پر وہ سمجھ لیتا ہے کہ جو چیز اس کو ملی ہے وہ اس کی اپنی محنت اور صلاحیت کی بنا پر ملی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی کے اندر دینے والے خدا کے لیے شکر کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

انسان کی یہی وہ غفلت ہے جس کو یہاں بے انصافی اور ناشکرگزاری سے تعبیر کیا گیا ہے۔

خدا کا حکم

قرآن کی سورہ نمبر ۱۶ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— (اے لوگو) بے شک خدا حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا۔ اور قرابت داروں کو دینے کا۔ اور خدا روکتا ہے فحشاء سے اور منکر سے اور سرکشی سے۔ خدا تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو۔ اور تم خدا کے عہد کو پورا کرو۔ جبکہ تم آپس میں عہد کر لو۔ اور قسموں کو پکّا کرنے کے بعد نہ توڑو۔ اور تم خدا کو ضامن بھی بنا چکے ہو۔ بے شک خدا جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو (النحل ۹۰ ـ ۹۱)

خدا کے نزدیک پہلی چیز جس کا انسان کو اہتمام کرنا چاہیے وہ عدل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کا حق جو دوسرے پر آتا ہے وہ اس کو پوری طرح ادا کرے۔ خواہ صاحبِ حق کمزور ہو یا طاقتور۔ اور خواہ وہ پسندیدہ شخص ہو یا ناپسندیدہ۔ حقوق کی ادائیگی میں صرف حق کا لحاظ کیا جائے نہ کہ دوسرے اعتبارات کا۔

دوسری چیز احسان ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ حقوق کی ادائیگی میں عالی ظرفی کا طریقہ اپنایا جائے۔ انصاف کے ساتھ مروّت کو جمع کیا جائے۔ قانونی دائرہ سے آگے بڑھ کر لوگوں کے ساتھ فیاضی اور ہمدردی کا رویہ اختیار کیا جائے۔ آدمی کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ حتی الامکان وہ اپنے لیے اپنے حق سے کم پر راضی ہو جائے اور دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دینے کی کوشش کرے۔

تیسری چیز ایتاء ذی القربیٰ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے علاوہ اپنے رشتہ داروں کی ضرورت کے بارے میں بھی حساس ہو۔ ہر صاحبِ استعداد شخص اپنے مال پر صرف اپنا اور اپنے گھر والوں ہی کا حق نہ سمجھے۔ بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کو بھی وہ اپنی ذمہ داری میں شامل کرے۔

اس کے بعد آیت میں تین چیزوں سے منع فرمایا گیا ہے —— فحشاء سے مراد کھلی ہوئی اخلاقی برائیاں ہیں۔ یعنی وہ برائیاں جن کا برا ہونا خود اپنے ضمیر کے تحت ہر آدمی کو معلوم ہوتا ہے —— منکر معروف کا الٹا ہے۔ معروف ان اچھی باتوں کو کہتے ہیں جن کو ہر معاشرے میں اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس منکر سے مراد وہ ناپسندیدہ کام ہیں جو عام اخلاقی معیار کے خلاف ہیں —— "بغی" کے معنی مقرر کی ہوئی حد سے تجاوز کرنا ہے۔

رات اور دن

قرآن کی سورہ نمبر ۱۷ میں ارشاد ہوا ہے —— اور انسان برائی مانگتا ہے جس طرح اس کو بھلائی مانگنا چاہیے۔ اور انسان بڑا جلد باز ہے۔ اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا پھر ہم نے رات کی نشانی کو مٹا دیا اور دن کی نشانی کو ہم نے روشن کر دیا۔ تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو۔ اور ہم نے ہر چیز کو خوب کھول کر بیان کیا ہے (بنی اسرائیل ۱۲-۱۱)

رات اور دن کا نظام بتاتا ہے کہ خدا کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تاریکی ہو اور اس کے بعد روشنی آئے۔ خدائی نقشہ میں دونوں یکساں طور پر ضروری ہیں۔ جس طرح روشنی میں فائدے ہیں اسی طرح تاریکی میں بھی فائدے ہیں۔ دنیا میں اگر رات اور دن کا فرق نہ ہو تو آدمی اپنے اوقات کی تقسیم کس طرح کرے۔ وہ اپنے کام اور آرام کا نظام کس طرح بنائے۔

آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ تاریکی سے گھبرائے اور صرف "روشنی" کا طالب بن جائے۔ کیوں کہ خدا کی دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ جو آدمی ایسا چاہتا ہو اس کو خدا کی دنیا چھوڑ کر اپنے لیے دوسری دنیا تلاش کرنی پڑے گی۔

مگر یہی انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ وہ ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ اس کو تاریکی کا مرحلہ پیش نہ آئے اور فوراً ہی اس کو روشنی حاصل ہو جائے۔ اسی کمزوری کا نتیجہ وہ چیز ہے جس کو عجلت کہا جاتا ہے۔ عجلت دراصل خداوندی منصوبہ پر راضی نہ ہونے کا دوسرا نام ہے۔ اور خداوندی منصوبہ پر راضی نہ ہونا ہی تمام انسانی بربادیوں کا اصل سبب ہے۔

خدا چاہتا ہے کہ انسان دنیا کی فوری لذتوں پر صبر کرے تاکہ وہ آخرت کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھ سکے، مگر انسان اپنی عجلت کی وجہ سے دنیا کی وقتی لذتوں پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ وہ آگے کی طرف اپنا سفر طے نہیں کر پاتا۔ آدمی کی عاجلہ پسندی اس کو آخرت کی نعمتوں سے محروم کرنے کا سب سے بڑا سبب ہے۔

یہی دنیا کا معاملہ بھی ہے۔ دنیا میں حقیقی کامیابی صبر سے ملتی ہے نہ کہ جلد بازی سے۔

تجربہ کی زبان سے

قرآن کی سورہ نمبر ۱۷ میں ارشاد ہوا ہے کہ ——— (اے لوگو) تمہارا رب وہ ہے جو تمہارے لیے سمندر میں کشتی چلاتا ہے۔ تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو۔ بے شک وہ تمہارے اوپر مہربان ہے۔ اور جب سمندر میں تم پر آفت آتی ہے تو تم ان معبودوں کو بھول جاتے ہو۔ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے تھے۔ پھر جب وہ تم کو خشکی کی طرف بچالاتا ہے۔ تو تم پھر جاتے ہو۔ اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے (بنی اسرائیل ۶۷ - ۶۶)

خدا نے موجودہ دنیا کو خاص قوانین کا پابند بنادیا ہے، اس بنا پر انسان کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ سمندر میں اور خشکی اور فضا میں اپنی سواریاں دوڑائے۔ یہ سب اس لیے تھا کہ انسان اپنے حق میں اپنے خدا کی نعمتوں کو پہچانے اور اس کا شکر گزار بنے۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ وہ جو کچھ ہوتے ہوئے دیکھتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ ایسا ہی ہونا ہے۔ ارادے کے تحت ہونے والے واقعے کو وہ اپنے آپ ہونے والا واقعہ فرض کرلیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان واقعات کو دیکھ کر اس کے اندر کوئی خدائی احساس نہیں جاگتا۔

خدا کی معرفت اتنی حقیقی ہے کہ وہ انسان کی فطرت کے اندر آخری گہرائی تک اتری ہوئی ہے۔ اس کا ایک مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس پر کوئی آفت آپڑے جس کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرے۔ مثلاً اتھاہ سمندر میں طوفان کا آنا اور جہاز کا اس کے اندر پھنس جانا۔ اس طرح کے لمحات میں انسان کے اوپر سے اس کے تمام مصنوعی پردے ہٹ جاتے ہیں۔ وہ ایک خدا کو پہچان کر اسے پکارنے لگتا ہے۔

یہ وقتی تجربہ انسان کو اس لیے کرایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی پوری زندگی کو اس پر ڈھال لے۔ وہ وقتی اعتراف کو اپنا مستقل ایمان بنالے۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ طوفان میں وہ جس حقیقت کو یاد کرتا ہے طوفان سے نکلنے کے بعد وہ اس کو بھول جاتا ہے۔

خدا کی خدائی کو ماننے کا نام توحید ہے۔ اور خدا کی خدائی کو نہ ماننے کا نام شرک۔ اس اعتبار سے توحید کی اصل حقیقت اعتراف ہے اور شرک کی اصل حقیقت عدم اعتراف۔

ذہنی خول

قرآن کی سورہ نمبر ۱۷ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— آدمی پر جب ہم انعام کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا ہے۔ اور پیٹھ موڑ لیتا ہے۔ اور جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ناامید ہو جاتا ہے۔ کہو کہ ہر ایک اپنے طریقے پر عمل کر رہا ہے۔ اب تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ ٹھیک راستہ پر ہے (بنی اسرائیل ۸۴ - ۸۳)

ہر انسان پر یہ کیفیت گزرتی ہے کہ جب اس کو راحت اور فراوانی حاصل ہوتی ہے تو وہ برخود غلط نفسیات کا شکار ہو جاتا ہے۔ کسی بات کو ماننے کے لیے وہ اتنا کڑا بن جاتا ہے جیسے کہ وہ ایسا لوہا ہے جو جھکنا نہیں جانتا۔ مگر جب اس کے اسباب چھن جاتے ہیں اور اس کو عجز کا تجربہ ہوتا ہے تو اچانک وہ بے ہمت ہو جاتا ہے اور مایوسی سے نڈھال ہو جاتا ہے۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی اپنے بارہ میں اس تجربہ سے گزرتا ہے۔ مگر ایسے لوگ کم ہیں جو اس تجربہ کے درمیان اپنی حقیقت کو دریافت کر لیں۔ وہ یہ سوچیں کہ دنیا میں جب کہ انھیں آزادی حاصل ہے وہ حق کے مقابلے میں اتنی سرکشی دکھا رہے ہیں مگر اس وقت ان کا کیا حال ہو گا جبکہ قیامت آئے گی۔ اور ان سے ان کا سارا اختیار چھین لے گی۔ انسان کتنا زیادہ کمزور ہے مگر وہ کتنا زیادہ اپنے کو طاقت ور سمجھتا ہے۔

شاکلہ سے مراد ذہنی سانچہ ہے۔ ہر آدمی کے حالات اور رجحانات کے تحت دھیرے دھیرے اس کا ایک خاص ذہنی سانچہ بن جاتا ہے۔ وہ اسی کے زیر اثر سوچتا ہے۔ اور اسی کے مطابق اس کا نقطۂ نظر بنتا ہے۔ مگر صحیح نقطۂ نظر وہ ہے جو علمِ الٰہی کے مطابق صحیح ہو اور غلط وہ ہے جو علمِ الٰہی کے مطابق غلط ہو۔

یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا امتحان ہے۔ آدمی کو یہ کرنا ہے کہ اس کے شاکلہ نے جو اس کا ذہنی خول بنا دیا ہے۔ وہ اس خول کو توڑے تاکہ وہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھ سکے جیسی کہ وہ ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ چیزوں کو ربانی نگاہ سے دیکھنے لگے —— جو لوگ اپنے ذہنی خول میں گم ہوں، وہ بھٹکے ہوئے لوگ ہیں اور جو لوگ اپنے ذہنی خول سے نکل کر خدائی نقطۂ نظر کو پالیں وہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت پائی۔

امتحان

قرآن کی سورہ نمبر ۲۰ میں ارشاد ہوا ہے ——— اور ہم نے آدم کو اس سے پہلے حکم دیا تھا تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس کہ اس نے انکار کیا۔ پھر ہم نے کہا کہ اے آدم، یہ بلاشبہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے تو کہیں وہ تم دونوں کو جنت سے نکلوا نہ دے پھر تم محروم ہوکر رہ جاؤ (طٰہٰ، ۱۱۵-۱۱۷)

خدا کے حکم پر قائم رہنے کے لیے مضبوط ارادہ انتہائی طور پر ضروری ہے۔ آدمی اگر غیر متعلق چیزوں سے متاثر ہو جایا کرے تو وہ یقیناً خدا کے راستہ سے ہٹ جائے گا۔ خدا کے راستہ پر قائم رہنے کے لیے صرف خدا کے حکم کو جاننا کافی نہیں، بلکہ یہ عزم بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ آدمی حکم خداوندی کے خلاف باتوں سے مزاحمت کرے اور ان کو اپنے اوپر اثر انداز نہ ہونے دے۔

خدا نے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو فرشتے فوراً سجدہ میں گر گئے، مگر شیطان نے سجدہ نہیں کیا۔ اس فرق کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرشتوں نے اس معاملہ کو خدا کا معاملہ سمجھا۔ اس کے برعکس ابلیس نے اس کو انسان کا معاملہ سمجھا۔ جب معاملہ کو خدا کا معاملہ سمجھا جائے تو آدمی کے لیے ایک ہی ممکن صورت ہوتی ہے ۔ وہ یہ کہ وہ اس کی اطاعت کرے۔ مگر جب معاملہ کو انسان کا معاملہ سمجھ لیا جائے تو آدمی یہ کرے گا کہ وہ سامنے کے انسان کو دیکھے گا۔ اگر وہ اس سے طاقت ور ہے تو وہ جھک جائے گا اور اگر وہ اس سے طاقتور نہیں ہے تو وہ جھکنے سے انکار کر دے گا، خواہ حق کا واضح تقاضا یہی ہو کہ وہ اس کے آگے اپنے آپ کو جھکا دے۔

آدم اور ابلیس کی یہ کہانی ہر انسان کی زندگی میں بار بار دہرائی جا رہی ہے۔ ہر آدمی کی زندگی میں یہ صورت پیش آتی ہے کہ زندگی کی سرگرمیوں میں اس کا سابقہ کسی صاحب حق انسان سے پڑتا ہے، یہ حق خواہ لین دین کی صورت میں ہو یا ایک سچی بات کی صورت میں۔ ہر ایسے موقع پر آدمی دوبارہ اسی امتحان میں کھڑا ہو جاتا ہے جو انسان اول کے ساتھ پیش آیا تھا۔ ایسے موقع پر جو آدمی حق کے آگے جھک جائے وہ گویا خدا کے آگے جھکا اور جو آدمی حق کے آگے نہ جھکے اس نے گویا شیطان کی پیروی کی۔

کائناتی نشانیاں

قرآن کی سورہ نمبر۲۲ میں ارشاد ہوا ہے۔ (اے انسان) کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے زمین کی چیزوں کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے۔ اور کشتی کو بھی، وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے۔ اور وہ آسمان کو زمین پر گرنے سے تھامے ہوئے ہے، مگر یہ کہ اسی کے حکم سے، بے شک اللہ لوگوں پر نرمی کرنے والا مہربان ہے۔ اور وہی ہے جس نے تم کو زندگی دی۔ پھر وہ تم کو موت دیتا ہے۔ پھر وہ تم کو زندہ کرے گا۔ بے شک انسان بڑا ہی ناشکرا ہے (الحج ۶۶ - ۶۵)

زمین کی تمام چیزیں ایک خاص توازن کو مسلسل اپنے اندر قائم رکھتی ہیں۔ اگر ان کا توازن بگڑ جائے تو چیزیں مفید بننے کے بجائے ہمارے لیے سخت مضر بن جائیں۔ پانی میں دھات کا ایک ٹکڑا ڈالیں تو وہ فوراً ڈوب جائے گا۔ مگر پانی کو خدا نے ایک خاص قانون کا پابند بنا رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ لکڑی یا لوہے کو کشتی کی صورت دے دی جائے تو وہ پانی میں نہیں ڈوبے گا۔ خلا میں بے شمار کرے ہیں۔ ان کو بظاہر گر پڑنا چاہیے مگر وہ خاص قانون کے تحت نہایت صحت کے ساتھ اپنے مدار پر تھمے ہوئے ہیں۔

انسان نے اپنے آپ کو خود نہیں بنایا۔ اس کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ پھر اس کو ایسی دنیا میں رکھا جو اس کے لیے سراپا رحمت ہے۔ مگر آزادی پاکر انسان ایسا سرکش ہو گیا کہ وہ اپنے سب سے بڑے محسن کے احسان کا اعتراف نہیں کرتا۔

کائنات خود اپنی ذات میں ایک مکمل دلیل ہے۔ وہ ان تمام حقیقتوں کا عملی مظاہرہ ہے جن کے ماننے کا مطالبہ انسان سے نظری طور پر کیا گیا ہے۔ انسان اگر کائنات کے نظام پر غور کرے، وہ اس کی خاموش آوازوں پر کان لگائے، وہ اس کی حکمتوں سے اپنے لیے نصیحت حاصل کرے تو کائنات کی کھلی ہوئی کتاب ہی میں وہ تمام خدائی حقیقتوں کو پڑھ لے گا۔ مخلوقات کے آئینے میں وہ کامل طور پر خالق کو دیکھ لے گا۔

خدا کو پانا انتہائی حد تک ممکن ہے۔ بشرطِ صرف یہ ہے کہ آدمی سنجیدہ مطالعے کی استعداد اپنے اندر پیدا کرے۔

وصیت انسان

قرآن کی سورہ نمبر ۳۱ میں ارشاد ہوا ہے —— اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے معاملہ میں تاکید کی۔ اس کی ماں نے دکھ پر دکھ اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا۔ اور دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا۔ کہ تو میرا شکر کر اور اپنے والدین کا۔ میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرائے جو تجھ کو معلوم نہیں تو ان کی بات نہ ماننا اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا۔ اور تم اس شخص کے راستہ کی پیروی کرنا جس نے میری طرف رجوع کیا۔ پھر تم سب کو میرے پاس آنا ہے۔ پھر میں تم کو بتا دوں گا جو کچھ تم کرتے رہے (لقمان ۱۵-۱۴)

خدا کے بعد انسان کے اوپر سب سے زیادہ حق ماں باپ کا ہے۔ البتہ اگر ماں باپ کا حکم خدا کے حکم سے ٹکرائے تو اس وقت خدا کا حکم لینا ہے اور ماں باپ کا حکم چھوڑ دینا ہے۔ تاہم اس وقت بھی یہ ضروری ہے کہ ماں باپ کی خدمت کو بدستور جاری رکھا جائے۔

خدا کے سلسلہ میں انسان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس کا شکر کرے۔ وہ دل کی تمام گہرائیوں کے ساتھ، خدا کی خدائی کا اعتراف کرے۔ اس کے تمام جذبات اور احساسات خدا کی نعمتوں کے اعتراف میں سرشار ہو جائیں۔ یہاں تک کہ وہ ہر لمحہ خدا کی یاد کرنے لگے، اس کا وجود سراپا خداوند ذوالجلال کا تذکرہ بن جائے۔

ماں باپ کے سلسلہ میں انسان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ان کے حقوق ادا کرے۔ وہ ان کو عزت دے۔ وہ ہمیشہ ان کے مقابلہ میں نرمی کے ساتھ بولے۔ وہ ان کی ضرورتوں کو پورا کرے۔ وہ کامل معنوں میں ان کا خدمت گزار بن جائے۔

اگر والدین کے حکم اور خدا کے تقاضوں میں ٹکراؤ ہو تو اس وقت انسان پر لازم ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آنے والے تقاضوں کو پورا کرے۔ ایسے وقت میں انسان پر والدین کے حکم کی پیروی ضروری نہیں، تاہم اس وقت بھی والدین کے ساتھ نرمی ہی کا معاملہ کرنا ضروری ہوگا۔ اخلاقی ذمہ داری کسی بھی حال میں انسان سے ساقط نہیں ہوتی۔

اختیارانہ اطاعت

قرآن کی سورہ نمبر ۳۳ میں ارشاد ہوا ہے ـــــ ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کیا اور وہ اس سے ڈر گئے۔ اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔ تاکہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو سزا دے۔ اور مومن مردوں اور مومن عورتوں پر توجہ فرمائے۔ اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے (الاحزاب ۷۲، ۷۳)

انسان اور کائنات دونوں ہی خدا کی مخلوق ہیں۔ دونوں ہی سے یہ مطلوب ہے کہ وہ کامل طور پر خدا کی ماتحتی میں رہیں۔ تاہم دونوں میں ایک فرق ہے۔ کائنات مجبورانہ طور پر خدا کی ماتحتی کو قبول کیے ہوئے ہے۔ انسان سے مطلوب ہے کہ وہ اسی ماتحتی کو خود اپنے آزاد فیصلہ کے تحت اختیار کرے۔

"امانت" سے مراد یہی اختیار ہے۔ اختیار کو امانت اس لیے فرمایا کہ وہ اللہ کی ایک چیز ہے جس کو اس نے عارضی مدت کے لیے انسان کو بطور آزمائش دیا ہے۔ تاکہ انسان خود اپنے ارادہ سے خدا کا تابعدار بنے۔ امانت، دوسرے لفظوں میں، اپنے اوپر خدا کا قائم مقام بننا ہے۔ اپنے آپ پر وہ کرنا ہے جو خدا ستاروں اور سیاروں پر کر رہا ہے۔ یعنی اپنے اختیار سے اپنے آپ کو خدا کے کنٹرول میں دے دینا۔

اس کائنات میں صرف اللہ حاکم ہے اور تمام چیزیں اس کی محکوم ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوئی کہ وہ ایک ایسی آزاد مخلوق پیدا کرے جو کسی جبر کے بغیر خود اپنے اختیار سے وہی کرے جو خدا اس سے کروانا چاہتا ہے۔ یہ اختیاری اطاعت بڑی نازک آزمائش تھی۔ آسمان اور زمین اور پہاڑ بھی اس کا تحمل نہیں کر سکتے۔ تاہم انسان نے شدید اندیشہ کے باوجود اس کو قبول کر لیا۔ اب انسان موجودہ دنیا میں خدا کی ایک امانت کا امین ہے۔ اس کو اپنے اوپر وہی کرنا ہے جو خدا دوسری چیزوں پر کر رہا ہے۔ انسان کو اپنے اوپر خدا کا حکم چلانا ہے۔ انسان حالت امتحان میں ہے۔ اور موجودہ دنیا اس کے لیے وسیع امتحان گاہ۔

یہ "امانت" ایک بے حد نازک ذمہ داری ہے۔ کیونکہ اسی کی وجہ سے جزا و سزا کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ دوسری مخلوقات مجبور و مقہور ہیں۔ اس لیے ان کے واسطے جزا و سزا کا مسئلہ نہیں۔ انسان آزاد ہے، اس لیے وہ جزا و سزا کا مستحق بنتا ہے۔

تزئینِ عمل

قرآن کی سورہ نمبر ۳۵ میں ارشاد ہوا ہے —— اے لوگو، بے شک اللہ کا وعدہ برحق ہے۔ تو دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے۔ اور نہ وہ بڑا دھوکہ باز تم کو اللہ کے باب میں دھوکہ دینے پائے۔ بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے تو تم اس کو دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنے گروہ کو اسی لیے بلاتا ہے کہ وہ دوزخ والوں میں سے ہو جائیں۔ جن لوگوں نے انکار کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کیا ان کے لیے معافی ہے اور بڑا اجر ہے۔ کیا ایسا شخص جس کو اس کا برا عمل اچھا کر کے دکھایا گیا، پھر وہ اس کو اچھا سمجھنے لگا۔ پس اللہ جس کو چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ پس ان پر افسوس کر کے تم اپنے کو ہلکان نہ کرو۔ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں (فاطر ۸ - ۵)

خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ زندگی کی نوعیت کے بارے میں جو خبر دی ہے آدمی فوراً اس سے دوچار نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جو دنیا کی چیزیں ہیں آدمی آج ہی ان سے دوچار ہو رہا ہے۔ موت اور زلزلہ اور حادثات گویا قیامت سے پہلے قیامت کی اطلاع ہیں۔ مگر شیطان فوراً ہی لوگوں کے ذہن کو یہ کہہ کر پھیر دیتا ہے کہ یہ سب اسباب کے تحت پیش آنے والے واقعات ہیں۔ نہ کہ خدائی مداخلت کے تحت۔ لیکن اس قسم کا ہر خیال شیطان کا فریب ہے۔ وہ دن آنا لازمی ہے جب کہ جھوٹ اور سچ میں تفریق ہو۔ جبکہ اچھے لوگوں کو ان کی اچھائی کا انعام ملے اور برے لوگوں کو ان کی برائی کی سزا دی جائے۔

خدا نے ہر آدمی کو یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ سوچے اور حق اور ناحق کے درمیان تمیز کر سکے۔ جو آدمی اپنی اس فطری صلاحیت کو استعمال کرتا ہے وہ ہدایت پاتا ہے۔ اور جو شخص اس فطری صلاحیت کو استعمال نہیں کرتا وہ ہدایت نہیں پاتا۔

آدمی کے سامنے جب حق آئے تو فوراً اس کے ذہن کو جھٹکا لگتا ہے۔ اس وقت اس کے لیے دو راستے ہوتے ہیں۔ اگر وہ حق کا اعتراف کر لے تو اس کا ذہن صحیح سمت میں چل پڑتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ کوئی مصلحت یا کوئی نفسیاتی پیچیدگی اس کے سامنے آئے اور وہ اس سے متاثر ہو کر حق کا اعتراف کرنے سے رک جائے تو اس کا ذہن اپنے عدم اعتراف کو جائز ثابت کرنے کے لیے باتیں گھڑنا شروع کرتا ہے، وہ اپنے برے عمل کو اچھا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

عہد فطرت

قرآن کی سورہ نمبر ۳۶ میں ارشاد ہوا ہے —— اور اے مجرمو، آج تم الگ ہو جاؤ۔ اے اولاد آدم، کیا میں نے تم کو تاکید نہیں کردی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اور یہ کہ تم میری ہی عبادت کرنا، یہی سیدھا راستہ ہے اور اس نے تم میں سے ایک کثیر گروہ کو گمراہ کر دیا۔ تو کیا تم سمجھتے نہیں تھے۔ یہ ہے جہنم جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ اب اپنے کفر کے بدلے میں اس میں داخل ہو جاؤ۔ آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے جو کچھ یہ لوگ کرتے تھے (یٰس ۶۵ - ۵۹)

موجودہ زندگی میں اچھے لوگ اور برے لوگ ایک ہی دنیا میں رہتے ہیں۔ اگلی زندگی میں دونوں کی دنیائیں الگ الگ کر دی جائیں گی۔ شیطان کے بندے شیطان کے ساتھ اور رحمٰن کے بندے رحمٰن کے ساتھ۔

کوئی آدمی شیطان کے نام پر شیطان کی پرستش نہیں کرتا۔ مگر بالواسطہ طور پر غیر اللہ کا ہر پرستار دراصل شیطان کا پرستار ہے۔ کیونکہ وہ شیطان ہی کی تزئین کے تحت ایسا کر رہا ہے۔ مثلاً فرشتوں اور قومی بزرگوں کی پرستش اس طرح شروع ہوئی کہ شیطان نے ان کے بارے میں بے اصل عقیدے لوگوں کے ذہن میں ڈالے اور لوگ ان شیطانی ترغیبات سے متاثر ہو کر ان کی پرستش کرنے لگے۔

جدید تحقیقات سے یہ ثابت ہوا کہ انسان کی کھال ایک قسم کا ریکارڈ ہے جس پر آدمی کی بولی ہوئی آوازیں مرتسم ہو جاتی ہیں اور ان کو دہرایا جا سکتا ہے۔ یہ ایک نشانی ہے جو اس بات کو قابل فہم بنا رہی ہے کہ کس طرح آخرت میں آدمی کے ہاتھ اور پاؤں آدمی کے احوال سنانے لگیں گے۔

ہر انسان کی فطرت یا اس کے لاشعور میں خدا کا تصور پیدائشی طور پر موجود ہے۔ ہر انسان پیدائشی طور پر یہ مزاج رکھتا ہے کہ وہ خدا کو اپنا بڑا مان کر اس کے آگے جھک جائے۔ یہ گویا عہد فطرت ہے اور تمام انسان اس عہد فطری کے ذریعہ اپنے خدا سے بندھے ہوئے ہیں۔ انسان جب اس فطری رہنمائی کو کام میں لا کر خدا کی فرماں برداری کے راستہ پر چلتا ہے تو وہ خدا کی مقرر کی ہوئی صراط مستقیم کا مسافر بن جاتا ہے جو اس کو ابدی سعادت کی منزل تک پہنچا دے۔

علم اور بے علمی

قرآن کی سورہ نمبر ۳۹ میں ارشاد ہوا ہے —— اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتا ہے۔ اس کی طرف رجوع ہو کر۔ پھر جب وہ اس کو اپنے پاس سے نعمت دے دیتا ہے تو وہ اس چیز کو بھول جاتا ہے جس کے لیے وہ پہلے پکار رہا تھا۔ اور وہ دوسروں کو خدا کا برابر ٹھہرانے لگتا ہے۔ تاکہ اس کی راہ سے گمراہ کر دے۔ کہو کہ اپنے کفر سے تھوڑے دن فائدہ اٹھالے۔ بے شک تو آگ والوں میں سے ہے۔ بھلا جو شخص رات کی گھڑیوں میں سجدہ اور قیام کی حالت میں عاجزی کر رہا ہو۔ آخرت سے ڈرتا ہو اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہو، کہو کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ نصیحت تو وہی لوگ پکڑتے ہیں جو عقل والے ہیں (الزمر ۹-۸)

ہر آدمی پر ایسے لمحات آتے ہیں جب کہ وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ جن چیزوں کو اپنا سہارا سمجھ رہا تھا۔ وہ بھی اس نازک لمحہ میں اس کے مددگار نہیں بنتے۔ اس وقت آدمی سب کچھ بھول کر خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ اس طرح مصیبت کی گھڑیوں میں ہر آدمی جان لیتا ہے کہ ایک خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ مگر مصیبت دور ہوتے ہی وہ دوبارہ پہلے کی طرح بن جاتا ہے۔ انسان کی مزید کوتاہی یہ ہے کہ وہ اپنی نجات کو خدا کے سوا دوسری چیزوں کی طرف منسوب کرے۔ وہ اس کو اسباب کا کرشمہ بتائے یا فرضی معبودوں کا کرشمہ۔

ایک انسان وہ ہے جس کو صرف مادی غم بے قرار کرے۔ دوسرا انسان وہ ہے جس کو خدا کی یاد بے قرار کر دیتی ہو۔ یہی دوسرا انسان دراصل خدا والا انسان ہے۔ اس کا اقرارِ خدا حالات کا پیداوار نہیں ہوتا۔ وہ اس کی شعوری دریافت ہوتا ہے۔ وہ خدا کو ایک ایسی برتر ہستی کی حیثیت سے پاتا ہے کہ اس کی امیدیں اور اس کے اندیشے سب ایک خدا کی ذات کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی بیقراریاں رات کے لمحات میں بھی اس کو بستر سے جدا کر دیتی ہیں۔ اس کی تنہائی غفلت کی تنہائی نہیں ہوتی بلکہ خدا کی یاد کی تنہائی بن جاتی ہے۔

علم والا وہ ہے جس کی نفسیات میں خدا کی یاد سے ہلچل پیدا ہوتی ہو۔ اور بے علم والا وہ ہے جس کی نفسیات کو صرف مادی حالات بیدار کریں۔ وہ مادی جھٹکوں سے جاگے اور اس کے بعد دوبارہ غفلت کی نیند سو جائے۔

انسانی امتیاز

قرآن کی سورہ نمبر ۴۹ میں ارشاد ہوا ہے ——— اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو قوموں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا، خبر رکھنے والا ہے (الحجرات ۱۳)

انسان بظاہر ایک دوسرے سے مختلف دکھائی دیتے ہیں مگر سب کے سب ایک ہی ابتدائی باپ اور ماں کی اولاد ہیں جن کو آدم اور حوا کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب انسان جیسی ایک مخلوق کو پیدا کرنے کا فیصلہ فرمایا تو سب سے پہلے اس نے ایک ابتدائی جوڑا پیدا کیا، ایک مرد اور ایک عورت۔ اسی ابتدائی جوڑے سے انسانی نسل کا آغاز ہوا۔ جیسے جیسے انسانوں کی تعداد بڑھتی گئی وہ زمین کے مختلف حصوں میں پھیلنے لگے یہاں تک کہ لمبی مدت کے بعد پوری زمین مردوں اور عورتوں سے آباد ہو گئی۔

زمین پر جغرافی حالات ہر جگہ یکساں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک حصہ اور دوسرے حصہ میں فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً کسی حصہ میں سخت گرمی ہے اور کسی حصہ میں سخت سردی۔ کسی حصہ میں خوراک کا زیادہ بڑا ذریعہ گوشت ہے اور کسی حصہ میں خوراک کا زیادہ بڑا ذریعہ زرعی پیداوار، وغیرہ۔

اس جغرافی فرق سے لوگوں کے رنگ اور حلیہ اور قد اور مزاج میں بھی فرق آتا چلا گیا۔ اس طرح کوئی سفید ہو گیا کوئی کالا، کوئی ایک نسل سے ہے اور کوئی دوسری نسل سے، یہ تمام فرق اضافی ہیں نہ کہ حقیقی۔ وہ صرف تعارف کے لیے ہیں نہ کہ امتیاز کے لیے۔ اکثر خرابیوں کا سبب یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس ظاہری فرق کو حقیقی فرق سمجھنے لگتے ہیں اور اس کی بنا پر ایک دوسرے کے درمیان فرق کرنے لگتے ہیں۔ اس سے وہ تفریق اور تعصب وجود میں آتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

انسان اپنے آغاز کے اعتبار سے سب کے سب ایک ہیں۔ ان میں امتیاز کی اگر کوئی بنیاد ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کون اللہ سے ڈرنے والا ہے اور کون اللہ سے ڈرنے والا نہیں۔ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان فرق ان کی حقیقی صفات کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ ان کی ظاہری خصوصیات کی بنیاد پر۔

خدائی نگرانی

قرآن کی سورہ نمبر ۵۰ میں ارشاد ہوا ہے —— اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں ان باتوں کو جو اس کے دل میں آتی ہیں۔ اور ہم رگ گردن سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ جب دو لینے والے لیتے رہتے ہیں جو کہ دائیں اور بائیں طرف بیٹھے ہیں۔ کوئی لفظ وہ نہیں بولتا مگر اس کے پاس ایک مستعد نگراں موجود ہے۔ اور موت کی بے ہوشی حق کے ساتھ آپہنچی۔ یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔ اور صور پھونکا جائے گا۔ یہ ڈرانے کا دن ہوگا۔ ہر شخص اس طرح آگیا کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا۔ تم اس سے غفلت میں رہے۔ پس ہم نے تمہارے اوپر سے پردہ ہٹادیا۔ پس آج تمہاری نگاہ تیز ہے۔ اور اس کے ساتھ کا فرشتہ کہے گا۔ یہ جو میرے پاس تھا حاضر ہے۔ جہنم میں ڈال دو ناشکر، مخالف کو۔ نیکی سے روکنے والا، حد سے بڑھنے والا، شبہہ ڈالنے والا۔ جس نے اللہ کے ساتھ دوسرے معبود بنائے۔ پس اس کو ڈال دو سخت عذاب میں۔ اس کا ساتھی شیطان کہے گا کہ اے ہمارے رب میں نے اسے سرکش نہیں بنایا بلکہ وہ خود راہ بھولا ہوا، دور پڑا تھا۔ ارشاد ہوگا، میرے سامنے جھگڑا نہ کرو اور میں نے پہلے ہی تم کو عذاب سے ڈرادیا تھا۔ میرے یہاں بات بدلی نہیں جاتی۔ اور میں بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں (ق ۲۹ - ۱۶)

دنیا کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں "ریکارڈنگ" کا ناقابل خطا نظام موجود ہے۔ انسان کی سوچ اس کے ذہنی پردہ پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو رہی ہے۔ انسان کا ہر بول ہوائی لہروں کی صورت میں مستقل طور پر باقی رہتا ہے۔ انسان کا عمل حرارتی لہروں کے ذریعہ خارجی دنیا میں اس طرح محفوظ ہو جاتا ہے کہ اس کو کسی بھی وقت دہرایا جا سکے۔ یہ سب آج کی معلوم حقیقتیں ہیں۔ اور یہ معلوم حقیقتیں قرآن کی اس خبر کو قابل فہم بنا رہی ہیں کہ انسان کی نیت، اس کا قول اور اس کا عمل سب کچھ خالق کے علم میں ہے۔ انسان کی ہر چیز فرشتوں کے رجسٹر میں درج کی جا رہی ہے۔

ان آیتوں میں موت اور اس کے بعد آنے والی قیامت کا منظر کھینچا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ وہاں ان لوگوں پر کیا بیتے گی جو موجودہ امتحان کی دنیا میں اپنے کو آزاد پا کر سرکش بنے ہوئے تھے۔ یہ منظر کشی بجائے خود اتنی واضح ہے کہ اس کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔

مقصدِ حیات

قرآن کی سورہ نمبر۵۱ میں ارشاد ہوا ہے —— اور میں نے جن اور انسان کو صرف اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ میں ان سے رزق نہیں چاہتا۔ اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھ کو کھلائیں بیشک اللہ ہی روزی دینے والا ہے، زور آور، زبردست ہے۔ پس جن لوگوں نے ظلم کیا ان کا ڈول بھر چکا ہے جیسے ان کے ساتھیوں کے ڈول بھرے تھے۔ پس وہ جلدی نہ کریں۔ پس منکروں کے لیے خرابی ہے ان کے اس دن سے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے (الذاریات ۶۰-۵۶)

خدا ہر قسم کا ذاتی اختیار رکھتا ہے۔ تاہم فرشتوں کو اس نے اپنی وسیع سلطنت کا انتظام کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ مگر انسانوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ انسان اس لیے پیدا نہیں کیے گئے کہ وہ خدا کی کسی شخصی یا انتظامی ضرورت کو پورا کریں۔ ان کی پیدائش کا واحد مقصد خدا کی عبادت ہے۔ عبادت کا مطلب اپنے آپ کو خدا کے آگے جھکانا ہے۔ اپنے آپ کو پوری طرح خدا کا پرستار بنا دینا ہے۔

اس عبادت کا خلاصہ معرفت ہے۔ چنانچہ ابن جُریج نے الا لیعبدون کی تشریح الا لیعرفون کی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر) یعنی انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ خدا کو بطور دریافت کے پائے۔ وہ بن دیکھے خدا کو پہچانے۔ اسی کا نام معرفت ہے۔ اس معرفت کے نتیجہ میں آدمی کی جو زندگی بنتی ہے اسی کو عبادت و بندگی کہا جاتا ہے۔

پانی کا ڈول بھرنے کے بعد ڈوب جاتا ہے۔ اسی طرح آدمی کی مہلتِ عمل پوری ہونے کے بعد فوراً اس کی موت آجاتی ہے۔ جو شخص ڈول بھرنے سے پہلے اپنی اصلاح کرلے اس نے اپنے آپ کو بچایا۔ اور جو شخص آخر وقت تک غافل رہا وہ ہلاک ہوگیا۔

ظالم لوگ اگر پکڑے نہ جا رہے ہوں تو انھیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ چھوڑ دیے گئے ہیں، وہ اس لیے آزاد ہیں کہ خدا کا طریقہ جلدی پکڑنے کا طریقہ نہیں، نہ اس لیے کہ خدا انھیں پکڑنے والا نہیں۔

خدا نے انسان کو اپنی ذات کی تکمیل کے لیے نہیں پیدا کیا ہے۔ بلکہ اس طرح خود انسان کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ وہ موجودہ امتحان کی دنیا میں اپنے آپ کو خدا کا سچا بندہ ثابت کرے تاکہ وہ خدا کی ابدی نعمتوں کا حق دار بن سکے۔

پیغمبرانہ رہنمائی

قرآن کی سورہ نمبر ۵۳ میں ارشاد ہوا ہے —— کیا انسان کو خبر نہیں پہنچی اس بات کی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے۔ اور ابراہیم کے، جس نے اپنا قول پورا کر دیا۔ کہ کوئی اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور یہ کہ انسان کے لیے وہی ہے جو اس نے کمایا۔ اور یہ کہ اس کی کمائی عنقریب دیکھی جائے گی۔ پھر اس کو پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور یہ کہ سب کو تمہارے رب تک پہنچنا ہے (النجم ۴۲ - ۳۶)

اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو پیدا کیا تو اسی کے ساتھ اس کی ہدایت کے لیے پیغمبروں کا سلسلہ قائم فرمایا۔ ہر دور میں اور ہر قوم میں پیغمبر آتے رہے اور وہ انسانوں تک خدا کی ہدایت پہنچاتے رہے۔ زندگی گزارنے کا سامان لوگوں کو خود اسی دنیا سے ملتا رہا۔ لیکن زندگی کے اصول اس کے پاس بار بار آسمان سے بھیجے جاتے رہے۔

ہر پیغمبر یکساں طور پر خدا کا سچا نمائندہ تھا۔ مگر زمانہ گزرنے کے ساتھ پچھلے پیغمبروں کی کتابیں اور ان کی ہدایات یا تو مٹتی رہیں یا بدلتی رہیں۔ یہاں تک کہ آخر میں خدا نے پیغمبر عربی کو قرآن کے ساتھ بھیجا اور آپ کی لائی ہوئی ہدایت کو کامل طور پر محفوظ کر دیا تاکہ ہر دور کے انسانوں کے لیے وہ مستند رہنمائی کا ذریعہ بنی رہے۔

پیغمبروں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جو حقیقت کھولی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر آدمی کو لازماً اپنے عمل کا بدلہ پانا ہے۔ نہ کوئی شخص اپنے عمل کے انجام سے بچ سکتا ہے اور نہ کوئی دوسرا شخص کسی کو بچانے والا بن سکتا ہے۔ جو لوگ اس پیغمبرانہ چیتاونی سے متنبہ نہ ہوں ان سے بڑا نادان خدا کی اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

خدا کی نسبت سے انسان کا جو معاملہ ہے اس میں ہر آدمی اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے۔ کوئی بھی آدمی نہ دوسرے کے انجام میں شریک ہو سکتا ہے اور نہ کوئی آدمی کسی بھی اعتبار سے دوسرے شخص کا مددگار بن سکتا ہے۔ خدا کی دنیا میں ہر آدمی کے لیے صرف وہی ہے جس کے لیے اس نے خود محنت کی ہو، ایک کی محنت کسی بھی حال میں دوسرے کے کام آنے والی نہیں۔

ٹھیک تول

قرآن کی سورہ نمبر ۵۵ میں ارشاد ہوا ہے ـــــ خدائے رحمٰن، اس نے قرآن کی تعلیم
ی، اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اس کو بولنا سکھایا۔ سورج اور چاند کے لیے ایک حساب ہے۔
ر ستارے اور درخت سجدہ کرتے ہیں۔ اور اس نے آسمان کو اونچا کیا۔ اور اس نے ترازو رکھ
ی۔ کہ تم تولنے میں زیادتی نہ کرو۔ اور انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو تو لو۔ اور تول
ں نہ گھٹاؤ (الرحمٰن ۹-۱)

انسان کو پیدا کرنا اور اس کے لیے آسمانی ہدایت اتارنا دونوں ہی خدا کی صفتِ رحمت کا ظہور ہیں۔ انسان کو پیدا کر کے خدا نے اس کو یہ موقع دیا کہ وہ زمین و آسمان میں اعلیٰ ترقی کا مقام حاصل کرے۔ وہ خوشیوں اور لذتوں کی ایک ابدی دنیا اپنے لیے پالے۔

اس کے بعد پیغمبر کی بعثت اور آسمانی کتاب کا نزول گویا اس نعمتِ الٰہی کا اتمام ہے۔ اس طرح انسان کو یہ موقع فراہم کیا گیا کہ وہ صحیح رہنمائی کے ساتھ یہاں اپنی زندگی کا آغاز کرے۔ وہ اِدھر اُدھر بھٹکے بغیر اس سیدھی شاہراہ پر اپنا سفر جاری رکھے جو اس کو منزلِ مقصود تک پہنچانے والی ہے۔

خدا نے انسان کو بنایا۔ اس کو نطق کی انوکھی صلاحیت دی جو ساری معلوم کائنات میں کسی کو حاصل نہیں۔ پھر انسان سے جو عادلانہ روش مطلوب تھی اس کا عملی نمونہ اس نے کائنات میں قائم کر دیا۔

انسان کے گرد و پیش کی پوری دنیا عین اسی اصولِ عدل پر قائم ہے جو انسان سے خدا کو مطلوب ہے۔ اور قرآن میں اسی عدل کو لفظی طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ قرآن خدائی عدل کا لفظی اظہار ہے اور کائنات خدائی عدل کا عملی اظہار۔ بندوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے قول و عمل کو اسی ترازو سے ناپتے رہیں۔ وہ نہ لینے میں بے انصافی کریں اور نہ دینے میں۔

ترازو عدل کی علامت ہے۔ وہ کسی چیز کو ٹھیک معیاری وزن کے مطابق تول دیتا ہے۔ یہ ترازو بتاتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں لینے اور دینے کے معاملہ میں کیا اصول اختیار کرنا چاہیے۔ اس کو چاہیے کہ اپنے قول و عمل میں یکسانیت پیدا کرے۔ اس کی ہر روش اس معیار کے مطابق ہو جو حق و صداقت کا معیار ہے۔

ہار جیت کا دن

قرآن کی سورہ نمبر ۶۴ میں ارشاد ہوا ہے کہ ——— (اے لوگو) خدا ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا۔ پھر تم میں سے کوئی ماننے والا ہے۔ اور کوئی نہ ماننے والا، اور خدا دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو ٹھیک طور پر پیدا کیا۔ اور اس نے تمہاری صورت بنائی نہایت اچھی صورت بنائی اور اسی کی طرف لوٹنا ہے وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو۔ اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔ اور خدا دلوں تک کی باتوں کا جاننے والا ہے ... انکار کرنے والوں نے دعویٰ کیا کہ وہ ہرگز دوبارہ اٹھائے نہ جائیں گے۔ کہو کہ ہاں میرے رب کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے۔ پھر تم کو بتایا جائے گا۔ جو کچھ تم نے کیا ہے۔ اور یہ خدا کے لیے بہت آسان ہے۔ پس خدا پر ایمان لاؤ۔ اور اس کے پیغمبر پر اور اس نور پر جس کو ہم نے اتارا ہے۔ وہ خدا جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ جس دن وہ تم سب کو ایک جمع ہونے کے دن جمع کرے گا۔ یہی دن ہار جیت کا دن ہوگا اور جو شخص خدا پر ایمان لایا ہوگا۔ اور اس نے نیک عمل کیا ہوگا۔ خدا اس کے گناہ اس سے دور کر دے گا۔ اور اس کو باغوں میں داخل کرے گا۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہی ہے بڑی کامیابی (التغابن ۲-۹)

کسی شخص کو دنیا میں کامیابی مل جائے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اور جو شخص یہاں ناکامی سے دوچار ہو وہ لوگوں کی نظر میں حقیر بن کر رہ جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں کی ہار بھی بے قیمت ہے اور جیت بھی۔

ہار جیت کا اصل مقام آخرت ہے۔ ہارنے والا وہ ہے جو آخرت میں ہارے۔ اور جیتنے والا وہ ہے جو آخرت میں جیتے۔ اور وہاں کی ہار جیت کا معیار بالکل مختلف ہے۔ دنیا میں ہار جیت ظاہری مادیات کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اور آخرت کی ہار جیت خدائی معیار کی بنیاد پر ہوگی۔ اس وقت دیکھنے والے یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ یہاں سارا معاملہ بالکل بدل گیا ہے۔ جس پانے کو لوگ پانا سمجھ رہے تھے وہ دراصل کھونا تھا۔ اور جس کھونے کو لوگوں نے کھونا سمجھ رکھا تھا وہی دراصل وہ چیز تھی جس کو پانا کہا جائے۔

تخلیقی منصوبہ

قرآن کی سورہ نمبر ۶۷ میں ارشاد ہوا ہے کہ ——— (اے لوگو) بڑا بابرکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے۔ اور وہ زبردست ہے۔ بخشنے والا ہے۔ جس نے بنائے سات آسمان۔ اوپر تلے، تم رحمٰن کے بنانے میں کوئی خلل نہیں دیکھو گے۔ پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لو کیا تم کو کوئی خلل نظر آتا ہے۔ پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھو۔ نگاہ ناکام تھک کر تمہاری طرف واپس آجائے گی اور ہم نے قریب کے آسمانوں کو چراغوں سے سجایا ہے۔ اور ہم نے ان کو شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ اور ہم نے ان کے لیے دوزخ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جن لوگوں نے اپنے رب کا انکار کیا۔ ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔ اور وہ بُرا ٹھکانا ہے (الملک ۱-۶)

جب ایک شخص موجودہ دنیا کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کو یہاں بظاہر ایک تضاد نظر آتا ہے۔ انسان کے سوا جو بقیہ کائنات ہے وہ انتہائی حد تک منظم اور کامل ہے۔ اس میں کہیں کوئی نقص نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس انسانی زندگی میں ظلم و فساد نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ انسان کی علاحدہ نوعیت ہے۔ انسان اس دنیا میں حالتِ امتحان میں ہے۔ امتحان لازمی طور پر عمل کی آزادی چاہتا ہے اس عمل کی آزادی نے انسان کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ دنیا میں ظلم و فساد کر سکے۔

انسانی دنیا کا ظلم انسانی آزادی کی قیمت ہے۔ اگر یہ حالات نہ ہوں تو ان قیمتی انسانوں کا انتخاب کیسے کیا جائے گا۔ جنھوں نے ظلم کے مواقع پاتے ہوئے ظلم نہیں کیا، جنھوں نے سرکشی کی طاقت رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو سرکشی سے بچایا۔

انسان کے سوا کائنات میں جو دوسری چیزیں ہیں ان کے لیے نہ جنت ہے اور نہ جہنم ہوگی انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ انسان ایک ذمہ دار مخلوق ہے۔ انسان کو استثنائی طور پر حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت دی گئی ہے۔ حال کا یہ فرق مستقبل کے فرق کی ایک علامت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار انسان کا جائزہ لیا جائے گا۔ اور اس کے بعد امتحان میں کامیاب ہونے والوں کو انعام ملے گا۔ اور جو لوگ ناکام ہوں گے وہ سزا کے مستحق قرار پائیں گے۔

اندرونی شہادت

قرآن کی سورہ نمبر ۷۵ میں ارشاد ہوا ہے ——— نہیں، میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔ اور نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔ کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کریں گے۔ کیوں نہیں، ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کی پور پور تک درست کردیں۔ بلکہ انسان چاہتا ہے کہ ڈھٹائی کرے اس کے سامنے۔ وہ پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب آئے گا۔ پس جب آنکھیں خیرہ ہوجائیں گی۔ اور چاند بے نور ہوجائے گا۔ اور سورج اور چاند اکٹھا کردیے جائیں گے۔ اس دن انسان کہے گا کہ کہاں بھاگوں۔ ہرگز نہیں، کہیں پناہ نہیں۔ اس دن تیرے رب ہی کے پاس ٹھکانا ہے۔ اس دن انسان کو بتایا جائے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ بلکہ انسان خود اپنے آپ کو جانتا ہے، چاہے وہ کتنے ہی بہانے پیش کرے (القیامہ ۱۵-۱)

ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر ایک صلاحیت موجود ہے۔ اس کو نفس لوامہ یا ضمیر کہا جاتا ہے۔ یہ صلاحیت آدمی کے اندر آزادانہ طور پر کام کرتی ہے۔ وہ اس کی عقل اور اس کی خواہش دونوں سے غیر متاثر رہ کر بار بار اس کو یہ بتاتی ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔

یہ ضمیر گویا خدا کی عدالت ہے۔ وہ پیشگی طور پر انسان کو اس کی غلطیوں سے خبردار کرتی ہے۔ وہ بار بار اس کو بتاتی ہے کہ اس کے لیے درست رویہ کیا ہے اور غلط رویہ کیا ہے۔ اس کے باوجود انسان خدا سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ اس طرح زندگی گزارتا ہے جیسے کہ قیامت کا دن آنے والا نہیں ہے جب کہ اس سے اس کے قول وعمل کا حساب لیا جائے گا۔

جو آدمی اس قسم کا رویہ اختیار کرے وہ گویا خود اپنی فطرت کا انکار کر رہا ہے۔ خود اس کا اندرون اس کو آواز دیتا ہے مگر وہ اس کو سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا ضمیر پیشگی طور پر اس کے حق میں خدائی فیصلہ کا اعلان ہے۔ آدمی اگر اس آواز پر کان لگائے تو وہ موت سے پہلے ہی یہ جان لے گا کہ موت کے بعد اس کے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے۔

دو راستے

قرآن کی سورہ نمبر ۷۶ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— کبھی انسان پر زمانہ میں ایک وقت گزرا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ ہم نے انسان کو ایک مخلوط بوند سے پیدا کیا، ہم اس کو پلٹتے رہے۔ پھر ہم نے اس کو سننے والا، دیکھنے والا بنادیا۔ ہم نے اس کو راہ سجھائی چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا انکار کرنے والا۔ ہم نے منکروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔ نیک لوگ ایسے پیالے سے پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی، اس چشمہ سے خدا کے بندے پئیں گے۔ وہ اس کی شاخیں نکالیں گے۔ وہ لوگ واجبات کو پورا کرتے ہیں۔ اور ایسے دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی عام ہوگی۔ اور اس کی محبت پر کھانا کھلاتے ہیں۔ محتاج کو اور یتیم کو اور قیدی کو۔ ہم جو تم کو کھلاتے ہیں۔ تو خدا کی خوشی چاہنے کے لیے ہم نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکر گزاری۔ ہم اپنے رب کی طرف سے ایک سخت اور تلخ دن کا اندیشہ رکھتے ہیں۔ پس خدا نے ان کو اس دن کی سختی سے بچالیا۔ اور ان کو تازگی اور خوشی عطا فرمائی اور ان کے صبر کے بدلہ میں ان کو جنت اور ریشمی لباس عطا کیا (الدھر ۱-۱۲)

دنیا میں انسان کو آزاد پیدا کیا گیا۔ اور پھر اس کو راہ دکھادی گئی۔ ناشکری کی راہ اور شکر گزار زندگی کی راہ۔ اب یہ انسان کے اپنے اوپر ہے کہ وہ دونوں میں سے کون سی راہ اختیار کرتا ہے۔ جو شخص ناشکری کا طریقہ اختیار کرے اس کے لیے آخرت میں دوزخ کا عذاب ہے۔ اور جو شخص شکر گزاری کا طریقہ اختیار کرے اس کے لیے جنت کی نعمتیں۔

جو آدمی خدا کو پہچان لے، اسی کے ساتھ وہ تمام حقیقتوں کو بھی پہچان لیتا ہے۔ خدا کا علم اس کے اوپر دوسرے تمام علوم کے دروازے کھول دیتا ہے۔ وہ اگر ایک طرف خداشناس بنتا ہے تو دوسری طرف وہ پورے معنوں میں حقیقت شناس بھی بن جاتا ہے۔ اس کی یہ معرفت اس کو اس قابل بنادیتی ہے کہ وہ خدا کے حقوق بھی ادا کرے اور اسی کے ساتھ دوسرے انسانوں کے حقوق بھی۔

فطرت اور شریعت میں حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔

نظامِ خداوندی

قرآن کی سورہ نمبر ۷۹ میں ارشاد ہوا ہے —— کیا تمہارا بنانا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کا، اللہ نے اس کو بنایا۔ اس کی چھت کو بلند کیا۔ پھر اس کو درست بنایا۔ اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کے دن کو ظاہر کیا۔ اور زمین کو اس کے بعد پھیلایا۔ اس سے اس کا پانی اور چارہ نکالا۔ اور پہاڑوں کو قائم کر دیا، سامانِ حیات کے طور پر تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے۔ پھر جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا۔ جس دن انسان اپنے کیے کو یاد کرے گا۔ اور دیکھنے والوں کے سامنے دوزخ ظاہر کر دی جائے گی۔ پس جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی، تو دوزخ اس کا ٹھکانا ہوگا اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہش سے روکا، تو جنت اس کا ٹھکانا ہوگا۔ وہ قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب کھڑی ہوگی۔ تم کو کیا کام اس کے ذکر سے۔ یہ معاملہ تیرے رب کے حوالے ہے تم تو بس ڈرانے والے ہو اس شخص کو جو ڈرے۔ جس روز یہ اس کو دیکھیں گے تو گویا وہ دنیا میں نہیں ٹھہرے مگر ایک شام یا اس کی صبح (النازعات ۲۷-۴۶)

کائنات کی صورت میں جو واقعہ ہمارے سامنے موجود ہے وہ اتنا زیادہ بڑا ہے کہ اس کے بعد ہر دوسرا واقعہ اس سے چھوٹا ہو جاتا ہے۔ پھر جس دنیا میں بڑے واقعہ کا ظہور ممکن ہو وہاں چھوٹے چھوٹے واقعہ کا ظہور کیوں ممکن نہ ہوگا۔ ایسی حالت میں قرآن کی یہ خبر کہ انسان کو دوبارہ پیدا ہونا ہے ایک ایسی خبر ہے جس کو قابل فہم بنانے کے لیے پہلے ہی سے بہت بڑے پیمانے پر معلوم اسباب موجود ہیں۔

آدمی دو چیزوں کے درمیان ہے۔ ایک موجودہ دنیا جو سامنے ہے۔ اور دوسرے، آخرت کی دنیا جو غیب میں ہے۔ آدمی کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ موجودہ دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دے۔ مگر یہ کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے نفس کی خواہشوں پر کنٹرول کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

انسان کو موجودہ دنیا میں آزمائش کے لیے رکھا گیا ہے۔ آزمائش لازمی طور پر آزادی چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو کائنات کے بقیہ اجزا کی طرح مجبور نہیں کیا گیا۔ اس کو اختیار ہے کہ چاہے تو اپنے آپ کو نظامِ خداوندی کے مطابق بنائے۔ اور چاہے تو اس سے منحرف ہو جائے۔ مگر یہ آزادی صرف عمل کے لیے ہے نہ کہ انجام کے لیے۔ انسان کا آخری انجام بہرحال وہی ہونا ہے جو خدا کے محکم قانون کے مطابق اس کا ہونا چاہیے۔

نعمتِ طعام

قرآن کی سورہ نمبر ۸۰ میں ارشاد ہوا ہے ——— پس انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے کھانے کو دیکھے۔ ہم نے پانی برسایا اچھی طرح۔ پھر ہم نے زمین کو اچھی طرح پھاڑا۔ پھر اگائے اس میں غلے اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجور اور گھنے باغ اور پھل اور سبزہ، تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامان حیات کے طور پر۔ پس جب وہ کانوں کو بہرہ کر دینے والا شور برپا ہوگا۔ جس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے۔ ان میں سے ہر شخص کو اس دن ایسا فکر لگا ہوگا جو اس کو کسی اور طرف متوجہ نہ ہونے دے گا۔ کچھ چہرے اس دن روشن ہوں گے، ہنستے ہوئے، خوشی کرتے ہوئے۔ اور کچھ چہروں پر اس دن خاک اڑ رہی ہوگی۔ ان پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔ یہی لوگ منکر ہیں، ڈھیٹ ہیں (عبس ۴۲ - ۲۴)

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کو زندہ رہنے کے لیے مسلسل خوراک کی ضرورت ہے۔ اس خوراک کا انتظام ہماری زمین پر نہایت وسیع پیمانہ پر کیا گیا ہے، جب کہ اس انتظام میں ہمارا کوئی دخل نہیں۔ اس خوراک کا ایک انتظام وہ ہے جو ہمارے لیے زرعی پیداوار کی صورت میں کیا گیا ہے، زمین پر پانی کا انتظام اور پانی کے ذریعہ طرح طرح کے غلے اور میوے کا پیدا ہونا۔ اس زرعی پیداوار کی حیثیت ہمارے لیے براہ راست خوراک کی ہے۔ دوسری خوراک وہ ہے جس کو بالواسطہ طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ یعنی حیوانات کا زمینی پیداوار کو کھا کر اس کو گوشت کی صورت میں تبدیل کرنا۔

اس نعمت کا تقاضا ہے کہ انسان دنیا میں خدا پرست بن کر رہے۔ یہ خدا پرستی جو انسان سے مطلوب ہے اس کا محرک اصلاً شکر ہے۔ انسان اپنی تخلیق کو سوچے اور اپنے گردوپیش کے قدرتی انتظامات پر غور کرے تو لازماً اس کے اندر اپنے رب کے بارہ میں شکر کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اس شکر اور احسان مندی کے جذبہ کے تحت جس عمل کا ظہور ہوتا ہے اسی کا نام خدا پرستی ہے۔

آخرت کی عزتیں اور کامیابیاں صرف ایسے ہی لوگوں کا حصہ ہوں گی۔

ایھا الانسان

قرآن کی سورہ نمبر ۸۲ میں انسان کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے ـــــ اے انسان، تجھ کو کس چیز نے اپنے رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ جس نے تجھ کو پیدا کیا۔ پھر تیرے اعضا کو درست کیا۔ پھر تجھ کو متناسب بنایا۔ جس صورت میں چاہا تم کو ترتیب دے دیا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ تم انصاف کے دن کو جھٹلاتے ہو۔ حالاں کہ تم پر نگہبان مقرر ہیں۔ معزز لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔ بے شک نیک لوگ عیش میں ہوں گے۔ اور بے شک گنہ گار دوزخ میں۔ انصاف کے دن وہ اس میں ڈالے جائیں گے۔ وہ اس سے جدا ہونے والے نہیں۔ اور تم کو کیا خبر کہ انصاف کا دن کیا ہے۔ پھر تم کو کیا خبر انصاف کا دن کیا ہے۔ اس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے لیے کچھ نہ کر سکے گی۔ اور معاملہ اس دن اللہ ہی کے اختیار میں ہوگا (الانفطار ۶-۱۹)

انسان معلوم کائنات کی سب سے زیادہ بامعنی مخلوق ہے۔ انسان کو ایک ایسا جسم دیا گیا ہے، جو انتہائی حد تک موزوں ہے۔ اس کو ایک ایسا دماغ دیا گیا ہے، جس سے بہتر عطیہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اسی کے ساتھ جس دنیا میں انسان کو رکھا گیا ہے، وہ بھی ناقابل بیان حد تک انسانی ضروریات کے مطابق ہے۔

عطیہ ہمیشہ اپنے ساتھ ذمہ داری لاتا ہے۔ یہی فطری اصول انسان کے معاملہ میں بھی ہے۔ انسان کو جو غیر معمولی عطیہ ملا ہے وہ خود اس بات کا اعلان ہے کہ اس کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی جڑی ہوئی ہیں۔

وہ ذمہ داری یہ ہے کہ انسان خدا کی نعمتوں کو خدا کی امانت سمجھے۔ وہ خدا کے عطیات میں خدا کی مرضی کے مطابق تصرف کرے۔

انسان کی بامعنی تخلیق ایک انتہائی بامعنی مقصد کے لیے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک دن اس کو انصاف کی عدالت میں کھڑا کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کس نے خدا کی دی ہوئی چیزوں میں صحیح تصرف کیا۔ اور وہ کون ہے جو اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے میں ناکام رہا۔ یہ انصاف کا دن جو موت کے بعد آنے والا ہے، اس دن خدا تمام انسانوں کو اپنے ریکارڈ کے مطابق جانچے گا، اس جانچ میں جو لوگ پورے اتریں ان کے لیے جنت ہے، اور جو لوگ اس جانچ میں پورے نہ اتریں ان کے لیے جہنم۔

اے انسان

قرآن کی سورہ نمبر ۸۴ میں ارشاد ہوا ہے ـــــ جب آسمان پھٹ جائے گا اور وہ اپنے رب کا حکم سن لے گا اور وہ اسی لائق ہے۔ اور جب زمین پھیلا دی جائے گی۔ اور وہ اپنے اندر کی چیزوں کو اگل دے گی اور خالی ہو جائے گی۔ اور وہ اپنے رب کا حکم سن لے گی اور وہ اسی لائق ہے۔ اے انسان تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف جا رہا ہے۔ پھر اس سے ملنے والا ہے۔ تو جس کو اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا، اس سے آسان حساب لیا جائے گا۔ اور وہ اپنے لوگوں کے پاس خوش خوش آئے گا اور جس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا، وہ موت کو پکارے گا اور جہنم میں داخل ہوگا۔ وہ اپنے لوگوں میں بے غم رہتا تھا۔ اس نے خیال کیا تھا کہ اس کو لوٹنا نہیں ہے۔ کیوں نہیں۔ اس کا رب اس کو دیکھ رہا تھا۔ پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی۔ اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو وہ سمیٹ لیتی ہے۔ اور چاند کی جب وہ پورا ہو جائے۔ کہ تم کو ضرور ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر پہنچنا ہے۔ تو انھیں کیا ہو گیا کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ خدا کی طرف نہیں جھکتے۔ بلکہ منکرین جھٹلا رہے ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ جمع کر رہے ہیں۔ پس ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کیے ان کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے (الانشقاق ۲۵-۱)

یہاں قیامت سے متعلق جو بات کہی گئی ہے وہ بظاہر نامعلوم دنیا کے بارہ میں ایک خبر کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم ایسے شواہد موجود ہیں جو اس کی صداقت کا قرینہ پیدا کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال موجودہ دنیا ہے۔ ایک دنیا کی موجودگی خود اس بات کا ثبوت ہے کہ دوسری ایسی ہی یا اس سے بہتر دنیا وجود میں آسکتی ہے۔ دوسرے، قرآن میں ایسے غیر معمولی پہلوؤں کا موجود ہونا جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ خدا کی کتاب ہے۔

ان واضح قرائن کے بعد جو لوگ آخرت پر یقین نہ کریں اور آخرت فراموشی کی زندگی گزاریں وہ بلاشبہ ایک ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

مہلت کا لمحہ

قرآن کی سورہ نمبر ۸۶ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی۔ اور تم کیا جانو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے۔ چمکتا ہوا تارہ۔ کوئی جان ایسی نہیں ہے جس کے اوپر نگہبان نہ ہو۔ تو انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا۔ وہ ایک اچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔ جو نکلتا ہے پیٹھ اور سینے کے درمیان سے، بے شک وہ اس کے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ جس دن چھپی باتیں پرکھی جائیں گی۔ اس وقت انسان کے پاس کوئی زور نہ ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔ قسم ہے آسمان چکّر مارنے والے کی۔ اور پھوٹ نکلنے والی زمین کی۔ بے شک یہ دو ٹوک بات ہے۔ اور وہ ہنسی کی بات نہیں۔ وہ تدبیر کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور میں بھی تدبیر کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ پس منکروں کو ڈھیل دے، ان کو ڈھیل دے تھوڑے دنوں (الطارق ۱ – ۱۷)

انسان کے اوپر ستارہ کا چمکنا تمثیل کی زبان میں اس واقعہ کی ایک یاد دہانی ہے کہ کوئی دیکھنے والا اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہ دیکھنے والا انسان کے اعمال کو ریکارڈ کر رہا ہے۔ وہ موت کے بعد دوبارہ انسان کو پیدا کرے گا۔ اور اس سے اس کے تمام اعمال کا حساب لے گا۔ یہ صرف امتحان کی مہلت ہے۔ جو انسان کے درمیان اور آنے والے وقت کے درمیان حد فاصل بنی ہوئی ہے۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اس کا وہ انجام سامنے آجائے گا جس سے آج وہ بظاہر بہت دور نظر آتا ہے۔

کائنات کا خالق اپنی ذات کے اعتبار سے غیب میں ہے۔ مگر اپنے تخلیقی عمل کے اعتبار سے وہ کائنات کی ہر چیز میں نمایاں ہے۔ انسان اگر سنجیدگی کے ساتھ کائنات پر غور کرے تو وہ یقینی طور پر خدا کو پالے گا۔ وہ اس حقیقت کو جان لے گا کہ موجودہ کائنات میں اس کے لیے صرف خدا کی اطاعت کا رویہ درست ہے۔ خدا کے ساتھ سرکشی کرنے والے کے لیے خدا کی اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ مصنوع صانع کا تعارف ہے۔ اسی طرح مخلوقات میں دیکھنے والے کے لیے خالق کی جھلکیاں دیتی ہیں۔

پرچۂ امتحان

قرآن کی سورہ الفجر نمبر ۸۹ میں ارشاد ہوا ہے —— پس انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا رب اس کو آزماتا ہے اور اس کو عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو عزت دی۔ اور جب وہ اس کو آزماتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو ذلیل کر دیا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے۔ اور تم مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں ابھارتے۔ اور تم وراثت کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور تم مال سے بہت زیادہ محبت رکھتے ہو۔ ہرگز نہیں، جب زمین کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔ اور تمہارا رب آئے گا اور فرشتے آئیں گے قطار در قطار۔ اور اس دن جہنم لائی جائے گی، اس دن انسان کو سمجھ آئے گی۔ اور اب سمجھ آنے کا موقع کہاں۔ وہ کہے گا۔ کاش میں اپنی زندگی میں کچھ آگے بھیجتا پس اس دن نہ تو خدا کے برابر کوئی عذاب دے گا اور نہ اس کے باندھنے کے برابر کوئی باندھے گا اے نفس مطمئن، چل اپنے رب کی طرف۔ تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔ پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری جنت میں (الفجر ۳۰ – ۱۵)

دنیا میں آدمی کو دو قسم کے احوال پیش آتے ہیں۔ کبھی پانا اور کبھی محروم ہو جانا۔ یہ دونو حالتیں امتحان کے لیے ہیں۔ وہ اس جانچ کے لیے ہیں کہ آدمی کس حالت میں کون سا ردعمل پیش کرتا ہے۔ جس شخص کا معاملہ یہ ہو کہ جب اس کو کچھ ملے تو وہ فخر کرنے لگے اور جب اس سے چھینا جائے تو وہ منفی نفسیات میں مبتلا ہو جائے، ایسا شخص امتحان میں ناکام ہو گیا۔

دوسرا انسان وہ ہے کہ جب اس کو ملا تو اس نے خدا کے سامنے جھک کر اس کا شکر ادا کیا، جب اس سے چھینا گیا تو دوبارہ اس نے خدا کے آگے جھک کر اپنے عجز کا اقرار کیا۔ یہی دوسرا انسان جس کو یہاں نفس مطمئنہ کہا گیا ہے۔ یعنی مطمئن روح۔

دنیا میں آدمی کو مال کی صورت میں یا کسی اور صورت میں جو چیزیں ملتی ہیں وہ سب اس کے امتحان کا پرچہ ہیں۔ وہ بذات خود مطلوب نہیں ہیں بلکہ ایک اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ وہ مقصد یہ انسان ان چیزوں کو اس طرح استعمال کرے کہ وہ آئندہ آنے والی ابدی زندگی میں اس کی نجات کا ذریعہ بن سکیں

دو بلندیاں

قرآن کی سورہ نمبر ۹۰ میں ارشاد ہوا ہے ——— نہیں میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔ اور تم اس میں مقیم ہو۔ اور قسم ہے باپ کی اور اس کی اولاد کی۔ ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا زور نہیں۔ کہتا ہے کہ میں نے بہت سا مال خرچ کر دیا۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اس کو نہیں دیکھا۔ کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں۔ اور ایک زبان اور دو ہونٹ۔ اور ہم نے اس کو دونوں راستے بتا دیے۔ پھر وہ گھاٹی پر نہیں چڑھا۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ گھاٹی۔ گردن کو چھڑانا۔ یا بھوک کے زمانہ میں کھلانا، قرابت دار یتیم کو، یا خاک نشیں محتاج کو۔ پھر وہ ان لوگوں میں سے ہو جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو ہمدردی کی نصیحت کی۔ یہی لوگ نصیب والے ہیں۔ اور جو ہماری آیتوں کے منکر ہوئے وہ بدبختی والے ہیں، ان پر آگ چھائی ہوئی ہوگی (البلد ۲۰-۱)

انسان کسی حال میں اپنے آپ کو مشقتوں سے آزاد نہیں کر پاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کسی بالاتر قوت کے ماتحت ہے۔ اسی طرح انسان کی آنکھیں بتاتی ہیں کہ کوئی برتر آنکھ بھی ہے جو اس کو دیکھ رہی ہے۔ انسان کی قوت نطق اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اوپر بھی ایک صاحبِ نطق موجود ہے جس نے اس کو نطق کی صلاحیت دی۔ اور اس کو ہدایت کا راستہ دکھایا۔ آدمی اگر حقیقی معنوں میں اپنے آپ کو پہچان لے تو یقیناً وہ خدا کو بھی پہچان لے گا۔

خدا نے انسان کو دو قسم کی بلندیوں پر چڑھنے کا حکم دیا ہے۔ ایک انسان کے ساتھ منصفانہ سلوک اور انسان کی ضرورتوں میں اس کے کام آنا۔ دوسری چیز اللہ پر ایمان و یقین ہے۔ یہ ایمان و یقین جب آدمی کے اندر گہرائی کے ساتھ اترتا ہے تو وہ آدمی کی اپنی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ متعدی بن جاتا ہے۔ ایسا انسان دوسروں کو بھی اسی حق پر لانے کی کوشش کرنے لگتا ہے جس کو وہ خود اختیار کیے ہوئے ہے۔

خدائی اصولوں کے تحت زندگی گزارنا انسان کو مشکل معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ بظاہر مشکل اپنے اندر آسانی لیے ہوئے ہے کیونکہ وہ انسان کو ابدی نجات کی طرف لے جانے والی ہے۔

احسن تقویم

قرآن کی سورہ نمبر ۹۵ میں ارشاد ہوا ہے —— قسم ہے تین کی اور زیتون کی۔ اور طورِ سینا کی۔ اور اس امن والے شہر کی۔ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ پھر اس کو سب سے نیچے پھینک دیا۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے تو ان کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ تو اب کیا ہے جس سے تم بدلہ ملنے کو جھٹلاتے ہو۔ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں (التین ۸-۱)

تین اور زیتون دو پہاڑوں کے نام ہیں جو بیت المقدس کے قریب واقع ہیں۔ یعنی وہ مقام جہاں حضرت مسیح آئے اور لوگوں کے سامنے خدائی ہدایت کا اعلان کیا۔ طورِ سینین سے مراد وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ پر خدا نے اپنا کلام نازل فرمایا۔ بلدِ امین سے مراد مکہ ہے جہاں پیغمبر اسلام مبعوث ہوئے اور آپؐ پر خدا نے اپنا آخری ہدایت نامہ اتارا۔

یہ مقامات اس حقیقت کی تاریخی یادگار ہیں کہ خدا انسان کی نگرانی کر رہا ہے۔ وہ اپنی پسند اور ناپسند کا علم مستند ذریعہ سے اس کے پاس بھیجتا ہے۔ اس طرح خدا ہر ایک کو پیشگی طور پر یہ بتا رہا ہے کہ وہ اس دنیا میں کس قسم کی زندگی گزارے تاکہ وہ برے انجام سے بچ جائے۔ اور خدا کی ابدی نعمتوں میں اپنا حصہ پا سکے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہ صلاحیتیں اس لیے ہیں کہ انسان پیغمبروں کے ذریعہ ظاہر کیے جانے والے حق کو پہچانے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق بنائے۔ جو لوگ ایسا کریں وہ عزت اور بلندی کا ابدی مقام پائیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنی خداداد صلاحیتوں کو خدا کی مرضی کے تابع نہ کریں، ان سے موجودہ نعمتیں بھی چھین لی جائیں گی اور کامل محرومی کے سوا کوئی جگہ نہ ہوگی جہاں ان کو ٹھکانا مل سکے —— پیغمبروں کی بعثت اور پیغمبروں کے ذریعہ ظاہر ہونے والے نتائج اس کی صداقت کی گواہی دیتے ہیں۔

صرف اعلیٰ مقصد ہی انسان کی زندگی کا مقصد ہو سکتا ہے۔ وہ اعلیٰ مقصد یہ ہے کہ آدمی اپنی صلاحیتوں کے صحیح استعمال کے ذریعہ خدا کی معرفت حاصل کرے اور خدا کی پسند والی زندگی گزارے۔ ایسے لوگوں کے لیے خدا کے یہاں بہت بڑا انعام ہے۔ جو لوگ اس معیار پر پورے نہ اتریں ان کا انجام کامل گھاٹے کے سوا اور کچھ نہیں۔

کتاب ہدایت

قرآن کی سورہ نمبر ۹۶ میں ارشاد ہوا ہے —— پڑھ اپنے رب کے نام سے۔ جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو علق سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا۔ ہرگز نہیں، انسان سرکشی کرتا ہے۔ اس بنا پر کہ وہ اپنے کو بے نیاز دیکھتا ہے۔ بے شک تیرے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے (العلق ۸-۱)

یہ قرآن کی وہ آیتیں ہیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے اتاری گئیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے پیغمبروں پر وحی بھیجنے کا جو طریقہ اختیار فرمایا اس کا مقصد کیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو وہ بات بتائی جائے جس سے انسان عام حالات میں باخبر نہیں ہو سکتا تھا۔

موجودہ دنیا میں انسان بظاہر آزاد ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ انسان کی کوئی پکڑ نہیں۔ موجودہ دنیا میں انسان کچھ دن زندہ رہ کر مر جاتا ہے۔ اس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ انسان کی زندگی، بس پیدائش سے موت تک ہے، اس کے آگے اور کچھ نہیں۔

اسی بے خبری کو توڑنے کے لیے خدا نے وحی اور رسالت کا سلسلہ قائم کیا۔ ہر دور میں اور ہر قوم میں خدا کی طرف سے پیغمبر آتے رہے۔ یہاں تک کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے جو آخری نبی ہیں۔ اور اب وہی قیامت تک کے لوگوں کے لیے ہدایت حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔

یہ پیغمبرانہ خبر، یہ ہے کہ انسان موجودہ دنیا میں آزاد نہیں ہے کہ اپنی مرضی سے جو چاہے کرے۔ اس کو اپنے تمام معاملات میں خدا کے ان حکموں کی پابندی کرنی ہے جو پیغمبر کے ذریعہ اس کو دیے گئے ہیں۔

خدا نے صرف خبر دے کر انسان کو چھوڑ نہیں دیا ہے بلکہ وہ اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ موت کے بعد تمام انسان خدا کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ اور پھر ہر ایک کے لیے اس کے دنیوی ریکارڈ کے مطابق سزا یا انعام کا فیصلہ سنایا جائے گا۔ انسان کی ہدایت کے لیے اصل اہمیت نبی کی ذاتی موجودگی نہیں ہے بلکہ اس کی لائی ہوئی کتاب کی موجودگی ہے۔ خدا کی کتاب، قرآن چونکہ محفوظ حالت میں موجود ہے اور پیغمبر کی سنت بھی مدون حالت میں موجود ہے اس لیے اب کسی انسان کے لیے کوئی عذر نہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ کتاب وسنت سے ہدایت لے کر اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔ اور خدا کی ابدی رحمتوں کا مستحق بن جائے۔

ایک بھونچال

قرآن کی سورہ نمبر ۹۹ میں ارشاد ہوا ہے ـــــ جب زمین شدت سے ہلادی جائے گی۔ اور زمین اپنا بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی۔ اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہوا۔ اس دن وہ اپنے حالات بیان کرے گی۔ کیوں کہ تمہارے رب کا اس کو یہی حکم ہوگا۔ اس دن لوگ الگ الگ نکلیں گے۔ تاکہ ان کے اعمال دکھائے جائیں۔ پس جس شخص نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس شخص نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا (الزلزال ۸-۱)

قیامت کا زلزلہ مدت امتحان کے ختم ہونے کا اعلان ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اب لوگوں سے وہ آزادی چھن گئی جو امتحان کی مصلحت کی بنا پر انھیں حاصل تھی۔ اب وہ وقت آگیا جب لوگوں کو ان کے عمل کا بدلا دیا جائے۔ آج خدا کی دنیا بظاہر خاموش ہے۔ مگر جب حالات بدلیں گے تو یہاں کی ہر چیز بولنے لگے گی۔ موجودہ زمانہ کی ایجادات نے ثابت کیا ہے کہ بے جان چیزیں بھی "بولنے" کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اسٹوڈیو میں کیے ہوئے عمل کو فلم اور ریکارڈ پوری طرح دہرا دیتے ہیں۔ اسی طرح موجودہ دنیا گویا بہت بڑا خدائی اسٹوڈیو ہے۔ اس کے اندر انسان جو کچھ کرتا ہے یا جو کچھ بولتا ہے وہ سب ہر لمحہ محفوظ ہو رہا ہے۔ اور جب وقت آئے گا تو ہر ایک کی کہانی کو یہ دنیا اس طرح دہرا دے گی کہ اس کی کوئی بھی بات اس سے چھپی ہوئی نہ ہوگی، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی۔

دنیا میں انسان کے رویہ کو درست کرنے کے لیے صرف ایک ہی چیز کافی ہے۔ آدمی کو اس بات کا پختہ شعور ہو جائے کہ وہ ہر لمحہ خدا کی نگرانی میں ہے۔ اس کا پورا کارنامۂ حیات خدا کی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ چھوٹا عمل ہو یا بڑا عمل، چھپ کر کیا ہوا کام یا اعلانیہ کیا ہوا کام، سب کا سب وہاں سامنے آجائے گا۔

آدمی کو اس حقیقت کا پورا یقین ہو جائے تو زمین کے ہلائے جانے سے پہلے وہ خود ہل جائے گا۔ قیامت کے عام زلزلہ سے پہلے خود اس کی اپنی روح میں ایک ایسا زلزلہ آجائے گا جو اس کو آخری حد تک بدل کر رکھ دے۔ اس کے بعد آدمی خود اپنا نگراں بن جائے گا۔ وہ آزاد زندگی کے بجائے پابند زندگی اختیار کرے گا۔ وہ اپنے اختیار کو خدا کے حکم کے تحت استعمال کرے گا نہ کہ آزادانہ طور پر۔

موت کے بعد

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۰ میں ارشاد ہوا ہے ــــــ قسم ہے ان گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں۔ پھر ٹاپ مار کر چنگاری نکالنے والے۔ پھر صبح کے وقت چھاپہ مارنے والے۔ پھر اس میں غبار اڑانے والے۔ پھر اس وقت فوج میں گھس جانے والے۔ بے شک انسان اپنے رب کا شکر نہیں کرتا۔ اور وہ خود اس پر گواہ ہے۔ اور وہ مال کی محبت میں بہت شدید ہے۔ کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب وہ قبروں سے نکالا جائے گا۔ اور نکالا جائے گا جو کچھ دلوں میں ہے۔ بے شک اس دن ان کا رب ان سے خوب باخبر ہوگا (العٰدیٰت ۱۱-۱)

گھوڑا ایک نہایت وفادار جانور ہے۔ وہ اپنے مالک کے لیے اپنے آپ کو آخری حد تک قربان کر دیتا ہے، حتیٰ کہ جنگ کے میدان میں بھی وہ اپنے مالک کا ساتھ نہیں چھوڑتا خواہ اس میں اس کی جان چلی جائے۔

یہ گویا ایک علامتی مثال ہے جو انسان کو بتاتی ہے کہ اسے کیسا بننا چاہیے۔ انسان کو بھی اپنے رب کا اسی طرح وفادار بننا چاہیے جیسا کہ گھوڑا انسان کا وفادار ہوتا ہے۔ مگر عملاً ایسا نہیں۔

اس دنیا میں جانور اپنے مالک کا شکر گزار ہے۔ مگر انسان اپنے رب کا شکر گزار نہیں۔ یہاں جانور اپنے مالک کا حق پہچانتا ہے۔ مگر انسان اپنے رب کا حق نہیں پہچانتا۔ یہاں جانور اپنے مالک کی اطاعت میں سرگرم ہے۔ مگر انسان اپنے رب کی اطاعت میں سرگرم نہیں۔

انسان اسی جانور کی قدر کرتا ہے جو اس کا وفادار ہو۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ اس راز کو نہ جانے کہ خدا کے یہاں وہی انسان قابل قدر ٹھہرے گا جو خدا کی نظر میں اس کا وفادار ثابت ہو۔ مگر مال کی محبت انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔ وہ ایک ایسی حقیقت کو جاننے سے محروم رہتا ہے۔ جس کا وہ خود اپنے قریبی حالات میں تجربہ کر چکا تھا۔

یہ صورت حال اسی طرح باقی رہنے والی نہیں۔ انسان کی موت اس بات کا الارم ہے کہ وہ مکمل طور پر خدا کی پکڑ میں ہے۔ موت دراصل، حساب و کتاب کی دنیا میں داخلہ کا دروازہ ہے۔ وہاں انسان کو اس خدا کی عدالت کے سامنے کھڑا ہونا ہے جس سے انسان کی کوئی بھی بات چھپی ہوئی نہیں۔

باوزن عمل

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ ——— (اے لوگو) کھڑکھڑانے والی۔ کیا ہے کھڑکھڑانے والی۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی۔ جس دن لوگ پتنگوں کی طرح بکھرے ہوئے ہوں گے۔ اور پہاڑ دھنے ہوئے رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے۔ پھر جس شخص کا پلہ بھاری ہوگا وہ دل پسند آرام میں ہوگا۔ اور جس شخص کا پلہ ہلکا ہوگا تو اس کا ٹھکانا گڑھا ہے۔ اور تم کیا جانو کہ وہ کیا ہے۔ بھڑکتی ہوئی آگ (القارعہ ۱۔ ۱۱)

قیامت کا بھونچال ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا۔ لوگوں کے تمام استحکامات درہم برہم ہو جائیں گے۔ اس کے بعد ایک نیا عالم بنے گا۔ جہاں سارا وزن صرف حق میں ہوگا۔ بقیہ تمام چیزیں اپنا وزن کھو دیں گی۔ موجودہ دنیا میں انسانوں کی پسند کا رواج ہے۔ یہاں انسانوں کی نسبت سے چیزوں کا وزن قائم ہوتا ہے۔ آخرت کی دنیا خدا کی دنیا ہے۔ وہاں خدا کی پسند کے اعتبار سے ایک چیز وزن دار ہوگی اور دوسری چیز بالکل بے وزن ہو کر رہ جائے گی۔

دنیا میں اعمال کا وزن ظاہر کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ آخرت میں اعمال کا وزن ان کی اندرونی حقیقت کے اعتبار سے ہوگا۔ جس آدمی کے عمل میں جتنا زیادہ اخلاص ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ وزنی قرار پائے گا۔ جو عمل اخلاص سے خالی ہو وہ آخرت میں بالکل بے وزن ہو کر رہ جائے گا۔ خواہ موجودہ دنیا میں ظاہر بینوں کو وہ کتنا ہی زیادہ باوزن دکھائی دے رہا ہو۔

موجودہ دنیا میں وہ عمل وزنی بنتا ہے جس میں دنیوی حالات کی رعایت شامل ہو، جو وقت کے رواج سے مطابقت رکھتا ہو، جو وقت کی سماجی روایات میں قابل لحاظ بن گیا ہو، جو لوگ اس طرح کے عمل کا ثبوت دیں وہ دنیا کے ماحول میں عظمت اور وقار کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔

آخرت کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہوگا۔ وہاں با اصول زندگی باوزن قرار پائے گی۔ وہاں اعلیٰ معیار کے مطابق کیا ہوا عمل قابل لحاظ سمجھا جائے گا۔ وہاں وقتی مصلحت کے بجائے ساری اہمیت اس عمل کو حاصل ہو جائے گی جو اپنے اندر ابدی اقدار کی صفت رکھتا تھا۔

دنیا میں باطل بھی باوزن دکھائی دے سکتا ہے۔ لیکن آخرت میں حق کے سوا کسی چیز میں وزن نہ ہوگا

مادی دوڑ

قرآن کی سورہ نمبر۱۰۲ میں ارشاد ہوا ہے ــــــ (اے لوگو) زیادہ کی حرص نے تم کو غفلت میں رکھا، یہاں تک کہ تم مر کر قبروں میں جا پہنچے، ہرگز نہیں، تم بہت جلد جان لوگے۔ پھر ہرگز نہیں، تم بہت جلد جان لوگے۔ ہرگز نہیں۔ کاش تم یقین کے ساتھ جانتے، کہ تم ضرور دوزخ کو دیکھو گے۔ پھر تم اس کو یقین کی آنکھ سے دیکھو گے۔ پھر اس دن تم سے نعمتوں کے بارے میں پوچھ ہو گی (التکاثر ۱ - ۸)

موجودہ دنیا طرح طرح کی مادی چیزوں کا ایک وسیع دستر خوان ہے، یہ چیزیں دنیا میں امتحان کے لیے رکھی گئی ہیں نہ کہ آزادانہ استفادہ کے لیے۔ آدمی اگر ان چیزوں کو امتحان کی نظر سے دیکھے تو وہ بقدر ضرورت ان کو حاصل کرے گا اور احتیاط اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ ان کو استعمال کرے گا۔

لیکن آدمی عام طور پر ذمہ دارانہ رویہ پر قائم نہیں رہ پاتا۔ مادی چیزوں کی کشش اس کو اپنی طرف اس طرح کھینچتی ہے کہ وہ ان ہی کی طرف دوڑ پڑتا ہے مزید یہ کہ اس کی حرص کہیں نہیں رکتی۔ وہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے وہ اپنے پورے وجود کو دنیا کی کمائی میں مشغول کر دیتا ہے۔ وہ اسی حال میں اپنے صبح و شام بسر کرتا ہے یہاں تک کہ اس کی موت کا وقت آجاتا ہے، وہ اپنی زندگی بھر کی کمائی کو موجودہ دنیا میں چھوڑ کر آخرت کی دنیا میں چلا جاتا ہے۔ اس وقت اچانک وہ اپنے آپ کو اس حال میں پاتا ہے کہ اس کے پاس ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں جو زندگی کے اگلے مرحلے میں اس کے کام آسکے۔ آدمی چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کمائے، وہ زیادہ سے زیادہ ساز و سامان اپنے پاس جمع کرے۔ وہ اسی دھن میں لگا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی موت آجاتی ہے۔ اس وقت اس کو معلوم ہوتا ہے کہ جمع کرنے کی چیز تو دوسری تھی اور میں کسی اور چیز کو جمع کرنے میں مصروف رہا۔

دنیا کی چیزوں کا اضافہ صرف آدمی کی مسئولیت کو بڑھاتا ہے۔ اور آدمی اپنی نادانی سے یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی کامیابی میں اضافہ کر رہا ہے۔

زمانہ گواہ ہے

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۳ میں ارشاد ہوا ہے ——— زمانہ گواہ ہے۔ بے شک انسان گھاٹے میں ہے۔ مگر جو لوگ کہ ایمان لائے اور نیک عمل کیا اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی (العصر ۳-۱)

انسان ایک مخصوص زمانہ میں پیدا ہوتا ہے۔ زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی عمر آگے بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ زمانہ کی اس حد پر پہنچ جاتا ہے جو اس کی عمر کی آخری حد ہے۔ اب اس پر موت آجاتی ہے۔ انسانی زندگی کی یہ نوعیت بتاتی ہے کہ وہی انسان کامیاب ہے جو اپنے ملے ہوئے وقت کو استعمال کر سکے۔ ورنہ وقت گزر جائے گا اور آخر میں اس کے حصہ میں کچھ نہ ہوگا۔

آدمی ہر لمحہ اپنی موت کی طرف جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اگر اپنی مہلتِ عمر کو استعمال نہ کرے تو آخر کار اس کے حصہ میں جو چیز آئے گی وہ صرف محرومی ہے۔ کامیاب ہونے کے لیے آدمی کو خود عمل کرنا ہے جبکہ ناکامی کے لیے کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے آپ اس کی طرف بھاگی چلی آرہی ہے۔

ایک بزرگ نے کہا کہ سورہ عصر کا مطلب میں نے ایک برف بیچنے والے سے سمجھا جو بازار میں آواز لگا رہا تھا کہ لوگو، اس شخص پر رحم کرو جس کا اثاثہ گھل رہا ہے۔ لوگو، اس شخص پر رحم کرو جس کا اثاثہ گھل رہا ہے۔ اس پکار کو سن کر میں نے اپنے دل میں کہا کہ جس طرح برف پگھل کر کم ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح انسان کو ملی ہوئی عمر بھی تیزی سے گزر رہی ہے۔ عمر کا موقع اگر بے عملی میں یا برے کاموں میں کھو دیا جائے تو یہی انسان کا گھاٹا ہے (تفسیر کبیر امام رازی)

اپنے وقت کو صحیح استعمال کرنے والا وہ ہے جو موجودہ دنیا میں تین باتوں کا ثبوت دے۔ ایک ایمان یعنی حقیقت کا شعور اور اس کا اعتراف۔ دوسرے عمل صالح یعنی وہی کرنا جو کرنا چاہیے اور وہ نہ کرنا جو نہیں کرنا چاہیے۔ تیسرے حق وصبر کی تلقین یعنی حقیقت کا اتنا گہرا ادراک کہ آدمی اس کا داعی اور مبلغ بن جائے۔

اس دنیا میں ایک کامیاب زندگی پانے کے لیے صبر لازمی طور پر ضروری ہے۔ آدمی جب خلافِ ایمان باتوں کا چھوڑنا برداشت کرتا ہے، اسی وقت اس کو ایمان کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ جب وہ اپنی خواہشوں پر بریک لگاتا ہے، اسی وقت عمل صالح کو اختیار کرنا اس کے لیے ممکن ہوتا ہے۔ جب وہ لوگوں کی طرف سے پیش آنے والی ناخوشگواریوں پر صبر کرتا ہے۔ اسی وقت وہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو حق کی نصیحت کر سکے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, Near DESU,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic.@axcess.net.in.

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY
MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi, Printed at Nice Printing Press, Delhi.

جولائی ۱۹۹۶ ، شمارہ ۲۴۸

فہرست — صفحہ

اسلامی جہاد

جہاد کیا ہے۔ جہاد پر امن جدوجہد کا دوسرا نام ہے۔ آج کل کی زبان میں جہاد کو پیس فل ایکٹوزم (peaceful activism) کہا جاسکتا ہے۔ یعنی پر امن ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے کسی اعلیٰ مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔

جہاد کے لفظی معنی کوشش یا جدوجہد کے ہیں۔ قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ خدا کی کتاب کے ذریعہ ان کے اوپر جہاد کبیر کرو (الفرقان ۵۲) ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت کے لیے اپنے نفس سے مقابلہ کرے (المجاھد من جاھد نفسہ فی طاعۃ اللہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس آئے۔ یہ ایک مہم تھی جس میں کوئی جنگ پیش نہیں آئی۔ واپسی کے بعد آپ نے فرمایا کہ ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف واپس آئے ہیں (رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر)

جہاد تمام تر ایک پر امن عمل کا نام ہے۔ انفرادی اعتبار سے جہاد یہ ہے کہ آدمی نفس کی ترغیبات سے اور ماحول کی ناخوش گواریوں کے باوجود خدا کے پسندیدہ راستہ کو نہ چھوڑے۔ مخالف اسباب کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو حق کی روش پر قائم رکھے۔ اجتماعی اعتبار سے جہاد کو پر امن جدوجہد کہا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی اسلامی مقصد کے لیے جب کوئی تحریک اٹھائی جائے تو اس کو مجاہدانہ انداز سے آگے بڑھایا جائے نہ کہ متشددانہ انداز سے۔ متشددانہ انداز میں آدمی طاقت پر بھروسہ کرتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مجاہدانہ انداز یہ ہے کہ ترغیب کے فطری طریقہ کو استعمال کرتے ہوئے اپنے مقصد کو حاصل کیا جائے۔

مجاہدانہ اسلوب میں سب سے زیادہ اعتماد ذہنی بیداری پر کیا جاتا ہے۔ لوگوں کے اندر صحت مند اسپرٹ جگائی جاتی ہے۔ تعمیری شعبوں میں مثبت استحکام پر ابھارا جاتا ہے۔ یہ کوشش کی جاتی ہے کہ لوگوں کے اندر اعلیٰ کردار پیدا ہو۔ لوگ دوسروں کے لیے نفع بخش بنیں۔ لوگوں کے اندر دوسروں کے لیے ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ پیدا ہو۔ جہاد کا ہتھیار محبت ہے نہ کہ نفرت اور تشدد۔

توجیہہ کا فتنہ

غلطی کی ایک قسم وہ ہے جس کو قرآن میں لمم کہا گیا ہے (النجم ۳۲) غلطی کی دوسری قسم وہ ہے جس کے لیے قرآن میں تزئین اعمال کے الفاظ آئے ہیں (الانعام ۱۲۲) پہلی قسم سے مراد وہ غلطی ہے جو بشری کمزوری کی بنا پر اتفاقاً پیش آئے۔ اور دوسری قسم سے مراد وہ غلطی ہے جو خوب صورت توجیہہ اور خوشنما تاویل کے تحت کی گئی ہو۔

غلطی کرنا برا نہیں ہے۔ اصل غلطی یہ ہے کہ آدمی غلطی کرنے کے بعد اس پر اصرار کرنے لگے (آل عمران ۱۳۵) کوئی آدمی جب بشری تقاضے کے تحت غلطی کرتا ہے تو وہ اس کو اپنے وقار کا مسئلہ نہیں بناتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا آدمی آسانی کے ساتھ اپنی غلطی کو مان لیتا ہے۔ وہ بہت جلد اس کی تلافی کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں توبہ کر کے اپنی غلطی کی اصلاح کر لیتا ہے۔

لیکن دوسری قسم کے انسان کا معاملہ یکسر مختلف ہے۔ ایسا آدمی غلطی کو غلطی سمجھ کر نہیں کرتا بلکہ اس کے پاس اپنے عمل کے حق میں دلائل کا سرمایہ ہوتا ہے، مثلاً اپنی خود ساختہ لڑائی کو بتانے کے لیے اس کے پاس جہاد فی سبیل اللہ کا نعرہ ہوتا ہے۔ اپنی تخریبی سیاست کے حق میں وہ نفاذِ اسلام جیسے خوب صورت الفاظ پائے ہوئے ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے جسم کے ساتھ بم باندھ کر خودکشی کرنے کے لیے بھی اس کو استشہاد (طلب شہادت) جیسی پرفخر تاویل مل جاتی ہے۔ وہ اپنے منفی عمل کو درست ثابت کرنے کے لیے مثبت تشریحات کا سہارا لیے ہوئے ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس دوسری قسم کے لوگ بہت مشکل سے اس کے لیے تیار ہوتے ہیں کہ وہ اپنی غلطی کو مانیں۔ حتیٰ کہ ان کے غلط اقدام کے نتیجہ میں پیش آنے والی تباہی بھی انھیں اپنی غلطی کے اعتراف پر مجبور نہیں کرتی۔ ایسے لوگ عین اپنی نفسیات کی بنا پر اعتراف کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ ان کے لیے رائے کی یہ قربانی جان کی قربانی سے بھی زیادہ مشکل ہوتی ہے، کیوں کہ جان کی قربانی آدمی کو ہیرو بناتی ہے اور رائے کی قربانی میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ آدمی لوگوں کے درمیان اچانک زیرو ہو کر رہ جائے گا۔ مقبولیت کھونے کا خوف اکثر حالات میں لوگوں کے لیے قبول حق میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

تدبیر خندق

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں جس واقعہ کو غزوۂ خندق کہا جاتا ہے وہ حقیقۃً تدبیر خندق ہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ یہ معروف معنوں میں کوئی غزوہ نہ تھا بلکہ وہ غزوہ یا مڈبھیڑ سے بچنے کی ایک کامیاب تدبیر تھی۔

اس موقع پر عرب کے مختلف قبائل بارہ ہزار کی تعداد میں اکٹھا ہو کر مدینہ کی سرحد پر آ گئے۔ اس وقت آپؐ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ سلمان فارسیؓ نے اپنی معلومات کی روشنی میں بتایا کہ ایران کے بادشاہ جب جنگ سے اعراض کرنا چاہتے ہیں تو وہ اپنے اور دشمن کے درمیان خندق کھود دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشورہ کو پسند فرمایا اور رات دن کی محنت سے ایک لمبی خندق کھود دی۔ اس طرح فریق مخالف کی پیش قدمی خندق کے دوسری طرف رک گئی اور دونوں فریقوں کے درمیان مڈبھیڑ کی نوبت نہیں آئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ غزوۂ خندق دراصل ایک دانش مندانہ تدبیر تھی۔ اس کا مقصد اپنے اور فریق مخالف کے درمیان ایک حاجز (buffer) قائم کرنا تھا تاکہ ٹکراؤ اور خوں ریزی کے بغیر صورت حال سے نپٹا جاسکے۔

اس معاملہ میں "خندق" کی حیثیت علامتی ہے۔ حالات کے لحاظ سے اس نوعیت کے دوسرے حاجز بھی اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً فرقہ وارانہ جلوس اگر آپ کے علاقہ میں آکر اشتعال انگیزی کرے تو خود سامنے نہ آکر پولیس کو بلایا جائے اور اپنے اور جلوس کے درمیان پولیس کو حاجز (بفر) بنا دیا جائے۔ اسی طرح دو فریقوں کے درمیان نزاع پیدا ہونے کے بعد اگر معاملہ کو سلجھانے کے لیے ثالثی بورڈ کو استعمال کیا جائے تو اس بورڈ کی حیثیت بھی گویا کہ ایک بفر کی ہوگی۔

مڈبھیڑ سے بچنا اور اپنے اور مخالف فریق کے درمیان کسی تیسری چیز کو بفر بنانا بھی پیغمبر اسلام کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ یہ سنتِ تدبیر بھی اتنی ہی اہم اور مقدس ہے جتنی کہ پیغمبر کی دوسری سنتیں۔

امن اور رزق

قرآن کی سورہ نمبر۱۶ میں ارشاد ہوا ہے کہ۔ اور اللہ ایک بستی والوں کی مثال بیان کرتا ہے کہ وہ امن واطمینان میں تھے۔ ان کو ان کا رزق فراغت کے ساتھ ہر طرف سے پہنچ رہا تھا۔ پھر انھوں نے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے ان کو بھوک اور خوف کا مزہ چکھایا ان کے اعمال کے سبب سے (النحل ۱۱۲)

دنیا بھر میں فطری طور پر جو نظام قائم کیا گیا ہے اس کے مطابق دو چیزیں آسانی کے ساتھ انسان کو مل جاتی ہیں۔ ایک امن اور دوسرے رزق۔ اگر انسان ان دو چیزوں کے ملنے پر قانع ہو جائے تو وہ نہایت آسانی کے ساتھ آسودہ زندگی کو حاصل کرے گا۔ مگر انسان کی طلب پسندی اس کو تیسری چیز کی طرف دوڑاتی ہے اور وہ اقتدار ہے۔ یہی اقتدار کی حرص وہ چیز ہے جو سماجوں میں فساد پیدا کرتی ہے۔

کسی انسانی سماج میں اگر ایسے حالات ہوں کہ لوگوں کو امن حاصل ہو اور رزق کی سرگرمیاں کسی رکاوٹ کے بغیر جاری ہوں تو گویا کہ انھیں ان کی بنیادی ضرورتیں حاصل ہو گئیں۔ اگر وہ ان دو چیزوں کے ملنے پر راضی ہو جائیں تو وہ اس چیز کو پالیں گے جس کو آسودہ زندگی کہا جاتا ہے۔ ان دو بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے بعد جو لوگ اقتدار کا جھگڑا کریں وہ خدا کی نظر میں سرکش ہیں۔ وہ کفرانِ نعمت کے مجرم ہیں۔ یعنی فطرت کے نقشہ پر راضی نہ ہونا اور اپنی خواہش کے مطابق فطرت کا نیا نقشہ بنانے کی کوشش کرنا۔

موجودہ دنیا میں کسی انسان کے لیے اصل اہمیت کی چیز یہ ہے کہ وہ حق کی معرفت حاصل کرے۔ وہ خدا کا تابعدار بن کر زندگی گزارے۔ وہ اپنے اندر اس ربانی شخصیت کی پرورش کرے جو آخرت میں جنت کی لطیف دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہو۔ یہ مواقع جب آدمی کو حاصل ہو جائیں تو اس کے بعد اس کی ساری فکر اس کے استعمال پر مرتکز ہو جانی چاہیے نہ یہ کہ وہ ان کے سوا کسی اور چیز کو اپنا مطلوب بنا کر اس کے پیچھے دوڑنے لگے۔

نئی لہر

نیویارک کے ٹائم میگزین (۲۳ ستمبر ۱۹۹۶) کی کور اسٹوری جدید اسلامی تحریکوں کے بارے میں تھی۔ اس کا عنوان تھا: اسلام کا نیا چہرہ۔

The New Face of Islam

اس میں بتایا گیا تھا کہ موجودہ زمانہ میں اٹھنے والی انتہا پسند تحریکیں اب جگہ جگہ امن کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ مثلاً ملیشیا کے انور ابراہیم ابتداءً الاخوان المسلمون کے اثر سے انتہا پسند مسلم نوجوان بن گئے۔ مگر اپنے ملیشیائی مزاج کی بنا پر جلد ہی انھوں نے انتہا پسندی چھوڑ دی اور ملیشیائی لیڈر ماتر محمد کے ساتھ مل کر تعمیری سیاست کے میدان میں سرگرم ہو گئے۔

ستمبر ۱۹۸۹ میں طرابلس (لیبیا) میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ یہاں میری ملاقات فلپائن کے انقلابی لیڈر مسٹر نور مسواری (Nur Misvari) سے ہوئی۔ اس کی تفصیل الرسالہ جنوری ۱۹۹۰ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں انھوں نے انگریزی میں ایک پر جوش تقریر کی۔ انھوں نے بتایا کہ فلپائن کے جنوبی علاقہ میں ہم آزادی کی جو لڑائی لڑ رہے ہیں اس میں اب تک ۱۲۵ ہزار مسلمان اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں۔

نور مسواری اور ان کے ساتھیوں نے اپنی یہ خونیں تحریک ۱۹۷۱ میں شروع کی تھی۔ آخر کار جان و مال کی زبردست تباہی کے بعد نور مسواری نے تشدد کو چھوڑ کر امن کا طریقہ اختیار کر لیا۔ انھوں نے فلپائن کے جنوبی حصہ کی آزادی کے مطالبہ کو ترک کر دیا اور حالت موجودہ (statusquo) پر راضی ہو گئے۔ اس کے نتیجہ میں انھیں جنوبی فلپائن کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔

یہی صورت حال فلسطین سے لے کر بوسنیا تک ہر اس جگہ پیش آ رہی ہے جہاں مسلمانوں نے ابتداءً پر تشدد تحریک شروع کی مگر ہولناک نتائج نے مجبور کر دیا کہ وہ تشدد کو چھوڑ دیں اور امن کا طریقہ اختیار کر لیں۔

ٹائم کے مذکورہ شمارہ میں بتایا گیا ہے کہ چند سال قبل مسٹر نور مسواری خفیہ طور پر ملیشیائی لیڈر ماتر محمد اور انور ابراہیم سے ملے۔ انور ابراہیم نے ٹائم کے نامہ نگار کو اس ملاقات کی تفصیل

بتاتے ہوئے کہا کہ ہم نے فلپائن کے باغی لیڈر سے پرزور تاکید کی کہ وہ جنگ کا طریقہ چھوڑ دیں۔ ہم نے انھیں بتایا کہ ایک ہی ممکن صورت ہے اور وہ امن ہے :

We told him the only option was peace. p. 20

نورمسواری اب مکمل طور پر بدل چکے ہیں۔ جس علاقہ کو پہلے وہ مسلم اسٹیٹ کی شکل دینا چاہتے تھے اب وہ اس پر راضی ہو گئے ہیں کہ وہ اس کو عیسائیوں اور مسلمانوں کے مشترک ملک کے طور پر قبول کریں اور دونوں کی یکساں ترقی کے آرزومند ہوں۔

نورمسواری نے "انقلابی طریقہ" اختیار کیا تو وہ ۲۵ سال میں تباہی کے سوا اور کوئی مثال قائم نہ کر سکے۔ انور ابراہیم نے مصالحانہ انداز اختیار کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملیشیا میں نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو اقتصادی خوش حالی ملی بلکہ وہاں دینی ترقیاں بھی ہوئیں جس کی ایک علامت کوالالمپور کی وہ مسجد ہے جو دنیا کی سب سے زیادہ بلند مسجد سمجھی جاتی ہے۔

یہ فطرت کا قانون ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ پرامن جدوجہد نتیجہ خیز ہو اور متشددانہ جدوجہد صرف بے نتیجہ ہو کر رہ جائے۔

اس مختلف انجام کو دیکھ کر اب ساری دنیا میں مسلم رہنماؤں کو ہوش آنا شروع ہو گیا ہے۔ جذباتیت کے بجائے تحمل، تشدد کے بجائے امن اور جوش کے بجائے ہوش کا طریقہ اب مسلم دنیا میں ایک عمومی لہر کی صورت اختیار کر رہا ہے۔ اس کی مثالیں ہر اس جگہ دیکھی جا سکتی ہیں جہاں پہلے لوگ پرفخر طور پر انتہا پسندی اور تشدد کی زبان بولنے لگے تھے۔

عقل اور اسلام دونوں کا تقاضا ہے کہ جب بھی کسی مقصد کے لیے عمل کرنا ہو تو محض اپنی خواہش کے تحت کوئی اقدام نہ کیا جائے بلکہ حالات کا گہرا جائزہ لے کر ایسا منصوبہ بنایا جائے جو قابل عمل ہو۔ اس معاملہ میں بنیادی اصول یہ ہے کہ پولیٹکل اسٹیٹس کو پر راضی رہتے ہوئے موجود امکانات کو استعمال کیا جائے۔ سیاسی نزاع کھڑی کرنے کے بجائے تعمیری میدان میں پرامن جدوجہد جاری کی جائے۔ حالات کے ڈھانچہ کو بدلے بغیر ملے ہوئے فوائد کو استعمال کیا جائے۔ یہی کسی عمل کا صحت مند آغاز ہے اور اسی طریقہ کو اختیار کرنے والے لوگ کوئی حقیقی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

فتح کا راز

جناب جمیل احمد صاحب (مدراس) نے بتایا کر وانمباڑی کے ایک مسلمان تاجر حاجی محمد ابراہیم صاحب نے ۱۹۱۰ میں یہاں ایک اسکول قائم کیا جو اب ترقی پاکر کالج بن چکا ہے اور کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ حاجی محمد ابراہیم صاحب نے اپنے آپ کو اس اسکول کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اس وقت مالیات کی سخت کمی تھی چنانچہ وہ روزانہ اپنے گھر سے اس طرح نکلتے کہ ان کے ہاتھ میں ایک کشکول ہوتا تھا وہ لوگوں سے مل مل کر اسکول کے لیے چندہ مانگتے۔ کوئی تھوڑا دیتا اور کوئی زیادہ۔ وہ سارا پیسہ اس کشکول سے ڈالتے رہتے اور شام کو واپس آکر اس کو اسکول کے حساب میں جمع کر دیتے۔

ایک دن وہ وانمباڑی کے ایک دولت مند تاجر کے پاس پہنچے۔ حسب معمول ان کا کشکول ان کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے مذکورہ مسلمان تاجر سے اسکول کے لیے چندہ مانگا۔ تاجر نے چندہ نہیں دیا۔ اس کے بجائے وہ محمد ابراہیم صاحب کو سخت سست کہتے رہے کہ تم اپنا کاروبار خراب کر کے اسکول کے پیچھے دوڑ رہے ہو۔ محمد ابراہیم صاحب مذکورہ تاجر کی بات کو نہایت خاموشی کے ساتھ سنتے رہے۔ انھوں نے ان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر میں محمد ابراہیم صاحب نے ان سے کہا: ہر آدمی جو کچھ دیتا ہے اُس کو میں اِس کشکول میں ڈال لیتا ہوں۔ آپ نے جو کچھ دیا اس کو بھی میں نے کشکول میں ڈال دیا۔ یہ کہہ کر انھوں نے مذکورہ تاجر کو سلام کیا اور اطمینان کے ساتھ واپس آگئے۔

یہ سادہ سا جملہ مذکورہ تاجر کے لیے اتنا سخت ثابت ہوا کہ وہ رات بھر سو نہیں سکے۔ اگلے دن اور رات بھی ان کی بے چینی بدستور جاری رہی، یہاں تک کہ تیسرے دن انھوں نے حاجی محمد ابراہیم صاحب کو بلایا۔ ان سے اپنے رویہ کی معافی مانگی۔ اس کے بعد انھوں نے گھر کے اندر سے اشرفیاں منگائیں اور ان کا کشکول اشرفیوں سے بھر دیا۔ محمد ابراہیم صاحب اگر مذکورہ تاجر کی بات پر مشتعل ہو جاتے تو بے فائدہ ٹکراؤ کے سوا اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا۔ مگر جب انھوں نے منفی رویہ کا جواب مثبت رویہ سے دیا تو صرف الفاظ ہی ان کی جیت کے لیے کافی ہو گئے۔

غلطی کا اعتراف

غلطی کرنا انسان کی صفت ہے۔ انسان کی تخلیق اس ڈھنگ پر ہوئی ہے کہ وہ کسی بھی حال میں غلطی سے بچ نہیں سکتا۔ اس دنیا میں فرد سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں اور جماعتوں سے بھی۔ ایسی حالت میں اصل اہمیت کی چیز یہ نہیں ہے کہ کسی انسان نے غلطی کی یا غلطی نہیں کی۔ بلکہ اصل اہمیت کی چیز یہ ہے کہ غلطی پیش آنے کے بعد اس کا رویہ کیسا رہا۔

اس اعتبار سے انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ لوگ جو غلطی کرنے کے بعد یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف نہ کریں، وہ اپنی غلطی کو کسی نہ کسی طرح دوسرے کے اوپر ڈال دیں۔ ایسے لوگ تمام معلوم واقعات کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ ثابت شدہ حقیقتوں کو رد کر دیتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ انھیں اپنی غلطی نہ ماننا ہو۔ وہ تمام دنیا کو غلط قرار دے دیتے ہیں صرف اس لیے کہ انھیں یہ نہ کہنا پڑے کہ "میں نے غلطی کی"۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو انسانیت کے اعلیٰ درجہ پر قائم ہوں۔ جنھوں نے اپنی فطرت کو اس کی اصل حالت پر زندہ رکھا ہو۔ ایسے لوگ اپنے مزاج کے اعتبار سے اس کا تحمل نہیں کر پاتے کہ وہ غلطی کرنے کے باوجود غلطی کا اعتراف نہ کریں، وہ اپنی غلطی کو کسی دوسرے کے سر پر ڈال کر مطمئن ہو جائیں۔

ایسے کسی انسان سے جب ایک غلطی ہو جاتی ہے تو اس کے اندر شدت سے شرمندگی کا احساس جاگ پڑتا ہے۔ اس کا پورا وجود اس کو ملامت کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے اندرونی جذبہ کے تحت مجبور ہوتا ہے کہ اس کا ضمیر جس چیز کو غلطی بتا رہا ہے اس کو اپنی زبان سے بھی وہ غلطی ہی بتائے۔ وہ بے اختیارانہ طور پر پکار اٹھتا ہے کہ یہ دراصل میری غلطی تھی نہ کہ کسی اور کی۔ حتیٰ کہ اگر اس غلطی میں جزئی طور پر بظاہر کچھ دوسرے لوگ بھی شریک ہوں تب بھی وہ اس کو اپنی ہی غلطی قرار دیتا ہے کیوں کہ اس کے بغیر وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا نہیں کر سکتا۔

غلطی کو وقار کا مسئلہ بنانا انسانیت کی پستی ہے۔ اور غلطی ہو جانے پر سیدھے طور پر اس کا اعتراف کر لینا انسانیت کی بلندی ہے۔

میں ویجیٹیرین ہوں

بیگم شمشاد محمد خاں برنگھم میں رہتی ہیں۔ ان کے یہاں کچھ مسلم خواتین ملاقات کے لیے آئیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کسی کی غیبت شروع کردی۔ بیگم شمشاد محمد خاں اس گفتگو میں شریک نہیں ہوئیں جب بات لمبی ہوگئی تو انھوں نے کہا مجھے اس گوشت خوری سے معاف رکھو۔ میں تو ایک ویجیٹیرین ہوں۔ ان کا اشارہ اس آیت کی طرف تھا جس میں غیبت سے منع کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ: تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، اس کو تم خود ناگوار سمجھتے ہو (۴۹:۱۲)

مذکورہ خواتین سے اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ غیبت کا نقصان سب سے زیادہ خود غیبت کرنے والوں کو اٹھانا پڑتا ہے۔ کیونکہ ان کی نیکیاں ٹرانسفر ہو جاتی ہیں۔ غیبت کرنے والے کی نیکیاں اس کے حساب میں ڈال دی جاتی ہیں جس کی انھوں نے غیبت کی تھی۔

ہمارے سماج میں غیبت کی حیثیت ایک عام برائی کی ہوگئی ہے۔ جب بھی کچھ مرد یا عورت باہم ملیں تو وہ فوراً دوسروں کی برائی شروع کر دیتے ہیں۔ یہ طریقہ اتنا زیادہ عام ہوگیا ہے کہ اب لوگوں کو شاید اس کے برے ہونے کا احساس بھی نہیں رہا۔

حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ غیبت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا "یہ کہ تم کسی شخص کا ذکر اس طرح کرو کہ وہ سنے تو اسے ناگوار ہو" اس نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ اگر میری بات واقعہ کے مطابق ہو۔ آپؐ نے جواب دیا: اگر تمہاری بات واقعہ کے مطابق نہ ہو تب تو وہ بہتان ہے (موطا امام مالک)

غیبت کرنے والوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ آدمی کی غیر موجودگی میں اس کی برائی کرتے ہیں مگر جب وہ سامنے موجود ہو تو وہ اس کو خوش کرنے کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ گویا غیبت اس انسان کا کردار ہے جو ڈبل اسٹینڈرڈ ہو۔ یہ ایک قسم کی اخلاقی بزدلی ہے۔ آدمی اپنے دل میں ایک شخص کے بارہ میں بری رائے رکھتا ہے مگر اس کے سامنے اس کو ظاہر کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا اس لیے وہ اس کی غیر موجودگی میں اس کی برائی بیان کرکے اپنے دل کو تسکین دیتا ہے۔

غلط فہمی

۱۲ مارچ ۱۹۹۷ کو ایرانی علماء کا ایک وفد مرکز میں آیا۔ اس میں سات افراد شامل تھے۔ اس کے قائد مولانا حسن ضیاء توحیدی تھے، وہ زاھدان میں رہتے ہیں۔ ان کا ٹیلی فون نمبر یہ ہے : 0098-541-36698, 0098-541-28686

انھوں نے بتایا کہ صابر طعیمہ کی ایک کتاب ہے۔ اس کا نام "دراسات فی الفرق" (مطبوعہ ریاض) ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے لکھا ہے کہ مشہور شیعہ عالم شیخ کلینی کی کتاب "اصول الکافی" میں درج ہے کہ امامیہ شیعہ اپنے بارہ اماموں کو ابناء اللہ (اللہ کے بیٹے) مانتے ہیں۔ گویا کہ ہمارا اعتقاد عیسائیوں جیسا ہے جو حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ میں نے اصل کتاب سے رجوع کیا اور اس صفحہ کو دیکھا جس کا حوالہ کتاب مذکور میں درج کیا گیا تھا۔ میں نے پایا کہ کتاب کی اصل عبارت اس طرح ہے کہ ہم اللہ کے امین ہیں (نحنُ اُمناء اللّٰہ) انھوں نے کہا کہ مصنف نے "میم" کو "ب" سے بدل دیا اور امامیہ کی طرف غلط طور پر وہ عقیدہ منسوب کر دیا جس کے کفر میں کوئی شک نہیں (مبدّلَ المیمِ باءً وافتری علی الشیعۃ الامامیۃ شیئاً لا شك فی کفر من اعتقدہ)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلط فہمیاں کس طرح پیدا ہوتی ہیں حتی کہ آدمی بد دیانت نہ ہو بلکہ وہ مخلص اور عالم ہو تب بھی وہ سنگین قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو سکتا ہے، جیسا کہ مذکورہ مثال میں نظر آتا ہے۔ مصنف نے "اُمَناء" کو "اَبناء" پڑھ لیا۔ اور اس کے بعد وہ بات لکھ دی جو اصل واقعہ کے بالکل خلاف تھی۔

کسی شخص کی طرف ایک بات کو منسوب کرنا بے حد ذمہ داری کا معاملہ ہے۔ ایسے موقع پر لازم ہے کہ حد درجہ احتیاط سے کام لیا جائے۔ پہلے پوری غیر جانب داری کے ساتھ قائل کے منشا کو سمجھنے کی کوشش کی جائے پھر صحت کے ساتھ اس کے قول کو نقل کیا جائے۔ قائل کی طرف وہی بات منسوب کی جائے جو اس نے فی الواقع کہی ہے۔ کسی کی طرف غلط بات منسوب کرنا اگر نادانستہ ہو تو وہ سخت بے احتیاطی ہے اور اگر دانستہ ہو تو عظیم سرکشی۔

علم انسانی

ڈاکٹر البرٹ شوئٹزر (Albert Schweitzer) ۱۸۷۵ء میں فرانس میں پیدا ہوا۔ اور ۱۹۶۵ء میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ایک فلسفی تھا۔ ۱۹۵۲ء میں اس کو نوبیل کا پیس پرائز دیا گیا۔ اس نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ اس نے اپنے علمی مطالعہ کا خلاصہ اس طرح بیان کیا ہے کہ جب ہم زیادہ علم حاصل کرتے ہیں تو چیزیں زیادہ قابل فہم نہیں ہو جاتیں، بلکہ صرف زیادہ پراسرار بن جاتی ہیں:

As we acquire more knowledge, things do not become more comprehensible—only more mysterious.

یہ بات تمام ان سائنس دانوں نے کسی نہ کسی انداز میں کہی ہے جنھوں نے موجودہ زمانہ میں عالم فطرت کا مطالعہ کیا۔ قدیم زمانہ میں معلومات کی حد قابل مشاہدہ اجسام تک تھی۔ نیوٹن کے زمانہ میں معلومات کی حد ایٹم تک پہنچ گئی۔ آئن سٹائن کے بعد معلومات کی حد الکٹران تک جا پہنچی۔ مگر ساری ترقیوں کے باوجود انسان آج بھی حیرانی کے عالم میں ہے۔ آج بھی وہ یہی محسوس کرتا ہے کہ معلومات میں اضافہ کے باوجود علم کی آخری حد ابھی بہت دور ہے۔ جو کچھ انسان نے جانا ہے، اس سے بہت زیادہ وہ ہے جس کو جاننا ابھی باقی ہے۔

علم کی اسی لامحدودیت کا یہ نتیجہ ہے کہ جو آدمی جتنا بڑا عالم ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ اس کے اندر تواضع ہوتی ہے۔ علم کا اضافہ صرف آدمی کے اس احساس کو بڑھاتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ اگر کسی آدمی کے اندر علم کا غرور ہو تو سمجھ لیجئے کہ وہ صرف جاہل ہے، وہ ابھی تک علم سے آشنا نہیں ہوا۔

یہی بات قرآن میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے کہ: انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (فاطر ۲۸) یعنی اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔ علم میں اضافہ خشیت الٰہی پیدا کرتا ہے، اور خشیت الٰہی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی آخری حد تک متواضع بن جاتا ہے۔

حقیقی علم اپنی بے علمی کو بتاتا ہے۔ حقیقی علم آدمی کو صرف اس سے واقف کراتا ہے کہ اس کا خالق کتنا زیادہ عظیم ہے اور اس کے مقابلہ میں میں کتنا زیادہ غیر عظیم ہوں۔ حقیقی علم آدمی کو سچا عبادت گزار بنا دیتا ہے ——— اور اسی کے ساتھ سچا انسان۔

حدیث کا مطالعہ

ایک شخص جب حدیث کا تفصیلی مطالعہ کرتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ حدیثوں میں کافی اختلاف ہے جو عام طور پر قرآن میں نظر نہیں آتا۔ یہ دیکھ کر وہ الجھن میں پڑ جاتا ہے اور حدیث کی صحت کا انکار کر دیتا ہے۔ مگر یہ کم فہمی کی بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن میں اسلام کے بنیادی اصول بتائے گئے ہیں جو ہمیشہ یکساں رہتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں حدیث اس بات کا ریکارڈ ہے کہ ان غیر متغیر اصولوں کو روزانہ کے بدلتے ہوئے حالات میں کس طرح منطبق کیا گیا۔ عملی زندگی چوں کہ ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہتی، اس لئے فطری طور پر انطباق میں فرق ہو جاتا ہے۔ حدیثوں میں جو بظاہر اختلاف نظر آتا ہے وہ دراصل اسی فطری فرق کی بنا پر پیدا ہوا ہے۔ وہ حکم کا اختلاف نہیں بلکہ انطباق کا اختلاف ہے۔

مثال کے طور پر ہدیہ کے مسئلہ کو لیجئے۔ ایک طرف بہت سی روایتیں ہیں جن میں ہدیہ اور تحفہ کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کے برعکس روایتیں بھی ہیں۔ مثلاً مؤطا (باب ما جاء فی المھاجرۃ) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک دوسرے کو ہدیہ دو، اس سے باہمی محبت پیدا ہوگی اور عداوت جاتی رہے گی (تھادوا تحابوا وتذھب الشحناء) مؤطا الامام مالک، صفحہ ۶۵۳۔

یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ ہدیہ اور تحفہ کے لین دین سے آپس میں انسیت اور محبت بڑھتی ہے۔ اسی طرح ہدیہ اور تحفہ نہ دینے سے دوری پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی ہدیہ دے اور اس کو قبول نہ کیا جائے تو اس کا برعکس اثر ہوگا۔ آپس میں نفرتیں بڑھیں گی۔ باہمی تعلقات میں کھنچاؤ اور تناؤ کی حالت پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح کی کیفیت دیر تک باقی رہے تو ایسے ماحول میں کوئی تعمیری کام کرنا ہی سرے سے ناممکن ہو جائے گا۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایا کے تبادلہ کی تلقین بھی کی اور خود بھی اس پر عمل فرمایا۔

روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی ہدیہ دیا جاتا تو آپ خوشی کے ساتھ اس کو قبول فرماتے تھے (کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقبل الھدیۃ)

فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۵/۲۳۹)

اب جہاں تک اہل اسلام سے ہدیہ قبول کرنے کا تعلق ہے، اس میں احادیث میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ لیکن غیر مسلموں کے سلسلہ میں روایات میں اختلاف ہے۔ کچھ روایتیں بتاتی ہیں کہ کسی غیر مسلم نے ہدیہ پیش کیا تو آپ نے شوق کے ساتھ اس کو قبول فرمایا۔ دوسری طرف ایسی بھی روایتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں کسی مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتا۔ (انی لا اقبل ھدیۃ مشرک) فتح الباری ۵/۲۷۳

سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ والفیٔ (باب فی الامام یقبل ہدایا المشرکین) میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عظیم فدک (غیر مسلم حکمراں) کا ہدیہ قبول فرما لیا۔ پھر عین اسی باب میں دوسری روایت ہے کہ ایک غیر مسلم نے ہدیہ پیش کیا تو آپ نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا (سنن ابی داؤد ۳/۱۶۹-۱۷۰)

یہاں واضح طور پر ایک ہی معاملہ میں دو مختلف مسلک اختیار کیا گیا۔ مگر یہ کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ ایک سادہ فطری حقیقت ہے۔ اس فرق کا سبب نفس حکم کا فرق نہیں ہے بلکہ حالات کا فرق ہے۔ اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ حالات کی رعایت ہمیشہ ایک حکم کے انطباق میں فرق پیدا کر دیتی ہے۔ اس معاملہ کی وضاحت کے لئے یہاں دو مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بار حاکموں اور سرداروں سے ہدیہ قبول فرمایا۔ مثلاً تبوک کی مہم (رجب ۹ ھ) میں آپ نے تیس ہزار اصحاب کے ساتھ سفر فرمایا تھا۔ اس مہم کے ذیل میں جو واقعات پیش آئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اس علاقہ کے مقام ایلہ کا حاکم یوحنا بن روبہ آپ کی خدمت میں آیا۔ اس نے آپ کو ایک سفید خچر کا ہدیہ پیش کیا جو واضح طور پر اس بات کی علامت تھی کہ وہ آپ کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ آپ نے خوشی کے ساتھ اس کا ہدیہ قبول فرمایا۔ اس کے بعد معتدل فضا میں اس سے بات ہوئی۔ اس نے آپ سے صلح کر لی اور جزیہ دینے پر راضی ہو گیا۔ (فتح الباری ۳/۴۰۵)

یہ واقعہ واضح طور پر تالیف قلب کا واقعہ ہے۔ ایک حاکم جس سے اچھے تعلقات قائم کرنے کی ضرورت ہے، اگر اس کا ہدیہ قبول نہ کیا جائے تو تلخی پیدا ہوگی اور بہتر تعلق قائم کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اس کا ہدیہ قبول کرنا اور اپنی طرف سے اس کو ہدیہ پیش کرنا قربت اور انس کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے غیر مسلم حاکموں سے ان کا تحفہ قبول فرمایا۔ سرداروں اور حکمرانوں سے ہدیہ قبول کرنے کے متعدد واقعات حدیث کی کتابوں میں آئے ہیں۔

ایک انسان جو ایک مشن کا علم بردار ہو وہ اس کا تحمل نہیں کرسکتا کہ لوگوں کے ہدیے اور تحفے قبول نہ کرے۔ ہدایا کے لین دین سے مشن کی ترقی کی راہیں کھلتی ہیں اور ہدایا کو لینے سے انکار کرنا مشن کے راستہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔ اس لئے اسلام میں یہ پسندیدہ بات نہیں کہ ہدایا کے لینے سے انکار کر دیا جائے۔

اب دوسری نوعیت کی مثال لیجئے۔ سنن ابی داؤد (۲/ ۱۷۰) اور بعض دوسری کتابوں میں ایک روایت آئی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مشرک عیاض بن حمار المجاشعی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اونٹنی بطور ہدیہ پیش کی۔ آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے اسلام قبول کر لیا۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا: فانی نھیت عن زبد المشرکین (تو مجھے مشرکوں کا عطیہ لینے سے منع کیا گیا ہے) فتح الباری ۵/ ۲۷۳

واقعات بتاتے ہیں کہ یہ انکار حقیقۃً کوئی انکار نہ تھا بلکہ وہ شفقت کا ایک معاملہ تھا۔ اپنی زبان میں ہم اس کو ایک قسم کا ترغیبی انکار کہہ سکتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ عیاض بن حمار آپ کی تحریک توحید سے متاثر تھے اور ذاتی طور پر آپ کے عقیدت مند بن چکے تھے۔ مگر ابھی تک انھوں نے اپنے اسلام کا اعلان نہیں کیا تھا۔ آپ نے مذکورہ الفاظ میں ہدیہ کا انکار کرکے ان کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا۔ حسب توقع اس کا مفید اثر ہوا اور جلد ہی انھوں نے باقاعدہ اسلام قبول کر لیا۔ چنانچہ اب ان کو اسلام کی تاریخ میں عیاض بن حمار المجاشعی رضی اللہ عنہ لکھا جاتا ہے (حیات الصحابہ ۲/ ۲۴۵)

آدم کی تخلیق

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ساری کائنات خدا کی تسبیح کر رہی ہے (الجمعہ ۱)، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام کائناتی چیزیں کامل طور پر خدا کے آگے مسخر ہیں۔ وہ ادنیٰ انحراف کے بغیر اس کی مرضی کی تعمیل کر رہی ہیں۔

کائنات کی یہ تسبیح تسبیحِ تکوینی ہے۔ کائنات کی تسبیح اپنے آزاد ارادہ کی بنا پر نہیں ہے۔ بلکہ خدا کی محکم تقدیر کے تحت ہے۔ کائنات وہی کرتی ہے اور وہی کر سکتی ہے جو اس کے لئے پیشگی طور پر مقدر کر دیا گیا ہے۔ اس کے پاس نہ آزادانہ اختیار ہے اور نہ اس کے لئے ممکن ہے کہ وہ اپنے آزاد اختیار کے تحت کوئی عمل کرے۔

اب خدا کو منظور ہوا کہ ایک ایسی مخلوق ہو جو خود اپنے اختیار کے تحت خدا کی تسبیح کرے۔ اسی اختیاری تسبیح کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا۔ انسان کو وہی دین اپنی آزاد مرضی کے تحت اختیار کرنا ہے جس کو بقیہ کائنات مجبورانہ طور پر اختیار کئے ہوئے ہے۔

اختیاری تسبیح کے اس مقصد کے لئے پہلے جنات کو پیدا کیا گیا تھا۔ اور ان کو زمین پر بسایا گیا تھا۔ مگر جنوں نے سرکشی کی۔ انھوں نے زمین پر فساد کیا۔ چنانچہ انھیں معزول کر دیا گیا اور زمین ان کے قبضہ سے لے لی گئی۔

جن کا تخلیقی مادہ آگ تھا۔ آگ میں طاقت زیادہ ہے۔ مگر اس میں سرکشی بھی زیادہ ہے۔ اب خدا نے انسان کی صورت میں ایک اور مخلوق پیدا کی جس کا مادۂ تخلیق مٹی تھی۔ مٹی میں طاقت کم ہے مگر اسی کے ساتھ اس میں سرکشی بھی کم ہے۔ آگ شدت کی نمائندہ ہے اور مٹی نرمی اور اعتدال کی نمائندہ۔

انسان چوں کہ جن کے بعد آیا تھا اس لئے اس کو خلیفہ کہا گیا۔ یعنی سابق ساکنانِ ارض کی جگہ آنے والا۔ انسان کو پیدا کر کے اس کو جنت میں بسانے کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ جنت انسان ہی کے لئے ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ تسبیح اختیاری کا ثبوت دے اور اس کے انعام کے طور پر جنت کی پر راحت دنیا میں آباد رہے۔

انسان کی پیدائش پر فرشتوں کا اشکال اس لئے تھا کہ انھوں نے انسان کو جنات پر قیاس کیا۔ انھوں نے سمجھا کہ آزادی پاکر جب پہلی مخلوق سرکش ہوگئی تو نئی مخلوق بھی ضرور اس طرح سرکش ہو جائے گی۔ اس وقت خدا نے عمل مظاہرہ کر کے فرشتوں کو بتایا کہ آتشیں مخلوق کے مقابلہ میں یہ خاکی مخلوق مختلف ہوگی۔ اگرچہ ان میں بھی بہت سے سرکش لوگ نکلیں گے۔ لیکن اسی کے ساتھ ان میں ایسے قیمتی افراد بھی نکلیں گے جو ساری مخلوقات کے لئے قابل رشک قرار پائیں۔

خدا نے جب انسان کو جنت میں بسایا تو فرمایا کہ یہاں کی ہر راحت تمہارے لئے ہے۔ البتہ فلاں درخت کا پھل تم نہ کھانا۔ اس سے مکمل طور پر پرہیز کرنا۔ بائبل میں اس کو اچھے اور برے کے علم کا درخت (tree of the knowledge of good and evil) کہا گیا ہے۔ یہاں درخت کا لفظ تمثیلی معنی میں ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جنت میں قیام کی شرط صرف ایک ہے، اور وہ متقیانہ (پرہیزگاری کی) زندگی ہے۔ یعنی یہ کرو اور وہ نہ کرو کے بارہ میں تم کو خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں کا پابند رہنا ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا تو خدا کی مدد تم سے اٹھ جائے گی۔ اور تم اس طرح محروم ہو جاؤ گے جس طرح کسی ملبوس آدمی کو اچانک ننگا کر دیا جائے۔

اس بات کو قرآن میں مختلف انداز سے بار بار بتایا گیا ہے۔ مثلاً فالهمها فجورها وتقواها (الشمس ۸) یعنی انسان کو یہ سمجھ عطا کی کہ کیا چیز اس کے لئے بری ہے اور کیا چیز اچھی۔ اس سے مراد نیکی اور بدی کا وہ وجدانی شعور ہے جو پیدائشی طور پر ہر انسان کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے۔

شیطان کے بہکاوے پر آدم نے جب ممنوعہ درخت کا پھل کھایا، بالفاظ دیگر، وہ خدا کی قائم کی ہوئی حد پر برقرار نہ رہ سکے تو ظاہر ہو گیا کہ صرف ہدایت نامہ دے کر انسانوں کو جنت میں داخل کرنا کافی نہیں۔ آدم تمام انسانیت کے نمائندہ تھے، ان کی لغزش نے ثابت کیا کہ اس معاملہ میں عمومی داخلہ کے بجائے انتخاب کا طریقہ اختیار کیا جانا چاہئے۔

اب یہ منصوبہ بنایا گیا کہ تمام انسانوں کو باری باری جنت کے باہر پہلے زمین پر آباد کیا جائے۔ یہاں زندگی کے مختلف احوال میں ڈال کر ہر ایک کی جانچ کی جائے۔ اور پھر جو افراد

پنے عمل سے یہ ثابت کریں کہ آزادانہ ماحول میں بھی وہ تسبیحِ اختیاری کے معیار پر قائم تھے۔ ان کو منتخب کر لیا جائے اور صرف انھیں کو جنت کی معیاری دنیا میں داخلہ دیا جائے۔ گویا پہلے جنت کا داخلہ عمومی تھا، اب جنت میں داخلہ کو انتخابی بنا دیا گیا۔

انسان کے سلسلہ میں خدا کی جو اصل اسکیم ہے وہ یہی ہے کہ ہر آدمی کو محدود مدت کے لئے دنیا کی آزمائش گاہ میں رکھا جائے۔ یہاں اس پر مختلف قسم کے احوال گزریں۔ پھر جو آدمی یہ ثبوت دے کہ تمام احوال سے اوپر اٹھ کر اس نے خدا پرستی کی زندگی گزاری، اور اس طرح اپنے کو جنت کا مستحق ثابت کیا۔ صرف ایسے ہی لوگوں کو جنت میں داخل کیا جائے۔ اور بقیہ تمام لوگوں کو اسی طرح رد کر دیا جائے جس طرح کارخانوں میں ناقص پیداوار رد کر دی جاتی ہیں۔

پیشگی طور پر جنت میں بسانا بھی اس اسکیم کا ایک اہم جز تھا۔ اس طرح گویا انسان کو وہ قیمتی جنت پہلے ہی دکھا دی گئی جس کی خاطر اس سے یہ قربانی مطلوب تھی کہ وہ دنیا کی ترغیبات کے درمیان رہتے ہوئے اپنے آپ کو جنت کا طلب گار بنائے رکھے۔

آدم انسان اول بھی تھے اور پوری انسانیت کے نمائندہ بھی، ان کو جنت کے مناظر براہ راست دکھا دئے گئے۔ اس کے بعد ان کی بعد کی نسلوں میں جنت کا تصور، پیدائشی اور وراثتی طور پر ڈال دیا گیا۔ یعنی وہی چیز جس کو موجودہ زمانہ میں جینٹک تسلسل کہا جاتا ہے۔

اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ ہر آدمی کے اندر ایک آئیڈیل دنیا کا تصور بسا ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہر آدمی نے اپنے لاشعور میں ایک جنت کو آباد کر رکھا ہے۔ یہی تصورِ جنت آدمی کو ایک ایسا گول دیتا ہے جو اس کو مسلسل متحرک رکھتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو دنیا کی تمام سرگرمیوں کا خاتمہ ہو جائے۔

قرآن (محمد ۶) میں ہے کہ اللہ اپنے صالح بندوں کو جس جنت میں داخل کرے گا وہ وہی جنت ہوگی جس کی انھیں پہچان کرا دی ہے (عرفہا لہم)

اب سوال یہ ہے کہ انسان کو اس جنت کی پہچان کہاں اور کب کرائی گئی۔ جواب یہ ہے کہ اس سے مراد وہی پہچان ہے جب کہ آدم کو جنت میں داخل کرکے اس کا مشاہدہ کرا دیا گیا۔ انسان اول نے اس جنت کو خود اپنی آنکھ سے دیکھا۔ بعد کی انسانی نسلوں کو جینٹک کوڈ کی صورت میں وراثتی طور پر اس سے متعارف کرایا گیا۔ پہلے انسان کے لئے جنت کا تعارف ایک شعوری واقعہ

تھا۔ دوسرے انسانوں کو لاشعور کے تحت یہ تعارف حاصل ہوا۔

لاشعور میں بسی ہوئی اس جنت یا اس آئیڈیل دنیا کو عام آدمی اکثر موجودہ زندگی کی رونقوں سے وابستہ کرتا ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے اپنی ساری طاقت لگا دیتا ہے۔ مگر جب وہ اس کو حاصل کر لیتا ہے تو وہ دریافت کرتا ہے کہ وہ اس کے تصورات سے کم تر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنت ایک معیاری دنیا ہے اور موجودہ دنیا ایک غیر معیاری دنیا۔ غیر معیاری دنیا کبھی معیاری دنیا کا بدل نہیں بن سکتی اس لئے موجودہ دنیا کا پانا کسی کے لئے حقیقی اطمینان کا باعث بھی نہیں بنتا۔

سجدۂ آدم کا جو واقعہ ہے جس میں فرشتوں نے اور ابلیس نے دو الگ الگ کردار ادا کیا، وہ انسانی آزمائش کے اصولی نکتہ کو بتاتا ہے۔ ابلیس نے جب آدم کے سامنے جھکنے سے انکار کیا تو اس کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ میں اس سے بہتر ہوں (انا خیر منہ) اس کو یاد نہیں رہا کہ مسئلہ بہتر اور کمتر کا نہیں ہے بلکہ خدا کے حکم کا ہے۔ جہاں خدا کا حکم آجائے وہاں بظاہر ایک برتر کو بھی اپنے سے کم تر کے آگے جھکنا ہے۔ ایسا نہ کرنا کبر کا مظاہرہ کرنا ہے، اور کبر خدا کی نظر میں سب سے بڑا جرم ہے۔

یہی آزمائش کا بنیادی نکتہ ہے۔ جس طرح خدا نے ابلیس کو آدم کے سامنے جھکنے کا حکم دیا، اسی طرح خدا کا حکم ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان کے مقابلہ میں تواضع کی روش اختیار کرے۔ ہر انسان صاحب حق کے آگے اپنے آپ کو جھکا دے۔ ہر انسان فخر وناز اور کبر و برتری کی نفسیات سے آخری حد تک اپنے آپ کو پاک کرلے۔

جنت میں داخلہ کی یہی بنیادی شرط ہے۔ تاہم انسان کی رعایت کرتے ہوئے توبہ کا طریقہ بھی رکھ دیا گیا۔ یعنی آدمی اگر کسی وجہ سے غلطی کر بیٹھے تو اس کے بعد اس کے اندر ندامت کا جذبہ ابھرنا چاہئے۔ اس کو چاہئے کہ وہ اپنی غلطی کی اصلاح کر کے دوبارہ صراط مستقیم پر گامزن ہو جائے۔

دو انسان

مسیلمہ کذاب (م ۱۲ ھ) نجد کے علاقہ میں یمامہ کا رہنے والا تھا۔ اس مقام کو اب جُبَیلہ کہا جاتا ہے۔ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا، اسی لیے وہ کذاب (جھوٹا) کہا جاتا ہے۔ عربی میں مثل ہے :
اکذب من مسیلمۃ۔ یعنی مسیلمہ سے بھی زیادہ جھوٹا۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمرو بن العاص ؓ نے یمامہ جاکر مسیلمہ سے ملاقات کی۔ مسیلمہ نے پوچھا کہ تمہارے صاحب پر حال میں اترنے والی وحی کیا ہے۔ عمرو بن العاص نے کہا کہ آپؐ پر ایک سورہ اتری ہے جو نہایت مختصر اور نہایت بلیغ ہے۔ اس نے پوچھا کہ وہ کیا ہے۔ عمرو بن العاص نے اس کو سورہ العصر سنائی :

والعصر۔ ان الانسان لفی خسر۔ الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔

اس کو سن کر مسیلمہ کچھ دیر چپ رہا۔ اس کے بعد بولا کہ میرے اوپر بھی اسی قسم کا کلام اترا ہے۔ عمرو بن العاص نے پوچھا کہ وہ کیا ہے۔ مسیلمہ نے حسب ذیل الفاظ سنائے :

یا وبر یا وبر وانما انت اذنان وصدر وسائرك حفر ونقر۔

اس کے بعد اس نے پوچھا کہ اے عمرو، تمہارا کیا خیال ہے۔ عمرو بن العاص نے جواب دیا : خدا کی قسم، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تم کو جھوٹا سمجھتا ہوں (تفسیر ابن کثیر ۴/۵۴۷) مسیلمہ کو معلوم تھا کہ اس کے یہ الفاظ بالکل لغو ہیں۔ مگر اس نے نعوذ باللہ قرآن کا مذاق اڑانے کے لیے ان کو موزوں کر کے سنایا۔

اب دوسری مثال لیجئے۔ یہ سورہ العصر مکہ میں نازل ہوئی تھی، جب وہ اتری تو بعض صحابہ نے اس کو ایک تختی پر لکھا اور اس کو کعبہ کی دیوار پر آویزاں کر دیا۔ اس کے بعد مختلف لوگوں نے اس کو پڑھا۔ انھیں میں سے ایک لبید بن ربیعہ العامری (م ۴۱ ھ) تھے۔ وہ بھی نجد کے علاقہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا شمار اصحاب المعلقات میں ہوتا ہے۔ بعد کو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بیعت کر کے اسلام قبول کیا۔

کہا جاتا ہے کہ اسلام سے ان کا پہلا تاثر سورہ العصر کے ذریعہ ہوا تھا، وہ مکہ آئے اور کعبہ کی دیوار پر لکھی ہوئی مختصر سورہ العصر کو پڑھا۔ ان پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ وہ جوش میں آکر

اسی وقت کعبہ کا طواف کرنے لگے۔ آخر میں انھوں نے کہا : واللہ ما ھذا من کلام البشر (خدا کی قسم، یہ کسی انسان کا کلام نہیں)

اس کے بعد وہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ وہ عرب کے ایک ممتاز شاعر تھے۔ مگر انھوں نے شاعری چھوڑ دی۔ کسی نے پوچھا کہ شاعری کیوں چھوڑی تو جواب دیا : أبعد القرآن (کیا قرآن کے بعد بھی) اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے صرف ایک شعر کہا (ترک الشعر فلم یقل فی الاسلام إلا بیتاً واحداً) الاعلام ۵/۲۴۰

ایک ہی واقعہ ایک شخص کے لیے گمراہی کا سبب بن گیا اور دوسرے آدمی کو اس سے ہدایت مل گئی۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب صرف ایک ہے، اور وہ انانیت ہے۔ مسیلمہ اپنے سینہ میں انانیت لیے ہوئے تھا۔ وہ اپنے کو سب سے بڑا سمجھتا تھا۔ وہ خود اپنی ذات میں گم تھا، اس لیے وہ حق کو دیکھنے سے محروم رہا۔ اس نے اپنے آپ کو جانا، اور اس کی ذات کے باہر جو زیادہ بڑی حقیقت تھی اس کا ادراک کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہو سکا۔

اس کے برعکس معاملہ لبید کا تھا۔ وہ حق کو سب سے بڑا سمجھتے تھے۔ ان کا سینہ خود پسندی سے پاک تھا۔ وہ ذاتی مصالح سے اوپر اٹھ کر حقائق کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس بنا پر جب حق آیا تو فوراً وہ اس کو پہچان گئے، اور اپنے آپ کو فوراً اس کے حوالے کر دیا۔

اس دنیا میں سب سے بڑا جرم حق کا انکار ہے، اور سب سے بڑی نیکی حق کا اعتراف۔ پہلی چیز آدمی کو جہنم میں لے جاتی ہے، اور دوسری چیز اس کو جنت کا مستحق بنا دیتی ہے۔

راجستھان کا سفر

بھارت وکاس پریشد کی دعوت پر راجستھان کا سفر ہوا۔ ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ کی صبح کو دہلی سے روانگی ہوئی۔ یکم اپریل کی شام کو دوبارہ دہلی واپس آگیا۔ ذیل میں اس سفر کی مختصر روداد درج کی جاتی ہے۔

۳۱ مارچ ۱۹۹۵ کو فجر سے پہلے گھر سے روانگی ہوئی۔ سڑکیں اور راستے بالکل سنسان نظر آئے۔ کہیں کہیں کوئی کار یا اسکوٹر رینگتا ہوا دکھائی دیا جو اس بات کی علامت تھا کہ یہاں کچھ انسان بھی بستے ہیں۔ میں نے سوچا کہ بڑے بڑے شہروں کی رونق اسی وقت ہے جب کہ وہاں زندہ انسان بھی موجود ہوں۔ شہر اگر زندہ انسانوں سے خالی ہو جائے تو اپنے تمام مادی اور ظاہری ساز و سامان کے باوجود یہ شہر شہر نہ رہیں بلکہ بھوت نگر دکھائی دیں۔

دہلی سے مودی لفٹ کی فلائٹ ۱۲۳ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ ہندستان میں اب پرائیویٹ ہوائی کمپنیوں کا دور آچکا ہے۔ مودی لفٹ انھیں میں سے ایک ہے جو ایک انڈین کمپنی اور جرمن کمپنی کے اشتراک سے قائم ہوئی ہے۔

پرائیویٹ کمپنیوں کی کارکردگی ہر لحاظ سے سرکاری کمپنیوں سے بہتر ہے۔ آزادی کے بعد ہندستان کی سیاسی قیادت پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھ میں آئی جو ۱۹۳۶ میں اپنی آٹو بیاگریفی میں لکھ چکے تھے کہ وہ صرف سوشلسٹ نظام (socialist order) کو تمام مسائل کا حل سمجھتے ہیں۔ آزادی کے بعد جنوری ۱۹۵۵ میں آوڈی (مدراس) میں کانگرس کا خصوصی اجلاس ہوا۔ اس میں جواہر لال نہرو کی پرجوش تحریک اور تجویز پر سوشلسٹ طرز کا سماج (socialistic pattern of society) بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

میں نے اس کے بعد ہی اس کے خلاف ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ سوشلزم (معاشی عمل پر حکومت کا کنٹرول) ایک تباہ کن نظریہ ہے۔ اس وقت شاید میں اکیلا تھا جو اس نظریہ کا اتنا شدید مخالف تھا۔ اب یہ بات ایک ثابت شدہ حقیقت بن چکی

چالیس سالہ تجربہ میں ملک تباہی کے آخری کنارے پہنچ چکا ہے۔ اب نئی دہلی کی حکومت اپنی نئی اقتصادی پالیسی کے تحت برلائزیشن کا دور لا رہی ہے۔ مگر حالات اتنے زیادہ خراب ہو چکے ہیں کہ بظاہر مزید چالیس سال تک بھی اس کی تلافی ممکن نظر نہیں آتی۔

جہاز میں میرے قریب کی سیٹ پر ادھیڑ عمر کا ایک شخص تھا۔ بظاہر وہ نان ریزیڈنٹ انڈین معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ غالباً دو بیگ تھے۔ کسی معاملہ پر وہ ایئرہاسٹس سے بحث کر رہا تھا۔ غالباً ایئر ہاسٹس کا اصرار تھا کہ وہ اپنا سامان لاکر (اوپر کے خانہ) میں رکھے۔ اور وہ انھیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ آخر وہ اس سیٹ سے اٹھ کر کسی دوسری سیٹ پر چلا گیا۔ جاتے ہوئے بڑبڑاہٹ کے انداز میں کہہ رہا تھا ——— ہندستان میں رہنا کتنا مشکل ہے:

It is so difficult to live in India.

مودی لفٹ کی مذکورہ فلائٹ کا وقت صبح پانچ بج کر ۵۵ منٹ تھا۔ گھڑی کی سوئی نے جیسے ہی ۵۵ - ۵ کا وقت بتایا فوراً جہاز میں حرکت شروع ہوگئی۔ وہ اپنے مقررہ وقت پر اودے پور پہنچ گیا۔

جہاز میں داخل ہو کر ہم لوگ بیٹھے تو ایئر ہاسٹس نے اعلان کیا: مودی لفٹ کی یہ فلائٹ جے پور ہوتی ہوئی اودے پور جا رہی ہے، دہلی سے جے پور کی دوری چالیس منٹ میں پوری کی جائے گی۔

میں نے سوچا کہ میری قریبی منزل جے پور ہے، مگر میری آخری منزل اودے پور ہے۔ تاہم آگے بڑھ کر سوچا جائے تو اودے پور بھی میری قریبی منزل ہے، وہ میری آخری منزل نہیں۔ اصل منزل جو اس کے بعد آنے والی ہے وہ موت اور آخرت ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم راہ چلتے ہوئے ایک [illegible] ہو۔

مودی لفٹ کا فلائٹ میگزین (Take Off) دیکھا۔ اس میں ایک مضمون پرواز کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ فلارنس کے قریب ۱۴۵۲ میں پیدا ہونے والا لیونارڈو (Leonardo) پہلا شخص ہے جس نے ہوائی پرواز کے لئے ایک علمی

بنیاد (scientific basis) فراہم کی۔ اس نے گہرائی کے ساتھ چڑیوں کا مطالعہ کیا کہ وہ کیسے اڑتی ہیں۔ اس طرح دس سالہ مطالعہ کے بعد اس نے ہوائی پرواز کے ابتدائی اصول وضع کئے۔

"چڑیا" شاید اس لئے تھی کہ انسان کو ہوائی جہاز کی صنعت کی طرف متوجہ کرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اس دنیا میں اشارہ کے انداز میں رکھ دیا ہے تاکہ آدمی ان کا مطالعہ کرکے تمدن کی تعمیر کرے۔ اسی طرح آخرت میں پیش آنے والی حقیقتوں کے پیشگی اشارے بھی اس دنیا میں رکھ دئے گئے ہیں۔ یہاں بھی انسان سے مطلوب ہے کہ ان اشاروں کا مطالعہ کرکے وہ آخرت کی حقیقتوں پر اپنے یقین کو مستحکم کرے۔

ہندستان ٹائمس (۳۱ مارچ ۱۹۹۵) کے پہلے صفحہ پر ایک نمایاں تصویر تھی۔ اس میں وہ فوٹو چھاپا گیا تھا جو امریکہ کی فرسٹ لیڈی (Hillary Clinton) اور ان کی بیٹی (Chelsea) نے آگرہ میں تاج محل کے سامنے بیٹھ کر کھنچوایا تھا۔ صدر امریکہ کی اہلیہ نے تاج محل کو دیکھنے کے بعد بار بار کہا کہ یہاں سے جانے کا جی نہیں چاہتا:

I don't feel like leaving the place.

مغل حکمرانوں نے اس ملک میں عمارتی کشش کے نمونے تو قائم کیے مگر اسلام کی کشش کے اسباب فراہم کرنے میں وہ ناکام رہے۔ انھوں نے اگر ملک میں اسلام کا تاج محل بنایا ہوتا تو شاید یہاں کی سیاحت کرنے والا یہ کہتا کہ ——— اسلام کے سوا کوئی اور دین اب مجھے پسند نہیں آتا۔

جہاز میں دوسرے اخباروں کے ساتھ اکنامک ٹائمس (The Economic Times) کا شمارہ ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ بھی تھا۔ اس کے صفحہ اول پر ایک لیبل علیحدہ سے چپکا ہوا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ یہ فلاں سفری کمپنی (Tours and Travels) کی اسپانسر کی ہوئی کاپی (sponsored copy) ہے۔ اور یہ کہ وہ آپ کی اپنی کاپی ہے:

This is your copy.

... اخبار کا ہر صفحہ ... کہ سو
بتا رہا تھا۔ کیوں کہ وہ زیادہ تر اشتہارات سے بھرا ہوا تھا۔ اس فیاضی کا مقصد ... اکیلا تھ

دینا نہیں تھا۔ بلکہ صرف اپنا اشتہار دینا تھا۔ تاکہ وہ ان کے سامانوں کا خریدار بن سکے۔ اپنے انٹرسٹ کے لئے لوگ مفت اخبار تقسیم کر رہے ہیں۔ مگر دوسروں کے انٹرسٹ کے لئے مفت اخبار فراہم کرنے والا کوئی نہیں۔

درمیان میں جہاز چالیس منٹ کے لئے جے پور میں ٹھہرا۔ کچھ مسافر یہاں اترے، اور کچھ نئے مسافر سوار ہوئے۔ وسیع نگاہ سے دیکھا جائے تو زمین بھی اسی قسم کی ایک زیادہ بڑی سواری ہے۔ ہر روز کچھ لوگ اس سے اترتے ہیں اور کچھ نئے افراد اس پر سوار ہوتے ہیں۔ جہاز کے مسافروں کے لئے ہم اترنے اور چڑھنے کا لفظ بولتے ہیں، اور زمین کے مسافروں کے لئے پیدائش اور موت کا لفظ۔

جے پور راجستھان کی ریاستی راجدھانی ہے۔ جے پور ۱۷۲۷ میں آباد کیا گیا تھا تاکہ امبر کی جگہ اس کو راجدھانی بنایا جاسکے۔ یہ ایک منصوبہ بند شہر ہے جس کی سیدھی سڑکوں کے کنارے گلابی رنگ کی عمارتوں کی قطاریں کھڑی ہوئی ہیں۔ دوسری بہت سی تاریخی عمارتوں کے علاوہ یہاں ایک رصدگاہ (جنتر منتر) ہے جو اٹھارویں صدی میں بغداد کی رصدگاہ کے نمونہ پر بنائی گئی تھی۔

جے پور کی ریاست کو بارھویں صدی میں راجپوتوں نے قائم کیا تھا۔ سولھویں صدی میں وہ مغل سلطنت کے ماتحت آگئی۔ ۱۸۱۷ میں اس پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ ۱۹۴۹ میں اس کو راجستھان میں ضم کر دیا گیا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ سو سال پہلے ریاست جے پور کی سرکاری زبان اردو تھی۔ اور عدلیہ و انتظامیہ دونوں شعبوں میں اردو ہی میں کام ہوتا تھا۔ (ماہنامہ ہدایت جنوری ۱۹۹۵، صفحہ ۸۹)

جے پور میں ایک بڑا مدرسہ (جامعۃ الہدایت) قائم ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے دینی تعلیم کے ساتھ کمپیوٹر اور صنعت و حرفت کو بھی اپنے کورس میں داخل کیا ہے۔

مدرسہ سے ایک ماہنامہ ہدایت نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ جنوری ۱۹۹۵ میں ایک مضمون

... بعض علماء کرام نے انگریزوں سے نفرت کے ساتھ انگریزی ...

اور انگریزی کی تعلیم کو ناجائز بلکہ حرام قرار دے کر مسلم قوم کے لئے علوم جدیدہ کی تحصیل کے
دروازے بند کردئے۔ اور اس فیصلہ سے برطانی حکومت کے انتقامی اور عیارانہ وشاطرانہ
عزائم کے پر لگا دئے۔ انگریزوں سے نفرت حق بجانب تھی۔ لیکن انگریزی جو علوم جدیدہ کے
حصول کا ذریعہ تھی اور جس سے سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم حاصل کر کے مسلم قوم پستی سے ابھر
سکتی تھی اور برادران وطن کے شانہ بشانہ چل سکتی تھی، اس کے دروازے مسلم قوم پر خود مسلم علماء
نے بند کر دئے (صفحہ ۸۹)

میں اضافہ کروں گا کہ انگریزوں سے نفرت کرنے میں بھی ہمارے علماء یقینی طور پر حق بجانب
نہ تھے۔ کیوں کہ یہ انگریز ہمارے لئے مدعو کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور مدعو سے داعی کا متنفر ہونا
ہرگز جائز نہیں۔

جہاز جے پور سے روانہ ہو کر اودے پور پہنچا۔ یہ ایک چھوٹا ایئر پورٹ ہے۔ یہاں
صرف چند جہاز اترتے اور روانہ ہوتے ہیں۔

اودے پور راجستھان کا ایک تاریخی شہر ہے۔ ۱۵۶۸ء میں چتوڑ کے بعد وہ مہاراجہ
اودے پور کی راجدھانی بنا۔ اس کے بعد راجہ نے یہاں دو بڑے محل تعمیر کرائے۔ شاہ جہاں
نے ۱۶۲۸ میں مغل تخت پر قبضہ کرنے سے پہلے جب اپنے باپ جہانگیر کے خلاف بغاوت کی تھی
تو اس وقت اس نے اودے پور کے ایک محل میں پناہ لی تھی۔ اودے پور کی ریاست سیسودیا
راجپوتوں نے آٹھویں صدی عیسوی میں قائم کی تھی۔ ۱۸۱۸ء میں اس پر انگریزوں نے قبضہ کیا۔
۱۹۴۸ میں اودے پور کو راجستھان میں شامل کر دیا گیا۔

آریہ سماج (۱۸۷۵) کے بانی دیانند سرسوتی نے اودے پور ہی میں اپنی مشہور
کتاب ستیارتھ پرکاش لکھی تھی (15/495)

اودے پور ایئرپورٹ پر مسٹر رادھے شیام چیچان اور پربھو دیال برلا موجود تھے۔
ان کے ساتھ بذریعہ کار بھیل واڑہ کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں حسب معمول میں ان
لوگوں سے معلوماتی انداز کی گفتگو کرتا رہا۔

مسٹر رادھے شیام چیچان ایک صنعت کار ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مرکزی حکومت

لبرلائزیشن کی پالیسی سے کیا آپ لوگ متفق ہیں۔ انھوں نے کہا کہ لبرلائزیشن اصولی طور پر درست ہے۔ مگر حکومت کو اسی کے ساتھ ملکی صنعتوں کو انفراسٹرکچر (بجلی، پانی، سڑک وغیرہ) بھی فراہم کرنا چاہئے۔ ابھی تو یہ حال ہے کہ باہر کی کمپنیوں کو ہر قسم کی سہولت فراہم جا رہی ہے۔ مثلاً ان کے سارے کام ایک "ونڈو" پر ہو جاتے ہیں۔ مگر ہم کو دسیوں ونڈو لائن لگانا پڑتا ہے۔ یہ تو کامپٹیشن نہیں ہے۔ یہ تو ایک کو پیچھے کر کے دوسرے کو آگے بڑھنے موقع دینا ہے۔

"راجستھان" کا عام تصور یہ ہے کہ وہ ریگستانی علاقہ ہے۔ راجستھان کی علامتی تصویروں میں اکثر اونٹ اور صحرا دکھایا جاتا ہے۔ مگر مجھے ایئرپورٹ سے بھیل واڑہ تک میں صحرا اور ریگستان نظر نہیں آیا۔ سڑک کے دونوں طرف درخت اور سبزہ اور کھیت کے مناظر تھے۔ میں نے ساتھیوں سے اس کا ذکر کیا تو مسٹر برلا نے کہا کہ میں ایک بار ٹرین سے دہلی سے بھیل واڑہ آرہا تھا۔ راستہ میں ایک خاتون کے ساتھ ان کا بچہ تھا۔ سفر کرتے ہوئے جب ہماری ٹرین راجستھان میں داخل ہوئی تو لڑکے نے اپنی ممی سے کہا: ممی، راجستھان تو آگیا۔ مگر وہ ریگستان کہاں ہے۔

مسٹر برلا نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ راجستھان کے صرف ایک علاقہ میں ریگستان ہے۔ مگر ایسا ہوا کہ دوسری ریاستوں میں نہیں ہے اس لئے راجستھان کی پہچان ریگستان بن گیا۔ اس غلطی کا تعلق صرف راجستھان سے نہیں۔ اکثر معاملات میں لوگ اس قسم کی غلطی کرتے ہیں، وہ جزئی معلوم کو کل کی پہچان بنا لیتے ہیں۔

راجستھان کا قدیم نام راجپوتانہ تھا۔ برٹش دور میں یہاں اٹھارہ ریاستیں تھیں۔ یہاں راجپوت راجہ راج کرتے تھے۔ اس لئے اس کا یہ نام پڑا۔ ۱۹۴۷ میں آزادی کے بعد ریاستیں ختم ہو گئیں اور اس کا مجموعی نام راجستھان رکھ دیا گیا۔

اس علاقہ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہاں کھدائی میں مٹی کے کچھ برتن ملے ہیں۔ کاربن ڈیٹنگ سے معلوم ہوا ہے کہ ان کی تاریخ ۲۷۰۰ قبل مسیح تک جاتی ہے۔ سولھویں صدی میں یہاں طاقتور راجپوت سلطنت قائم تھی۔ لیکن رانا سنگرام سنگھ (سانگا) اور بابر کی لڑائی

میں رانا سانگا کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد یہ علاقہ مغل سلطنت کے تحت آگیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جہانگیر اور شاہ جہاں دونوں راجپوت ماؤں سے پیدا ہوئے تھے۔ (15/495)

راجستھان راجاؤں کی سرزمین رہی ہے۔ چنانچہ یہاں کثرت سے تعمیری یادگاریں ہیں جو دور قدیم کو یاد دلاتی ہیں۔ ذیل میں اسی قسم کی ایک خوبصورت عمارت کی تصویر دی جارہی ہے۔ یہ اودے پور کے پاس ہے۔ اس کو راج سمدر یا جے سمدر کہا جاتا ہے۔

اودے پور سے ڈھائی گھنٹہ کا سفر طے کرکے ہم لوگ بھیل واڑہ پہنچے۔ بھیل واڑہ میں میرا قیام یہاں کے سرکٹ ہاؤس میں کیا گیا تھا۔ سرکٹ (circuit) کے معنی ہیں گھیرا۔ سرکٹ ہاؤس کا لفظ انگریزوں کے زمانہ میں رائج ہوا۔ انگریزی حکومت نے شہری مقامات پر ایک رقبہ مخصوص کرکے اس کے اندر بنگلہ نما مکانات بنائے تھے تاکہ انگریز عہدیدار اپنے دوروں کے وقت وہاں قیام کرسکیں۔ اس قسم کے مخصوص علاقے اب بھی ہر شہر میں موجود ہیں، اور



حکومت کے ذمہ دار اپنے سفروں کے دوران وہاں وقتی قیام کرتے ہیں۔ انھیں کو سرکٹ ہاؤس کہا جاتا ہے۔

بھیل واڑہ نے صرف دس سال کے اندر نمایاں ترقی کی ہے۔ بھیل واڑہ نے بھیونڈی کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ حالاں کہ بھیونڈی کو مقابلۃً بہت سے ایڈوانٹج حاصل تھے۔ "سوٹنگ" میں وہ سارے ملک سے آگے نکل گیا ہے۔

مسٹر گووند نارائن راٹھی جو خود بھی بزنس مین ہیں، انھوں نے بتایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں میں رسک لینے کی استعداد (capacity) ہے مزید یہ کہ یہاں کے لوگ دنگے سے بہت دور رہتے ہیں۔ یہاں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ اور بزنس کے لئے امن بہت ضروری ہے۔

بھیل واڑہ کی آبادی تقریباً دو لاکھ ہے۔ اس میں ۱۰ فیصد سے کچھ زیادہ مسلمان شامل ہیں۔ یہاں دس مسجدیں ہیں اور اتنی ہی تعداد میں دینی مدرسے ہیں۔ دستور ہند نے مسلمانوں کو برابر کے شہری کا درجہ دیا ہے۔ مگر تعلیم اور اقتصادیات میں پیچھے ہو جانے کی وجہ سے عملاً ہر جگہ وہ "دوسرے درجہ" کی کمیونٹی نظر آتے ہیں۔ اس صورت حال کی ذمہ داری تمام تر صرف مسلمانوں کے نااہل رہنماؤں پر عائد ہوتی ہے۔

بھیل واڑہ کا یہ سفر بھارت وکاس پریشد کی دعوت پر ہوا۔ بھارت وکاس پریشد کا قیام ۱۹۸۵ میں ہوا تھا۔ اس کے آل انڈیا پریسیڈنٹ سپریم کورٹ کے سابق جج مسٹر آر ایچ کھنا ہیں۔ راجستھان میں اس کی چالیس شاخیں ہیں۔

بھارت وکاس پریشد ایک غیر سیاسی ادارہ ہے۔ یہ لوگ تعمیری کاموں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ مثلاً اسکول، اسپتال، رفاہ عامہ، خدمت خلق، وغیرہ۔ انھوں نے سوامی دویکانند کے اس قول کو اپنا ماٹو بنایا ہے کہ راشٹر نرمان۔ ویکتی نرمان۔ یعنی فرد کی تعمیر سے ملک کی تعمیر ہوتی ہے۔ ان کے پروگراموں کے چار اجزاء یہ ہیں: سیوا، سنسکار، سہیوگ، سمپرک۔

ایک بات کا میں نے خود تجربہ کیا۔ اور وہ وقت کی پابندی ہے۔ ان کے تمام پروگرام پوری پابندی کے ساتھ انجام دئے گئے۔ ۳۱ مارچ کی شام کے پروگرام میں بھیل واڑہ

کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ چندر منت کی تاخیر سے پہنچے۔ مگر منتظمین نے کلکٹر صاحب کا انتظار کئے بغیر ٹھیک وقت پر اپنا پروگرام شروع کر دیا۔ ہر پروگرام ٹھیک مقررہ وقت پر شروع اور ختم ہوتا رہا۔ یکم اپریل کو مجھے بھیل واڑہ سے بذریعہ کار چل کر ساڑھے چار بجے اودے پور پہنچنا تھا۔ اودے پور میں دوپہر کا کھانا تھا۔ اور یہاں کا مشہور قلعہ دیکھنا تھا۔ پھر ایئر پورٹ پہنچنا تھا جس کا وقت ساڑھے چار بجے مقرر تھا۔ سارے پروگراموں کو پورا کرنے کے بعد جب ہماری کار ایئرپورٹ پہنچ کر کھڑی ہوئی تو میں نے دیکھا کہ گھڑی کی ایک سوئی چار پر تھی اور دوسری سوئی ۳۰ پر۔

مسٹر نریندر رلودھا (بھارت وکاس پریشد کے مقامی صدر) کا ٹیلیفون دہلی میں آیا تھا کہ ۱۳ مارچ کو جمعہ کا دن ہوگا۔ اس دن آپ لوگوں کی خاص نماز ہوتی ہے۔ پھر اس کے لئے ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ میں نے کہا کہ آپ کسی مسلمان سے کہدیں کہ وہ مجھ کو مسجد میں لے جائے۔ وہاں میں نماز پڑھ لوں گا۔

چنانچہ جمعہ سے پہلے سرکٹ ہاؤس میں کئی مسلمان آگئے۔ ان کے ساتھ جا کر یہاں کی اسٹیشن والی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ نماز پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ دہلی کی مسجد میں جس طرح میں اپنے آپ کو دوسروں سے مانوس پاتا ہوں۔ اسی طرح یہاں بھی اور سارے دنیا میں باہمی انسیت کا احساس ہوتا ہے۔

اس تجربہ کے بعد خیال آیا کہ اسلامی اتحاد کی بنیاد دینی روحانی یگانگت ہے۔ آپ کے جس حصہ میں جائیں، آپ محسوس کرتے ہیں کہ دوسرے مسلمانوں کا عقیدہ، ان کی سوچ ان کا اخلاقی اصول، ان کی عبادت کا طریقہ، وہی ہے جو میرا ہے۔ یہی اشتراک عالمی اسلامی اتحاد کی بنیاد ہے۔ مگر کچھ انتہا پسند لوگوں نے بے بنیاد طور پر یہ نظریہ بنایا کہ سیاسی اسلامی اتحاد کی بنیاد ہے۔ یعنی ساری دنیا کا ایک خلیفہ ہو اور تمام لوگ اس کے سیاسی کے تحت منظم ہوں۔ یہ ایک بے اصل نظریہ ہے۔ قرآن وسنت میں اس کے لئے کوئی بنیاد موجود نہیں۔

۱۳ مارچ کو دوپہر کا کھانا سرکٹ ہاؤس میں کھایا۔ لمبی میز پر کئی معزز لوگ بیٹھے

भारत विकास परिषद, भीलवाड़ा

नववर्ष कार्यक्रम दिनांक 31-3-1995 व 1-4-1995

मौलाना वहीदुद्दीन खान सा. का कार्यक्रम दिनांक 31-3-1995

प्रातः काल 5.55 पर देहली से उड़ान
प्रातः काल 7.50 पर डबोक (उदयपुर) पहुंच
प्रातः काल 8.15 पर डबोक से भीलवाड़ा के लिए कार द्वारा प्रस्थान
दोपहर 12.00 बजे भीलवाड़ा (सर्किट हाउस पर) पहुंच
दोपहर 12.30 भोजन (सर्किट हाउस)
दोपहर 1.20 प्रस्थान नमाज हेतु
दोपहर 1.30 से 2.30 तक नमाज
दोपहर 2.55 बजे बैठक हेतु प्रस्थान
अपरान्ह 3.00 से 4.00 बजे तक सदस्यों के साथ बैठक (सूचना केन्द्र)
अपरान्ह 4.00 से 5.00 बजे तक पत्रकार वार्ता (सूचना केन्द्र)
सांय 5.15 से 7.15 तक विश्राम (सर्किट हाउस)
सांय 7.15 पर प्रस्थान विचार गोष्ठी (सभागार हेतु)
रात्रि 9.15 सभागार मे सर्किट हाउस
रात्रि 9.30 भोजन (सर्किट हाउस)
रात्रि 10.30 बजे दीप विसर्जन

दिनांक 1-4-1995

प्रातः काल 8.00 बजे अल्पाहार
प्रातः काल 9.00 बजे चुनिन्दा मुस्लिम बन्धुओ के साथ बैठक, वार्ता
प्रातः काल 10.00 बजे चाय
प्रातः काल 10.30 बजे प्रस्थान चित्तौड़ के लिए (कार द्वारा)
दोपहर 11.30 बजे चित्तौड़ पहुंच
दोपहर 11.30 1.30 से तक दुर्ग भ्रमण
मध्यान्ह 1.30 से 2.00 तक भोजन चित्तौड़
अपरान्ह 2.00 बजे डबोक (उदयपुर) हेतु प्रस्थान
अपरान्ह 4.30 बजे डबोक पहुंच
सांय 5.55 बजे डबोक से उड़ान
रात्रि 8.00 बजे दिल्ली पहुंच

میں نے کھانا شروع کرتے ہوئے بلند آواز سے کہا: بسم اللہ الرحمان الرحیم۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک تعلیم یافتہ ہندو نے اس کا مطلب جاننا چاہا۔ میں نے کہا کہ اس کا مطلب ہے میں شروع کرتا ہوں خدا کے نام سے جو نہایت رحیم اور مہربان ہے۔ اسلام میں بتایا گیا ہے کہ آدمی جب بھی کوئی کام شروع کرے تو وہ ان الفاظ کو اپنی زبان سے دہرالے۔ یہ بندہ کی بندگی کا اظہار اور خدا کی خدائی کا اعتراف ہے۔

۳۱ مارچ کو ۳ بجے سہ پہر میں سوچنا کیندر (انفارمیشن سنٹر) میں نوجوانوں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ تمہیدی تقریروں کے بعد مجھے موقع دیا گیا۔ میں نے اپنے خطاب میں کہا کہ دو باتیں اگر ہمارے اندر آجائیں تو ملک کی ترقی کو کوئی روک نہیں سکتا۔ آجکل یہ حال ہے کہ لوگ دیش سے صرف لینا جانتے ہیں، وہ دیش کو دینا نہیں جانتے۔ یہ مزاج نہ صرف ملک کے لئے نقصان دہ ہے بلکہ طویل مدت کے اعتبار سے خود افراد کے لیے نقصان کا باعث ہے۔ ہمیں یہ کرنا ہوگا کہ ذاتی مفاد کے مقابلہ میں دیش کے مفاد کو اونچا رکھیں۔

دوسری چیز یہ کہ اس ملک کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندو مسلم جھگڑا ہے۔ یہ جھگڑا تمام تر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ایمرجنسی کے زمانہ میں جب ہندوؤں اور مسلمانوں کو گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا گیا اور وہاں دونوں ایک ساتھ رہے تو ہر ایک نے محسوس کیا کہ ایک دوسرے کے بارہ میں ان کے خدشے بے بنیاد تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اگر کسی طرح صرف اختلاط بڑھ جائے تو تمام غلط فہمیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔

اس میٹنگ کے بعد کافی سوالات آئے جن کا میں نے جواب دیا۔ خاص بات یہ تھی کہ سوالات کے لئے نہایت منظم طریقہ اختیار کیا گیا۔ لوگوں نے کاغذ پر لکھ کر اپنے سوالات صدر صاحب کے پاس بھیج دیئے۔ یہ سوالات ہندی میں لکھے ہوئے تھے۔ صدر صاحب نے ایک ایک سوال کو باری باری پڑھا اور میں نے ہر ایک کا جواب دیا۔ کسی بھی جواب کے بعد دوبارہ سوال نہیں کیا گیا۔ سوالات اور ان کے جوابات یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

سوال: آپ دیش میں آنے والے سمے میں کس پرکار کی راج نیتک شاسن ویوستھا کی سمبھاونا دیکھتے ہیں۔ وشیش کر ورتمان سندربھ میں (پرکاش چندر نکل)

جواب: بظاہر حالات امید کی طرف جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ۱۹۹۲ کے آخر میں میں نے بھاجپا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ لوگ کانگریس کے سیکولرزم کو سوڈو سیکولرزم کہتے ہیں۔ اور خود ہندتو کا نام لیتے ہیں۔ مگر سوڈو سیکولرزم کا بدل ہندتو نہیں ہے بلکہ ٹرو سیکولرزم ہے۔ اب آپ دیکھئے کہ خود بھاجپا کے لیڈر (آڈوانی اور باجپئی) ٹھیک اسی قسم کے الفاظ بول رہے ہیں۔ یہ واضح طور پر ایک صحت مند تبدیلی کی علامت ہے۔

سوال: بھارتیہ سنسکرتی ایوم اسلامک سنسکرتی میں کیا فرق ہے۔ دونوں سنسکرتیوں میں ہم کیا سمانتا دیکھیں۔ کیا دونوں سنسکرتیاں راشٹر کو سنگٹھت کرنے ایوم نو نرمان میں سہائک ہو سکتی ہیں (جگبیر سنگھ چودھری)

جواب: ہماری موجودہ سنسکرتی ایک نئی سنسکرتی ہے۔ اس کا قدیم بھارتی سنسکرتی سے بہت کم تعلق ہے۔ یہ دراصل ہندستانی تہذیب، اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے امتزاج سے بنی ہے۔ اور تہذیب یا سنسکرتی ہمیشہ اسی طرح امتزاج ہی سے بنتی ہے۔ یہی مشترکہ تہذیب ہندستان کی تہذیب ہے اور وہی ہماری ترقی کا ذریعہ ہے۔

سوال: شری رام مندر ایوم بابری مسجد کا مدا مندر ایوم مسجد تک سیمت نہیں رہ کر اب یہ ہندوؤں کی ایوم مسلمانوں پرتی شودکا کارن بن گیا ہے۔ اس کمی کو اب کیسے دور کیا جا سکتا ہے۔ ایوم اس سمسیا کا کیا سماتمک سمادھان ہو سکتا ہے۔ کرپیا پرکاش ڈالیں۔ (دامودر اگروال)

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ وقتی طور پر ضرور ایسا ہوا تھا کہ یہ اشو دونوں فرقوں کے لئے ہیریسٹیج اشو بن گیا تھا۔ مگر حالات کے زور پر اب وہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اب دونوں فرقوں کو محسوس ہونے لگا ہے کہ یہ ایک نان اشو تھا جس کو ہم نے جذبات میں آکر اشو بنا لیا۔

سوال: ہندو شبد راشٹروادشبد ہے۔ پھر بھی راشٹر کے سبھی ورگ کے لوگ اس کو جاتی کا دھرم سمجھ رہے ہیں۔ اس کا کیا کارن ہے۔ آپ کا اس سمبندھ میں کیا وچار ہے (ریکھا رام چندرانی)

جواب: یہ بات کہ ہندو شبد ایک راشٹروادشبد ہے، یہ صرف کچھ ہندوؤں کا کہنا

ہے جو بہت چھوٹی مائناریٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد ملک کا جو کانسٹی ٹیوشن بنا وہ تمام تر ہندو افراد ہی کا بنایا ہوا تھا۔ مگر اس میں ملک کے شہری کو ہندو نہیں کہا گیا۔ بلکہ انڈین (یا ہندستانی) کہا گیا۔ آپ جب تک کانسٹی ٹیوشن میں ترمیم نہ کریں آپ کو ایسا کہنے کا حق نہیں ہے۔

سوال: ایسا کہا جاتا ہے کہ بھارتیہ مسلم آج بھی راشٹرکل مکھیہ وچار دھارا تھا سے کٹا ہوا ہے۔ تتھا اس کی کیا وجہ ہے۔ آپ ایسا مانتے ہیں۔ انھیں کیسے جوڑا جا سکتا ہے۔ (ہری کرشن رام چندانی)

جواب: میں اس کو نہیں مانتا کہ مسلمان کسی فیصلہ کے تحت نیشنل مین اسٹریم سے کٹا ہوا ہے۔ جو واقعہ ہے وہ یہ ہے کہ نکمے قسم کے مسلم لیڈروں نے جذباتی تحریکیں چلا کر مسلمانوں کو تعلیم میں پیچھے کر دیا۔ اس پچھڑے پن کی وجہ سے مسلمان ملک کی عمومی سرگرمیوں میں جڑ نہیں پاتے۔ اس بنا پر وہ کارنر ہو کر رہ گئے ہیں۔ اگر مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنا دیا جائے تو اپنے آپ وہ تمام ملکی سرگرمیوں میں شریک ہو کر مین اسٹریم میں دکھائی دینے لگیں گے۔

سوال: ہندستان کے مسلم سماج میں ابھی بھی یہ ابھیمان بنا ہوا ہے کہ ہم نے بھارت ورش پر راج کیا۔ اسی ابھمان کے کارن وہ بھارتیہ سنسکرتی میں گھل مل نہیں پائے ہیں۔ اس بارے میں آپ کے کیا وچار ہیں۔ اس کمی کو کیسے دور کیا جا سکتا ہے۔ (رام کمار چھابڑی)

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ "مسلم سماج" میں یہ ابھیمان نہیں ہے۔ البتہ کچھ نام نہاد مسلم دانشوروں میں ضرور یہ ابھیمان پایا جاتا ہے اور وہ اس قسم کی بولیاں بولتے رہتے ہیں۔ مگر مسلم سماج میں ان کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اور حالات کا رخ بتاتا ہے کہ ایسی سوچ کے لوگ بہت جلد تاریخی میوزیم کا حصہ بن کر رہ جائیں گے۔

سوال: کوئی بستی ہندو بستی نہیں۔ پھر کوئی بستی مسلم بستی کیوں (سنجیو اگروال)

جواب: میرے جاننے میں کسی بستی کا نام مسلم بستی نہیں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی بستی میں سب مسلمان ہوں تو اس کو کوئی مسلم بستی کہنے لگے۔ اسی طرح کسی بستی میں سب ہندو ہوں تو اس کو کوئی شخص ہندو بستی کہنے لگے گا۔

سوال: انتر راشٹریہ استر سے دیکھا جائے تو آج سامپردائے واد کا ...

ہی زیادہ دکھ دائی ہوتا جا رہا ہے، ایسا کیوں (نام درج نہیں)

جواب: اس کا سبب ہندستان کا تعلیم میں پچھڑا پن ہے۔ مزید یہ کہ قوموں میں اس طرح کی خرابیاں ہمیشہ انٹرایکشن نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ نوآبادیاتی دور میں ہندستانیوں کا انٹرایکشن دوسری قوموں سے ہوتا تھا۔ آزادی کے بعد نہرو کی "پروٹکشن" کی پالیسی نے یہ انٹرایکشن ختم کر دیا۔ اسی کے یہ سب نتائج ہیں۔ اب نئی سرکاری پالیسی کے تحت دوبارہ ہندستانیوں کا انٹرایکشن دوسری قوموں کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو اپنے آپ یہ برائی ختم ہو جائے گی۔

سوال: کیا دور درشن یا آکاش وانی سے ایکتا کے نعرے لگانے سے راشٹریہ ایکتا ہو سکتی ہے۔ یدی نہیں تو دونوں ورگوں میں بھائی چارہ کی نیو مضبوط کرنا ہے تو ملاّؤں تما سنتوں کو ... کرنا ہے تو کون پریرنا دے گا۔ کہیں نہ کہیں دوش ورگوں کا ہے۔ اسے کیسے دور کیا جا سکتا ہے (نام درج نہیں)

جواب: دور درشن اور آکاش وانی کے پر[illegible] اموں سے قومی ایکتا نہیں آسکتی۔ [illegible] کے لئے سچی کوشش ضروری ہے۔ اور یہ سچی کوشش مذہبی اور روحانی لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ [illegible] صوفیوں اور سنتوں نے ہی میل ملاپ کی فضا بنائی تھی، آج بھی وہی لوگ ایسا کر سکتے ہیں۔

[illegible] ایسا کیوں ہے کہ بھارت میں کئی ورگوں کے ہوتے ہوئے بھی سامپردائک تناؤ [illegible] ورگوں ہی میں پھیلتا ہے۔ کیا اس کا کارن مسلم ورگ کی شا شک منوورتی ہے یا دھا[illegible]ک [illegible] ہندستان میں ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے مسلم ورگ کو ہزار ورش ہونے کے باوجود [illegible] منوورتی کیوں ہے۔ (نام درج نہیں)

جواب: اس کا صحیح جواب وہ ہے جو ہمایوں کبیر نے دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ اس کا [illegible] مسلمان میجاریٹی کیونٹی کے مقابلہ میں نکسٹ ٹو میجاریٹی کی حیثیت رکھتے [illegible] نفسیات ہے جس کو ہندی میں ترپریا کہا جاتا ہے۔ بھائی بہن اگر ترپریا ہوں [illegible] جھونک ہوتا رہتا ہے۔ یہی مسلمانوں اور ہندوؤں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ تاہم [illegible] ہو جائیں تو یہ نفسیات ختم ہو جاتی ہے۔ ہندو اور مسلمان تعلیم کی کمی کی بنا پر

ابھی بچوں کی عمر کو نہیں پہنچے۔ تعلیم پڑھنے کے بعد جب دونوں کا شعور پختہ ہوگا تو یہ حالت اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔

۲۱ مارچ کی شام کو جانبے سوچا کیندر (انفارمیشن سنٹر) کے ہال میں پریس کانفرنس ہوئی۔ تقریباً سبھی اخباروں کے نمائندے یہاں موجود تھے۔

بہت سے سوالات کئے گئے۔ اکثر ٹیڑھے قسم کے سوالات تھے۔ مگر میں نے تمام سوالوں کا جواب بالکل ٹھنڈے انداز میں دیا۔ پریس کانفرنس کی رپورٹ، نیز پبلک میٹنگ کی رپورٹ یہاں کے تمام اخباروں میں شائع ہوئی۔

پریس کانفرنس میں ایک ہندو جرنلسٹ نے سوال کیا کہ آجکل دیکھا جا رہا ہے کہ مندر اور مسجد دونوں جگہ جانے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں فرقوں کی مذہبی کٹرتا میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس مسئلہ کا حل آپ کے نزدیک کیا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ مفروضہ درست نہیں۔ مندر اور مسجد میں جانے کا کوئی تعلق کٹرتا سے نہیں ہے۔ وہاں جانے والے من کی شانتی یا روحانی سکون حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آج ہی کی مثال لیجئے۔ آج میں نے جمعہ کی نماز یہاں کی اسٹیشن والی مسجد میں پڑھی۔ دو ہندو بھائی اپنی گاڑی پر مجھ کو وہاں لے گئے تھے جو اس پریس کانفرنس میں اب آپ کے سامنے موجود ہیں۔ آپ ان سے پوچھ لیجئے۔ جب میں مسجد سے نماز پڑھ کر نکلا تو بیکڑوں مسلمان مجھ سے مصافحہ کرنے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ حالانکہ تمام لوگ جانتے ہیں کہ میں کٹرتا کے خلاف ہوں۔ اگر وہ لوگ مسجد سے کٹرتا کا سبق لے کر نکلتے تو کبھی بھی مجھ سے ملنے کے لئے اس طرح نہ دوڑ پڑتے۔

میں نے کہا کہ مذہبی کٹرتا کی بات وہ لوگ کرتے ہیں جو سرے سے مذہبی ہی نہیں۔ اپنے سیاسی انٹرسٹ کے لئے مذہب کا اکسپلائیٹیشن کر رہے ہیں۔

۲۱ مارچ کی شام کو ساڑھے سات بجے یہاں کے ٹاؤن ہال میں پروگرام تھا۔ وسیع ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ ضلع کلکٹر سے لیکر تاجر اور وکیل اور ڈاکٹر اور پروفیسر تک سبھی لوگ تھے۔ اس میں اصل تقریر میری ہی تھی۔ اور اسی پروگرام کے لئے مجھے یہاں بلایا گیا تھا۔

میں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ ملک کو امن اور ترقی کی طرف لے جانے کے لئے ہمیں کیا کرنا ہے۔ دوسری باتوں کے علاوہ میں نے ایک بات یہ کہی کہ کسی قوم کے دانشور قوم کا ذہن بنانے والے (opinion makers) ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک کے دانشوروں نے اس معاملہ میں صحیح کردار ادا نہیں کیا۔ اس کی وجہ سے مسائل پیدا ہوتے رہے۔ لوگوں میں صحیح سوچ نہیں ابھری۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۹۷۱ میں انڈیا نے شیخ مجیب الرحمان کا ساتھ دیا اور پاکستان ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا تو پاکستان کے دانشوروں نے اپنی قوم میں انتقام کی آگ بھڑکانا شروع کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں انڈیا سے اس کا بدلہ لینا ہے۔ چنانچہ انھوں نے کشمیر کے علاحدگی پسند عناصر کی ہمت افزائی کی۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۹ میں باقاعدہ طور پر وہاں گن کلچر چلوا دیا۔

ایسا ہی کام ہندو دانشوروں کے ایک طبقہ نے کیا۔ انھوں نے بابری مسجد کے معاملے میں ہندو قوم کو یہ بتایا کہ یہ تمہارے لئے دوسری ہار (second defeat) کا مسئلہ ہے۔ ۱۹۴۷ میں تم کو مسلمانوں کے مقابلہ میں ہار ہوئی تھی۔ اب دوسری بار تم کو ہار پر راضی نہیں ہونا ہے۔

دونوں فرقوں کے دانشوروں کو وہ کرنا چاہئے تھا جو دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپانی دانشوروں نے کیا۔ امریکہ نے ایٹم بم گرا کر جب ہیروشیما کو تباہ کیا تو جاپانی انتقامی نفسیات سے بھڑک اٹھے۔ اس وقت جاپانی دانشوروں نے اپنی قوم سے کہا کہ ۱۹۴۱ میں ہم نے امریکہ کے پرل ہاربر کو تباہ کیا تھا، انھوں نے ۱۹۴۵ میں ہمارے ہیروشیما کو تباہ کر دیا۔ معاملہ برابر ہو گیا۔ اب ماضی کے انتقام کو چھوڑ کر مستقبل کی تعمیر کی فکر کرو۔ اس طرح جاپانیوں کو عمل کا صحیح تعمیری رخ مل گیا۔

اسی طرح پاکستانی دانشوروں کو کہنا چاہئے تھا کہ ہم نے ۱۹۴۷ میں ان کے ملک کو توڑا تھا، انھوں نے ۱۹۷۱ میں ہمارے ملک کو توڑ دیا۔ معاملہ برابر ہو گیا۔ اسی طرح ہندستانی دانشوروں کو کہنا تھا کہ ۱۹۴۷ میں انھوں نے ہمارے ملک کو بٹوایا تھا جس کا ہمیں غم تھا، ۱۹۷۱ میں ہم نے ان کے ملک کو دو حصے کر کے معاملہ برابر کر لیا۔ اب اس بات کو چھوڑو اور تعمیر و ترقی کی طرف دھیان لگاؤ۔ مگر بدقسمتی سے دونوں میں سے کسی ملک میں بھی جاپان جیسے دانشور نہیں

[illegible] ترقی یافتہ نہیں ہو سکے

[illegible] صبح کو میں سرکٹ ہاؤس (کمرہ نمبر ۲) میں سو رہا تھا کہ باہر سے اذان کی آواز [illegible] سے ہو رہی تھی۔ مگر الحمدللہ اسپیکر کی وجہ سے آواز صاف سنائی دے رہی [illegible] سائنس کی تکنیک نے کس طرح ہم کو یہ موقع دے دیا ہے کہ ہم خدا کی آواز کو وہاں تک پہنچا سکیں جہاں ہم اپنی زبان سے بولے ہوئے الفاظ کو پہنچا نہیں سکتے۔

میں نے اٹھ کر وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کی۔ دیر تک ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا رہا۔ نئی جگہ پر جب آپ نماز پڑھیں اور رکوع اور سجدہ کریں تو آپ کے اندر نئی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ آپ نئی کیفیات کے ساتھ اپنے رب کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔

صبح کو کچھ لوگ سرکٹ ہاؤس میں آگئے۔ ان سے ملکی اور ملی موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ صبح کی چائے کے لئے "سیرت سرائے" والوں نے بلایا تھا۔ ڈاکٹر چھیپا کے ساتھ انھیں کی گاڑی پر سیرت سرائے گیا۔ یہاں ایک مختصر نشست ہوئی۔

سیرت سرائے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ "سیرت سرائے" کے لفظ سے بظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ کوئی ٹوٹی پھوٹی گندی جگہ ہوگی۔ مگر یہ نہایت صاف ستھری جگہ تھی۔ اس میں تقریباً ایک سو کمرے ہیں۔ یہ کمرے مسافروں کو معمولی کرایہ پر دئے جاتے ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک مفید ملی خدمت ہے جس کی تقلید ہر جگہ کے مسلمانوں کو کرنا چاہئے۔

اس کے بعد صبح ۹ بجے سوچنا کیندر میں جلسہ تھا۔ یہاں ہندو اور مسلمان دونوں اکٹھا ہوئے۔ ایک ہندو بھائی نے قرآن کا ذکر کیا۔ چنانچہ میں نے اپنی تقریر میں قرآن ہی کو موضوع بنایا۔

میں نے کہا کہ پہلی آیت جو قرآن میں اتری وہ اقرأ تھی۔ یعنی علم حاصل کرو۔ اس وقت مکہ میں بہت سے مسائل تھے، مگر ان مسائل کا ذکر نہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ علم حاصل کرو۔ اس سے ایک نہایت اہم اصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ قرآن کا طریق عمل یہ ہے کہ مسائل خواہ کتنے ہی زیادہ ہوں، ان کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے عمل کا آغاز ہمیشہ علم اور شعور بیداری سے کرنا۔ اس سلسلہ میں قرآن اور اسلامی تاریخ سے تفصیلات بیان کی گئیں۔

اس دوران میں مسلسل ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ لوگوں نے مختلف قسم کے سوالات کئے۔ میں اپنے انداز میں ہر ایک کو جواب دیتا رہا۔ ایک سوال یہ تھا کہ اسلام کیا غیر مسلموں کے تئیں نفرت کی تعلیم دیتا ہے۔

میں نے کہا کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اسلام تمام انسانوں کے ساتھ محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور انسان سے نفرت یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ کسی دل میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اس سلسلہ میں مختلف حدیثیں پیش کیں جو بتاتی ہیں کہ ایمان کس طرح آدمی کے اندر اعلیٰ انسانی اخلاق پیدا کرتا ہے۔

۶ اپریل کو واپسی تھی۔ بذریعہ کار بھیل واڑہ سے اودے پور کے لئے روانہ ہوا جہاں سے جہاز لینا تھا۔ راستہ میں ہم لوگ کچھ دیر کے لئے چتوڑ میں ٹھہرے جو بھیل واڑہ اور اودے پور کے بیچ میں ہے۔

چتوڑ گڑھ میں ایک بہت بڑی درگاہ ہے۔ اس کا نام ہے " درگاہ قاضی چل پیر شاہ" درگاہ کی مسجد میں ظہر کی نماز ادا کی۔ درگاہ کی سیڑھیوں پر ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی عمر کافی ہو چکی تھی۔ انھوں نے مجھ کو دیکھ کر میرے ساتھی سے کہا: حضرت چل پیر شاہ انھیں کی طرح تھے۔ میں نے ان کو اپنی نوجوانی کی عمر میں دیکھا ہے۔

چتوڑ گڑھ نہایت تاریخی مقام ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا قلعہ ہے جو آٹھویں صدی عیسوی میں بنایا گیا تھا۔ سولھویں صدی تک یہ شہر ریاست میواڑ کی راجدھانی تھا۔ یہاں سیسودیا راجپوت راج کرتے تھے۔

مسلم عہد میں سب سے پہلے علاء الدین خلجی نے ۱۳۰۳ء میں اس کا محاصرہ کیا۔ گجرات کے بہادر شاہ نے ۱۵۳۴ء میں اور اکبر نے ۱۵۶۷ء میں اس کا محاصرہ کیا۔ لیکن راجپوتوں نے نہایت بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ مرد بڑی تعداد میں مارے گئے اور عورتوں نے اجتماعی خودسوزی کی رسم (جوہر) کے تحت اپنا خاتمہ کر لیا۔ مگر انھوں نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ پہلی بار ۱۵۶۸ء میں اکبر اس کو فتح کرنے میں کامیاب ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں تیس ہزار راجپوت ہلاک ہو گئے (9/380)

اس [illegible] کے اندر بہت سی عمارتیں ہیں۔ انھیں میں سے ایک پدمنی محل بھی ہے۔ یہاں تالاب کے [illegible] وہ عمارتیں بنی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی [illegible] نیچے کی عمارت میں رانا پرتاپ سنگھ کی رانی پدمنی بیٹھی جو بہت خوبصورت تھی۔ دوسری طرف سامنے کی عمارت میں بڑا سا آئینہ دیوار پر لگا تھا۔ اس آئینہ میں نیچے کی بالمقابل عمارت دکھائی دیتی تھی۔ سلطان علاء الدین خلجی نے اس آئینہ میں رانی پدمنی کا عکس دیکھا۔ وہ اس پر فریفتہ ہو گیا۔ مگر پدمنی نے سلطان کا پیغام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری راجپوت خواتین کے ساتھ جوہر (خود سوزی) کے ذریعہ اس نے اپنا خاتمہ کر لیا۔ بورڈ میں اس کی بابت یہ الفاظ درج ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ سلطان خلجی نے پدمنی کو آئینہ کے ذریعہ دیکھا تھا:

Khilji is said to have seen her through mirrors.

چتوڑگڑھ کی ایک قابل دید چیز وجے استمبھ (Tower of victory) ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا قلعہ ہے۔ اس قلعہ کے اندر یہ استمبھ واقع ہے:



یہ ۱۲۲ فٹ اونچا ایک مینار ہے۔ اس کا اصل نام وجے استمبھ ہے۔ یعنی منارۂ فتح۔ یہاں آرکیالوجی کی طرف سے جو بورڈ لگایا گیا ہے اس پر لکھا ہوا ہے کہ رانا کمبھا کو ۱۴۴۰ء میں سلطان محمود خلجی (مالوہ) پر فتح حاصل ہوئی تھی۔ اس فتح کی یادگار کے طور پر رانا نے ۱۴۶۸-۱۴۵۸ء میں یہ استمبھ بنوایا۔ اس کی تعمیر میں جو پتھر لگائے گئے ہیں ان پر ہندو دیوی دیوتاؤں کی تصویریں تراش کر بنائی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ہتھیاروں اور موسیقی کے سازوں کی تصویریں بھی تراشی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ استمبھ کے اندر عربی رسم الخط میں اللہ بھی لکھا ہوا ہے۔

استمبھ کے باہر آرکیالوجی کا جو بورڈ لگا ہوا ہے اس پر اس کی بابت یہ الفاظ درج ہیں کہ استمبھ کی تیسری اور آٹھویں منزل پر عربی میں لکھا ہوا لفظ اللہ بتاتا ہے کہ راجہ دوسرے مذہبوں کا بھی کتنا احترام کرتا تھا:

The word "Allah" inscribed in Arabic in 3rd and 8th stories shows the regard of other faiths also.

مہارانا پرتاپ سنگھ (میواڑ) اور شہنشاہ اکبر کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ پرتاپ سنگھ کا سپہ سالار ایک مسلمان حکیم خاں سوری تھا۔ اور اکبر کا سپہ سالار ایک ہندو راجہ مان سنگھ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل دور میں جو لڑائیاں ہوئیں وہ صرف سیاسی بالادستی کی لڑائیاں تھیں۔ ان کا کچھ بھی تعلق مذہب سے نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو راجہ کی فوج میں مسلمان اور مسلم بادشاہ کی فوج میں ہندو ہوتے تھے۔ حتی کہ مذکورہ مثال کے مطابق، ہندو راجہ نے مسلم بادشاہ پر اپنی فتح کا مینار تعمیر کیا تو اس کی دیواروں پر اس نے ہندو مذہبی علامتوں کے ساتھ عربی رسم الخط میں اللہ کا نام بھی کندہ کیا

اودے پور کا قلعہ دیکھنے کے بعد ہم لوگ ایئر پورٹ کے لئے روانہ ہوئے۔ ہم اپنے پروگرام کے مطابق، ٹھیک وقت پر ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ مگر وہاں معلوم ہوا کہ جہاز لیٹ ہے۔ میری واپسی انڈین ایئر لائنز کے جہاز سے تھی۔ لیکن انڈین ایئر لائنز میں تاخیر ایک عام چیز ہے اور وقت پر روانگی صرف ایک استثنا ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے با صرار کہا کہ آپ لوگ چلے جائیں۔ مگر وہ لوگ آخر وقت تک ایئر پورٹ پر ٹھہرے رہے۔ جہاز کا مقرر وقت پانچ بجے

تھا۔ مگر جہاز صبح ساڑھے سات بجے روانہ ہوا۔

احمد آباد سے انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ ۴۹۴ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ یہاں حسب معمول ایئر لائنز کے دو فلائٹ میگزین (سوآگت) دیکھے۔ مارچ ۱۹۹۵ کے شمارہ میں ایک مضمون [illegible] کی [illegible] سمٹری (انگلش قبرستان) کے بارہ میں تھا۔

اس میں بتایا گیا تھا کہ آگرہ کے اس قبرستان میں بھی انگریزوں کی قبریں ہیں۔ ان میں سے ایک انگریز سوداگر جان ملڈن ہال (Johan Mildenhall) ہے۔ وہ ۱۶۰۳ء میں مغل دربار میں آیا۔ اس کے پاس الزبتھ اول کا ایک تعارفی خط تھا۔ اس میں مغل حکمراں سے ہندستان میں تجارت کی اجازت مانگی گئی تھی۔ اکبر نے کسی قدر تردد کے ساتھ تجارت کی اجازت دے دی۔ بعد کو سر ٹامس رو (Sir Thomas Roe) جہانگیر کے دربار میں آیا۔ اس نے جہانگیر سے بات کرکے اس سے مزید رعایتیں حاصل کرلیں۔ اس طرح ہندستان میں انگریزوں کے نفوذ کے لئے دروازہ کھل گیا:

Thus heralding the rise of the British in India (p. 42)

انڈین ایئر لائنز کا فلائٹ میگزین سوآگت (اپریل ۱۹۹۵) دیکھا۔ اس میں تقریباً انگریزی اور نصف ہندی مضامین ہوتے ہیں۔ ہندی شعبہ میں ایک مضمون کا عنوان تھا: رہے گا بانس تو بجے گی بانسری۔ عنوان سے بظاہر یہ خیال ہوتا تھا کہ یہ مضمون "بانسری" کے بارہ میں ہوگا۔ لیکن پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ بانسری کا ذکر اس میں محض ضمنی طور پر ہے۔ اصلاً یہ مضمون بانس کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ بانس ایک بہت مفید درخت ہے اور بانسری کے علاوہ اس کے بہت سے استعمال ہیں۔ مختلف ملکوں میں بانس کے استعمالات بتائے گئے تھے۔

میں نے سوچا کہ محض عنوان یا کوئی ظاہری پہلو دیکھ کر کسی چیز کے بارہ میں رائے قائم نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ اس کو پوری طرح دیکھنا اور سمجھنا چاہئے۔ عین ممکن ہے کہ جزء کو دیکھ کر بظاہر جو رائے بنی تھی، وہ کل سے واقفیت کے بعد بدل جائے۔

انگریزی روزنامہ ہندو کا شمارہ یکم اپریل ۱۹۹۵ دیکھا۔ اس میں ایک خبر یہ تھی کہ گجرات کی حکومت نے ریاست کے تمام پرائمری اسکولوں، سکنڈری اسکولوں اور ہائر سکنڈری

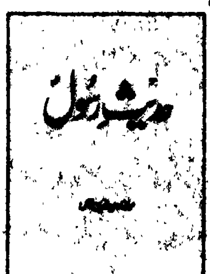
ںکولوں کے لئے لازم قرار دیا ہے کہ تمام طلبہ روزانہ اجتماعی طور پر بندے ماترم کا ترانہ گائیں ۔ ہیکیشن منسٹر تلیں بسٹ نے اسٹیٹ اسمبلی میں اس کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ وندے ترم بچوں کے اندر حب الوطنی ، قومیت کا جذبہ پیدا کرنے میں مددگار ہوگا اور پوری قوم کو متحد رنے کا ذریعہ بنےگا :

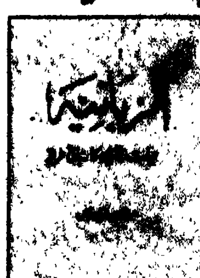
Vande Mataram would help the children in developing patriotism and nationalism and would be a vehicle to unite the entire nation. (p. 9)

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ ترانوں سے کبھی کوئی قوم نہیں بنتی ۔ ۱۹۴۷ سے پہلے پوری پاکستانی قوم نے یہ ترانہ گایا تھا اور اب بھی گاتی ہے کہ ــــــ پاکستان کا مطلب کیا ، لا الٰہ الا اللہ ۔ مگر مزاج اور کردار کی تعمیر کے اعتبار سے اس کا ایک پرسنٹ فائدہ بھی نہیں ہوا ۔ یہی انجام بندے ماترم کا بھی ہوگا ۔ اسکول کے بچے تو درکنار ، اگر انڈیا کے تمام لوگ ہر روز صبح کو یہ ترانہ گائیں تب بھی اس کا کوئی حقیقی عملی نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں ۔ اس طرح کے ترانے صرف بڑا ول کو خوش کرتے ہیں ، وہ بچوں کے تعمیر کردار میں کچھ بھی مددگار نہیں ہوتے ۔

یکم اپریل ۱۹۹۵ کی شام کو ۹ بجے دہلی واپس آگیا ۔ ایک غلط فہمی کی وجہ سے یہاں ایئرپورٹ پر لوگ دیر میں پہنچے ۔ مجھ کو تقریباً پندرہ منٹ کھڑے ہو کر ان کا انتظار کرنا پڑا ۔ یہ پندرہ منٹ اتنا لمبا معلوم ہوا کہ میری زبان سے نکلا کہ خدایا ، اس دنیا میں پندرہ منٹ کا انتظار بھی برداشت نہیں ہوتا ۔ قیامت میں انسان کا حال کیا ہوگا جب اس کو لامعلوم مدت تک انتظار کی حالت میں کھڑا رہنا پڑے گا ، جب کہ وہاں کا ہر منٹ دنیا کے منٹ سے بے حساب حد تک زیادہ سخت ہے ۔







خبر نامہ اسلامی مرکز

۱ کلکتہ کے ادارہ فروغ ہندو مسلم انڈر اسٹینڈنگ کی طرف سے ۹ دسمبر ۱۹۹۶ کو ایک عمومی سیمینار بنگلہ اکیڈمی ہال میں منعقد کیا گیا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور سیکولرزم کا مستقبل (فیوچر آف سیکولرزم) کے موضوع پر تفصیلی خطاب کیا۔ اس خطاب کے بیشتر حصے اسی دن کلکتہ ٹی وی سے نشر کئے گئے اور بنگلہ اخباروں میں شائع ہوئے۔

۲ مسیح الملک یونانی میڈیکل کالج کے زیر اہتمام مظفر نگر میں ایک سیمینار ہوا۔ اس کا موضوع تھا اقلیت کے مسائل۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور مذکورہ موضوع پر تقریر کی۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ انڈیا مسلمانوں کے لئے کوئی پرابلم کنٹری نہیں۔ یہاں ان کے لئے ہر قسم کی ترقی کے لئے وسائل موجود ہیں۔

۳ بھارتیہ آریہ پرتنیدھی سبھا کی طرف سے ۱۲ نومبر ۱۹۹۶ کو گاندھی پیس فاؤنڈیشن (نئی دہلی) میں ایک پریس کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس کا موضوع ملک میں مکمل شراب بندی تھا۔ انھوں نے اس موضوع پر اپنے خیالات پیش کئے۔ ایک سوال یہ تھا کہ شراب بند کرنے سے اٹھارہ ہزار کروڑ روپیہ سالانہ کا ریونیو کا نقصان ہوگا۔ وہ کہاں سے پورا ہوگا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ شراب نوشی کا بہت گہرا تعلق جرائم سے ہے۔ شراب نوشی بند ہوگی تو جرائم گھٹیں گے۔ اس طرح کرائم کنٹرول کا خرچ بہت کم ہو جائے گا۔ اس کی مثال سعودی عرب ہے۔ وہاں شراب بندی اور دوسرے اسباب سے جرائم بہت کم ہوتے ہیں۔ چنانچہ کرائم کنٹرول کا غیر ضروری خرچ بچ کر سوشل ویلفیر کی مدوں میں استعمال ہوتا ہے جس سے عوام کو غیر معمولی فائدہ حاصل ہوا ہے۔

۴ ۱۰ دسمبر ۱۹۹۶ کو مایا میگزین کے نمائندہ مسٹر بی ڈی گوتم نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ بنیادی موضوع یہ تھا کہ ۱۹۹۶ کا سال مسلمانوں کے لئے کیسا سال تھا۔ اس سلسلہ میں

میں داخل ہو سکے ہیں۔ نیز وہ اس حقیقت کو جان سکے کہ ڈاکٹر نمائر کی سیاست بے فائدہ
سیاست ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ مل جل کر زندگی گزاری جائے اور نزاعی مسائل کو پر امن
بات چیت کے ذریعہ حل کیا جائے۔

۵ مسٹر ٹامس میتھیو کی دعوت پر نومبر ۱۹۹۶ کے آخری ہفتہ میں صدر اسلامی مرکز نے
پونا کا سفر کیا۔ یہاں ہندستان کے علاوہ مختلف ملکوں کے سات سو ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔
اسلام میں امن کے تصور پر یہاں دو تقریریں ہوئیں۔ اس کے علاوہ شہر میں مختلف اجتماعات سے
خطاب کیا۔ بعض مقامی اخبارات نے انٹرویو بھی لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستان
کے عام مسلمان یہاں کی نیشنل مین اسٹریم میں شریک ہیں۔ یہ صرف مسلمانوں کے خود ساختہ
لیڈر ہیں جو اپنی جذباتی تقریروں سے الٹا تاثر دیتے ہیں۔

۶ اسٹیٹس مین کے نمائندہ مسٹر ضیاء السلام نے ۲ دسمبر ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو
لیا۔ سوالات کا تعلق اسلامی رواج سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ
اسلام کے نام پر برصغیر ہند کے مسلمانوں میں جو رسوم رائج ہیں وہ زیادہ تر پڑوسی قوموں
کے اثر سے مسلمانوں میں آگئے ہیں۔ وہ اسلام کی تعلیم کا نتیجہ نہیں۔

۷ ۱۸ دسمبر ۱۹۹۶ کو آریہ سماج کے دفتر (جنتر منتر روڈ، نئی دہلی) میں مختلف مذاہب کے دانشوروں
کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ کلکتہ
ہائی کورٹ نے نومبر ۱۹۹۶ میں اپنے ایک فیصلہ کے تحت بنگال میں عبادت خانوں کے اوپر
لاؤڈ اسپیکر لگانے پر پابندی عائد کر دی ہے۔ کہا گیا کہ یہ فیصلہ بالکل درست ہے اور
پورے ملک میں اس پر عمل ہونا چاہیے۔ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال عبادت خانہ کے اندرونی
حصہ میں بوقت ضرورت ہونا چاہیے۔ مگر باہر لاؤڈ اسپیکر لگانا صرف شور میں اضافہ کرتا ہے
اس کا کوئی بھی مثبت فائدہ نہیں۔ اس پروگرام کا خلاصہ اسی دن ٹی وی پر دکھایا گیا۔

۸ برلن کے ادارہ سنٹر فار ماڈرن اورینٹل اسٹڈیز کے ریسرچ اسکالر
(Dr Dietrich Reetz) نے ۱۵ دسمبر ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی۔
اور تفصیلی انٹرویو لیا۔ وہ انڈیا کی قبل از آزادی مسلم تحریکوں پر ریسرچ کر رہے ہیں۔

خبرنامہ اسلامی مرکز

۱۔ کلکتہ کے ادارہ سنٹر فار ہندو مسلم انڈر اسٹینڈنگ کی طرف سے ۹ نومبر ۱۹۹۶ کو ایک سیمینار ہوا۔ یہ سیمینار بنگلہ اکیڈمی ہال میں منعقد کیا گیا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور سیکولرزم کا مستقبل (فیوچر آف سیکولرزم) کے موضوع پر تفصیلی خطاب کیا۔ اس خطاب کے بیشتر اجزاء اسی دن کلکتہ ٹی وی سے نشر کئے گئے اور بنگلہ اخبارات میں شائع ہوئے۔

۲۔ حاجی اقبال یونانی میڈیکل کالج کے زیر اہتمام مظفر نگر میں ایک سیمینار ہوا۔ اس کا موضوع تھا اقلیت کے مسائل۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور مذکورہ موضوع پر تقریر کی۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ انڈیا میں مسلمانوں کے لئے کوئی پرابلم نہیں۔ یہاں ان کے لئے ہر قسم کی ترقی کے لئے وسائل موجود ہیں۔

۳۔ بھارتیہ آریہ پرتنیدھی سبھا کی طرف سے ۱۲ نومبر ۱۹۹۶ کو گاندھی پیس فاؤنڈیشن (نئی دہلی) میں ایک پریس کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس کا موضوع ملک میں مکمل شراب بندی تھا۔ انھوں نے اس موضوع پر اپنے خیالات پیش کئے۔ ایک سوال یہ تھا کہ شراب بند کرنے سے اٹھارہ ہزار کروڑ روپیہ سالانہ کا ریونیو کا نقصان ہوگا۔ وہ کہاں سے پورا ہوگا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ شراب نوشی کا بہت گہرا تعلق جرائم سے ہے۔ شراب نوشی بند ہوگی تو جرائم گھٹیں گے۔ اس طرح کرائم کنٹرول کا خرچ بہت کم ہو جائے گا۔ اس کی مثال سعودی عرب ہے۔ یہاں شراب بندی اور دوسرے اسباب سے جرائم بہت کم ہوتے ہیں۔ چنانچہ کرائم کنٹرول کا [illegible] پانچ کروڑ [illegible] کی مد میں استعمال ہوتا ہے جس سے عوام کو بہتر سہولیات [illegible] حاصل ہوا ہے۔

۴۔ [illegible] دسمبر ۱۹۹۶ کو [illegible]
یا بنیادی [illegible] ۱۹۹۶ [illegible]
گیا کہ ۱۹۹۶ میں اسلام [illegible]

جو مسائل ہو گئے ہیں۔ نیز وہ اس حقیقت کو جان گئے ہیں کہ ٹکراؤ کی سیاست منفی سیاست ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ مل جل کر زندگی گزاری جائے اور نزاعی مسائل کو پر امن بات چیت کے ذریعہ حل کیا جائے۔

ورلڈ فلاسفرس میٹ کی دعوت پر نومبر ۱۹۹۶ کے آخری ہفتہ میں صدر اسلامی مرکز نے پونا کا سفر کیا۔ یہاں ہندستان کے علاوہ مختلف ملکوں کے سات سو ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ اسلام میں امن کے تصور پر یہاں دو تقریریں ہوئیں۔ اس کے علاوہ شہر میں مختلف اجتماعات سے خطاب کیا۔ بعض مقامی اخبارات سے انٹرویو بھی لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستان کے عام مسلمان یہاں کی نیشنل مین اسٹریم میں شریک ہیں۔ یہ صرف مسلمانوں کے خود ساختہ لیڈر ہیں جو اپنی جذباتی تقریروں سے الٹا تاثر دیتے ہیں۔

اسٹیٹس مین کے نمائندہ مسٹر ضیاء السلام نے ۲ دسمبر ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق اسلامی رواج سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اسلام کے نام پر برصغیر ہند کے مسلمانوں میں جو رسوم رائج ہیں وہ زیادہ تر پڑوسی قوموں کے اثر سے مسلمانوں میں آ گئے ہیں۔ وہ اسلام کی تعلیم کا نتیجہ نہیں۔

۱۸ دسمبر ۱۹۹۶ کو آریہ سماج کے دفتر (جنتر منتر روڈ، نئی دہلی) میں مختلف مذاہب کے دانشوروں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ کلکتہ ہائی کورٹ نے نومبر ۱۹۹۶ میں اپنے ایک فیصلہ کے تحت بنگال میں عبادت خانوں کے اوپر لاؤڈ اسپیکر لگانے پر پابندی عائد کر دی ہے۔ کہا گیا کہ یہ فیصلہ بالکل درست ہے اور پورے ملک میں اس پر عمل ہونا چاہیے۔ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال عبادت خانہ کے اندرونی حصہ میں بوقت ضرورت ہونا چاہیے۔ مگر باہر لاؤڈ اسپیکر لگانا صرف شور میں اضافہ کرتا ہے اس کا کوئی بھی مثبت فائدہ نہیں۔ اس پروگرام کا خلاصہ اسی دن ٹی وی پر دکھایا گیا۔

برلن کے ادارہ سنٹر فار ماڈرن اورینٹل اسٹڈیز کے ریسرچ اسکالر (Dr Dietrich Reetz) نے ۱۸ دسمبر ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی اور تفصیلی انٹرویو لیا۔ وہ انڈیا کی جنگ آزادی میں مسلم تحریکات پر ریسرچ کر رہے تھے۔

مذکورہ موضوع سے متعلق سوالات دیتے ہوئے کہا کہ یہ تحریکیں زیادہ تر ردّعمل کے تحت اٹھنے والی تحریکیں تھیں۔ وہ مثبت معنوں میں اسلامی تحریکیں نہ تھیں۔

۹ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۱ جنوری ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر ہوئی۔ اس تقریر کا موضوع تھا: روزہ کی انفرادی اور اجتماعی اہمیت۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ رمضان کا روزہ ایک سالانہ تربیت ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اسلامی اسپرٹ اور اسلامی کردار پیدا کیا جائے تاکہ وہ سال کے بقیہ مہینوں میں اس کے مطابق زندگی گزاریں۔

۱۰ نئی دہلی کے پروٹسٹنٹ چرچ (کیتھڈرل) میں ۲۷ دسمبر ۱۹۹۶ کو ایک فنکشن ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور باہمی ہم آہنگی اور میل ملاپ کی اہمیت پر ایک تقریر کی۔

۱۱ ۲۵ دسمبر ۱۹۹۶ کو سہارن پور (پنجابی ہوٹل) میں ایک سیمنار ہوا۔ اس کا موضوع تھا: مسلم اقلیت کے تعلیمی مسائل۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر شرکت کی۔ اور اس موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہمارا تعلیمی مسئلہ خود ہماری محنت اور جدوجہد سے حل ہوگا نہ کہ شکایت اور مطالبہ کی مہم چلانے سے۔

۱۲ نائیڈا نہرو یووک کیندر میں ۲۹ دسمبر ۱۹۹۶ کو ایک جلسہ ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے شرکت کی۔ اور "محبت انسانی" کے موضوع پر تقریر کی۔

۱۳ راشٹریہ سہارا (ہندی) کے نمائندہ شری کرشن دیو نے ۲۹ دسمبر ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس موضوع سے تھا کہ ۱۹۹۷ کے لئے آپ کے نزدیک نیشنل ایجنڈا کیا ہونا چاہئے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ حقیقت کو تسلیم کرنا ہمارے لئے عمل کا راستہ کھولتا ہے۔ اور حقیقت سے ٹکرانا پیش قدمی کے عمل کو روک دیتا ہے۔

۱۴ پیغمبر انقلاب کا مراٹھی ترجمہ پروفیسر ساٹھے نے کیا ہے اور جناب کارنک صاحب نے شائع کروایا ہے۔ کتاب حاصل کرنے کے لئے ذیل کے پتہ پر خط و کتابت کریں۔

D.B. Karnik, A-68 Adarsha Nagar, Worli, Mumbai-25, Ph: 4220304

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اُردو		مطالعہ سیرت	8/-	حیات طیبہ	7/-
تذکیر القرآن جلد اول	200/-	ڈائری جلد اول	-	باغ جنت	7/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
اللہ اکبر	45/-	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
پیغمبر انقلاب	40/-	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
مذہب اور جدید چیلنج	45/-	تعمیر کی طرف	9/-	مضامین اسلام	30/-
عظمت قرآن	30/-	تبلیغی تحریک	20/-	تعدد ازدواج	3/-
عظمت اسلام	50/-	تجدید دین	20/-	ہندستانی مسلمان	40/-
عظمت صحابہ	7/-	عقلیات اسلام	30/-	روشن مستقبل	7/-
دین کامل	50/-	مذہب اور سائنس	-	صوم رمضان	7/-
الاسلام	40/-	قرآن کا مطلوب انسان	8/-	علم کلام	9/-
ظہور اسلام	40/-	دین کیا ہے	8/-	اسلام کا تعارف	4/-
اسلامی زندگی	25/-	اسلام دین فطرت	7/-	علماء اور دور جدید	8/-
احیاء اسلام	20/-	تعمیر ملت	6/-	سیرت رسولؐ	
راز حیات	50/-	تاریخ کا سبق	7/-	ہندستان آزادی کے بعد	3/-
صراط مستقیم	40/-	فسادات کا مسئلہ	5/-	مارکسزم تاریخ جس کو	8/-
خاتون اسلام	50/-	انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-	رد کر چکی ہے	
سوشلزم اور اسلام	40/-	تعارف اسلام	5/-	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	7/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-	اسلام پندرہویں صدی میں	5/-	الاسلام یتحدی (عربی)	85/-
الربانیہ	40/-	راہیں بند نہیں	7/-	**ہندی**	-
کاروان ملت	45/-	ایمانی طاقت	7/-	سچائی کی تلاش	8/-
حقیقت حج	30/-	اتحاد ملت	7/-	انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
اسلامی تعلیمات	25/-	سبق آموز واقعات	7/-	پیغمبر اسلام	4/-
اسلام دور جدید کا خالق	25/-	زلزلۂ قیامت	10/-	سچائی کی کھوج	-
حدیث رسولؐ	25/-	حقیقت کی تلاش	7/-	آخری سفر	8/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-	پیغمبر اسلام	5/-	اسلام کا پریچے	6/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	-	آخری سفر	7/-	پیغمبر اسلام کے جیون ساتھی	8/-
میوات کا سفر	35/-	اسلامی دعوت	7/-	راستے بند نہیں	7/-
قیادت نامہ	20/-	خدا اور انسان	7/-	جنت کا باغ	8/-
راہ عمل	25/-	حل یہاں ہے	10/-	بھوشیہ واد اور اسلام	3/-
تعبیر کی غلطی	60/-	سچا راستہ	5/-	اتہاس کا سبق	8/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-	دینی تعلیم	7/-	اسلام ایک سوابھاوک مذہب	7/-

A Treasury of the Qur'an	75.00
The Beautiful Commands of Allah	[illegible]
The Beautiful Promises of Allah	[illegible]
The Wonderful Universe of Allah	[illegible]
Words of the Prophet Muhammad	75.00
Muhammad: A Prophet for All Humanity	165.00
The Life of the Prophet Muhammad	75.00
Sayings of Muhammad	75.00
Presenting the Qur'an	165.00
The Soul of the Qur'an	125.00
Indian Muslims	85.00
Islam and Modern Challenges	95.00
Islam: The Voice of Human Nature	30.00
Islam: Creator of the Modern Age	55.00
Woman Between Islam and Western Society	95.00
Woman in Islamic Shari'ah	65.00
Islam As It Is	55.00
Religion and Science	45.00
The Way to Find God	20.00
The Teachings of Islam	25.00
The Good Life	20.00
The Garden of Paradise	25.00
The Fire of Hell	25.00
Man Know Thyself	6.00
Muhammad: The Ideal Character	8.00
Tabligh Movement	40.00
Polygamy and Islam	7.00
Hijab in Islam	20.00
Concerning Divorce	7.00
An Islamic Treasury of Virtues	

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

اگست ۱۹۹۷ ، شمارہ ۲۴۹

فہرست	صفحہ
	۴۷

زیر طبع کتابیں

تصویر ملت

دعوت اسلام

سفرنامہ غیر ملکی اسفار (جلد دوم)

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, Near [illegible],
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY

MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

حکمتِ قرآن

قرآن ۲۳ سال میں نجماً نجماً (تدریجی طور پر) اترا۔ اس اسلوبِ نزول کی حکمت بتاتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے : ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضیٰ الیک وحیہ وقل رب زدنی علما (طٰہٰ ۱۱۴) اور تم قرآن کے لینے میں جلدی نہ کرو جب تک اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے اور کہو کہ اے میرے رب، میرا علم زیادہ کر دے۔

مکہ میں قرآن کے ذریعہ جو دعوتی مہم چل رہی تھی، اس میں بار بار لوگوں کی طرف سے نئے نئے سوالات اٹھائے جاتے تھے۔ اور ان مسائل کا حل دریافت کیا جاتا تھا جن کی بابت قرآن میں ابھی کچھ نہیں اترا تھا۔ مثلاً مشرکین کی زیادتیوں کے بارہ میں قرآن میں یہ حکم اترا تھا کہ ان پر صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کرو۔ اب ان کا شکار ہونے والے مسلمان یہ کہتے تھے کہ ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم ان سے لڑ کر اس کا خاتمہ کریں۔ ایسی حالت میں مخلص اہلِ ایمان فطری طور پر یہ چاہتے تھے کہ قرآن کا وقفۂ نزول کم ہو تاکہ بقیہ معاملات میں بھی جلد از جلد خدا کی رہنمائی مل جائے۔ جزئی احکام والے قرآن کے بجائے مکمل احکام والا قرآن ہمیں حاصل ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن جس ترتیب و تدریج سے اتر رہا ہے وہ اتفاقی نہیں ہے بلکہ وہ خدا کا طے شدہ منصوبہ ہے۔ قرآن اسی طرح اسی اسلوب میں اترتا رہے گا یہاں تک کہ فطری طور پر وہ اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔

اہل ایمان کو اس سے روکا گیا کہ وہ مستقبل میں اترنے والے قرآن (یا احکام قرآن) کو حال میں اتارنے کے خواہش مند ہوں۔ اس کے بجائے تمہیں یہ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تمہارے فہم قرآن میں اضافہ کر دے۔ قرآن کی اگلی آیتوں کے بارہ میں تعجیل کے بجائے تمہیں اس حکمت کو جاننے کی کوشش کرنا چاہیے کہ قرآنی احکام کے نزول میں تدریج کیوں رکھی گئی ہے۔

مصلح کے لیے جائز نہیں کہ وہ جلد باز بنے۔ دعوت کے حالات میں لوگوں کو جہاد پر اکسانا، تعمیرِ فکر کے دور میں اجتماعی اقدام کا حکم سنانا، جن مواقع پر صبر و اعراض مطلوب ہے وہاں قتال کی آیتوں کے حوالے دینا، یہ سب اسی کے ذیل میں داخل ہے۔

انسان کی قسمیں

انسان کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو اپنے آپ کو برائیوں سے بچائے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اگرچہ خود تو برائیوں میں ملوث ہوں مگر وہ ان لوگوں کی قدر کریں جو برائی سے دور رہتے ہیں۔ تیسری قسم وہ ہے جب کہ برائی کرنے والا نہ صرف برائی کرے بلکہ وہ اچھے لوگوں کا دشمن بن جائے ۔ ہر شخص کو اپنا احتساب کرکے دیکھنا چاہیے کہ وہ ان تینوں میں سے کس قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

خدا نے ہر عورت اور مرد کو آزاد پیدا کیا ہے۔ تاہم یہ آزادی حق کے طور پر نہیں بلکہ آزمائش کے طور پر ہے۔ خدا کے مطلوب بندے صرف وہ ہیں جو اپنی آزادی کا غلط استعمال نہ کریں۔ یہی لوگ ہیں جو موت کے بعد جنت میں داخل کیے جائیں گے۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جو اپنے آپ کو کنٹرول میں نہ رکھ سکیں۔ اور برائیوں میں ملوث ہو جائیں۔ تاہم ان کی فطرت اس حد تک زندہ ہو کہ جب وہ کوئی برا کام کریں تو اس پر وہ شرمندگی محسوس کرتے ہوں۔ اسی کے ساتھ وہ اچھے لوگوں کی قدر کریں۔ ان کا سر اچھے لوگوں کے آگے جھک جاتا ہو۔ یہ لوگ بھی اگرچہ برے ہیں لیکن ان کی شرمندگی اور نیک لوگوں کے لیے ان کی قدردانی، یہ ان کی ایسی صفت ہے جو شاید خدائے رحمٰن ورحیم کے سامنے ان کی سفارش بن سکے۔

تیسری قسم ان عورتوں اور مردوں کی ہے جن کا حال یہ ہو کہ وہ برائیوں میں اس طرح ملوث ہوں کہ ان کا سینہ بے حسی کا کارخانہ بن جائے۔ وہ برائی کرتے کرتے اس حد تک بے حس ہو چکے ہوں کہ نیک لوگ ان کے لیے قابل نفرت چیز بن جائیں۔ نیک لوگوں کو بدنام کرنا، ان کو ذلیل کرنا، ان کی ترقی کو روکنا، ان کے مفادات کو مجروح کرنا، یہ ان کا شیوہ بن جائے۔

ایسے لوگ خدا کی نظر میں بدترین جانور ہیں۔ خدا انھیں کبھی معاف کرنے والا نہیں، اِلّا یہ کہ وہ توبہ کریں اور اپنی روش سے باز آئیں۔

غیر جانب دارانہ سوچ

۱۰ مارچ ۱۹۹۷ کو جناب شمشاد محمد خاں صاحب لندن سے دہلی آئے۔ ملاقات کے وقت انھوں نے بتایا کہ ان کا یہ سفر برٹش ایرویز کے جہاز سے تھا۔ جہاز کے ایک ہندستانی مسافر نے ان سے کہا کہ یہ انگریز لوگ آج بھی ہم ہندستانیوں سے امتیازی سلوک کرتے ہیں۔ دیکھئے، میں نیویارک سے آرہا ہوں۔ نیویارک سے لندن تک کا سفر میں نے برٹش ایرویز سے کیا تھا، اب لندن سے دہلی کا سفر بھی برٹش ایرویز سے کر رہا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ نیویارک سے لندن کے لیے جو جہاز تھا اس میں سیٹوں کے درمیان جگہ (leg space) زیادہ تھی۔ اور بھی بہتر سہولتیں اس کے اندر موجود تھیں۔ لیکن لندن سے دہلی کے لیے ہم جس جہاز سے سفر کر رہے ہیں اس میں یہ سہولتیں موجود نہیں۔ یہ کتنا بڑا امتیاز (discrimination) ہے۔

شمشاد محمد خاں صاحب نے مذکورہ ہندستانی مسافر سے کہا کہ بھائی صاحب، یہ امتیازی سلوک کی بات نہیں ہے۔ یہ کمپٹیشن کی بات ہے۔ ٹرانس اٹلانٹک راستہ پر بہت سی کمپنیاں پروازیں کرتی ہیں۔ وہاں نہایت سخت مقابلہ ہے۔ کمپنیاں مسافروں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے مقابلہ میں بہتر سہولت فراہم کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ مگر لندن اور دہلی کے راستہ پر ایسا کمپٹیشن نہیں۔ اس لیے یہاں کوئی کمپنی اتنا زیادہ توجہ بھی نہیں دیتی۔ یہ فرق برٹش ایرویز ہی میں نہیں خود ایر انڈیا میں بھی موجود ہے جو ہندستان کی اپنی کمپنی ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر غلط فہمیاں کس طرح جنم لیتی ہیں۔ اس کا سبب بیشتر حالات میں یہ ہوتا ہے کہ ایک واقعہ کو جس معاملے سے جوڑنا چاہیے اس کے بجائے اس کو کسی اور معاملے سے جوڑ لینا۔

واقعات کو صحیح رخ سے دیکھئے۔ کوئی معاملہ سامنے آئے تو اس کو اصل سبب سے جوڑیے۔ محض ظاہری طور پر رائے قائم کرنے کے بجائے گہرائی میں اتر کر اپنی رائے بنائیے۔ متاثر ذہن سے سوچنے کے بجائے غیر جانب دارانہ طور پر سوچئے۔ اگر آپ ایسا کریں تو اس کے بعد آپ کو کسی سے نہ شکایت ہوگی اور نہ غلط فہمی۔

شیطان کا خطرہ

قرآن کی سورہ نمبر ۷ میں ارشاد ہوا ہے کہ ——— اے بنی آدم، ہم نے تم پر لباس اتارا، جو تمہارے بدن کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور زینت بھی۔ اور تقویٰ کا لباس اس سے بھی بہتر ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ تاکہ لوگ غور کریں۔ اے آدم کی اولاد، شیطان تم کو بہکا نہ دے جس طرح اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوادیا، اس نے ان کے لباس اتروائے، تاکہ ان کو ان کے سامنے بے پردہ کردے۔ وہ اور اس کے ساتھی تم کو ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھتے۔ ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا دوست بنادیا ہے جو ایمان نہیں لاتے (الاعراف ۲۶ - ۲۷)

خدا نے انسان کو لباس دیا جو اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ اس کے حسن و وقار کو بڑھانے کا ذریعہ بھی ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ آدمی کے روحانی وجود کے لیے بھی اسی طرح ایک لباس ضروری ہے۔ یہ لباس تقویٰ ہے۔ تقویٰ آدمی کا معنوی لباس ہے۔ جو اس کو ایک طرف شیطان کے حملوں سے بچاتا ہے۔ اور دوسری طرف اس کے باطن کو سنوار کر اس کو جنت کی لطیف و نفیس دنیا میں بسانے کے قابل بناتا ہے۔ یہ تقویٰ کا لباس کیا ہے۔ یہ ہے ——— اللہ کا خوف، حق کا اعتراف، اپنے لیے اور دوسروں کے لیے ایک معیار رکھنا، اپنے کو بندہ سمجھنا، تواضع کو اپنا شعار بنانا، دنیا میں گم ہونے کے بجائے آخرت کی طرف متوجہ رہنا۔ آدمی جب ان چیزوں کو اپنائے تو وہ اپنے اندرونی وجود کو ملبوس کرتا ہے۔ اور وہ اگر اس کے خلاف رویہ اختیار کرے تو وہ اپنے اندرون کو ننگا کر لیتا ہے۔ ظاہری جسم کو کپڑے کا بنا ہوا لباس ڈھانکتا ہے۔ اور باطنی جسم کو تقویٰ کا لباس۔

آدمی کو گمراہ کرنے کے لیے شیطان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس کو بہکاتا ہے۔ وہ خدا کے ممنوعہ درخت کو ہر قسم کے خیر کا سرچشمہ بتاتا ہے۔ وہ ایسے معصوم راستوں سے اس کی طرف آتا ہے کہ آدمی کا گمان بھی نہیں جاتا کہ ادھر سے اس کی طرف گمراہی آرہی ہوگی۔ شیطان آدمی کے تمام نازک مقامات کو جانتا ہے۔ اور انہی نازک مقامات سے وہ اس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ تاہم شیطان صرف ان لوگوں کے مقابلہ میں کامیاب ہوتا ہے جو اس کے لیے اپنے تمام دروازے کھول دیں۔

اقتدار کے باوجود

لارڈ ایکٹن (Lord J.E.E.D. Acton) ۱۸۳۴ میں نیپلس میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۲ میں ٹیگرنسی میں ان کی وفات ہوئی جو اب ویسٹ جرمنی میں واقع ہے۔ تاریخ اور فلسفہ میں انھوں نے شہرت حاصل کی۔ ان کا ایک قول ہے کہ اقتدار آدمی کو بگاڑتا ہے اور کامل اقتدار بالکل ہی بگاڑ دیتا ہے۔ اس سے زیادہ گمراہی کی کوئی بات نہیں کہ یہ کہا جائے کہ اقتدار کا منصب آدمی کو پاک باز بناتا ہے :

Power tends to corrupt, and absolute power corrupts absolutely. There is no worse heresy than that the office sanctifies the holder of it.

لارڈ ایکٹن تاریخ اور نفسیات کے بہت بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں، مگر وہ صرف دنیادار اور سیکولر لوگوں کی تاریخ سے واقف تھے۔ ان کو اس تاریخ کی خبر نہیں تھی جو ان مقدس ہستیوں نے بنائی ہے جن کو اللہ کی سچی معرفت حاصل ہوئی اور جو آخرت کی فکر میں زندگی گزارنے والے تھے۔

اس معاملہ میں انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سیکولر انسان، اور دوسرے متقی انسان۔ سیکولر انسان کے لیے حکومتی منصب ایک اعزاز ہوتا ہے۔ اقتدار کا عہدہ پاکر وہ خوش ہوتا ہے کہ اس کو اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا موقع حاصل ہوا۔ یہ چیز اس کے اندر فخر و ناز کی نفسیات پیدا کرتی ہے اور فخر و ناز یا تکبر کی نفسیات ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

اس کے برعکس متقی انسان کو جب اقتدار ملتا ہے تو وہ اس کو ذمہ داری کا ایک منصب سمجھتا ہے۔ وہ اس اندیشہ میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ موت کے بعد مجھے اللہ تعالیٰ کے یہاں حساب دینا ہوگا کہ میں نے اقتدار کے منصب کو کس طرح استعمال کیا۔ یہ تصور اس کے اندر تواضع اور جواب دہی کا احساس جگا دیتا ہے۔ اور جس آدمی کے اندر تواضع اور جواب دہی کی کیفیت پیدا ہو جائے وہ اقتدار کے منصب پر پہنچ کر اور زیادہ محتاط بن جاتا ہے ——— اسلام کے دور اول کے حکمراں اس کی نہایت اعلیٰ مثال ہیں۔ اقتدار کے منصب کو پاکر وہ ذرا بھی نہیں بہکے۔ اس کے برعکس وہ اور زیادہ سنبھل گئے۔ وہ پہلے سے زیادہ پاکباز انسان بن گئے۔

زمانی فرق

کی دور کا ایک واقعہ ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسلام قبول کیا تو ایک روز وہ کعبہ گئے اور انھوں نے اسلامی طریقہ کے مطابق نماز پڑھنا شروع کیا۔ مکہ کے مشرکین نے ان یں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ دوڑ کر آئے اور ان کے اوپر ٹوٹ پڑے۔ انھوں نے و بری طرح مارا پیٹا حتی کہ یہ ممکن نہ رہا کہ وہ وہاں اپنی نماز کو پورا کر سکیں۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۹۶ کو راقم الحروف کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا جس کو یہاں میں بلا تقابل ج کر رہا ہوں۔ اس دن بمبئی میں چوپاٹی کے مقام پر ایک بہت بڑا جلسہ تھا۔ اس کو سوادھیائے یک والوں نے منظم کیا تھا۔ چوپاٹی کے میدان میں تقریباً دس لاکھ ہندو حضرات اکٹھا تھے۔ ایک سرے پر بہت اونچا اور بہت وسیع منچ بنایا گیا تھا جس پر مسٹر ایل کے ایڈوانی اور سرے بہت سے بڑے بڑے ہندو لیڈر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی مبصر کے طور پر وہاں و تھا۔

اس دوران مغرب کا وقت ہو گیا۔ میں نے منچ کے ایک طرف کھڑے ہو کر سب کے منے مغرب کی نماز ادا کی۔ اس وقت سوادھیائے تحریک کے چیرمین داداجی پانڈورنگ شاستری قریر ہو رہی تھی۔ انھوں نے اپنی تقریر روکی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا۔

ان دونوں واقعات میں یہ فرق کیوں ہے۔ دور اول کے واقعہ میں غیر مسلموں نے مسلمان کو نماز پڑھنے نہیں دیا تھا۔ آج خود غیر مسلموں کے بڑے مجمع میں ایک مسلمان آزادی کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے۔ اس فرق کا سبب زمانے کی تبدیلی ہے۔ قدیم زمانے میں مذہبی ا نظام قائم تھا۔ اور موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔ اس بنا پر آج مذہب کے حق میں ے امکانات کھل گئے ہیں جو کبھی پائے نہیں جاتے تھے۔

پہلے تشدد کے ماحول میں مذہب پر عمل کیا جا سکتا تھا۔ آج امن کے ماحول میں مذہب پر کیا جا سکتا ہے۔ پہلے آزادانہ طور پر مذہبی سرگرمیاں جاری نہیں کی جا سکتی تھیں، آج یہ ممکن ہو گیا ہے ل آزادی کے ساتھ مذہبی سرگرمیوں کو جاری کیا جائے۔

ترتیب وتدریج

صحیح البخاری (کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن) میں حضرت عائشہؓ کی ایک روایت ہے۔ وہ بتاتی ہیں کہ اسلام میں پہلے جنت وجہنم والی آیتیں اتریں۔ جب لوگوں کے اندر قبولیت کا مادہ پیدا ہوگیا تو اس کے بعد حرام و حلال کے احکام اترے۔ اگر شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ شراب چھوڑ دو اور زنا چھوڑ دو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم تو کبھی شراب نہیں چھوڑیں گے، ہم کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے (لقالوا لا ندع الخمر ابدًا ولا ندع الزنا ابدًا) فتح الباری ۹/۶۵۵

احکام کو جاری کرنے کی یہ ترتیب صرف دور اول کے لیے نہیں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ ترتیب وتدریج صرف ابتدائی دور کے لیے تھی جب کہ قرآن اتر رہا تھا، اب جبکہ قرآن پورا اتر چکا تو اب وہ بیک وقت پورا نافذ بھی کیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ احکام کے اجراء اور نفاذ کا تعلق معاشرہ کی ایمانی اور اخلاقی حالت سے ہے۔ جب بھی لوگوں میں ایمانی اور اخلاقی کمزوری پائی جائے گی تو دوبارہ وہی ترتیب مطلوب ہو جائے گی جو دور اول میں مطلوب تھی

مورخین اسلام نے خلیفہ عادل حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بارہ میں لکھا ہے کہ خلیفہ ہو جانے کے باوجود انھوں نے سارے شرعی احکام بیک بار نافذ نہیں کیے۔ ان کے نوجوان صاحبزادہ عبدالملک نے ایک دن کہا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ تمام شرعی احکام کو نافذ نہیں کر رہے ہیں۔ اب آپ اس قوم کے خلیفہ ہیں، تمام شرعی احکام کو نافذ کر کے آپ موجودہ تمام ظلم وفساد کو ختم کر دیجیے۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا:

لاتعجل یا بنی، فإن الله ذم الخمر فی القرآن مرتین وحرمها فی الثالثة۔ وانی اخاف ان احمل الحق علی الناس جملة فیدفعونه جملة ویکون من ذا فتنة۔

(المجلۃ ۱۸-۲۴ فروری ۱۹۹۶، صفحہ ۳۵)

اے میرے بیٹے، جلدی نہ کرو۔ کیوں کہ اللہ نے شراب کی دو بار مذمت کی اور پھر تیسری بار اس کو حرام کیا۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں حق کو بیک وقت لوگوں کے اوپر لاد دوں تو وہ اس کو بیک وقت اتار پھینکیں گے۔ اور پھر ایک نیا فتنہ پیدا ہو جائے گا۔

عمر بن عبدالعزیز کے اس جواب پر ان کے صاحبزادہ عبدالملک نے یہ نہیں کہا کہ یہ تو اس وقت کی بات ہے جب کہ قرآن اتر رہا تھا۔ اب جب کہ پورا قرآن نازل ہو چکا ہے تو اب بعد کے لوگوں کے لیے یہ ترتیب نہیں ہے۔ اب ہمارے پاس مکمل شریعت ہے، اور اب ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم سیاسی طاقت کو استعمال کر کے پوری شریعت کو مکمل طور پر نافذ کر دیں۔ اب ہم اس کے حصے بخرے نہیں کر سکتے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے نزول کی ترتیب ہی ابدی طور پر اس کے نفاذ کی ترتیب بھی ہے۔ اگلی نسلوں میں ہمیں دوبارہ یہ دیکھنا ہے کہ لوگوں کی ایمانی طاقت کیا ہے۔ لوگوں کی قبولیت کیا ہے۔ سماجی اور سیاسی حالات کیسے ہیں۔ اور پھر حقیقی صورت حال کا جائزہ لے کر اس کے مطابق تدریجی طور پر شرعی احکام کو نافذ کرنا ہے۔

اسی کا نام اسلامی حکمت ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ نظری اور عملی پہلوؤں میں فرق کیا جائے۔ اسلام کے عملی احکام کو بالترتیب اتنا ہی نافذ کیا جائے جتنا کہ لوگوں کے اندر قبولیت کا مادہ پیدا ہو چکا ہے، اور بقیہ اجزاء شریعت کے سلسلے میں ترغیب و تبلیغ کی مہم جاری رکھی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ قوانین کے نفاذ کا معاملہ ۵۰ فی صد حکومت سے تعلق رکھتا ہے، اور ۵۰ فی صد [illegible] نفاذ انسانوں سے۔ کوئی قانون کسی معاشرہ میں اسی وقت نافذ ہوتا ہے جب کہ معاشرہ کے اندر اس کے حق میں ایک درجہ کی آمادگی پیدا ہو چکی ہو۔ معاشرہ میں موافق ماحول [illegible] کے اندر قانون کا نفاذ اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ زمین تیار کیے بغیر اس کی فصل حاصل کرنا۔

گوہاٹی کا سفر

گوہاٹی (آسام) میں ۳ - ۶ جنوری ۱۹۹۵ کو ایک نیشنل سیمنار ہوا۔ اس کی دعوت پر گوہاٹی کا سفر ہوا۔ اس سیمنار کا موضوع تھا ـــــ نارتھ ایسٹ انڈیا اور اکیسویں صدی:

North-east India and the 21st century.

آج گوہاٹی کے لئے روانگی کا دن تھا۔ میں تیاری میں مصروف تھا۔ دو صاحبان ملاقات کے لئے آگئے۔ دونوں پڑھے لکھے اور دیندار مسلمان تھے۔ دونوں نے کہا کہ ہم کو آپ کے مشن سے اختلاف ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا اختلاف ہے۔ ایک نے کہا کہ آپ ہمارے اکابر پر تنقید کرتے ہیں۔ دوسرے نے کہا کہ آپ ہندوؤں کے مقابلہ میں صبر کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ اس وقت میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں آپ دونوں سے صرف ایک بات کہتا ہوں۔ آج رات کو جب آپ بستر پر سونے کے لئے جائیں تو یہ سوچیں کہ کل اگر آپ کی موت ہو جائے اور خدا آپ سے پوچھے کہ تم الرسالہ مشن کے مخالف کیوں بن گئے تھے۔ تو کیا آپ کا یہ جواب وہاں کام آئے گا کہ ہم اس لئے مخالف ہو گئے کہ یہ شخص ان لوگوں پر تنقید کرتا تھا جس کو ہم نے بطور خود اکابر کا درجہ دے رکھا تھا۔ اور وہ ہندوؤں سے صبر کرنے کے لئے کہتا تھا جن کو ہم اپنا قومی دشمن بنائے ہوئے تھے۔

جنوری ۱۹۹۵ کی دو تاریخ ہے اور صبح ساڑھے گیارہ بجے کا وقت۔ میں دہلی ایرپورٹ پر گوہاٹی جانے والے جہاز کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ نشست گاہ میں نسبتاً کم آدمی نظر آرہے ہیں۔ تاہم تقریباً ہر آدمی کے ہاتھ میں آج کا اخبار ہے۔ اخبار کیا ہے۔ خارجی دنیا کا خبرنامہ۔ میں نے سوچا: ہر آدمی دوسروں کا خبرنامہ پڑھ رہا ہے۔ خود اپنا خبرنامہ پڑھنے کا شوق کسی کو نہیں۔

کچھ دیر میں گیٹ پر روشن حروف میں یہ الفاظ نمایاں ہو گئے (Now Boarding—889)

یہ اس بات کا خاموش اعلان تھا کہ گوہاٹی جانے والا جہاز روانگی کے لئے تیار ہے۔ مسافر ایک ایک کرکے گیٹ سے گزر کر انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۸۸۹ میں داخل ہو گئے۔

جہاز کسی قدر تاخیر کے ساتھ روانہ ہوا۔ دہلی سے گوہاٹی کے لئے یہ سوا دو گھنٹہ کی نان

اسٹاپ فلائٹ تھی۔ ایئرپورٹ پر یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جہاز ٹھیک وقت سے گوہاٹی کے لئے روانہ ہوگا۔ مگر جب تمام مسافر جہاز کے اندر بیٹھ گئے تو معلوم ہوا کہ کچھ ٹکنکل سبب کے تحت جہاز لیٹ ہے۔ چنانچہ ۴۵ منٹ کی تاخیر کے ساتھ جہاز پونے ایک بجے روانہ ہوا۔

میں نے سوچا کہ ہندستان میں آدمی خواہ ہوائی جہاز سے سفر کرے یا ٹرین کے ذریعہ، ہر جگہ ناقابل قیاس مسائل ہیں۔ کل دہلی ریلوے اسٹیشن پر ایک ناقابل ذکر واقعہ پیش آیا۔ ہمارے دفتر کے ایک کارکن نصیر احمد صاحب کے بوڑھے والد اپنے بیٹے سے مل کر واپس اپنے وطن یوپی جارہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک نیا سوٹ کیس تھا جس میں کچھ نئے کپڑے اور کھانے کا سامان تھا۔ بزرگ پلیٹ فارم پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے بیٹے سیٹ دیکھنے کے لئے گاڑی میں گئے تھے۔ اتنے میں ایک آدمی آیا۔ اس نے کہا: بڑے میاں چلئے آپ کو گاڑی میں بٹھا دیں۔ یہ کہہ کر فوراً اس نے بیگ اٹھایا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ بڑے میاں کہتے رہے کہ میرے ساتھ میرا لڑکا ہے۔ مجھے ضرورت نہیں۔ مگر وہ آدمی تیزی سے بیگ لے کر غائب ہوگیا۔

اس قسم کے جرائم ہر روز ہر بستی اور ہر شہر میں ہو رہے ہیں۔ ان کے مسلسل جاری رہنے کا واحد سبب یہ ہے کہ مجرمین کو یہ اطمینان رہتا ہے کہ انھیں کوئی سزا ملنے والی نہیں۔ اگر انھیں یقین ہو کہ جرم کرنے پر مجھے کوڑا مارا جائے گا، میرا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا، مجھے گولی مار دی جائے گی، تو جرائم اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

پرواز کے دوران ۲ جنوری کے اخبارات ہندو، بزنس لائن، دی آبزرور پڑھا۔ مگر ان میں کوئی قابل ذکر بات نہیں ملی۔ ہندستان کے اخبارات پر سیاسی ذوق اتنا زیادہ چھایا ہوا ہے کہ میرے جیسے آدمی کو کوئی کام کی بات مشکل ہی سے ملتی ہے۔ مغربی ملکوں میں ایسا نہیں ہے۔ مگر وہاں بگاڑ صرف یہ فرق ہوا ہے کہ اخباروں کے صفحات پر سیاست کی جگہ تجارت نے قبضہ کرلیا ہے۔

انڈین ایئرلائنز کی فلائٹ میگزین سوگت کا شمارہ جنوری ۱۹۹۵ دیکھا۔ اس میں ایک مضمون ہندستان کی سیاحت پر تھا جو مارک نکلس (Mark Nicholls) کے قلم سے تھا۔ وہ بذریعہ ٹرین مختلف مقامات کا سفر کرتا ہوا آگرہ پہنچتا ہے۔ وہاں وہ تاج محل کو دیکھتا ہے۔ تاج محل کو وہ عجوبۂ عالم (Wonder of the World) قرار دیتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اگر کسی ایک بلڈنگ کو انڈیا

کی علامتی تصویر بنتا ہو تو وہ ممتاز محل کا مقبرہ (تاج محل) ہے:

If one building was to sum up an image of India it is the tomb of Mumtaz Mahal. (p. 74)

لوگ تاج محل کو غیر معمولی اہمیت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مگر تقریباً ۲۵ سال پہلے جب میں پہلی بار آگرہ گیا اور تاج محل کو دیکھا تو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوئی۔ میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر قریب کی مسجد میں چلا گیا۔

۴ جنوری کی سہ پہر کو ۳ بجے جہاز گوہاٹی ایرپورٹ پر اتر گیا۔ یہاں ایرپورٹ کے لاؤنج میں تھوڑی دیر کے لئے بیٹھنا پڑا۔ یہاں ایک معمر بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ یہ پروفیسر بی کے رائے برمن تھے۔ وہ دہلی میں رہتے ہیں (Tel. 641194) انھوں نے بتایا کہ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں پر کئی کتابیں انگریزی میں لکھی ہیں۔ ان کی دو کتابوں کے نام یہ ہیں:

Prism in Islam
Muharram in two cities
by B.K. Roy Burman
1779, C.R. Park, New Delhi

میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ مختصر طور پر بتائیں گے کہ آپ کے مطالعہ کے مطابق اسلام کی اسپرٹ کیا ہے۔ انھوں نے حسب ذیل الفاظ میں اپنا تاثر بیان کیا:

Human brotherhood, man's basic nature is in quest of his humane essence, social justice.

پروفیسر رائے برمن نے کثرت سے ملک کے مختلف حصوں کا سفر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان مختلف اور متضاد کلچروں کا ملک ہے۔ انھوں نے بتایا کہ گوہاٹی سے ۶۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ایک مندر ہے۔ وہاں سال میں ایک دن باجماعت نماز ہوتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے بتایا کہ بھوٹان کی سرحد پر ایک قبیلہ ہے۔ وہ اپنے دیوتا کو خوش کرنے کے لئے سال میں ایک دن گائے کی قربانی کرتا ہے۔ اس طرح کی مختلف باتیں انھوں نے بتائیں۔

ایرپورٹ سے ہوٹل کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ تقریباً پون گھنٹہ کا راستہ تھا۔ راستہ

یہاں سڑک کے دونوں طرف گوہاٹی کے مناظر سامنے سے گزرتے رہے۔ ہر چیز پر پسماندگی کے آثار دکھائی دیئے۔ یہاں کے مکانات، یہاں کی دکانیں، یہاں کے مرد اور عورت، سب کچھ کم سے دکھائی دیئے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ہر چیز پر پسماندگی کی اسٹیمپ لگی ہوئی ہے۔ (Miniature)

ایک آدمی جب دہلی کو دیکھتا ہے تو وہ اس کو پر عظمت شہر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ گوہاٹی کو دیکھتا ہے تو گوہاٹی اس کو مقابلۃً نمبر ۲ کا شہر معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہ فرق اس کے اندر وہ احساس جگاتا ہے جس کو "علیحدگی پسندی" کہا جاتا ہے۔ ہندستان کی یہی ناسادی ترقی یہاں کی سیاسی بے چینی کی اصل ذمہ دار ہے۔ اس کے برعکس آپ امریکہ میں جائیں یا یورپ کے کسی ترقی یافتہ ملک کا سفر کریں تو وہاں بڑے شہر اور چھوٹے شہر میں اس قسم کا فرق آپ کو نہیں ملے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں ہمارے ملک جیسی علیحدگی کی تحریکیں بھی ابھرنے نہیں پاتیں۔

گوہاٹی میں میرا قیام اشوک گروپ کے ہوٹل برھم پتر اکے کمرہ ۲۰۱ میں تھا۔ ہوٹل کے کمرہ میں پشت کی طرف "شیشہ کی دیوار" کے باہر سبزہ اور درخت کے مناظر ہیں۔ اس کے بعد جھیل ہے جس کا پانی دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے اوپر چڑیوں کے جھنڈ اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جھیل کے اس پار سبز پوش پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں۔

یہ مناظر بتاتے ہیں کہ یہ علاقہ قدرتی وسائل سے بھرا ہوا ہے۔ خاص طور پر یہاں پانی کی افراط ہے جس سے زراعت اور باغبانی کو بہت ترقی دی جاسکتی ہے۔ نیز سستی بجلی بڑی مقدار میں پیدا کی جاسکتی ہے۔ اس کے باوجود یہ علاقہ پسماندہ پڑا ہوا ہے۔ ایک ریٹائرڈ افسر نے بتایا کہ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ حکومت نے اس علاقہ کی مدد نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ مرکزی حکومت نے اس علاقہ کو بے پناہ مالی مدد بھیجی ہے۔ مگر اس مدد کا بڑا حصہ تھوڑے سے لوگوں کی جیب میں چلا گیا۔ اس کا بہت کم حصہ ڈیولپمنٹ کے کاموں میں استعمال ہوا۔ ہندستان میں آپ جس مسئلہ کی تحقیق کریں، آخر میں سب کی جڑ میں یہی کرپشن نظر آئے گا۔

اس صورت حال کی بنا پر اب میرا حال یہ ہے کہ حکومت جب "ڈولپمنٹ" کے نام پر کسی بڑی رقم کا اعلان کرتی ہے تو میری روح کانپ اٹھتی ہے کہ عوامی ٹیکسوں پر لوٹ کی ایک نئی مد کھل گئی۔

۲ جنوری کی شام کو میں اپنے کمرہ میں تھا کہ داخلی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی کہ جسٹس بھاگوتی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ان سے گفتگو ہوئی۔ وہ بھی سیمینار میں آئے ہوئے ہیں اور اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ ضرور تشریف لائیں۔ چند منٹ کے بعد وہ کمرہ میں آ گئے۔

جسٹس پی این بھاگوتی (سابق چیف جسٹس آف انڈیا) انٹرنیشنل شہرت کے آدمی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہاں سے واپسی کے بعد میں اریٹریا جا رہا ہوں۔ وہاں کی حکومت نے اپنے دستور کا ڈرافٹ تیار کرنے کے لئے مجھے بلایا ہے۔ وہاں سے واپسی کے بعد میں دہلی میں آپ سے تفصیلی ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ گفتگو کے بعد ۱۵ جنوری کی تاریخ طے ہوئی۔ میں نے تجویز کیا کہ دہلی میں کچھ معروف افراد پر مشتمل ایک حلقہ بنایا جائے۔ اس کی ماہانہ میٹنگ ہوا کرے دوسرے کاموں کے علاوہ اس کا ایک خاص کام یہ ہو کہ پیش آمدہ اشوز پر وہ تبادلہ خیال کے بعد ایک اسٹیٹمنٹ تیار کرے اور فوری طور پر اس کو اخبارات میں شائع کرایا جائے۔ انھوں نے اس سے مکمل اتفاق کیا۔ اور کہا کہ میں سفر سے واپسی کے بعد ۱۵ جنوری تک آپ سے ملوں گا اور اس تجویز کو عملی شکل دینے کے لئے گفتگو کروں گا۔

آج شام کو مغرب کی نماز ہوٹل کے کمرہ میں پڑھی۔ نماز کے بعد ہاتھ اٹھایا تو یہ دعا زبان سے نکلی: اللّٰھم ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق و اجعل لی من لدنک سلطاناً نصیراً

۲ جنوری کی شام کو ۸ بجے ایک ہال میں تفریحی پروگرام تھا۔ لوگ اس کو دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ میں رنج و غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے قرآن کی آیت (الجمعہ ۱۱) یاد آئی۔ میں نے سوچا کہ آج کی دنیا میں آدھے انسان لہو میں مبتلا ہیں۔ اور آدھے انسان تجارت میں۔ ذکر خداوندی میں مشغول ہونے والا انسان کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

اس سے واپسی میں مسٹر چترنجن ڈیب سے ملاقات ہوئی۔ وہ اگرتلا کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۴۶ میں جب گاندھی جی نواکھالی گئے تھے تو وہ وہاں جاکر گاندھی جی سے ملے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اس وقت میری عمر ۱۶ سال تھی۔ میں نے گاندھی جی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا تو گاندھی جی

ہنس پڑے۔ یہ ہنسی غضب کی تھی۔ وہ آدمی کو مسحور کر دینے والی تھی۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ مونسٹن چرچل نے کیوں اپنے لڑکے سے کہا تھا کہ اس ننگے فقیر سے (naked Fakir) مت ملنا۔ اس کی ہنسی تم کو کھا جائے گی۔

اشوک ہوٹل میں مولانا اسعد مدنی کے صاحبزادہ جناب محمود اسعد مدنی (۲۸ سال) سے ملاقات ہوئی۔ وہ بزنس کے سلسلہ میں یہاں آئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جب میں دار العلوم میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، اس وقت سے میرے اندر تجارت کا جذبہ پیدا ہوا۔ لوگوں سے سنتا تھا کہ چندہ لے کر کھا گئے تو میں نے طے کیا کہ میں بزنس کروں گا۔ چنانچہ انھوں نے لکڑی کی تجارت شروع کی ہے۔ ٹیک کی لکڑی وہ آسام سے خرید کر لے جاتے ہیں اور لکھنؤ میں ہول سیل میں اس کو فروخت کرتے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ عام طور پر علماء کے خاندان کے لوگ مدرسہ اور چندہ کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ آپ نے اس کے بجائے تجارت کا کام شروع کر کے ایک مثال قائم کی ہے۔

مولانا محمود اسعد مدنی سے میں نے کہا کہ میں گوہاٹی کے کچھ مسلمانوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کچھ مقامی مسلمانوں سے ربط قائم کیا۔ چنانچہ ۵ جنوری کو نماز مغرب کے بعد کچھ لوگ آگئے۔ ہوٹل کے کمرہ میں نشست ہوئی۔ ان میں جمیل الدین احمد صاحب، رقیب الحسین صاحب آصف احمد صاحب، علی رضا صاحب، غلام اکبر صاحب وغیرہ موجود تھے۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی اس نشست میں گوہاٹی اور آسام کے مسلمانوں کے بارہ میں گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ آسام میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۳۰ فیصد ہے اور گوہاٹی میں تقریباً پندرہ فیصد۔ گوہاٹی شہر میں تقریباً ایک سو مسجدیں ہیں۔ بہت سے مدرسے قائم ہیں۔ ایک بڑا مدرسہ جس میں دورۂ حدیث تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ تاہم پورے آسام میں مسلمانوں کا کوئی اخبار موجود نہیں۔ روایتی طور پر آسام میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات بہت اچھے رہے ہیں۔ مگر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد یہاں کے کچھ مسلمانوں نے انتہائی نادانی سے کام لیتے ہوئے اجودھیا کا غصہ آسام میں اتارنا چاہا۔ اس کے نتیجہ میں تعلقات میں کچھ بگاڑ آگیا۔

۳ جنوری کی صبح کو ناشتہ کی میز پر کئی آدمیوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک مسٹر روندر کیلے کر (Ravindra Kelekar) ہیں۔ ان کی عمر ۷۰ سال ہے اور وہ گوا کے رہنے والے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ اپنی زندگی کا کوئی خاص واقعہ بتائیے۔

انھوں نے ۱۹۵۳ کا ایک واقعہ بتایا۔ اس وقت وہ واردھا (سیوا گرام) میں تھے۔ وہاں سے گجراتی زبان میں ایک پرچہ نکلتا تھا جس کا نام منگل پربھات تھا۔ اس پر اڈیٹر کی حیثیت سے کاکا صاحب کالیلکر کا نام ہوتا تھا۔ مگر عملاً اس کو روندر کیلے کر ہی مرتب کرتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ انھوں نے سنسکرت کا ایک اشلوک گجراتی میں نقل کیا تو سنسکرت میں زیادہ واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے اس کو انھوں نے غلط طور پر لکھ دیا تھا۔ لوگوں نے کاکا صاحب کالیلکر کو توجہ دلائی تو انھوں نے روندر کیلے کر کو ایک خط لکھا تھا کہ تم سنسکرت کے اشلوک غلط لکھتے ہو، اس طرح تو میری بدنامی ہو جائے گی۔ اس کے جواب میں روندر کیلے کر نے انھیں لکھا کہ اس کا حل یہ ہے کہ پرچہ میں میرا نام ورکنگ اڈیٹر کے طور پر لکھ دیا جائے۔ اس طرح اس قسم کی غلطیاں میرے خانہ میں چلی جائیں گی۔ اور آپ کی بدنامی نہیں ہوگی۔

کاکا صاحب کالیلکر (وفات ۱۹۸۱) نے جواب میں لکھا کہ ایسا کرنا تمہارے حق میں اچھا نہیں ہے۔ جب تک تم تیاری کے مرحلہ میں ہو تب تک تمہاری غلطیاں مجھے لینا چاہئے۔ اس وقت تم کو بدنامی سے بچانا زیادہ ضروری ہے تاکہ تمہارا صحافتی مستقبل خراب نہ ہونے پائے۔

۳ جنوری کو سیمینار کا افتتاح تھا۔ ہم لوگ ہوٹل سے راج بھون لے جائے گئے۔ گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو دو درجن کی تعداد میں ناگا لوگ استقبال کے لئے موجود تھے۔ وہ اپنے روایتی لباس میں تھے۔ روایتی انداز کا نیم برہنہ لباس ان کے جسم پر تھا۔ ہاتھوں میں بلم لئے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی زبان میں ایک گانا گایا جو سمجھ میں نہ آسکا۔ اس کے بعد مہمانوں کو دونوں طرف سے اپنے جلو میں لے کر اندر ہال میں لے گئے۔ یہاں دوبارہ وہ لوگ اسٹیج کے پیچھے اپنے روایتی اسلحہ کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

مسٹر ٹھور ٹھکر جو اس علاقہ کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ ناگا لوگ ہیں۔ ان کا کلچر جنگ پر مبنی ہے۔ ان کا پورا کلچر وار کلچر ہے۔ آج کی تقریب میں انھوں نے فتح کا منظر دکھایا تھا جیسے

کہ ہم نے اس شہر کو فتح کیا ہے۔ اور اب فتح کی تقریب منانے کے لئے ہم اس ہال میں آئے ہیں اور ابھی وہ ہمارے ساتھ ہیں۔

مسٹر نٹور ٹھکر نے اپنے ویلکم ایڈریس میں کہا کہ جواہر لال نہرو کہتے تھے کہ ہم سب چھوٹے لوگ ہیں، جو ایک بڑے کام میں مشغول ہیں:

We all are small men engaged in great mission.

میں نے سوچا کہ یہ بات تو بڑی اچھی ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ سو سال محنت کے باوجود ہماری کوششوں کا رزلٹ کیوں نہیں نکل رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک الٹی جانب سفر کر رہا ہو۔

جسٹس پی این بھاگوتی نے اپنے افتتاحی ایڈریس میں دہرایا کہ نہرو نے کہا تھا کہ اپنی کامیابی کو جانچنا ہو تو ملک کے سب سے چھوٹے آدمی کو دیکھو:

. .see the smallest man of India.

یہ سیمینار ناگالینڈ گاندھی آشرم کے زیر انتظام منعقد کیا گیا تھا۔ سابق چیف جسٹس آف انڈیا پی این بھاگوتی نے اس کا افتتاح کیا۔ اپنے افتتاحی خطاب میں انھوں نے کہا کہ اس علاقہ میں علیحدگی کا جو طاقت ور رجحان پایا جاتا ہے، اس کا واحد حل یہ ہے کہ مرکز کا اقتدار اسٹیٹ کے اوپر سے کم کیا جائے۔ غیر مرکزی نظام ہی اس کا واحد حل ہے:

the only solution is decentralisation of power.

چند اور تقریریں ہوئیں۔ مقامی انگلش اخبار کے اڈیٹر ڈاکٹر بیزبورہ (D.N. Bezboruah) نے کہا کہ اکیسویں صدی میں ہمارے ملک میں کوئی معجزہ ہونے والا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں کا آدمی صرف اپنے حقوق کو جانتا ہے۔ اس کو ملک کے بارہ میں اپنی ذمہ داریوں کا پتہ نہیں:

No miracle was going to happen in the 21st century in the country. This was due to our obsession with our rights rather than duties to our country.

افتتاحی اجلاس ۳ جنوری کو رابندر بھون میں ہوا تھا۔ بقیہ تمام اجلاس ہوٹل برہم پتر

اشوک کے ہال میں ہوئے۔ مقررین نے بہت سی باتیں کہیں۔ ساری باتیں نقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ چند باتیں متفرق طور پر یہاں درج کی جاتی ہیں:

ایک صاحب نے گاندھی جی کا یہ قول دہرایا کہ "سارے مذہب اچھے ہیں، سارے مذہب سچے ہیں، مگر سارے مذہب کچے ہیں"۔ یہ بات کہنے میں بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر وہ غیر منطقی ہے۔ سچائی کو آدمی اس لئے اختیار کرتا ہے تاکہ وہ اعتقادی یقین حاصل کر سکے۔ مگر مذکورہ فارمولا آدمی کو ہمیشہ کے لئے یقین سے محروم کر دیتا ہے۔ ایسا فارمولا تلاش حق کے جذبہ کے مطابق نہیں۔ اس لئے وہ صحیح بھی نہیں ہو سکتا۔

ایک صاحب نے کہا کہ جو لوگ انگریزی زبان کو ختم کرنے کی بات کرتے ہیں ان کو جاننا چاہئے کہ موجودہ حالات میں وہ ممکن نہیں۔ لوگ انگریزی زبان کی طرف کیوں جاتے ہیں۔ وہ تین باتوں کے لئے ایسا کرتے ہیں ـــــ پاور، رسپکٹ، جاب۔ یہ تینوں باتیں جب تک آپ کی زبان میں پیدا نہ کر سکیں، انگریزی کی طرف دوڑ بھی ختم ہونے والی نہیں۔

مسٹر دوارکا شرما نے بتایا کہ میزورم میں ایک نوجوان سے انھوں نے پوچھا کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ نوجوان نے جواب دیا کہ ہم انڈیا سے الگ ہونا چاہتے ہیں۔ انھوں نے دوبارہ پوچھا کہ کیوں۔ نوجوان نے جواب دیا کہ وہ ہمارے ساتھ برابر کا سلوک نہیں کرتے:

They are not treating us as equal.

ایک صاحب نے کہا کہ ان نوجوانوں میں گھومنے کے بعد میں سمجھا ہوں کہ ان کے نزدیک پر امن ذرائع کا وقت اب ختم ہو چکا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب وہ ہتھیار کے سوا کوئی اور بات سننے کے لئے تیار نہیں۔ نوجوان مایوس ہیں، اور یہی اصل مسئلہ ہے:

Youths are disillusioned, this is the problem.

۳ جنوری کو دوپہر بعد کے سیشن میں ہیومن رائٹس کے مسئلہ پر غور ہوا۔ یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اس علاقہ میں عوام کے اندر جو بے چینی ہے اس کی وجہ کیا یہ ہے کہ ان کے حقوق انسانی کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں دو قسم کی باتیں سامنے آئیں۔ میری رائے یہ تھی کہ اصل مسئلہ بے شعوری کا ہے نہ کہ حقوق انسانی کی خلاف ورزی کا۔

۳ جنوری کو تیسرا اجلاس ساڑھے نو بجے صبح شروع ہوا۔ آج بھی حقوق انسانی کا مسئلہ دوبارہ زیر بحث آیا۔ سرکاری افسروں کا خیال تھا کہ گورنمنٹ بہت کام (tremendous work) کر رہی ہے۔ تحفظ حقوق کا قانون (Protection of human rights act) بنایا گیا ہے۔ ہیومن رائٹس کمیشن بنایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیموں کا نیشنل رجسٹر بنایا گیا۔ کمیشن کے نام چار ہزار شکایتیں حقوق انسانی کی خلاف ورزی کی وصول ہوئیں۔ وغیرہ۔

ایک اہم مثال یہ ہے کہ کمیشن نے تجویز کیا کہ ٹاڈا پر نظر ثانی کی جائے۔ اسی طرح جیل کا معائنہ کر کے تجویز کیا کہ قیدیوں کی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ مثلاً جیل میں جگہ کی تنگی (over crowding in jails) وغیرہ۔

میں نے کہا کہ حقوق انسانی کے جو واقعات اخباروں میں چھپتے ہیں وہی مجالس میں زیر بحث آتے ہیں۔ حالانکہ وہ کل ہونے والے واقعات کا بمشکل ۵ فیصد حصہ ہوتا ہے۔

۳ جنوری کی شام کو میں پروگرام سے فارغ ہو کر ہوٹل واپس آ رہا تھا۔ گاڑی میں میرے علاوہ دو اور صاحبان تھے۔ دونوں دو الگ الگ یونیورسٹیوں کے پروفیسر تھے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا: آپ کی یونیورسٹی میں کوئی پرابلم تو نہیں۔ انھوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ جس یونیورسٹی میں پرابلم نہ ہو وہ یونیورسٹی ہی نہیں:

University minus of problems is not a university.

یہ حال اب ہمارے ملک میں تعلیمی اداروں کا ہو چکا ہے۔ اب تعلیمی اداروں میں تعلیم سے زیادہ سیاست کی سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ سیاسی سرگرمیوں کے لئے جو اشو استعمال کئے جاتے ہیں انھیں کا نام پرابلم ہے۔ ہماری تعلیم گاہوں کا یہ حال کیوں ہے۔ اس کا سبب بہت پیچھے تک جاتا ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے کے زمانہ میں تعلیم گاہوں میں سیاست داخل کی گئی تاکہ آزادی کی تحریک کے حق میں نوجوانوں کی تائید حاصل کی جا سکے۔ ۱۹۴۷ کے بعد دوبارہ سیاست جاری رکھی گئی کیونکہ نئے حکمرانوں کو الکشن میں ووٹ حاصل کرنے کے لئے طلبہ کی مدد کی ضرورت تھی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار تعلیمی ادارے تعلیم سے زیادہ سیاست بازی کا مرکز بن گئے۔
اس علاقہ کی سات ریاستوں میں تعلیم کی حالت کیا ہے، اس کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے ہوگا:

Percentage of literacy to total population 1981 & 1991

States	1981			1991		
	Average	Male	Female	Average	Male	Female
Arunachal Pr.	20.70	28.94	11.32	41.22	51.20	29.37
Assam	—	—	—	53.42	62.34	43.70
Manipur	41.35	53.29	29.06	60.96	72.98	48.64
Meghalaya	34.08	37.89	30.08	48.26	51.57	44.78
Mizoram	50.88	64.46	54.91	81.23	84.06	78.09
Nagaland	42.57	50.06	33.89	61.30	66.09	55.72
Tripura	42.12	51.70	32.00	60.39	70.08	50.01
India	*43.56*	*56.37*	*29.75*	*52.11*	*63.86*	*39.42*

ایک مقامی بزرگ نے بڑے دردمندانہ انداز میں اس علاقہ کے حالات بتائے۔ انھوں نے کہا کہ علیحدگی کی تحریک میں ہم نے اپنا سب کچھ کھو دیا، اور پایا کچھ بھی نہیں۔ نئی دہلی کے لوگوں سے کہئے کہ وہ کوئی مؤثر ڈائیلاگ شروع کریں، اور یہ ڈائیلاگ کسی پیشگی شرط (pre-condition) کے بغیر ہو۔ نارتھ ایسٹ کا یہ علاقہ جلنے کے لئے نہیں ہے:

The North-East is not for burning.

میں نے کہا کہ یہ سارا معاملہ غیر حقیقت پسندانہ انداز اختیار کرنے کی وجہ سے پیش آیا ہے۔ اور اب حقیقت پسندی کا طریقہ کرکے ہم اس کو ختم کر سکتے ہیں۔

گوہاٹی کو اگرچہ دوسرے ہندستانی شہروں کے مقابلہ میں ایک بی کلاس سٹی کا درجہ حاصل ہے۔ مگر اس کی اہمیت اس اعتبار سے بہت زیادہ ہے کہ وہ پورے نارتھ ایسٹرن علاقہ کے لئے ہندستانی دروازہ کی حیثیت رکھتا ہے:

Gauhati is the gateway to the entire north-eastern region.

نارتھ ایسٹ انڈیا کا علاقہ اپنی مخصوص جغرافی پوزیشن کی وجہ سے مرغ کی گردن

(chicken's neck) کہا جاتا ہے۔ ذیل کے نقشے سے اس کا اندازہ ہوگا:

سیمینار میں جو کاغذات تقسیم کئے گئے ان میں کچھ معلوماتی صفحات تھے۔ ان میں سے ایک میں بتایا گیا تھا کہ ان ساتوں ریاستوں میں مذہب کے اعتبار سے آبادی کا تناسب کیا ہے، یہ اعداد و شمار اگلے صفحہ پر نیچے نقل کئے جا رہے ہیں۔

واضح ہو کہ ہندوستان میں اس وقت چھ بڑے مذاہب پائے جاتے ہیں۔ وہ یہ ہیں ---- ہندوازم، اسلام، مسیحیت، سکھ ازم، بدھزم، جین ازم۔ آبادی کے اعتبار سے ان مذاہب کا تناسب یہ ہے:



(1)	Hindu	....	76.4%
(2)	Islam	....	12.6%
(3)	Christian	....	7.3%
(4)	Jaina	...	2.2%
(5)	Buddhist	....	2%
(6)	Sikh	....	2.8%

مسٹر نٹور ٹھکر مشنری انسان کا کامیاب نمونہ ہیں۔ انھوں نے نیشنل انٹگریشن کا مشن لیکر ۱۹۵۵ میں ناگا پہاڑیوں میں گاندھی آشرم بنایا۔ اس وقت سے اب تک ہر قسم کی مشکلات کے باوجود وہ اس ایک مقصد کے تحت یہاں جمے ہوئے ہیں۔ ایک ایسا علاقہ جہاں علیحدگی کی تحریک جارحانہ بنیاد پر چل رہی تھی، وہاں انھوں نے ملکی اتحاد کے لئے خاموش محنت شروع کی۔ ان پر کئی بار قاتلانہ حملے کئے گئے، مگر آج وہ ناگاؤں کے درمیان ایک محبوب شخصیت ہیں۔ انھوں نے اپنے مقصد میں قابل لحاظ کامیابی حاصل کی ہے۔

یہ کامیابی انھیں کیسے ملی۔ اس کے لئے سب سے پہلے انھوں نے یہ کیا کہ یہاں آنے کے بعد انھوں نے پوری طرح ناگا کلچر کو اختیار کر لیا۔ وہ انھیں میں کے ایک فرد بن گئے۔ وہ نہایت سخت قسم کے سبزی خور ہیں اور پورے معنوں میں گاندھی وادی ہیں۔ مگر یہاں انھوں نے دیکھا کہ گوشت ناگاؤں کی روزمرہ کی غذا ہے۔ ایسی حالت میں سبزی خوری کی عادت کو لے کر وہ ناگاؤں میں گھل مل نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے مقصد کی خاطر گوشت خور (non-vegetarian) بن گئے۔ انھوں نے اپنا قصہ بتلاتے ہوئے کہا:

Distribution of Religion in North Eastern State (in percentage)

States	Hinduism	Islam	Christ.	Sikh	Buddhists	Jains	Others
Arunachal Pr.							
Assam*	58.57	24.28	6.3	0.12	0.43	0.12	0.03
Manipur	60.04	6.99	29.6	0.06	0.03	0.06	3.15
Meghalaya	18.02	3.10	52.6	0.12	0.20	0.04	25.76
Mizoram	7.14	0.45	83.8	0.08	8.19	—	0.23
Nagaland	14.36	1.52	80.1	0.00	0.07	0.15	3.68
Tripura	89.34	6.74	1.20	0.01	2.69	0.01	0.01

*—1971 census figures for Assam

I remember trying to eat meat which tasted like rubber to me, but as a mark of respect for my religion I refused to eat beef.

مجھے یاد ہے کہ کس طرح میں گوشت کھانے کی کوشش کرتا تھا جس کا ذائقہ مجھے بالکل ربر کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ البتہ اپنے مذہب کے احترام میں گائے کا گوشت کھانے سے میں نے انکار کر دیا۔

مسٹر ٹھکرا اپنے آشرم سے ایک انگریزی پرچہ اشانی (Ishani) کے نام سے نکالتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ سیاست اور مذہب کا دور ختم ہو گیا۔ مستقبل اب سائنس اور روحانیت کے لئے ہے:

The days of politics and religion are now over and the future belongs to science and spiritualitv

میں نے کہا کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ سیاست کا رول اب محدود ہو گیا ہے۔ مگر سچا اور حقیقی مذہب بدستور علم اور روحانیت دونوں کے لئے گائڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔

گوہاٹی کے سینار (اور اس طرح کے دوسرے سیناروں میں جو باتیں میں نے سنیں اور مسلم اجتماعات میں جو باتیں کی جاتی ہیں، جب میں دونوں کا مقابلہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں کوئی مناسبت نہیں۔ اس طرح کے سیناروں میں ہمیشہ ملکی مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ مثلاً گوہاٹی کے سینار میں ساری بحث دو نکتہ پر مرکوز رہی۔ اس علاقہ میں علیحدگی پسندی کے رجحان کو کس طرح ختم کیا جائے۔ اس علاقے کی معاشی پس ماندگی کو کس طرح دور کیا جائے۔ اس کے برعکس مسلم اجتماعات میں ساری بحث صرف مسلم کمیونٹی کے مسائل پر ہوتی ہے۔ یہ بحث بھی اس مفروضہ پر ہوتی ہے کہ مسلمان اس ملک میں تعصب اور ظلم کا شکار ہو رہے ہیں، اس کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔

اس صورت حال نے مسلمانوں کو ملک کی مین اسٹریم سے الگ کر دیا ہے۔ وہ اس طرح زندگی گزار رہے ہیں جیسے کہ وہ کوئی الگ قوم ہیں۔ مزید یہ کہ وہ اس ملک میں ایک محروم اور مظلوم طبقہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک مسلمان بزرگ سے میں نے کہا کہ ہندستان کی قیادت کی سو سالہ سرگرمیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ —— پہلے ہنگامہ کر کے تقسیم کرانا، اور جب تقسیم

ان کے مسائل حل نہ ہوئے تو اس کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال کر دوبارہ فریاد شروع کر دینا۔

ایک صاحب نے کہا کہ اعداد و شمار پیش کرکے ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ گراس نیشنل پروڈکشن (جی این پی) میں اضافہ ہوا ہے۔ میں کہوں گا کہ اگر جی این پی بڑھا ہے تو ساتھ ہی ایک اور جی این پی بھی بڑھا ہے۔ یہ دوسرا جی این پی ہے —— گراس نیشنل پاورٹی۔

ایک صاحب نے کہا کہ نارتھ ایسٹ انڈیا کا سارا مسئلہ مصنوعی تقسیم کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس غلطی کی تصحیح کیجئے، اور بنگلہ دیش کی سرحدوں کو ختم کرکے سارے علاقہ کو ایک جغرافی وحدت بنا دیجئے، اور پھر سارا مسئلہ اپنے آپ حل ہو جائے گا۔

بنگلہ دیش کی طرف سے روزگار کی تلاش میں جو لوگ آتے ہیں، ان کو ایک صاحب نے ناخواندہ مہمان (unwelcome guests) بتایا اور کہا کہ ان کا سلسلہ بند ہونا چاہئے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ اس کا تعلق "بنگلہ دیش" سے نہیں ہے۔ یہ تو تقسیم کے بہت پہلے سے رائج ہے۔ معاشی ضرورت کے تحت ساری دنیا میں لوگ اِدھر سے اُدھر جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ بھی آتے ہیں، اور پھر اکثر واپس چلے جاتے ہیں۔

گوہاٹی کے انگریزی اخبار نارتھ ایسٹ ٹائمس (The North East Times) کا شمارہ ۳ جنوری دیکھا۔ اس میں نیو گوہاٹی کے جیبون سائیکیا (Jibon Saikia) کا خط پڑھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ کانگریس کی ووٹ بنک کی پالیسی کے نتیجہ میں بنگلہ دیش سے مسلمانوں کی آمد برابر جاری ہے۔ مسلمانوں کو خوش کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہا تو اگلے ۲۰ سال میں آسام ایک مسلم اکثریت کا علاقہ بن جائے گا:

> It has now become crystal clear that Assam is going to be a Muslim majority state in India, in the course of near about twenty years. (p. 4)

اس کے ساتھ اخبار میں بہت سی خبریں تھیں جو بتا رہی تھیں کہ یہاں کے جرائم کی رفتار بڑھ رہی ہے۔ اپھال کے علاقہ میں پانچ کوکی مار ڈالے گئے اور تین آدمی بری طرح زخمی ہو گئے۔ جورہاٹ میں پانچ مسلح نوجوان ایک بنک میں داخل ہوئے اور دو لاکھ ۴۴ ہزار روپیے لے کر فرار ہو گئے۔ گوام دیو گاؤں میں پندرہ ڈاکوؤں کا ایک گروہ ایک اسکول ٹیچر جہند داس کے گھر

میں گھس گیا۔ انھوں نے گھر والوں کو مارا اور ایک ہزار روپیہ نقد اور قیمتی سامان لے کر بھاگ گئے مدھوپنی میں ایک ہتھیار بند گروہ ایک بنک میں داخل ہوا اور پچاس لاکھ روپیہ لے کر بھاگ گیا۔ وغیرہ

آسام میں بنگلہ دیشیوں کی آمد کا افسانہ صحیح ہے یا غلط، اس سے قطع نظر، آج لوگوں کا حال یہ ہے کہ ریاست اگر بالفرض مسلم اکثریت کا علاقہ بننے والی ہو تو ان کو سخت پریشانی ہوگی لیکن اگر ان کی ریاست جرائم اکثریت کا علاقہ بن رہا ہو تو اس کے لئے انھیں کوئی پریشانی نہیں۔ یہی غیر حقیقت پسندانہ مزاج ہے جس نے ملک کو موجودہ تباہی کے مقام پر پہنچایا ہے۔

مسٹر چارلس چاشی (Charles Chashie) انگریزی روزنامہ ناگالینڈ آبزرور کے اڈیٹر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس علاقہ کی ٹریجڈی دراصل لیڈرشپ کا فقدان ہے۔ انھوں نے آرایم بالد کی کتاب قیادت کی تلاش (In Search of Leadership) کا حوالہ دیا۔ مصنف نے اس میں میک گریگر (Mac Gregor) کا قول نقل کیا ہے کہ عوام کو بہتر حالت کی طرف لے جانے کا راز قیادت کو بہتر بنانا ہے:

That people can be lifted into their better selves is the secret of transforming leadership.

میں نے کہا کہ یہ مسئلہ صرف اس علاقہ کا نہیں ہے بلکہ پورے ملک کا اور ہر کمیونٹی کا ہے۔ مگر اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے یہاں اچھے لیڈر نہیں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ عمومی جہالت اور بے شعوری کی وجہ سے لوگ اچھے آدمی کو اپنا لیڈر نہیں بناتے۔ کیوں کہ اچھا لیڈر ہمیشہ حقیقت پسندی کی بات کرتا ہے جس کی اہمیت کو بے شعور عوام سمجھ نہیں پاتے۔ اس کے برعکس برا لیڈر جذباتی باتیں کرتا ہے جس کو ہر آدمی سمجھ لیتا ہے اور پرجوش طور پر اس کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔

کلکتہ سے مبارک کریم جوہر صاحب بھی اس سمینار میں آئے ہیں۔ ان کی عمر تقریباً پچاس سال ہے۔ اس مدت میں وہ بنگلہ زبان میں پچاس کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ان کی کئی کتابیں صوفی ازم پر ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کوئی معرفت کی بات جو آپ نے اپنے مطالعہ میں پائی ہو اس کو بتائیے۔ انھوں نے حسب ذیل الفاظ اپنے قلم سے لکھے: انسان اپنے کو جاننے سے تمام ادیان کا جاننا ہو جاتا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ کلکتہ کے ہندو پبلشر ایران سے اسلامی کتابیں منگاتے رہتے ہیں۔ مگر وہ ان کی قرأت پوری نہیں کر پاتے۔ ان کی کتابیں زیادہ تر ہندو پبلشر نے چھاپی ہیں۔ صحیح بخاری اور اسی طرح کی کئی دوسری کتابوں کا بنگلہ ترجمہ وہ چھپوا چکے ہیں۔ انھوں نے کلکتہ میں انجمن صوفی سماج کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ (Tel. 400475)

ایک مجلس میں ملک کی تقسیم پر باتیں ہونے لگی۔ ایک صاحب نے کہا کہ مسٹر محمد علی جناح تو ۱۹۳۰ میں لندن چلے گئے تھے اور وہاں پریوی کونسل میں پریکٹس کرنے لگے تھے۔ پانچ سال بعد نواب زادہ لیاقت علی خاں لندن گئے۔ اور ان کو ہندستان واپسی کے لئے آمادہ کیا۔

حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ یہ سب غیر ضروری باتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم سب کے سب ملک کی تقسیم کے ذمہ دار ہیں۔ اور ہم ہی کو اس کی قیمت ادا کرنا ہے:

We all are responsible for partition and we have to pay the price.

ایک صاحب نے بتایا کہ راج موہن گاندھی نے اپنی انگریزی کتاب (آٹھ زندگیاں) میں لکھا ہے کہ مسٹر محمد علی جناح جب ہندستانی پالٹکس سے الگ ہو کر لندن چلے گئے تو اس کے بعد برٹش سرکار کے کسی ذمہ دار نے بات کرتے ہوئے جواہر لال نہرو سے پوچھا کہ جناح کا معاملہ کیا ہے۔ نہرو نے جواب دیا کہ جناح تو سیاسی اعتبار سے ختم ہو گئے (Jinnah is finished) جناح تک یہ خبر پہنچی تو انھوں نے کہا کہ اچھا، میں ان کو دکھاؤں گا کہ میں کس طرح زندہ ہوں:

Finished, I will show him.

اس کے بعد نواب زادہ لیاقت علی خاں لندن گئے۔ اور مسٹر جناح کو ہندستان واپس آنے کے لئے کہا۔ مسٹر جناح نے کہا کہ آپ ہندستان واپس جائیے اور لوگوں کی رائے معلوم کر کے مجھے بتائیے۔ لیاقت علی خاں واپس آئے۔ اور لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے بعد مسٹر جناح کو ایک ٹیلی گرام بھیجا۔ یہ ٹیلی گرام صرف ایک لفظ پر مشتمل تھا — آجائیے (come) اس طرح مسٹر جناح دوبارہ ہندستانی پالٹکس میں واپس آ گئے۔

انھوں نے بتایا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۷ کے الکشن کے بعد جناح کانگرس سے الگ ہو گئے اور ملک کی تقسیم پر بختہ ہو گئے۔ مگر مولانا آزاد کے بیان کے

مطابق، یہ مسئلہ صرف یہ نہیں تھا کہ یوپی کیبنٹ میں کانگریسی مسلمان لئے جائیں یا مسلم لیگی مسلمان۔ اصل یہ ہے کہ مسلم لیگ نے اپنے جن دو آدمیوں کو کیبنٹ میں شامل کرنے کے لئے جو دو نام دئے تھے، وہ لیاقت علی خاں اور عبدالرحمان نشتر تھے۔ دونوں زمیندار طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے جے پرکاش نرائن، رام منوہر لوہیا جو کسان لیڈر تھے، وہ اس کے سخت مخالف ہو گئے۔ یہ لوگ سوشلسٹ ذہن کے تھے اور اس زمانہ میں زمینداری کے خلاف تحریک چلا رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم زمینداروں کو اپنی کیبنٹ میں لیں تو ہم عوام کو کیا جواب دیں گے یہ وجہ تھی جس کی بنا پر مسلم لیگ کے نامزد افراد کو کیبنٹ میں لینے سے انکار کیا گیا۔

مسٹر بی کے رائے برمن نے اپنے مفصل پیپر میں نارتھ ایسٹ کے قبائل کے لئے حق خود اختیاری (right of self-determination) کی وکالت کی اور اس علاقہ کے مسئلہ کا حل یہ بتایا کہ ان کو اٹانومی دی جائے۔ تاہم انھوں نے کہا کہ حق خود اختیاری سے ان کی مراد حق خود انتظامی (right of self-management) ہے نہ کہ انقطاع (secession)۔ اس سلسلہ میں انھوں نے دستور ہند کے علاوہ اقوام متحدہ کے ڈیکلریشن اور انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز کا حوالہ دیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ اصل المیہ یہ ہے کہ ہمارے دستور میں شہریوں کے حقوق کی دفعہ تو موجود ہے۔ مگر اس میں شہریوں کی ذمہ داری کی کوئی دفعہ نہیں۔ چنانچہ اب سارے ملک کا یہ حال ہو رہا ہے کہ لوگ اپنے حقوق کو تو آخری حد تک جانتے ہیں، مگر اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی انھیں خبر نہیں۔ ہمارا ذہن کچھ اس طرح بن گیا ہے جیسے کہ آزاد ملک کے لوگوں کے صرف حقوق ہوتے ہیں، ان کے کوئی فرائض نہیں ہوتے:

Citizens of a free country have only rights and rights and rights, but no duties.

اس معاملہ میں مسلمانوں کا کوئی استثناء نہیں۔ میں مسلم دانشوروں کی جتنی بھی تحریریں پڑھتا ہوں ہر ایک میں صرف مسلمانوں کے حقوق بتائے جاتے ہیں۔ کوئی بھی نہیں جو مسلمانوں کو بتائے کہ مسلمان جس ملک میں یا جن لوگوں کے درمیان رہتے ہیں ان کے

نہیں ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔

ایک جلسہ میں ایک صاحب پرجوش تقریر کر رہے تھے کہ بنگلہ دیش سے مسلمان برابر سرحد پار کر کے ہمارے یہاں آ رہے ہیں، یہ سلسلہ بند ہونا چاہئے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ بنگلہ دیش کو ختم کرنا ہمارے بس میں نہیں ہے، پھر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ مسٹر بنجے ہزاریکا نے کہا کہ مائیگریشن موجودہ زمانہ کی ایک عام چیز ہے۔ امریکہ بھی اس کو روک نہیں سکتا، پھر ہم کیسے اس پر روک لگا سکتے ہیں۔

پھر انھوں نے کہا کہ نصف ملین ہندستانی نیپال چلے گئے ہیں۔ وہاں ان کا جانا نیپال کے لئے ایک مسئلہ ہے۔ مگر ہم ایسا نہیں کرتے کہ ان ہندستانیوں کو وہاں سے واپس لانے کی بات کریں۔ پھر بنگلہ دیش والوں پر اتنا شور کیوں۔ ہم ڈبل اسٹینڈرڈ نہیں ہو سکتے۔

ایک صاحب نے کہا کہ اس علاقہ میں علیحدگی پسندی کا رجحان پیدا ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ ترقیات کا فائدہ خواص تک رہ جاتا ہے، وہ عوام تک نہیں پہنچتا:

The fruit of developments do not perculate to the grassroot level.

دوسرے صاحب نے کہا کہ یہی اصل بات نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب کو ترقیاتی پروگراموں کا اتنا فائدہ پہنچا کہ وہ ملک کی سب سے زیادہ خوش حال ریاست بن گئی۔ وہاں اس معاملہ میں عوام و خواص میں کوئی تفریق نہیں۔ اس کے باوجود پنجاب میں علیحدگی کی خوں ریز تحریک شروع ہوئی۔

۴ جنوری کی شام کے اجلاس میں مجھے موقع دیا گیا۔ میں دہلی سے ایک انگریزی پیپر تیار کر کے لے گیا تھا جو ملک میں بڑھتی ہوئی علاقائیت پسندی کے خلاف تھا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ علیحدہ خطہ بنانا کسی کے مسائل کا حل نہیں ہے۔ اس معاملہ کو پاکستان اور بنگلہ دیش کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ دونوں ہی مسائل کے حل کے نام پر علیحدہ ملک کے طور پر وجود میں آئے۔ مگر دونوں میں سے کسی جگہ بھی مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ بلکہ مسائل پہلے سے زیادہ بڑھ گئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جغرافی تقسیم یا علیحدگی سے مسائل کے حل کا کوئی تعلق نہیں۔

سیمنار کے ناظم مسٹر تھور شکر نے آخر وقت میں کہا کہ آپ کو ایک اور موضوع پر بھی بولنا ہے۔

وہ مذہبی ہم آہنگی اور کلچرل ٹالرنس کا مسئلہ ہے۔ اس موضوع پر پہلے سے میں نے کچھ تیار نہیں کیا تھا۔ اس وقت بیٹھ کر انگریزی میں ایک پیپر لکھا اور اس کو وہاں پیش کیا لوگوں نے بہت پسند کیا۔

اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مذہبی اختلافات یا کلچرل اختلاف کے مسئلہ کا حل اختلاف کو ختم کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کو ٹالریٹ کرنا ہے۔ اس نقطۂ نظر کی تفصیل کرتے ہوئے آخر میں نے کہا کہ اس مسئلہ کا حل سوامی ویویکانند نے ایک جملہ میں اس طرح بتایا ہے —— ایک کی اتباع کرو، اور کسی کے خلاف نفرت نہ کرو:

Follow one, and hate none.

میرا پیپر، دوسرے پیپروں کی طرح، حاضرین کے درمیان تقسیم کیا گیا۔ ہر پیپر کی کاپیاں پہلے سے تیار کی جاتی تھیں اور وہ ہال میں لوگوں میں تقسیم کی جاتی تھیں۔

۴ جنوری کی شام کا اجلاس تاخیر کے ساتھ ساڑھے چھ بجے ختم ہوا۔ ہر آدمی جو اسٹیج پر آتا وہ لمبی تقریر کرنے لگتا۔ جب مقرر مدت سے زیادہ وقت ہو گیا تو صدر اجلاس مسٹر پی ایچ ترویدی (آئی ایس آئی) نے بحث کے خاتمہ کا اعلان کرتے ہوئے مائک اٹھایا تاکہ وہ صدر کی حیثیت سے اپنے آخری کلمات کہہ سکیں۔ عین اسی وقت حاضرین میں سے ایک خاتون نے بلند آواز سے کہا "کیا میں ایک منٹ لے سکتی ہوں"۔ صدر نے جواب دیا کہ نہیں، اب وہ ایک منٹ کسی کے لئے باقی نہیں رہا:

We have no that one minute.

یہ سن کر مجھے موت کے لمحہ کا خیال آ گیا۔ میں نے سوچا کہ آدمی کی عمر کا آخری وقت جب آئے گا اور موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے کے لئے پہنچے گا تو آدمی کہے گا کہ ایک منٹ کی مہلت مجھے اور دے دو۔ فرشتہ جواب دے گا کہ اس ایک منٹ کا وقت گزر چکا۔ اب وہ ایک منٹ کہاں۔

منی پور کے مسٹر نیل کنٹھ شرما نے کہا کہ ہمارے علاقہ کے نوجوان کثرت سے ہتھیار اور ڈرگ کی طرف جا رہے ہیں۔ حتی کہ ڈرگ سے بچانے کے لئے ان کے والدین اپنے بچوں سے کہتے ہیں کہ تم کو شراب پینا ہو تو پی لو، لیکن ڈرگ کے قریب نہ جاؤ۔ یہ سب اس لئے کہ ان

نوجوانوں میں بے روزگاری اور وسائل معاش کی کمی نے سخت فرسٹریشن پیدا کر دیا ہے۔

انفرادی ملاقات میں مسٹر پی ایچ ترویدی نے کہا کہ یہاں جو لوگ اکٹھا ہوئے ہیں ، وہ وہ لوگ ہیں جو فساد نہیں کرتے۔ فساد کرنے والے تو دوسرے لوگ ہیں اور ہمارے ان کے درمیان کوئی لنک نہیں۔ میں نے کہا کہ اس کو میں اس طرح کہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں ایک پرابلم گروپ ہے اور دوسرا نو پرابلم گروپ۔ چنانچہ میں پچھلے دو سال سے پرابلم گروپ کے لوگوں سے ربط قائم کر کے ان کی سوچ کو بدلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

انتہا پسند ناگاؤں کے خیالات کتنے سخت ہیں ، اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں ہم ایک اقتباس نقل کرتے ہیں۔ ۶۲ سالہ مسٹر موئیوا (Thuingaleng Muivah) مشہور ناگا لیڈر ہیں۔ وہ نیشنل سوشلسٹ کونسل آف ناگالینڈ کے فاؤنڈر ہیں۔ ان کے اوپر کئی قاتلانہ حملے ہو چکے ہیں۔

سنڈے کے نمائندہ مسٹر سوبیر بھومک (Subir Bhaumik) اور ان کے ساتھی تھائی لینڈ اور برما کی سرحد پر ایک خفیہ مرکز میں ان سے ملے۔ وہ لوگ ۸ گھنٹہ تک جنگلوں میں سفر کر کے مسٹر موئیوا کے یہاں پہنچے تھے۔ انھوں نے ناگا لیڈر کا انٹرویو لیا جس کو خود ناگا لیڈر انٹرویو کے بجائے انٹرایکشن کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ سنڈے کے شمارہ ۱۶ جون ۱۹۹۶ میں یہ انٹرویو پانچ صفحات پر چھپا ہے جس کے ساتھ کئی تصویریں بھی شامل ہیں۔ اس انٹرویو کا ایک سوال و جواب یہاں نقل کیا جاتا ہے :

Q. But unless you start talking, how do you know how sincere India is about a settlement?

A. Mr. Bhaumik, it may hurt your feelings as an Indian if we tell you how bad our experience has been in this regard. India's government, her bureaucrats are masters of double-talk, your society has so much double standard. I have read your epics and even your heroes like Rama and Krishna have made and broken rules at their convenience. Rama used dissension to subjugate Bali's kingdom, a kingdom of tribals. His brother Sugriv was used. Krishna signalled to Bhim to hit Duryodhana below his waist when Bhim was all at sea. Whenever rules have proved to be problem, your society and its leaders have flouted it, expecting everyone else to observe them.

Sunday weekly, Calcutta, 16-22 June 1996, p. 50

اشاتی کے شمارہ اپریل ۱۹۹۶ میں منی پور کے شہری رتن تھیم (Ratan Thiyyam) کا انٹرویو چھپا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کی دنیا میں مجھ سے زیادہ غمگین شاید اور کوئی نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آج میرے وطن منی پور کی کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر باقی نہیں رہی:

Nothing seems to be in place in Manipur today.

انھوں نے کہا کہ پہلے ہم منی پور کے لوگ بہت آسودہ زندگی گزارتے تھے۔ ہمارا ہر معاملہ درست تھا۔ کھانا پینا، ہر چیز فراغت کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ آج سب کچھ تباہ ہوچکا ہے۔ قدیم روایتیں ختم ہوگئیں۔ ہمارا اعتماد جاتا رہا۔ ۳۰ سال کی مدت میں پوری زندگی کچھ سے کچھ ہوگئی۔

یہ سب نتیجہ ہے علیحدگی پسندی کی انتہاپسندانہ اور متشددانہ تحریک کا۔ میں نے اس کو پڑھا تو میں نے سوچا کہ آج ٹھیک یہی حال ان تمام مسلم علاقوں کا بھی ہے جہاں آزادی کے نام پر اسی قسم کی تحریکیں چلائی گئیں۔ مثلاً بوسنیا، چیچنیا، برما، فلپائن، فلسطین، وغیرہ۔ ہر جگہ آج سے "۳۰ سال" پہلے مسلمان نہایت عمدہ حالت میں تھے۔ ہر قسم کی ترقی کے مواقع انھیں حاصل تھے۔ مگر انھوں نے متشددانہ قسم کی سیاسی تحریکیں چلادیں۔ اس کے نتیجہ میں ملا ہوا بھی تباہ ہوگیا۔ اور مزید کچھ تو ملنے والا ہی نہ تھا۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ لوگوں کو اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ وائلنٹ ایکٹوزم کا زمانہ ختم ہوگیا۔ اب صرف نان وائلنٹ ایکٹوزم یا پیس فل ایکٹوزم ہی ممکن ہے۔ اور وہ بھی اس وقت جب کہ فی الواقع اس کی ضرورت پیش آگئی ہو۔

نارتھ ایسٹرن انڈیا میں علیحدگی پسندی کے رجحان کو ختم کرنے اور اس کو ملک کی مین اسٹریم میں لانے کے لئے بار بار نئی دہلی اور مقامی لیڈروں کے درمیان میٹنگیں ہوئیں اور اکارڈ طے پائے۔ مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ مثلاً:

Shillong Accord 1975, Assam Accord 1985, Mizoram Accord 1986, Tripura Accord 1988, Bodo Accord 1994

اس کے باوجود اس علاقہ کی بے چینی ختم نہیں ہوئی۔ درجنوں عسکری تنظیمیں بدستور پورے علاقہ میں سرگرم ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس علاقہ کی معاشی اور تمدنی پسماندگی بدستور باقی ہے۔

ہندوستان ٹائمس کے اسسٹنٹ اڈیٹر مسٹر آش نرائن رائے کا ایک مقالہ جنرل آف نوویس ہنڈ ینڈ دنیٹیملی کے شمارہ جولائی۔ اگست ۱۹۹۵ میں چھپا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ اس علاقہ میں امن اور ہم آہنگی کی کنجی محض اکارڈوں پر دستخط کرنا نہیں ہے بلکہ ضرورت یہ ہے کہ یہاں اقتصادی ترقی لائی جائے اور لوگوں کو زیادہ سے زیادہ معاشی وسائل فراہم کئے جائیں:

The key to peace and harmony in the region lies not in merely signing accords but in the rapid economic development and the widening of economic opportunities. (Ash Narain Roy)

جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے، خرابی کی اصل جڑ کرپشن ہے۔ مرکزی حکومت کی طرف سے اس علاقہ کی ترقی کے لئے بہت بڑی رقمیں منظور کی گئیں مگر وہ زیادہ تر لوگوں کی جیبوں میں چلی گئیں۔ اس علاقہ کے ترقیاتی کاموں میں وہ بہت کم استعمال ہو سکیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ یہ درست ہے کہ نارتھ ایسٹ ایریا ایک پرابلم ایریا بن گیا ہے لیکن ہر مسئلہ کا الزام حکومت کو دینا صحیح نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ تو ہم اپنے عمل کی قیمت بھگت رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ سے پہلے جب ہندستان میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی تو ہمارے سیاسی لیڈر ہر مسئلہ کا الزام برٹش گورنمنٹ کو دیدیتے تھے، خواہ وہ کوئی بھی مسئلہ ہو۔ اس وقت یہ بات بہت اچھی لگتی تھی۔ کیوں کہ اس طرح عوام انگریزوں کے خلاف اٹھ رہے تھے اور وہ عوامی طاقت ظہور میں آرہی تھی جو ہماری بے تشدد تحریک آزادی کو طاقت ور بنانے کے لئے ضروری تھی۔

اس طرح عوام کی نفسیات یہ بن گئی کہ تمام مسائل کی ذمہ دار حکومت ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ اپنے اس مزاج کی بنا پر اب وہ اسی طرح ہر خرابی کا الزام قومی حکومت کو دے رہے ہیں۔ یہ قیمت ہمیں اس وقت تک بھگتنا ہوگا جب تک عوام میں نیا شعور پیدا نہ کر دیا جائے۔

ایک پرانے گاندھی وادی نے بتایا کہ جب وہ نوجوان تھے، وہ کھادی کی ایک کانگرسی دکان پر کپڑا خریدنے گئے۔ دکان والے نے پوچھا: ہاتھ کھادی یا مل کھادی۔ یعنی ہاتھ سے بنے ہوئے سوت کی کھادی یا مل میں تیار کئے ہوئے سوت کی کھادی۔ مذکورہ نوجوان کو اس سے بہت دھکا لگا۔ انھوں نے مہاتما گاندھی کو خط لکھا کہ میرے ساتھ ایسا ایسا واقعہ گزرا۔ کیا کھادی بھی دو کھادی ہوتی

ہے۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔

گاندھی جی نے اس خط کا جواب اپنے پرچہ ینگ انڈیا میں دیا۔ انھوں نے لکھا کہ نوجوان کو اس طرح کے معاملات میں زیادہ حساس (oversensitive) نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے کہا یہ نہایت صحیح جواب تھا۔ اگر معاملہ حق اور ناحق کا ہو تو آدمی کو ضرور بہت زیادہ حساس ہونا چاہئے۔ مگر جو معاملہ حق اور ناحق سے تعلق نہ رکھتا ہو تو اس میں نظر انداز کرنے کی پالیسی اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس فرق کے بغیر زندگی کا نظام نہیں چلایا جا سکتا۔

ایک صاحب نے کہا کہ گاندھی جی جب ساؤتھ افریقہ سے آئے تو وہ کوٹ پتلون پہنتے تھے۔ پھر گاندھی جی نے کہا کہ آزادی کی تحریک میں شریک ہونے سے پہلے میں سارے دیش میں گھوم کر لوگوں سے ملوں گا۔ چنانچہ انھوں نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ ملک میں بے شمار لوگ ابھی تک غربت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے جسم پر پورا کپڑا بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد گاندھی جی نے کہا کہ جس دیش میں غریبوں کی اکثریت ہو وہاں آزادی کی تحریک چلانے کے لئے مجھے خود بھی غریب ہندستانی کی طرح رہنا ہوگا۔ یہ کہہ کر انھوں نے کوٹ پتلون اتار دیا اور وہ کپڑا پہن لیا جس کو دیکھ کر برطانیہ کے سرونسٹن چرچل نے ان کو ننگا فقیر (naked fakir) کہا تھا۔

کوہیما سے ایک انگریزی اخبار نکلتا ہے۔ اس کا نام جرنل (The Journal) ہے۔ اس کے شمارہ ۱۷ نومبر ۱۹۹۴ میں ایک جائزہ چھپا تھا۔ اس کا عنوان تھا ــــ جبری استحصال کی زمین (A Land of Extortion) اس میں بتایا گیا تھا کہ اس علاقہ کے بیرونی آئی اے ایس افسران بہت غیر مطمئن حالت میں ہیں۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے چلے جانا چاہتے ہیں:

> Non-local IAS officers want to be transferred out of Nagaland as quickly as possible.

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ہر وقت ان کو اپنی جان کا خطرہ رہتا ہے۔ غیر مقامی افسروں کو یہاں کے لوگ اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس طرح ۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں انگریز افسران دیکھا جاتا تھا۔ مقامی لیڈروں کی تقریروں نے اس معاملہ میں لوگوں کو اتنا جذباتی بنا دیا ہے کہ غیر مقامی افسروں کو دیکھ کر وہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ ہم کو غلام بنانے کے لئے یہاں آئے ہیں۔

[illegible] کی عیسائی [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

Above all [illegible] are a binding force to feel "Indian".

[illegible] سب سے زیادہ [illegible] کا مشترک احساس [illegible]

[illegible] مشترک احساس باقی نہ رہے

[illegible]

مقامی انگریزی اخبار ناگالینڈ ٹائمس (۲۲ نومبر ۱۹۹۳) میں علاقہ کی سات ریاستوں کے بارہ میں ایک رپورٹ چھپی تھی جس کا عنوان تھا:

Symphony of the Seven Sisters.

اس میں بتایا گیا تھا کہ نارتھ ایسٹ کی سات ریاستوں (آسام، ناگالینڈ، منی پور، میگھالیہ، میزورم، اروناچل پردیش، تری پورہ) میں ہر ایک کا مخصوص کلچر ہے۔ ہر ایک کا مذہب اور زبان الگ الگ ہے۔ ان پر پڑوسی ممالک برما، چین، تبت کلچر کے اثرات ہیں۔ چنانچہ اس علاقہ کی کوئی مشترک زبان نہیں۔ اس کی وجہ سے "سات بہنوں" کا [illegible]

ناگالینڈ ٹائمس کی اس رپورٹ میں مزید بتایا گیا تھا کہ درحقیقت [illegible] ان قبائل کے لئے اجنبی ہے جو کہ بنیادی طور پر گوشت خور ہیں:

[illegible] is much alien to the psyche of the tribals who are basically [illegible] and liberated in their way of life.

اس میں بتایا گیا تھا کہ نارتھ ایسٹ کا یہ علاقہ ۱۸۲۶ میں [illegible] کے زیر اثر آیا۔ اور اس پہاڑی علاقہ میں مسیحیت نے اپنی جڑیں قائم کرلیں۔ یہ ان [illegible] کے ذریعہ ہوا جنھوں نے ان پہاڑیوں میں انتھک محنتیں کیں۔ مثال کے طور پر میگھالیہ کے قبائل کی [illegible] لکھنے پڑھنے کی زبان بنانے کا کارنامہ ٹامس جونز (Rev. Thomas Jones) وغیرہ نے کیا۔ [illegible] لوگوں نے میگھالیہ کے قبائل کو ان کی پہلی مطبوعہ کتاب دی۔ انھوں نے یہاں اسکول اور اسپتا[ل]

کے۔ انھوں نے اس علاقہ کے لوگوں کو پہلی بار علم سے آشنا کیا۔ تاہم ان مسیحی مبلغوں کے
ات سے ... اور ... پایا۔

... جنوری کی شام کو کھانے کی میز پر کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ صاحبان تھے۔ وہ گاندھی واد
... رکھتے تھے۔ ڈاکٹر جینت پاٹل (ممبر پلاننگ کمیشن) نے کہا کہ ساری سمسیاؤں کا حل
... واد میں ہے۔ گاندھی کے وچاروں کو دیش میں لانا ہوگا، تبھی دیش کا بھلا ہو سکتا ہے۔
... نے کہا کہ ۱۹۴۷ کے بعد مہاتما گاندھی کے اپنے بنائے ہوئے ساتھی ان سے پھر گئے۔
... سے پہلے جو گاندھی ہیرو بنا ہوا تھا، وہ ۱۹۴۷ کے بعد خود اپنے ملک میں زیرو ہو گیا۔ چنانچہ
... وقت مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ "اب میری کون سنے گا"۔ ان کے اسی جملہ کو پیارے لال نے اپنی
... کتاب کا ٹائٹل بنایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد انڈیا میں خود گاندھی جی اپنے
... وچاروں کو عمل کی صورت نہ دے سکے۔ پھر اب کون ہوگا جو ان کو عملاً قائم کرے۔ کیا آپ
... ایک سپر گاندھی لا سکتے ہیں۔ بمبئی کے پروفیسر رونڈر کیلیکر بھی اس گفتگو میں شریک تھے۔
پھر ... نے کہا کہ وہ مقام جہاں گاندھی واد فیل ہوا ہے وہ لارڈ ایکٹن کے الفاظ میں
... ہے کہ طاقت اور اقتدار آدمی کو بگاڑ دیتا ہے:

Power currupts and absolute power currupts abs...

... کا اصل سبب یہی تھا۔ اب ہمیں اس انسانی کمزوری کا حل
... کے بغیر ہمارے خوابوں کا نیا ہندستان بننے والا نہیں۔
... تھی کہ سیاسی استحکام کیسے حاصل کریں۔
(how to ...) مختلف لوگوں نے مختلف باتیں کہیں۔ میں نے کہا کہ
... کے بعد کوئی بھی پارٹی اپنے حق میں نئی سیاسی روایات قائم کرنے
... بعد ... آزادی کارکردگی پر زندہ نہیں تھی بلکہ قبل از آزادی
... تھی۔ کانگرس کا سارا سرمایہ جدوجہد آزادی کے دور کی
... اپنی آخری حد پر پہنچ کر ختم ہو گیا۔
... کوئی مثبت پیغام نہ تھا۔ اس نے دو بڑے فرقوں کے درمیان چھپی ہوئی

منافرت اور نفرت کو استعمال کیا، مگر اس کی بھی ایک حد تھی۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو خود اسی کے ساتھ اس کی آخری حد آگئی۔ اب ملک میں ایک قسم کا سیاسی خلا ہے، اور ملک کسی ایسے نئے گروہ کا منتظر ہے جو ظاہر ہو اور دوبارہ ملک کو سیاسی استحکام دے سکے۔

نارتھ ایسٹ انڈیا سات مختلف ریاستوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے ان کو سات بہنیں کہا جاتا ہے۔ دھنک میں چونکہ سات الگ الگ رنگ ہوتے ہیں، اس لئے ان ریاستوں کے مجموعہ کو زمینی دھنک کا نام بھی دیا گیا ہے:

a rainbow on the ground.

ان سات ریاستوں میں آپ گھومیں پھریں تو آپ کو ہر طرف وہاں مسائل ہی مسائل دکھائی دیں گے۔ مگر الفاظ کی دنیا میں اس کی تصویر بالکل برعکس دکھائی دیتی ہیں۔ جو لوگ صرف الفاظ کو دیکھ کر حقیقت کے بارہ میں رائے قائم کریں وہ ہمیشہ اصل حقیقت کے ادراک سے محروم رہیں گے۔

۵ جنوری کو صبح ۳ بجے نیند کھلی۔ مجھے ٹی وی کا کوئی شوق نہیں۔ مگر میں نے سوچا کہ دیکھیں کیا رات کو بھی ٹی وی کے پروگرام آتے ہیں۔ میں نے یہ جاننے کے لئے ٹی وی سیٹ کھولا تو اس وقت کئی پروگرام آرہے تھے۔ ایک چینل سے کھیل کا پروگرام آرہا تھا۔ دوسرے چینل پر غالباً کوئی انگریزی فلم دکھائی جارہی تھی۔ اس کا جو منظر میرے سامنے آیا اس میں ایک مرد اور ایک عورت کھڑے ہوئے تھے۔ عورت اپنے اتارے ہوئے کپڑے کو پہن رہی تھی۔ اس نے اپنے کھلے جسم پر مختصر لباس پہنا اور مرد کی ناک پر پستول رکھ کر اسے گولی مار دی۔

ہندستان میں کچھ لوگ یہ لکھنے اور بولنے میں مشغول ہیں کہ ہندو ایک منظم سازش کے تحت ہمارے ملی تشخص کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ یہ بے حد سادہ لوحی کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہندو اور مسلمان دونوں کے روایتی تشخص کو مٹانے کا کام سٹلائٹ ٹی وی کر رہا ہے جس کی زد سے اپنے آپ کو بچانا دونوں میں سے کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ یہ ٹی وی رات دن کھیل کود، مار دھاڑ اور سیکس کے مناظر دکھاتا رہتا ہے۔ اس کی ہمہ گیری کا یہ حال ہے کہ

نشان ہے اگر آپ اس کو روکیں تو وہ آسان سے آپ کے گھروں میں داخل ہو جائے گا۔ یہ طوفانی سیلاب نہ صرف ہندستان کو بلکہ تمام عرب دنیا اور مسلم دنیا کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔ میری طرح کے کچھ لوگ جو اپنے ذوق کے تحت محفوظ نہ ہو سکتے ہوں وہی اس سے بچے ہوئے ہیں۔ ورنہ نام نہاد دیندار گھرانے تک اس فتنہ سے محفوظ نہیں۔

۵ جنوری ۱۹۹۵ کی صبح کو ناشتہ کی میز پر مسٹر زدیدی (آئی اے ایس) سے گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ انڈیا کے جھگڑوں کو ختم کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ مذہب کے بارہ میں گاندھی جی کے نظریہ کو پھیلایا جائے۔ یعنی یہ کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ میں دو نقطۂ نظر ہیں۔ ایک یہ کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔ یہ نظریہ بظاہر خوبصورت معلوم ہوتا ہے مگر وہ یقینی طور پر قابل عمل نہیں۔ شہنشاہ اکبر سے لے کر ڈاکٹر بھگوان داس (اسینشل یونیٹی آف آل ریلیجنز) اور مہاتما گاندھی تک غیر معمولی کوشش کے باوجود یہ نظریہ سراسر ناکام رہا ہے:

حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کا حل باہمی اعتراف (mutual recognition) میں نہیں ہے بلکہ باہمی احترام (mutual respect) میں ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ ناگالینڈ اور منی پور کی حیثیت ٹائم بامب کی ہو چکی ہے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ یہ صرف دو ریاستوں کی بات نہیں۔ بلکہ نارتھ ایسٹ کا پورا علاقہ آج اسی حالت کو پہنچ چکا ہے۔ اس طرح کی اور بہت سی باتیں لوگ کر رہے تھے، اور میں سوچ رہا تھا کہ اردو اخباروں میں ہمارے لکھنے والے جو کچھ لکھتے ہیں، اس کے مطابق، اردو خواں مسلمانوں کو صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ اس علاقہ میں مسلمانوں کے خلاف شدید تعصب ہے اور بنگلہ دیشی کے نام پر مسلمانوں کو یہاں سے نکالا جا رہا ہے۔ حالانکہ "بنگلہ دیشی مسئلہ" اس علاقہ میں پیدا شدہ مسائل کا صرف ایک فیصد ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ مذہب اور کلچر کے اختلافات میں یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے مذہب کی پیروی کرتے ہوئے دوسروں کے مذہب کا احترام کریں:

We have to respect other religions while following our own.

ہمارے یہاں اس معاملہ میں یہی سچ ترین بات ہے اور یہی واحد قابل عمل صورت ہے۔ اس معاملہ میں ہمیں پریکٹیکل بننا چاہئے نہ کہ آئیڈیلسٹ۔ عجیب بات ہے کہ ذاتی انٹرسٹ کا معاملہ ہو تو ہر آدمی پریکٹیکل بن جاتا ہے۔ مگر جب ملک اور سماج کے بارہ میں گفتگو ہو تو وہی آئیڈیلزم کی بات کرنے لگتا ہے۔ اسی دوطرفہ معیار نے سارے مسائل پیدا کئے ہیں۔

سیمینار کا مقصد ان لفظوں میں بتایا گیا تھا کہ ـــــ نارتھ ایسٹ اور ملک کے بقیہ حصوں کے دانشوروں کو باہمی تبادلۂ خیال کا موقع دینا :

to facilitate interaction between the intellectuals of the North-East and the rest of the country.

مگر میرا تجربہ ہے کہ برصغیر ہند کے دانشوروں کا تبادلۂ خیال ہمیشہ بے فائدہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں سننے اور ماننے کا مزاج نہیں۔ ہر ایک میں صرف سنانے اور منوانے کا مزاج ہے۔ یہاں کا ہر آدمی اعجاب کل ذی رأي برأيه کا مصداق ہے۔ ایسے لوگوں کے درمیان تبادلۂ خیال کبھی کسی مثبت نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔

گوہاٹی کا یہ انٹرنیشنل سیمینار بڑی امیدوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اس کا اہتمام ناگالینڈ گاندھی آشرم کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف اداروں نے اس کے ساتھ تعاون کیا۔ خاص طور پر حسب ذیل ادارہ نے :

North-East Institute of Bank Management (NEIBM)

اس کا بنیادی موضوع تھا : نارتھ ایسٹ انڈیا اور اکیسویں صدی۔ اس کے چھ ذیلی موضوعات مقرر کئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک موضوع یہ تھا:

North-East, a rainbow on the ground
Religious and ethnic pluralism—amity through diversity
—a future perspective.

آخری اجلاس میں منتظمین کی طرف سے ایک رزولیوشن کا ڈرافٹ پیش کیا گیا۔ اس پر بحث ہوئی۔ یہاں تک کہ اس کو رد کر دیا گیا۔ پھر یہ طے ہوا کہ ایک اسٹیٹمنٹ جاری کیا جائے۔

اعلانیہ بھی رد ہوگیا۔ آخر میں طے ہوا کہ اجلاس کے دوران جو مختلف رائیں سامنے آئی ہیں، ان کا خلاصہ تیار کیا جائے اور اس کو اشاعت کے لئے دے دیا جائے۔ دو آدمیوں نے اس کا ڈرافٹ تیار کیا۔ مگر وہ بھی منظور نہ ہوسکا۔ آخرکار یہ سیمینار اس طرح ختم ہوا کہ اس کی طرف سے کوئی متفقہ چیز پریس میں اشاعت کے لئے نہ دی جاسکی۔

میں بے حد غم زدہ حالت میں یہ تمام بحثیں سن رہا تھا۔ آخر میں میں نے کہا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک سنگین قومی مسئلہ پر پورے ملک کے دماغ اکٹھا ہوئے۔ تین دن کے بحث و مباحثہ کے بعد اب وہ یہاں سے واپس جارہے ہیں۔ اور حالت یہ ہے کہ ہم اتنا بھی نہیں کرسکے کہ ایک متفقہ بیان تیار کرکے کل کے اخبار میں دے دیتے تاکہ لوگ کم سے کم یہ جان لیں کہ ہم نے انھیں کیا پیغام دیا ہے۔

۶ جنوری کی شام کو واپسی تھی۔ ہوٹل سے ایئرپورٹ تک کے سفر میں دو صاحبان کا ساتھ تھا۔ پرتاپ سنگھ اور عبدل بھائی۔ ایئرپورٹ پر دیر تک ان لوگوں سے گفتگو ہوئی۔ پرتاپ سنگھ ایک سیاسی آدمی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ تمام لیڈر کرپٹ ہیں، خواہ ایک پارٹی کے ہوں یا دوسری پارٹی کے۔ میں نے کہا کہ پالی ٹکس میں ہمیشہ کرپشن رہتا ہے۔ البتہ اس کو ایک حد کے اندر رہنا چاہئے۔ ہندستان کی مصیبت یہ ہے کہ یہاں کا کرپشن حد سے باہر چلا گیا ہے۔

عبدل بھائی مسلمانوں میں نکاح و طلاق کے مسائل سے بہت پریشان تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سلسلہ میں کچھ اصلاحی قانون بننا چاہئے۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں اصل مسئلہ قانون کا نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم بہت کم ہے۔ تعلیم یافتہ آدمی ہی جانتا ہے کہ کیسے جینا چاہئے۔ اس لئے اگر آپ اصلاح چاہتے ہیں تو قوم کو تعلیم یافتہ بنائیے، اس کے بعد تمام مسائل اپنے آپ حل ہوجائیں گے۔

۶ جنوری ۱۹۹۵ کو گوہاٹی سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ یہ سفر انڈین ایئرلائنز کی فلائٹ نمبر ۸۹۰ کے ذریعہ طے ہوا۔ گوہاٹی سے واپسی میں جہاز کے نیچے بادلوں کی گہری چادر نہیں تھی۔ ہمارا جہاز بنگلہ دیش کے اوپر سے اڑتے ہوئے ہندستانی علاقہ میں

داخل ہوا۔ میں نے جہاز کے نیچے دیکھا تو درختوں سے ڈھکا ہوا بنگلہ دیش ایک جنگل کی تصویر پیش کر رہا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ ایک ہندستانی جرنلسٹ مسٹر چنچل سرکار نے حال میں بنگلہ دیش کا سفر کیا تھا۔ اس کے بعد ان کا ایک تبصرہ دہلی کے انگریزی اخبار پانیر میں چھپا تھا۔ مسٹر سرکار نے بنگلہ دیش میں مختلف قسم کے لیڈروں سے ملاقات کی۔ کوئی اسلامی سیاست کی بات کرتا تھا اور کوئی سیکولر سیاست کی۔ مگر ہر ایک کا اسلام بھی الگ تھا اور ہر ایک کا سیکولرزم بھی الگ۔ چنانچہ انھوں نے بنگلہ دیش کو ایک سیاسی جنگل (political jungle) سے تعبیر کیا تھا۔

یہ صرف بنگلہ دیش کی بات نہیں۔ اختلافات کی کثرت نے آج پوری مسلم دنیا کو اسی طرح کی صورت حال میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اتحاد کے لئے یہی کافی نہیں ہے کہ قوم کے پاس ایک کتاب اور ایک قرآن ہو۔ اگر لوگوں کا مزاج بگڑا ہوا ہو تو وہ ایک کتاب کی سیکڑوں تعبیر کرکے دوبارہ قوم کو افکار کے ایک جنگل میں بھٹکا دیں گے۔

اس قسم کی صورت حال ہمیشہ نااہل لوگوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ بولنے کے قابل لوگوں کے لئے جتنا بولنا ضروری ہے اتنا ہی ضروری یہ ہے کہ وہ لوگ جو بولنے کے قابل نہیں ہیں وہ نہ بولیں۔ ۹۹ آدمی چپ رہیں اسی وقت ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی بولے اور اس کا بولنا لوگوں کے لئے مفید ثابت ہو۔

گوہاٹی سے دہلی تک ڈھائی گھنٹہ کا سفر تھا۔ درمیان میں کچھ اخبارات پڑھے۔ آسام ٹریبیون (گوہاٹی) کے شمارہ ۶ جنوری ۱۹۹۵ کے صفحہ اول پر ریاستی حکومت کے حوالے سے یہ خبر تھی کہ تری پورہ میں قبائلی جنگجوؤں (tribal militants) کے پاس جدید ہتھیاروں (sophisticated arms) کی بھاری مقدار پہنچ گئی ہے۔ وہ انسانوں کے اوپر ان ہتھیاروں کا تجربہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ اخبار کی اسی اشاعت میں کئی خبریں تھیں کہ اچانک موٹر سائیکل پر کچھ لوگ آئے اور بے قصور لوگوں پر فائر کرکے بھاگ گئے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو علاقہ کی آزادی کے نام پر اپنی متشددانہ تحریک چلا رہے ہیں۔ اس

کے بجائے اگر وہ یہ کہیں کہ ہم نراج اور بدامنی لانے کے لئے تحریک چلا رہے ہیں تو یہ زیادہ صحیح بات ہوگی۔

بدقسمتی سے ٹھیک یہی حال مسلم دنیا کا ہے۔ جگہ جگہ مسلم نوجوانوں نے اسلام کے نام پر ہتھیار اٹھا رکھا ہے۔ حالاں کہ ان کی اس متشددانہ تحریک سے آج بھی صرف قتل وخون برآمد ہو رہا ہے اور آئندہ بھی اس سے قتل وخون ہی کا تحفہ لوگوں کو ملنے والا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال افغانستان ہے۔

ہوائی جہاز کے نیچے جو پہیہ ہوتا ہے وہ ایئرپورٹ پر جہاز چلانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جب جہاز اوپر اٹھ کر اڑنے لگتا ہے تو پہیہ اندر کی طرف اٹھا لیا جاتا ہے۔ میں نے پائلٹ سے پوچھا کہ لینڈنگ کے وقت اگر آپ پہیہ کو نیچے گرانا بھول جائیں تو کیا ہوائی جہاز حادثہ کا شکار ہو جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ معمولی نقصان تو ہوگا، لیکن اس سے کوئی بڑا حادثہ پیش نہیں آئے گا۔ انھوں نے بتایا کہ لینڈنگ کے وقت پہیہ نیچے گرانے کے لئے یاددہانی کے مختلف انتظامات کئے گئے ہیں۔ نئے ہوائی جہازوں میں کمپیوٹرائزڈ ریکارڈنگ ہوتی ہے جو لینڈنگ کے وقت پائلٹ کو ان الفاظ میں مسلسل وارننگ دیتی ہے:

Check your landing gear, check your landing gear.

میں نے پوچھا کہ جہاز کا پہیہ (لینڈنگ گیر) اوپر کیوں اٹھا لیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید اونچی بلڈنگ یا پہاڑ وغیرہ کی ٹکر سے بچانے کے لئے ایسا کیا جاتا ہوگا۔ انھوں نے بتایا کہ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ پہیہ دس فٹ یا اس سے بھی زیادہ لمبا ہوتا ہے۔ اگر پہیہ نیچے لٹکا رہے تو اس کی وجہ سے ہوائی رکاوٹ پیدا ہو جائے گی:

Drag is created if the landing gear is down.

جہاز تقریباً دو گھنٹہ لیٹ ہو کر ساڑھے پانچ بجے شام کو دہلی پہنچا۔ جہاز کے اندر اعلان میں مسافروں سے کہا گیا کہ اس دیری کے کارن آپ کو جو اسوبیدھا ہوئی اس کے لئے ہم چھما چاہتے ہیں۔ تاہم انڈین ایئرلائنز کے لئے یہ ایک معمول کی بات ہو چکی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں لوگوں کو طرح طرح کی زحمتیں پیش آتی ہیں۔

آج کے اخبار میں ایک خبر یہ تھی کہ حکومت ہند کے ایک ذمہ دار نے کہا کہ ترقی کا فائدہ ہمیں ہندستان کے عام شہریوں تک پہنچانا ہے۔ میں نے سوچا کہ ہوائی جہاز میں جو لوگ سفر کرتے ہیں وہ تو خواص کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ پھر پچاس سال کانگرس حکومت کے باوجود جب ترقی کا فائدہ ملک کے خواص تک بھی پوری طرح نہیں پہنچا تو ملک کے عوام تک ترقی کا فائدہ پہنچانے کے لیے آخر کتنا زیادہ وقت درکار ہوگا۔

۶ جنوری ۱۹۹۵ کی شام کو میں دہلی واپس پہنچا۔

خصوصی اعلان

تمل ناڈو مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن کی طرف سے ترنل ولی میں ایک آل انڈیا کانفرنس ۴-۵ ۱۹۹۷ کو ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور وہاں کے جلسۂ عام میں ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا موضوع تھا: دی کانسپٹ آف پیس ان اسلام۔

۲ نومبر ۱۹۹۶ کے آخری ہفتہ میں پونا میں فلاسفیکل کانگرس کی طرف سے ایک انٹرنیشنل میٹنگ ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور امن اور اسلام کے موضوع پر وہاں تقریر کی۔ اس کے علاوہ پونا میں کچھ اور پروگرام ہوئے۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۳ حلقۂ الرسالہ بمبئی کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بمبئی کا سفر کیا۔ وہاں باندرہ میں ایک مسلم اجتماع میں تقریر کی۔ اس کے علاوہ ملاقات اور گفتگو کے کئی پروگرام ہوئے۔ یہ سفر ۷-۹ جنوری ۱۹۹۷ کو ہوا۔

۴ امریکہ کے الرسالہ حلقہ سے ای میل (الکٹرانک میل) کے ذریعہ بہت سے مسلم اور غیر مسلم حضرات کو اب الرسالہ کے مضامین خاص طور پر اسلام کے جنرل ٹاپکس پر اور عام طور پر مختصر مضامین بھیجنے کا سلسلہ دسمبر ۱۹۹۶ سے شروع کر دیا گیا ہے۔ الکٹرانک میل امریکہ میں عام بات ہو گئی ہے۔ یہ زیادہ تر لوگوں کا سورس آف انفارمیشن بنتا جا رہا ہے۔ ای میل کے ذریعہ سے جو ٹکسٹ بھیجی جاتی ہے وہ ڈائرکٹ ان لوگوں کے کمپیوٹرس میں پہنچ جاتی ہے۔ چاہے وہ کمپیوٹر دنیا کے کسی بھی کونے میں رکھا ہوا ہو۔

۵ انگریزی اخبار پائنیر کے دفتر میں ۲۰ جنوری ۱۹۹۷ کو ایک میٹنگ ہوئی جس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس کا موضوع بحث تھا: کیا گاندھی موجودہ ہندستان میں کامیاب ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور موضوع پر ایک تقریر کی۔ یہ تقریر ان شاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۶ ۲۲ جنوری ۱۹۹۷ کو زی ٹی وی کی ایک ٹیم اسلامی مرکز میں آئی اور اس نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس مسئلہ سے تھا

کہ آزادی کے بعد ملک نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ ایک سوال یہ تھا کہ آزادی سے پہلے مختلف فرقوں میں اتحاد تھا اور اب نہیں ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ آزادی سے پہلے سارے ملک کے سامنے ایک نشانہ (انگریز کو ہٹاؤ) تھا۔ آزادی کے بعد اسی طرح قوم کے سامنے ایک مشترک اور مثبت نشانہ دینا تھا۔ مگر ہمارے لیڈر ذاتی سیاستوں میں ایسا پھنسے کہ وہ ملک کو کوئی ایسا نشانہ نہ دے سکے۔

۷ ٹی وی ادارہ کمیونی کیشن گروپ (نئی دہلی) نے ۲۴ جنوری ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک ٹی وی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ یہ انٹرویو تقریباً آدھ گھنٹہ کا تھا۔ اس کا موضوع تھا: اسلام اور مسلمان۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ زمانہ میں مختلف ملکوں میں اسلام کے نام پر جو پر تشدد تحریکیں چل رہی ہیں ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ لوگ اپنی ذاتی سیاست کے لئے اسلام کا نام استعمال کر رہے ہیں۔ ان کے غیر اسلامی ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اسلام کا گہرا علم رکھنے والے علماء کہیں بھی ان تحریکوں میں شریک نہیں۔

۸ مسٹر محمد عاشق رضا نے علی گڑھ کے سلیمان ہال میگزین کے لئے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ موجودہ زمانہ میں مسلم نوجوانوں کے کرنے کا کام صرف ایک ہے۔ وہ سیاست کو چھوڑیں اور اپنی ساری توجہ تعلیم کے حصول میں لگا دیں۔ یہ انٹرویو ۲۱ جنوری کو ریکارڈ کیا گیا۔

۹ الحکمت فاؤنڈیشن کی طرف سے کانسٹی ٹیوشن کلب، نئی دہلی میں ۲۵ جنوری ۱۹۹۷ء (۱۵ رمضان) کو ایک اجتماع ہوا۔ اس کا موضوع تھا: روزہ کی انسانی برکتیں۔ اس اجتماع میں تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان بہت بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور روزہ کے موضوع پر خطاب کیا۔ یہ تقریر انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۰ اسٹوڈینٹس اسلامک آرگنائزیشن کی طرف سے ۲۸ جنوری کو جواہر لال نہرو یونیورسٹی (نئی دہلی) میں ایک سمپوزیم ہوا۔ اس کا عنوان تعلیم اور اخلاقیات تھا۔ صدر اسلامی

مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ اور اس موضوع پر خطاب کیا۔

۱۱ یکم فروری ۱۹۹۷ کو گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ایک افطار پارٹی تھی۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور روزہ کے موضوع پر مختصر تقریر کی۔

۱۲ یکم فروری ۱۹۹۷ کو وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس (نئی دہلی) میں بدھسٹ تنظیم کا ایک بڑا جلسہ ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور سماجی تعمیر کے لئے اخلاق کی اہمیت پر تقریر کی۔

۱۳ دسمبر ۱۹۹۶ میں بھوپال میں تبلیغی جماعت کا سالانہ اجتماع ہوا۔ اس موقع پر الرسالہ اور اس کی مطبوعات کا اسٹال لگایا گیا۔ ڈاکٹر حمید اللہ ندوی نے اطلاع دی ہے کہ یہ اسٹال بہت کامیاب رہا۔ کافی لوگ اسٹال پر آئے اور مشن کا تعارف حاصل کیا۔

۱۴ حیدرآباد میں ۳۰ نومبر سے ۸ دسمبر ۱۹۹۶ تک کتابوں کی نمائش نیشنل بک فیئر ہوئی۔ اس موقع پر الرسالہ اور اس کی مطبوعات کا اسٹال لگایا گیا۔ مولانا اکبرالدین قاسمی صاحب نے اطلاع دی ہے کہ اسٹال بہت کامیاب رہا۔ کثیر تعداد میں لوگوں نے کتابیں حاصل کیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ دینی کتب کے اسٹال جو وہاں لگے تھے ان میں ہماری کارکردگی سب سے زیادہ رہی۔ پہلی مرتبہ ہم کو اس کا علم ہوا کہ آپ کی فکر سے متفق مسلمانوں کا ایک بڑا حلقہ ہے اور یہ لوگ جماعتی چھاپ سے آزاد دین کو بے آمیز انداز میں دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ سب کے سب تعلیم یافتہ اور باشعور لوگ ہیں۔ لوگوں نے جو غیر معمولی تاثرات بیان کئے ان میں سے ایک مسٹر قریشی کا تاثر تھا جنھوں نے کہا کہ اس بک فیئر میں جتنے بھی اسٹال ہیں ان میں ایک کتاب بھی ایسی نہیں جو آپ کی کسی کتاب کی مثال بن سکے۔ ایک اور صاحب نے کہا کہ مولانا جس عرق ریزی اور دلیل و برہان سے لکھتے ہیں اس کا کوئی جواب نہیں۔

۱۵ جناب سید شفیع الدین صاحب ایم اے (انگریزی) کتاب زندگی کا انگریزی ترجمہ کر رہے ہیں۔ یہ ترجمہ تقریباً مکمل ہو گیا ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی اس کو شائع کیا جائے گا۔ کتاب زندگی کے انگریزی ایڈیشن کے بعد ان شاء اللہ اس کا ہندی ایڈیشن بھی شائع کیا جائے گا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ستمبر ۱۹۹۸، شمارہ ۲۵۰

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near DESU,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

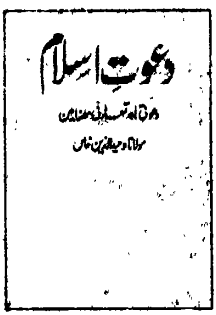
DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

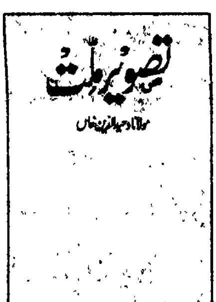
DISTRIBUTED IN USA BY
MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi

خصوصی شمارہ
فلسطین نمبر — پہلی قسط

نئی کتابیں





سفرنامہ فلسطین

روم کی مسیحی تنظیم (The Community of S. Egidio) کی طرف سے یروشلم میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ اس میں یہودیت، مسیحیت اور اسلام کے نمائندے اکٹھا ہوئے۔ اس کی دعوت پر فلسطین کا سفر ہوا۔ ذیل میں اس سفر کی روداد درج کی جاتی ہے۔

۲۶ ستمبر ۱۹۹۵ کی شام کو سفر پر روانگی ہوئی۔ ایرپورٹ کے راستہ میں مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا۔ یہاں کینٹونمنٹ ایریا میں ایک مسجد ہے۔ اس کے چاروں طرف دور تک سبزہ دکھائی دیتا ہے۔ گاڑی سڑک کے کنارے روک کر مسجد میں پہنچا۔ جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ امام صاحب نے سورہ الکوثر تلاوت کرتے ہوئے کہا: فصل لربك وانحر ان شانئك هو الابتر" دل سے دعا نکلی کہ خدایا، تیرے حکم کے مطابق میں نے نماز ادا کرلی۔ اب تو ان شانئك هو الابتر کے وعدہ کو میرے لیے پورا فرما۔ امام صاحب نے بتایا کہ اس مسجد کا نام الحبیبیہ مسجد ہے۔

اس مخصوص علاقہ میں ایک خوب صورت مسجد کو دیکھ کر خیال آیا کہ کچھ مسلم لیڈروں کی نادانی سے اس ملک کے مسلمانوں نے اگرچہ بہت کچھ کھو دیا ہے۔ مگر اب بھی یہاں ملک کے طول وعرض میں تقریباً چار لاکھ ایسی مسجدیں موجود ہیں جو اہل توحید کے لیے امید اور اعتماد کا نشان ہیں۔ فیضی کا یہ شعر مسلمانوں کے لیے مزید اضافہ کے ساتھ سچا ثابت ہوا ہے:

گفتہ گر شد زکفم شکر کہ ناگفتہ بجا است ازدو صد گنج یکے مشت گہر باختہ ام

دہلی کے انٹرنیشنل ایرپورٹ پر میں فلائٹ کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ کچھ لوگ خوش پوش اور خوش باش چہرہ کے ساتھ چلتے ہوئے نظر آئے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ یہ کہہ رہے ہوں کہ ہم کامیاب ہیں۔ ہماری جیب میں پیسے ہیں۔ ہم اپنی پسند کی کوئی بھی چیز دنیا کے بازار سے خرید سکتے ہیں۔ ہم اپنی راحت اور خوشی کی کوئی بھی قیمت ادا کر سکتے ہیں۔

میرے دل نے کہا کہ کیسا جھوٹا احساس کامیابی ہے جس میں لوگ جی رہے ہیں۔ کاش انھیں اصل حقیقت سے آگاہ کیا جا سکے۔ کاش وہ اس جھوٹے بھرم سے باہر نکل سکیں۔

میرے سفر کا راستہ یہ تھا —— دہلی، بمبئی، تل ابیب، دہلی۔ ایر انڈیا کی فلائٹ ۱۱

کے ذریعہ دہلی سے روانگی ہوئی۔ جہاز کا مقررہ وقت ۹ بجے شام تھا۔ مگر جہاز ڈیڑھ گھنٹہ کی تاخیر سے روانہ ہوا۔ دہلی سے بمبئی کی دوری ۱۱۰۰ کیلو میٹر ہے جو پونے دو گھنٹہ میں پوری ہوئی۔

دوران پرواز ایر انڈیا کی فلائٹ میگزین نمسکار (جولائی۔ اگست ۱۹۹۵) دیکھا۔ اس کے ایک صفحہ پر اوپر کے درجہ کے مسافروں سے کہا گیا تھا کہ فرسٹ کلاس اور ایگزیکیٹو کلاس کے مسافروں کے لیے دوران سفر میں بلا انقطاع تفریح (non-stop entertainment) کا انتظام کیا گیا ہے۔ میری سیٹ کے ساتھ ایرفون رکھا ہوا تھا مگر میں نے اس کو استعمال نہیں کیا۔

اس قسم کی تفریحات نے انسان سے یہ موقع چھین لیا ہے کہ وہ کائنات میں بکھری ہوئی خدا کی تجلیات پر غور کرے اور ان سے اپنی روح کے لیے ربانی غذا حاصل کرے۔ کائنات میں ہر طرف خدائی نغمے بلند ہو رہے ہیں مگر انسان نے "ہیڈ فون" لگا کر اپنے آپ کو اس سے محروم کر لیا ہے کہ وہ زیادہ اعلیٰ نغماتِ خداوندی کو سن سکے۔

بمبئی کے انٹرنیشنل ایرپورٹ پر اترا تو یہاں بہت زیادہ بھیڑ نظر آئی۔ مسلمان اور عرب بھی کافی تعداد میں تھے۔ ایرپورٹ پر لمبی مسافت طے کرکے ایل آل کے کاؤنٹر پر پہنچا۔ یہاں ایک خاتون نے کہا کہ میں ایل آل کی طرف سے سیکوریٹی چیک کے لیے ہوں۔ اور میں آپ سے سوالات کروں گی۔ یہ خاتون آدھا گھنٹہ تک مجھ سے طرح طرح کے بے معنی سوالات کرتی رہی ——— آپ کہاں سے آئے ہیں۔ کہاں جا رہے ہیں۔ آپ کا ٹکٹ کس نے خریدا ہے۔ آپ کو کسی نے کوئی گفٹ دیا ہے۔ آپ کے بیگ میں کیا کیا چیزیں ہیں۔ آپ کا یہ پاسپورٹ نیا ہے پھر پچھلا پاسپورٹ کہاں ہے۔ اس بیگ میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے۔ اگر سب سامان نکال دیا جائے تو بیگ کس کا ہے۔ آپ دہلی میں رہتے ہیں تو دہلی سے کیوں نہیں گئے، بمبئی سے کیوں جا رہے ہیں۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک وہ اس قسم کے سوالات کرتی رہی۔ میں پہلے تو معتدل انداز میں اس کا جواب دیتا رہا۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ اس کے سوالات ختم ہی نہیں ہو رہے ہیں تو مجھے غصہ آگیا۔ میں نے کہا:

Who are you foolish girl to ask me such silly questions.

میں نے کہا کہ میں تل ابیب نہیں جاؤں گا۔ میرے کاغذات مجھے لوٹا دو۔ میں اب دہلی واپس جا رہا ہوں۔ پھر میں نے کہا کہ تم اپنا نام بتاؤ۔ میں تمہاری کمپلینٹ کروں گا اور پھر تم کو سب کچھ معلوم

پوچھا گیا تھا۔ اب وہ گھبرا گئی اور نام بتانے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ آخر میں ایک مرد آیا۔ اس نے کہا کہ تم ان کو مت روکو اور اپنا نام لکھ کر دے دو۔ اس کے بعد اس نے اپنا نام سوزن جیکب (Ms Susan Jacob) لکھا۔ اور فوراً میرا بورڈنگ کارڈ مجھے دے دیا۔ اس کے بعد ایک اور یہودی مسٹر نیول مستری (Naville Mistry) کو میرے ساتھ کر دیا۔ وہ پہلے مجھے ریستوراں میں لے گیا۔ اس کے بعد مجھے گیٹ نمبر ۲ تک پہنچایا جہاں سے مجھے آگے کا جہاز لینا تھا۔

ہندستان میں ساڑھے چھ ہزار یہودی ہیں۔ ان میں سے ساڑھے پانچ ہزار بمبئی میں آباد ہیں۔ بمبئی کی سموئیل اسٹریٹ پر یہودیوں کی ایک عبادت گاہ (synagogue) ہے جو ۱۷۹۶ میں تعمیر کی گئی تھی۔ ہندستان میں یہودی دو ہزار سال پہلے آئے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے برصغیر ہند میں ان کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ بمبئی میں مجموعی طور پر یہودیوں کے نو سینیگاگ موجود ہیں۔ تاہم یہودیوں کی دلچسپی اپنے مذہب سے اتنی کم ہے کہ سموئیل اسٹریٹ کے دو سو سالہ قدیم سینیگاگ میں سنیچر (سبت) کے دن بمشکل دس یہودی اپنی ہفتہ وار عبادت کے لیے آتے ہیں (آفٹرنون، بمبئی، ۳ ستمبر ۱۹۹۵)

بمبئی کے ابوالبقا صاحب (عمر ۶۴ سال) نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۹۵ کی ایک ملاقات میں بتایا کہ بمبئی میں ایران سے آیا ہوا ایک یہودی تھا۔ اس کا نام مسٹر کلاٹی (A.A. Kelaty) تھا۔ اس کی تجارتی فرم کا نام یہ تھا:

Kelaty Trading Company

وہ شیپ کیسنگ (sheep casing) کی سپلائی کا کام کرتا تھا۔ ۱۹۷۱ میں اس کے ساتھ ابوالبقا صاحب کی پارٹنرشپ ہوئی۔ کئی سال تک اس کے ساتھ پارٹنرشپ بہت اچھی طرح چلتی رہی۔ اس کے بعد وہ بمبئی چھوڑ کر اسرائیل گیا اور وہاں سے پھر امریکہ چلا گیا۔

جب دونوں میں پارٹنرشپ کی بات ہوئی تو مسٹر کلاٹی نے کہا کہ دیکھئے، آپ مسلمان ہیں میں ایک یہودی ہوں۔ عرب اور اسرائیل کی نزاع میں میرا آپ کا اختلاف واضح ہے۔ اس کے باوجود ہمیں اپنی مشترک تجارت کو کامیابی کے ساتھ چلانا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ آپ کبھی عرب اور اسرائیل کے مسئلہ پر بات نہ کریں۔ چنانچہ دونوں اس پر قائم رہے۔ ان کی پارٹنرشپ آخر وقت تک کامیابی کے ساتھ چلتی رہی۔

اسرائیل ایرلائن کا نام ایل آل (El Al) ہے۔ اس کی فلائٹ نمبر ۸۲ (LY-082) کے ذریعہ بمبئی سے روانگی ہوئی۔ جہاز اپنے وقت پر صبح چار بجے روانہ ہوا۔ جب کہ کیلنڈر میں ۲۱ اگست کی تاریخ ہو چکی تھی۔ یہ سات گھنٹہ کی مسلسل پرواز تھی۔ راستہ میں بار بار نیند آتی رہی۔ اس طرح راستہ آسانی کے ساتھ طے ہو گیا۔

جہاز میں ایک شخص نے میرے چہرہ پر داڑھی اور سر پر پگڑی دیکھ کر کہا کہ کیا آپ سکھ ہیں:

Are you a Sikh

میں نے کہا کہ نہیں، میں مسلم ہوں۔ اگر وہ زیادہ غور کرتا تو ایسا سوال نہ کرتا۔ کیوں کہ میری داڑھی سکھوں کی داڑھی سے مختلف تھی۔ اسی طرح میری سفید پگڑی سوڈانیوں کی پگڑی سے مشابہ تھی نہ کہ سکھوں کی پگڑی سے۔ فرق یہ ہے کہ سوڈانیوں کی پگڑی کافی بڑی ہوتی ہے اور میری نسبتاً چھوٹی۔

جہاز کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو نیچے بادلوں کا منظر تھا جس کے اوپر جہاز رینگتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہی منظر ہر جہاز میں اور ہر ملک میں سفر کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ اسرائیل کے سفر میں جو منظر مشاہدہ میں آرہا ہے وہی غیر اسرائیل کے سفر میں بھی نظر آتا ہے۔ مگر انسان کا مزاج عجیب ہے۔ وہ مشابہتوں پر دھیان نہیں دیتا اور اختلافات کی طرف زیادہ دوڑتا ہے۔

جہاز اور اس کی سروس دوسرے ملکوں کے جہازوں کے مقابلہ میں معمولی تھی۔ حتی کہ ایر انڈیا کے مقابلہ میں بھی۔ رات کو مسافروں کی تفریح کے لیے جو فلم دکھائی گئی وہ زیادہ تر مار دھاڑ کی فلم تھی۔ کچھ نوجوان گولی مارتے ہوئے اور بم مارتے ہوئے دکھائے گئے جس سے ماحول میں تباہی پھیل گئی۔ میں نے سوچا کہ اسرائیل کی اقتصادیات جنگی اقتصادیات (war-based economy) ہے۔ یہاں کے تمام بہترین وسائل جنگی تیاریوں اور متشددانہ کارروائیوں پر صرف ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسرائیل سنگاپور اور جاپان کی طرح ترقی نہ کر سکا۔

صبح کو کھڑکی کھولی تو سورج کی سنہری روشنی کھڑکی کے راستہ سے اندر داخل ہوئی اور جہاز کے اندر ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ میں نے سوچا کہ سورج اسرائیلی جہاز اور غیر اسرائیلی جہاز میں فرق نہیں کرتا۔ اس کی نفع رسانی ہر ایک کے لیے یکساں طور پر جاری ہے۔ یہ خدائی اخلاقیات ہے جس کو گویا سورج کے ذریعہ معلوم و مشہود بنایا جا رہا ہے۔

بمبئی اور تل ابیب کے درمیان پرواز کرتے ہوئے ایک انگریزی میگزین ایکشن ایشیا (Action Asia) کا شمارہ اگست۔ستمبر ۱۹۹۵ دیکھا۔ یہ میگزین امریکہ سے شائع ہوتا ہے۔ یہ میگزین ہر اعتبار سے نہایت عمدہ تھا۔ امریکہ موجودہ زمانہ میں غیر امریکی ملکوں کا بھی تیمپین بنا ہوا ہے۔

اس میں ایک مضمون کامیاب لوگوں (Achievers) کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ نیپال کے کچھ دریاؤں میں پانی نہایت طغیانی کے ساتھ بہتا ہے۔ ان میں کشتی چلانا بہت جوکھم کا کام ہے۔ معذور لوگوں کی ایک ٹیم نے طے کیا کہ وہ ان دریاؤں میں عین طغیانی کے زمانہ میں کشتی چلائیں۔ انھوں نے سوچا کہ ہم جسم کے اعتبار سے معذور ہیں مگر ہمارا دماغ معذور نہیں:

We are disabled only in body, not in mind.

نومبر ۱۹۹۴ میں چھ معذور افراد نے ہر قسم کے ضروری سامان سے لیس ہو کر اپنی کشتی دریا میں ڈال دی۔ انھوں نے ہمت سے کام لے کر کامیابی حاصل کی اور یہ ثابت کیا کہ اعلیٰ کارکردگی کے لیے واحد رکاوٹ صرف وہ ہے جو آدمی خود اپنے اوپر ڈال لے:

A group of disabled adventurers took on the wild white water of Nepal, and proved the only limits to performance are those we impose on ourselves.

بمبئی کے تجربہ کی بنا پر مجھے اندیشہ تھا کہ شاید اسرائیلی ایرپورٹ پر پہنچ کر وہاں بھی اسی قسم کا سخت تر معاملہ پیش آئے۔ تاہم یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ وہاں ایرپورٹ پر کانفرنس کے منتظمین موجود ہوں گے اور وہ میرے لیے کافی ہو جائیں گے۔ مگر جہاز سے باہر آنے کے بعد وہاں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ چنانچہ میں دوسرے مسافروں کے ساتھ لائن میں لگ گیا۔ یہاں بھی اتفاق سے کھڑکی کے پیچھے ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر اس نے چند معمولی سوال پوچھ کر فوراً ہی میرے پاسپورٹ پر اسٹیمپ ڈال دی اور مجھے رخصت کر دیا۔

باہر آیا تو ڈاکٹر لیونارڈو مل گئے جو میری رہنمائی کے لیے یہاں آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ کچھ دیر کے لیے وی آئی پی لاؤنج میں بیٹھا۔ پھر بذریعہ کار یروشلم کے لیے روانگی ہوئی۔ یروشلم یہاں سے تقریباً چالیس کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ جس اسرائیلی ایرپورٹ پر ہمارا جہاز اترا اس کا نام بن گوریان انٹرنیشنل ایرپورٹ ہے وہ لُد (Lod) کے علاقہ میں واقع ہے۔ لُد کے

وسیع ایرپورٹ پر جہاں ہمارا جہاز اترا تھا عین اسی مقام پر سفید رنگ کا ایک اونچا مینار تھا۔ یہ مینار اپنی بلندی کی وجہ سے دور سے دکھائی دیتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ مسیح ابن مریم جب نازل ہوں گے تو وہ دجال کا پیچھا کریں گے۔ یہاں تک کہ وہ لُد کے دروازہ پر اس کو پکڑیں گے اور اس کو قتل کردیں گے (فیطلبہ حتی یدرکہ بباب لُدّ فیقتلہ) صحیح مسلم، سنن ابی داؤد وغیرہ

اس مقام کا قدیم نام لُد ہے۔ انگریزی میں اس کو لِڈّہ (Lydda) کہتے ہیں۔ حدیث میں جس مقام کا ذکر ہے، ممکن ہے کہ وہ یہی مقام ہو۔ اس کا نام بائبل میں کئی بار آیا ہے۔ اقوام متحدہ نے ۲۹ نومبر، ۱۹۴۷ کو فلسطین کی تقسیم کا جو رزولیوشن پاس کیا تھا اس کے تحت یہ مقام عربوں کو دیا گیا تھا۔ مگر ۱۲ جولائی ۱۹۴۸ کو اسرائیلی فوجوں نے حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلیا۔ اس وقت سے وہ اسرائیل کا ایک حصہ ہے۔ لد کا یہ انٹرنیشنل ایرپورٹ اسرائیل کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ ہے۔

دور آخر میں حضرت مسیح کے نزول کے بارہ میں بعض حضرات نے مختلف رائیں پیش کی ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں:

آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہیں   یا مجدد، جس میں ہوں فرزند مریم کے صفات

ایرپورٹ سے یروشلم کا سفر بذریعہ کار طے ہوا۔ سڑک نہایت عمدہ تھی۔ دونوں طرف درخت کی قطاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ مگر درختوں پر وہ ہریالی نہ تھی جو ایک ہفتہ پہلے ہریانہ کے سفر میں سڑک کے دونوں طرف میں نے دیکھی تھی۔ اس کی وجہ یہاں بارش کی کمی ہے۔ موسم کافی گرم تھا۔

راستہ میں سڑک کے دونوں طرف بستیاں دکھائی دیں۔ وہ سب کریم کلر کے پتھروں سے بنائی گئی تھیں۔ یروشلم میں داخل ہوا تو تمام عمارتیں اسی قسم کے پتھروں کی نظر آئیں۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ عمارتوں کو پتھر سے بنانے کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ اس کی قدیم وضع کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ تاہم تمام عمارتیں جدید فن تعمیر کے مطابق بنائی گئی تھیں اور خوب صورت تھیں۔

یروشلم کا عرب سیکٹر جغرافی اعتبار سے یہاں کے سب سے بہتر اور خوب صورت علاقہ میں واقع ہے۔

یروشلم کی سڑکوں پر چلتے ہوئے مختلف قسم کے مناظر سامنے آئے۔ دکانوں کے سائن بورڈ میں انگریزی اور عبرانی کے ساتھ عربی زبان کے اندراجات بھی دکھائی دیے۔ مثلاً ٹیلی فون کے ساتھ تلفون وغیرہ۔

سڑک سے گزرتے ہوئے ہم ایک علاقہ میں پہنچے تو میرے گائڈ نے کہا، یہ جیوش ایریا ہے۔ جیوش علاقہ واضح طور پر زیادہ صاف اور کشادہ تھا۔ ایک فرق یہ نظر آیا کہ عرب ایریا میں دکانوں کے آگے لوگ فٹ پاتھ پر کرسیاں بچھائے ہوئے باہر بیٹھے ہیں۔ تجارتی سامان بھی باہر رکھا ہوا تھا۔ مگر یہودی ایریا میں دکانوں کے سامنے نہ کرسی دکھائی دی نہ دکان کے باہر کوئی سامان رکھا ہوا نظر آیا۔ اسی طرح عرب ایریا میں دکانوں سے عربی گیت کی آواز سنائی دے رہی تھی جب کہ یہودی ایریا میں خاموشی کا منظر تھا۔

اسی خوب صورت عرب سیکٹر کے ایک سرسبز رقبہ میں وہ ہوٹل واقع ہے جس میں میرے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس ہوٹل کا نام (Hotel 7 Arches) ہے۔ اس کے کمرہ نمبر ۲۰۶ میں میرا قیام تھا۔ اس کمرہ کے اندر میں داخل ہوا تو ایسا محسوس ہوا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ کمرہ کے ایک طرف کی لمبی دیوار جو پوری کی پوری شیشہ کی تھی۔ اس کے اوپر حسب قاعدہ پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے پردہ ہٹایا تو سامنے کھلی دھوپ میں بیت المقدس کا سنہری رنگ کا گنبد چمک رہا تھا۔ وہ اس ہوٹل سے بہت قریب ہے اور میرے کمرہ کے شیشہ سے بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میرے دل کی عجیب کیفیت ہوئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے یروشلم میں میرے لیے بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کے عین پڑوس میں قیام کا انتظام فرمایا۔

میں دیر تک بیت المقدس اور اس کے اردگرد علاقہ کو دیکھتا رہا۔ یہی وہ علاقہ ہے جس کے بارے میں قرآن میں الذی بارکنا حولہ کہا گیا ہے۔ تاریخ مجسم ہو کر سامنے کھڑی ہوئی نظر آئی۔ خلیفہ ثانی عمر فاروق ؓ نے آکر اسی مقام پر نماز ادا کی تھی اور پھر وہاں مسجد بنائی گئی تھی۔ ۱۹۸۲ میں جب میں حج کو گیا تو اکثر بیت اللہ میں داخل ہو کر کعبہ کو دیکھتا رہتا تھا۔ یہاں میں خود اپنے ہوٹل کے کمرہ سے بیت المقدس کو دیکھ رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے یہ سعادت بھی مقدر فرمائی تھی۔

دہلی میں میری رہائش ایک ایسے مکان میں ہے جو گویا نئی دہلی اور پرانی دہلی کے درمیان

ہے۔ موجودہ ہوٹل کی نوعیت بھی یہی ہے۔ اس ہوٹل کے ایک طرف جدید یروشلم کی عمارتیں دکھائی دیتی ہیں۔ دوسری طرف قدیم یروشلم ہے جس میں عرب سیکٹر واقع ہے۔ ظہر کا وقت ہوا تو مختلف مسجدوں سے اذان کی آوازیں آنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ ہندستان کے شہروں کی طرح یہاں بھی عرب علاقہ کی مسجدوں میں اور خود بیت المقدس میں لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے ہیں اور پانچوں وقت ان سے اذان کی آوازیں فضا میں بلند ہوتی ہیں۔ مجھے تعجب انگیز خوشی ہوئی کہ پچاس سالہ یہود و عرب کے خونیں نزاعات کے باوجود آج بھی یہاں یہ مواقع موجود ہیں کہ مسلمان لاؤڈ اسپیکر پر پانچوں وقت اذان بلند کریں اور مسجدوں میں جمع ہو کر باقاعدہ نماز ادا کریں۔

فلسطین تین بڑے مذہب کا مقدس مقام سمجھا جاتا ہے۔ یہود کا اس لیے کہ ان کے خیال کے مطابق وہ براہ راست خدا کی طرف سے انھیں دیا گیا ہے۔ وہ ان کے لیے ارض موعود ہے (Promised Land) جس کا فیصلہ براہ راست خدا کی طرف سے کیا گیا۔ عیسائیوں کا اس لیے کہ حضرت مسیح یہاں پیدا ہوئے اور اسی سرزمین میں انھوں نے اپنے مشن کی تکمیل کی۔ مسلمانوں کا اس لیے کہ پیغمبر اسلامؐ معراج کے سفر میں یہاں آئے اور ہجرت کے بعد ایک سال سے زیادہ مدت تک بیت المقدس کو اپنی عبادت کا قبلہ بنایا۔

فلسطین کا اہم ترین شہر یروشلم ہے۔ اسی کے علاقہ میں تینوں مذاہب کے مقدس مقامات واقع ہیں۔ اس کی تاریخ ۱۴ ویں صدی قبل مسیح تک جاتی ہے جب کہ اس علاقہ پر مصریوں کی حکومت تھی۔ اس کے بعد بار بار اس علاقہ کی حکومت بدلتی رہی۔ اس زمانہ کی تقریباً تمام قومیں ایک کے بعد ایک اس پر حکومت کرتی رہیں یہاں تک کہ ایک ہزار قبل مسیح میں حضرت داؤد علیہ السلام کی حکومت فلسطین و شام کے علاقہ میں قائم ہوئی۔ جو مزید اضافہ کے ساتھ ان کے صاحب زادہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ تک جاری رہی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یروشلم کی توسیع کی اور قدیم یہودی عبادت خانہ (ہیکل) تعمیر کیا۔ جس کا اب صرف ایک حصہ دیوار گریہ (مغربی دیوار) کی صورت میں موجود ہے۔ حضرت سلیمان کے بعد مختلف حکمراں یروشلم کو اور معبد کو تباہ کرتے رہے یہاں تک کہ سلیمانی ہیکل ایک کھنڈر کی صورت میں باقی رہ گیا۔

۶۳۸ء میں جب کہ اس علاقہ میں رومیوں کی حکومت تھی، عربوں نے رومیوں کو شکست

دے کر فلسطین پر اپنا قبضہ قائم کیا۔ خلیفہ دوم عمر فاروق فاتحانہ طور پر مدینے سے یروشلم پہنچے۔ ان کے اس سفر کی یادگار مسجد عمر کی شکل میں آج بھی یروشلم میں کلیسۂ قیامہ کے پاس موجود ہے۔ بنو امیہ کی سلطنت کے زمانہ میں خلیفہ عبد الملک بن مروان نے مقدس صخرہ کے اوپر ایک گنبد تعمیر کیا جو بیت المقدس (قبۃ الصخرۃ) کے نام سے مشہور ہے۔

خلیفہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اہل فلسطین کے ساتھ نہایت رواداری کا معاملہ فرمایا۔ بحیثیت فاتح وہاں انھوں نے جو تقریر کی تھی اس میں یہ اعلان کیا کہ اے اہل فلسطین تم کو بھی وہی تمام حقوق حاصل ہوں گے جو اسلامی قانون کے تحت مسلمانوں کو حاصل ہیں (یا اھل ایلیاء لکم ما لنا وعلیکم ما علینا)

مسلم سلطنتوں کے زمانہ میں خلافت راشدہ کے بعد بھی رواداری کی یہی پالیسی جاری رہی۔ مورخین یہ اعتراف کرتے ہیں کہ بنو امیہ اور بنو عباس دونوں نے یہودی اور عیسائی باشندوں کے حق میں فراخدلی کی پالیسی اختیار کی :

Both the Umayyads and their successors, the Abbasids, pursued a liberal policy towards Christians and Jews. (10:140)

عباسی سلطنت کے بعد یہ پالیسی پوری طرح باقی نہ رہ سکی۔ کہا جاتا ہے کہ مصر کے فاطمی خلیفہ نے ۱۰۱۵ میں عیسائیوں کے مقدس مقامات کو توڑنے کی دھمکی دی۔

عیسائی اپنی سابق روایت کے مطابق مختلف مقامات سے جوق در جوق اپنے مقدس مقامات کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ اس سلسلہ میں مقامی طور پر غالباً کچھ ناخوش گوار واقعات ہوئے۔ سلجوقی سلطنت کے زمانہ میں ۱۰۷۱ میں عیسائی زائرین کے راستے بند کر دیے گئے۔ اس سے عیسائیوں کا مذہبی طبقہ بہت زیادہ برانگیختہ ہو گیا۔ اس نے یورپ کے مسیحی حکمرانوں کو غیرت دلائی۔ اس کے نتیجہ میں قدس پر مسیحی قبضہ بحال کرنے کے لیے وہ طویل جنگ شروع ہوئی جو کروسیڈس کے نام سے مشہور ہے۔

ان صلیبی جنگوں کے نتیجہ میں مسیحی حکمراں عارضی طور پر یروشلم پر قابض ہو گئے۔ ان کا یہ قبضہ ۱۰۹۹ سے ۱۱۸۷ تک باقی رہا۔ اس کے بعد صلاح الدین ایوبی نے ایک فیصلہ کن جنگ

میں عیسائی قبضہ کو ختم کر کے دوبارہ فلسطین پر مسلم سلطنت قائم کی۔
اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفہ کے لیے چند انقلابات پیش آئے اور آخر میں ۱۵۱۷ میں عثمانی سلطان سلیم اول نے یہاں ترک حکومت قائم کی جو مسلسل چار سو سال تک باقی رہی۔ ۱۹۱۷ میں برطانیہ نے لیگ مینڈیٹ کے تحت یروشلم پر سیاسی بالادستی حاصل کرلی۔ ۱۹۴۸ سے فلسطین کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد یروشلم کا نیا دور آیا تو ابتدا میں شہر ۱۹۴۸ سے ۱۹۶۷ تک دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک کو اردنی سیکٹر اور دوسرے کو اسرائیلی سیکٹر کہا جاتا تھا۔ جون ۱۹۶۷ کی چھ روزہ جنگ میں اسرائیل نے بقیہ نصف پر قبضہ کر کے پورے یروشلم پر اپنا کنٹرول قائم کرلیا۔ مصر کے سابق حکمراں جمال عبدالناصر، جو الاخوان المسلمون کی مکمل تائید سے حکومت میں آئے تھے، انھوں نے احمقانہ جوش کے تحت جولائی ۱۹۵۶ میں نہر سوئز کے پٹہ کو قبل از وقت منسوخ کر دیا اور اس کو سرکاری قبضہ میں لینے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد حالات میں جو زبردست تبدیلی ہوئی اسی کا نتیجہ تھا کہ یروشلم پورا کا پورا اسرائیلی قبضہ میں چلا گیا۔ بیشتر انسانی تباہیاں ہمیشہ نادانی کے اقدام کے نتیجہ میں پیش آتی ہیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، الرسالہ نومبر ۱۹۹۲، صفحہ ۲۸)

یروشلم میں پہلی عبادت گاہ (ہیکل) حضرت سلیمانؑ نے اپنی بادشاہت کے زمانہ میں بنائی۔ یہ ہیکل ۹۵۷ ق م میں بن کر تیار ہوا۔ اس عبادت گاہ کو بابل (عراق) کے حکمراں بنوخذ نصر (Nebuchadrezzar II) نے لوٹا اور ۵۸۶ ق م میں اس کو مکمل طور پر ڈھادیا۔ ایک عرصہ کے بعد یہودیوں نے یہ عبادت گاہ دوبارہ بنائی۔ اس دوسری عبادت گاہ (ہیکل) کو بھی رومیوں نے ۷۰ء میں ڈھا کر کھنڈر کر دیا۔ اس عمارت کی صرف ایک دیوار باقی رہ گئی ہے جس کو دیوار گریہ (Wailing Wall) یا مغربی دیوار کہا جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یروشلم کی وہ کون سی "مسجد اقصیٰ" تھی جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسراء اور معراج کے وقت ۶۲۲ء میں تمام انبیاء کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔ تاریخی شہادت کے مطابق، اس وقت وہاں صرف کھنڈر تھا، اس وقت وہاں کوئی "مسجد" موجود نہ تھی۔ مگر صحیح بخاری کی روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں جب اپنے اس واقعہ کا اعلان فرمایا

تو قریش نے اس پر یقین نہیں کیا۔ اس وقت مکہ میں کچھ ایسے افراد تھے جنھوں نے یروشلم کا سفر کیا تھا اور مسجد کو دیکھا تھا۔ انھوں نے کہا کیا آپ مسجد کا نقشہ بتا سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے نقشہ بتانا شروع کیا تو اس کی بعض چیزوں کے بارے میں آپ مشتبہ ہو گئے۔ اسی وقت مسجد لا کر آپ کے سامنے رکھ دی گئی۔ اور آپ نے دیکھ کر اس کا پورا نقشہ بیان کر دیا۔ قریش نے کہا کہ جہاں تک بیان کرنے کا تعلق ہے انھوں نے ٹھیک بیان کیا (اما النعت فقد اصاب) فتح الباری ۸/۲۰۴

بخاری کی روایت کے مطابق، ۶۲۲ء میں وہاں باقاعدہ "مسجد" کی عمارت ہونا چاہیے۔ مگر موجودہ تاریخی شہادتوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ یہ مسئلہ اس قابل ہے کہ از سر نو اس کی تحقیق کی جائے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اہل کتاب کی روایت کے مطابق، حضرت یعقوب علیہ السلام جن کو یہودی اسرائیل کہتے ہیں، انھوں نے مسجد اقصیٰ کی بنا ڈالی، یہ فلسطین (ایلیا) کی مسجد ہے جس کو بیت المقدس کہا جاتا ہے (البدایہ والنھایہ ۱/۱۹۲)

اصل یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے جس مقام پر یہودی معبد کی بنیاد رکھی تھی، اسی مقام پر بعد کو ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی گئی۔ اس ہیکل کو ایک سے زیادہ بار تباہ کر دیا گیا۔ معراج کے وقت یہاں زیادہ تر کھنڈر تھا۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے لکھا ہے کہ قرآن میں المسجد الاقصیٰ سے مراد جگہ ہے نہ کہ کوئی عمارت :

(Masjid) properly denotes the site, not the building of a mosque. (3/2)

مسجد اقصیٰ بظاہر ہیکل سلیمانی کے کھنڈر پر بنائی گئی۔ اور بیت المقدس کی تعمیر صخرہ (چٹان) کے اوپر ہوئی۔ یہاں دیکھ کر معلوم ہوا کہ مسجد اقصیٰ ایک بہت بڑے ہال کی مانند ہے اور وہ پورے معنوں میں ایک مسجد ہے۔ مگر بیت المقدس معروف معنوں میں کوئی مسجد نہیں ہے۔ اس کی تعمیر مقبرہ جیسی ہے۔ جس طرح ہمارے یہاں قبر کے اوپر گنبد بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح صخرہ کے اوپر گنبد بنایا گیا ہے۔ اس کے اندر باجماعت نماز نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے یہاں کسی موقع پر نماز ہوتی ہے تو قبہ کے باہر میدان میں صفیں قائم کی جاتی ہیں۔

صخرہ کے متعلق یہود کی روایت ہے کہ یہاں ان کے ستر نبی قتل کیے گئے۔ ان میں حضرت یحییٰ بن زکریا

بھی تھے۔ یہود کا عقیدہ ہے کہ حضرت ابراھیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی بھی اسی صخرہ پر کی تھی۔ ان کے نزدیک یہ حضرت اسحاق تھے۔ کیوں کہ وہ لوگ حضرت اسحاق علیہ السلام ہی کو ذبیح مانتے ہیں (البدایہ والنہایہ ۵۵/۲)

کویت کے میگزین المجتمع (یکم اگست ۱۹۹۰) میں سعودیہ کے سعود محمد الرمحی نے لکھا تھا کہ ۸۰ فیصد مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ قبۃ الصخرۃ ہی المسجد الاقصی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اصل تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔ غالباً ۹۰ فی صد لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اور یہ غلط فہمی بہت پہلے سے چلی آرہی ہے۔

ابن ہشام نے ابن اسحاق سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے جایا گیا اور وہ بیت المقدس ہے (ثم أسری برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی وھو بیت المقدس) سیرۃ ابن ہشام ۲/۲

ابن کثیر نے اپنی تفسیر قرآن میں لکھا ہے کہ: الی المسجد الاقصی وھو بیت المقدس (تفسیر ابن کثیر ۲/۳) یہی بات قرطبی نے بھی لکھی ہے کہ: أسری بہ من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی وھو بیت المقدس (۲۱۰/۱۰)

اسی طرح مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنی تفسیر قرآن میں لکھا ہے کہ ——— یعنی جس ملک میں مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) واقع ہے۔ (صفحہ ۳۶۵) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے: مسجد حرام یعنی بیت اللہ سے مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس تک (تفہیم القرآن ۲/۵۸۸)

مسجد اقصیٰ کا مسئلہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے نزدیک ان کا سب سے زیادہ بڑا مسئلہ ہے اس کے بارے میں ساری دنیا کے مسلم پریس میں مسلسل مضامین اور رپورٹوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ کی اصل نوعیت کے بارے میں لوگوں کی معلومات بے حد کم ہیں۔ ہر ایک بس جذباتی انداز کی تحریریں شائع کر رہا ہے۔ مثلاً مسجد اقصیٰ کی بازیابی پر ایک مضمون چھپے گا اور اس کے ساتھ جو تصویر شامل کی جائے گی وہ بیت المقدس کی ہوگی۔ حالاں کہ دونوں واضح طور پر دو الگ الگ عمارتیں ہیں اور دونوں کی نوعیت ایک دوسرے سے بالکل الگ ہے۔ مثلاً بمبئی کے ایک ماہنامہ میں اس مسئلہ پر ایک نہایت جذباتی


البلاغ

ر یہ شائع ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ مسجد اقصیٰ کی تصویر ہے اور اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا ہے "مسجد اقصیٰ کو یہودی تولیت سے آزاد کراؤ" (تصویر اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

اصل مضمون جو نہایت جذباتی انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس کے چند جملے یہ ہیں :

یہاں تک مسجد اقصیٰ کا تعلق ہے اس پر پورے عالم اسلام کا حق ہے اور اس پر یہودیوں کے اصبانہ تسلط کو عالم اسلام کبھی برداشت نہیں کر سکتا اور جب تک یہودی اس پر قابض ہیں دنیا کا یک ایک مسلمان اس کی آزادی کے لیے جہاد کرتا رہے گا اور عالم اسلام میں اس وقت تک امن و ین کا ماحول پیدا نہیں ہوگا جب تک مسلمانوں کا پہلا قبلہ اور پیغمبر اسلام کے معراج کی پہلی منزل ہودیوں سے آزاد نہیں ہو جاتی۔ اس لیے مسجد اقصیٰ اور عالم اسلام کے دوسرے مقامات مقدس ی بابت یہودیوں سے ساز باز اور ان سے سیاسی سودے بازی کو مسلمان کبھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ ور اس سلسلہ میں مصری علماء اور شیخ الازہر کے کسی فتوے کو دنیا کے مسلمان تسلیم نہیں کر سکتے۔ سجد اقصیٰ مسلمانوں کی امانت ہے اس پر تولیت کا حق صرف مسلمانوں کا ہے (ماہنامہ البلاغ، سمبر ۱۹۹۵)

اس طرح کے مضامین پڑھ کر اکثر میری زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں ــــــ اس سے یادہ عجیب بات شاید اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ مسجد اقصیٰ کو جانتے بھی نہیں اور اس کے حقوق کے محافظ بنے ہوئے ہیں۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعد کے دور میں مسلمانوں نے "قبلہ اول" کے لفظ کو جذباتی طور پر تو بہت استعمال کیا مگر مسجد اقصیٰ کی زیارت کا رواج ان کے درمیان نہیں پڑا۔ آمد و رفت کی اس کمی کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگوں کے ذہن میں واضح تصویر نہیں بنی کہ بیت المقدس کیا ہے اور سجد اقصیٰ کیا ہے۔

یہاں قریب سے دیکھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس کا ایک سبب غالباً دونوں کا جغرافی فرق بھی ہے۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ بیت المقدس (قبۃ الصخرۃ) ایک اونچی چٹان پر ہے۔ اس کے مقابلہ میں مسجد اقصیٰ اس سے الگ نسبتاً نشیبی زمین پر ہے۔ اس بنا پر جب کوئی فوٹو لینے والا فوٹو لیتا ہے تو دونوں عمارتیں بیک وقت فوکس میں نہیں آتیں۔ اِلّا یہ کہ کسی بڑے کیمرے

کے ذریعہ کافی دور سے اس کا فوکس لیا جائے۔ تاہم دور سے فوکس لینے کی شکل میں بھی یہ صورت بدستور قائم رہتی ہے کہ اسی جغرافی فرق کی بنا پر تصویر میں بیت المقدس (قبۃ الصخرۃ) نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے اور مسجد اقصیٰ اس کے پیچھے صرف غیر نمایاں انداز میں نظر آتی ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہجرت کے بعد جس زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنایا، اس وقت وہاں موجودہ گنبد نہ تھا۔ اس وقت صرف سنگ خارا کی ایک چوکور چٹان تھی۔ یہی چٹان یہودیوں کا قبلہ بھی تھا اور عارضی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بھی۔ گویا قبلۂ یہود یا قبلۂ اول دونوں ہی "صخرہ" ہیں نہ کہ وہ "سنہرا گنبد" جس کو بیت المقدس کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ گنبد اس وقت سرے سے موجود ہی نہ تھا۔

ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (م ۳۱۰ ھ) نے اپنی تفسیر قرآن میں قبلۂ اول کے مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ خلاصہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے ہی مدینہ کے مسلمان (انصار) بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۲۲ء میں مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو آپ نے بھی اسی کے مطابق عمل فرمایا۔ اس کی وجہ اہل کتاب کی تالیف قلب تھی (فاختار بیت المقدس لکی یتألف اھل الکتاب)

بیت المقدس کتنے عرصہ تک قبلہ رہا، اس میں اختلاف ہے۔ بعض روایتوں کے مطابق، سولہ ماہ، بعض کے مطابق سترہ ماہ اور بعض کے مطابق انیس ماہ۔ غالباً اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ جن راویوں نے انصار کے زمانہ کو شامل کر کے بتایا انھوں نے زیادہ مدت بتائی، اور جنھوں نے صرف رسول اللہؐ کی مدت کو بتانا چاہا انھوں نے کم مدت بیان کی۔

اس وقت بیت المقدس کی موجودہ عمارت (قبہ) موجود نہ تھی۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دراصل صخرہ (چٹان) کو قبلہ بنایا تھا جس کو یہود مقدس سمجھتے تھے اور وہی یہود کا قبلہ تھا (کان یستقبل صخرۃ بیت المقدس وھی قبلۃ الیھود) تفسیر طبری ۲/۲-۵

ابن کثیر نے حضرت عمر کے سفر کے بارے میں ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ مدینہ سے گھوڑے پر بیٹھ کر روانہ ہوئے تاکہ سفر تیزی سے طے ہو سکے۔ اور مدینہ میں حضرت علیؓ کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ اس طرح چلتے ہوئے وہ جابیہ (سرحد فلسطین) پر پہنچے (البدایہ والنھایہ ۷/۵۶)

دوسری روایت کے مطابق، آپ کا سفر اونٹ کے ذریعہ طے ہوا۔ اسی طرح اس میں بھی اختلاف ہے کہ سفر کس طرح طے ہوا۔ ایک روایت کے مطابق، آپ اور آپ کا غلام دونوں اونٹ پر باری باری بیٹھتے تھے۔ ایک اور روایت کے مطابق، تین باری تھی۔ ایک بار آپ اور ایک بار غلام سوار ہوتا تھا اور تیسری بار اونٹ کو خالی رکھا جاتا تھا تاکہ وہ آرام کرلے۔

خلیفہ ثانی عمر فاروق ۶۳۸ء میں فاتحانہ طور پر یروشلم میں داخل ہوئے تھے۔ اس کے بعد سے فلسطین مسلسل مسلمانوں کے قبضہ میں رہا۔ بارھویں صدی عیسوی میں مسیحیوں نے یروشلم پر قبضہ کرلیا جو ۸۸ سال تک جاری رہا۔ اس قبضہ کو صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۸۷ء میں ختم کیا۔ ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ بظاہر صلاح الدین ایوبی نے یہ کامیابی صرف ایک دن (۴ جولائی ۱۱۸۷) کی جنگ حطین میں حاصل کی تھی۔ مگر یہ کامیابی جوش کا نہیں بلکہ تیاری کا نتیجہ تھی۔ اس ایک دن کی فتح کے لیے صلاح الدین نے کئی سال تک غیر معمولی تیاریاں کی تھیں، یہاں تک کہ اس کی فوجی طاقت لاطینی صلیبیوں کے برابر ہوگئی۔

مورخین نے اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں نے جب یروشلم کو فرینک (Franks) کے قبضہ سے واپس لیا تو انھوں نے وہاں کے باشندوں سے انتہائی شرافت کا معاملہ کیا۔ مسیحیوں نے جب یروشلم پر قبضہ کیا تو انھوں نے وحشیانہ طور پر وہاں کے باشندوں کو قتل کیا تھا اور آزادانہ طور پر لوگوں کا خون بہایا تھا۔ اس کے بالکل برعکس مسلمانوں کی دوبارہ فتح ممتاز طور پر شائستگی کا انداز لیے ہوئے تھی۔ صلاح الدین اور اس کے فوجیوں نے لوگوں سے نہایت فیاضانہ سلوک کیا:

In stark contrast to the city's conquest by the Christians, when blood flowed freely during the barbaric slaughter of its inhabitants, the Muslim reconquest was marked by the civilized good faith and courteous behaviour of Saladin and his troops. (16/177)

صلاح الدین ایوبی نے ۵۸۳ھ میں یروشلم (قدس) کو فتح کیا تھا۔ اس وقت یہ ایک حصار بند شہر تھا اور نہایت مشکل کے ساتھ اس کی فتح ممکن ہوسکی۔ فتح کے بعد جب مسلمان اندر داخل ہوئے تو مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ میں کثرت سے صلیب اور تماثیل وغیرہ رکھی ہوئی تھیں۔ حتی کہ کہا جاتا ہے کہ وہاں خنزیر بھی موجود تھے۔ مسلمانوں نے ان مقدس مقامات کی پوری صفائی کی اور اس کو پھر

سے پاک کر کے اس کو حمایت کے قابل بنایا (البدایہ والنہایہ ۱۲/۳۲۲)

جاک بیرک ایک فرانسیسی تھا۔ وہ ۱۹۱۰ میں الجزائر میں پیدا ہوا۔ اس وقت الجزائر فرانس کا مقبوضہ تھا۔ جاک بیرک کے فرانسیسی والدین ایک استعماری ادارہ میں کام کرنے کے لیے الجزائر گئے تھے، جولائی ۱۹۹۵ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

جاک بیرک نے الجزائر میں عربی زبان سیکھی اور اس میں کمال حاصل کر لیا۔ وہ اسلامی موضوعات پر ایک عالم کی طرح کلام کرتا تھا۔ اسلامی لٹریچر کے مطالعہ سے وہ اسلام سے غیر معمولی طور پر متاثر ہو گیا۔ حتی کہ وہ اسلام کی حمایت و مدافعت کرنے لگا۔ اس کی کئی کتابیں اس موضوع پر ہیں۔ مثلاً العرب امس والیوم (۱۹۶۰)۔ اس نے قرآن کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ بھی کیا جو ایک عمدہ ترجمہ شمار کیا جاتا ہے۔ وغیرہ۔

ایک عرب نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا: احب جان بیرك العربية والاسلام حتى لتحسبه عربيا مسلما۔ وقد خسر العلم بموته خسارة يصعب ان تعوض۔ وخسر العرب والمسلمون صديقا من طراز نادر۔

میں نے کہا کہ استعماری دور میں اس طرح کے بہت سے یورپی پیدا ہوئے جو یا تو اسلام دوست بن گئے یا انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس میں ہمارے لیے ایک بہت بڑا سبق چھپا ہوا ہے۔ وہ یہ کہ جب "استعمار" جیسا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ کوئی غیر قوم آپ کے اوپر سیاسی غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔ مگر اس کا دوسرا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس عمل کے دوران اہل اسلام اور غیر اہل اسلام کے درمیان اختلاط پیش آتا ہے۔ بالفاظ دیگر مدعو خود چل کر داعی کے پاس آجاتا ہے۔ لوگ عام طور پر پہلے رخ کو دیکھتے ہیں، وہ اس واقعہ کا دوسرا پہلو نہیں دیکھتے، اس لیے وہ اس کو استعمال بھی نہیں کر پاتے۔ اگر اس دوسرے پہلو کو منظم طور پر استعمال کیا جائے تو جاک بیرک جیسے ہزاروں لوگ پیدا ہو جائیں۔ حتی کہ خود اسرائیلیوں میں بھی، جن کو اب تک آپ صرف دشمن اور مخالف اسلام کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔

یروشلم میں میں نے مختلف لوگوں سے پوچھا کہ کہا جاتا ہے کہ یہودی موجودہ مسجد اقصیٰ کو ڈھا کر وہاں دوبارہ ہیکل سلیمانی بنانا چاہتے ہیں۔ مگر لوگوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ یہ ایک بے وقوفی کی بات ہوگی کہ ہزار سال کی تاریخ کو رد کرکے نئی تاریخ لکھنے کی کوشش کی جائے۔

ایک عیسائی انجینیر جو روم میں رہتے ہیں اور بار بار یروشلم آتے رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے کبھی نہیں سنا کہ یہودیوں میں کوئی سنجیدہ خواہش اس بات کی ہے کہ ہیکل سلیمانی کو دوبارہ اسی جگہ بنایا جائے۔ بعض انتہا پسند افراد ایسا کہتے ہوں گے مگر نہ وہ یہودی قوم کی بات ہے اور نہ حکومت اسرائیل کی بات :

I have never heard that there is a serious intention to rebuild the temple of Israel on the same area where it was before its last destruction. (Antonello Paba)

مجھے جس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا اس کا انگریزی نام (Hotel 7-arches) ہے، اور اس کا عربی نام فندق الاقواس ہے۔ جائے وقوع کے اعتبار سے یہ یروشلم کا نمبر ایک ہوٹل ہے۔ اس کے چاروں طرف قدرتی مناظر اور تاریخی نشانیوں کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔

ہوٹل میں یہودی اور مسلمان بالکل معتدل فضا میں ملتے ہوئے نظر آئے۔ اکثر صباح الخیر، السلام علیکم، حیاک اللہ جیسے عربی الفاظ سنائی دیتے ہیں۔ ہوٹل کی دیواروں پر شیشہ کے فریم میں جو خوب صورت تصویریں لگی ہوئی ہیں، ان میں متعدد خالص عربوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً ایک بڑے فریم میں بہت سی رنگین تصویریں ہیں۔ اس کے اوپر عربی میں لکھا ہوا ہے : لمحة عن الحياة البدوية۔ اس میں تصویروں کے ذریعہ بدوی علاقہ کے فلسطینیوں کی زندگی کے مختلف مناظر دکھائے گئے ہیں۔ اس طرح ایک اور فریم دیوار پر نظر سے گزرا۔ اس کے اوپر لکھا ہوا تھا : التراث الفلسطيني۔ اس میں فلسطینیوں کی بعض تاریخی چیزیں خوب صورت تصویروں کے ذریعہ دکھائی گئی تھیں۔

۲۷ اگست کو دوپہر بعد میں اپنے ساتھی کے ہمراہ نکلا۔ گاڑی ہم نے ایک جگہ پارک کردی اور عرب سیکٹر کے بہت بڑے علاقہ میں پیدل گھومتے رہے۔ گھنٹوں اِدھر سے اُدھر گئے۔ فلسطینی بچے، نوجوان اور بڑی عمر کے لوگ بالکل معتدل انداز میں اپنا کام کرتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے چہروں پر غم یا خوف وہراس نظر نہیں آیا۔ پورے علاقہ میں صرف ایک جگہ تین اسرائیلی فوجی

گھیرے ہوئے بیٹھے تھے۔ وہ آپس میں غالباً عبرانی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔

۲۷ اگست کی صبح کو میں نیچے اترا تو ریسپشن ڈسک کے پیچھے کھڑے ہوئے خوش پوش نوجوان نے کہا کہ آج آپ کیسے ہیں (How are you today) میں نے کہا کہ فائن۔ اس نے دوبارہ کہا: الحمد للہ۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ یہ ہوٹل فلسطینی عربوں کا ہے۔ چنانچہ ہوٹل کا عملہ بیشتر عرب افراد پر مشتمل ہے۔ ایک نئی بات یہ نظر آئی کہ یہاں ہوٹل کی خدمات میں عام قاعدہ کے مطابق لڑکیاں نہیں ہیں بلکہ سارا کام مرد کرتے ہیں۔ کسی بھی شعبہ میں مجھے کوئی خاتون نظر نہیں آئی۔

۲۷ اگست کی شام کو چار بجے مسٹر اینٹی نیو (Mr. Antonello Paba) کے ساتھ مقاماتِ مقدسہ دیکھنے کے لیے نکلا۔ کئی کیلو میٹر کے دائرہ میں پھیلا ہوا ایک وسیع احاطہ ہے جس کے اندر یہودیوں اور عیسائیوں اور مسلمانوں کے مقدس مقامات واقع ہیں۔ راستہ میں ہر جگہ سیاح مردوں اور عورتوں کی بھیڑ نظر آئی۔

طویل راستہ طے کرنے کے بعد ہم لوگ مسجد اقصیٰ پہنچے۔ یہ ایک ہی بڑا احاطہ ہے جس کے اندر ایک طرف مسجد اقصیٰ ہے اور دوسری طرف سو قدم کی دوری پر بیت المقدس (قبۃ الصخرہ) واقع ہے۔ سب سے پہلے میں مسجد اقصیٰ میں داخل ہوا۔ یہ بہت بڑی اور بلند و بالا مسجد ہے۔ اس کا اندرونی حصہ ایک طرف سے ۱۱۰ قدم اور دوسری طرف ۸۵ قدم ہے۔ یہاں میں نے دو رکعت نماز پڑھی اور دعائیں کیں، کئی آدمی بلند آواز سے قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے نظر آئے۔

اس کے بعد بیت المقدس میں گیا۔ اس کو قبۃ الصخرہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے نیچے درمیان میں پتھر کی ایک چٹان ہے۔ یہ چٹان تقریباً کمر تک اونچی ہے۔ چٹان کے چاروں طرف لکڑی کا کٹہرا بنا دیا گیا ہے۔ کٹہرا اور گنبد کی دیوار کے درمیان گول دائرہ میں ایک گیلری ہے۔ میں نے اس گیلری میں چل کر دیکھا تو وہ دو سو قدم تھی۔ اس گیلری میں میں نے دو رکعت نماز ادا کی اور دعائیں مانگیں۔ قبۃ الصخرہ مسجد نہیں ہے بلکہ چٹان کے اوپر قبہ ہے، اور اس کے باہر کشادہ صحن۔

اس کے بعد میں مسجد عمر بن الخطاب گیا۔ یہ مسجد چھوٹی ہے۔ ۲۵ قدم چوڑی اور ۲۵ قدم لمبی۔ اس کی چھت بھی زیادہ اونچی نہیں۔ یہاں بھی میں نے دو رکعت نماز ادا کی۔ مسجد کے بیرونی حصہ میں جدید طرز کے وضو خانے اور غسل خانے بنے ہوئے ہیں۔ مسجد کے پاس ہی

کنیسۃ القیامہ (Church of Resurrection) ہے جو کافی بڑا ہے۔

اس وقت مجھ پر ایک تحیر کی کیفیت طاری تھی۔ ان مقدس مقامات کی زیارت اور ان میں نماز ادا کرنا مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ کیوں کہ زندگی میں کبھی میں یہ سوچ بھی نہیں سکا تھا کہ میں قدس جاؤں گا اور وہاں ایسی جگہ سجدہ کروں گا جہاں پیغمبروں نے اور اصحاب پیغمبر نے سجدے کیے ہیں۔

۲۸ اگست کو صبح کا وقت ہے۔ سورج کی چمک دار روشنی باہر کے پورے ماحول کو منور کیے ہوئے ہے۔ میرے کمرہ کے "قد دیوار" شیشوں کے باہر بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی عمارتیں دکھائی دے رہی ہیں۔

مسجد اقصیٰ کے اندر آپ داخل ہوں تو وہ نہایت عظیم اور پر ہیبت دکھائی دیتی ہے۔ میں نے اتنی پر ہیبت مسجد کوئی اور نہیں دیکھی۔ بیت المقدس کا نقشہ دوسرا ہے۔ اس کا طرز مقبرہ جیسا ہے۔ یعنی درمیان میں بڑا سا پتھر، اس کے اوپر اونچا گنبد، اور پتھر کے گرد گول دائرہ میں ایک گیلری۔

کمرہ سے ان تاریخی مناظر کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں قرآن کی یہ آیت آئی: سُبحانَ الّذی اسریٰ بِعبدہ لیلاً مِن المسجدِ الحَرام الی المسجدِ الاقصیٰ الّذی بارکنا حولَہ لِنُرِیَہ مِن آیاتنا (الاسراء) ان قرآنی الفاظ پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ بارکنا حولہ سے مراد غالباً اِس مقام کا یہ امتیازی پہلو ہے کہ یہاں کی سرزمین سے بہت سے جلیل القدر انبیاء کی تاریخ وابستہ ہے۔ گویا کہ یہ سرزمین نبوت ہے۔ اور لِنُرِیَہ من آیاتنا سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو چشم زدن میں مکہ سے ۱۰۰۰ کیلومیٹر دور یروشلم میں لاکر اس نئے آنے والے دور کا تعارف کرایا جس کو دور مواصلات (age of communication) کہا جاتا ہے۔

اس غیر معمولی سفر کے ذریعہ اس بات کا ایک مظاہرہ کیا گیا کہ خدا کا دین اب قومی نبوت کے دور سے گزر کر بین اقوامی نبوت کے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ اب وہ مقامی پیغام رسانی کی محدودیت سے نکل کر عالمی پیغام رسانی کے وسیع تر دائرہ میں پہنچ گیا ہے۔

أسرى بعبده ليلاً من المسجد الحرام الى المسجد الاقصى ـــــ یہ آیت اپنے ابتدائی مفہوم کے اعتبار سے ذات نبوت کے بارے میں ہے مگر اسی کے ساتھ اس کا ایک وسیع تر مفہوم بھی ہے جس کا تعلق پوری امت محمدیؐ سے ہے۔ پیغمبر اسلام کو ایک لمحے میں ... کیلومیٹر کا دوطرفہ سفر کرانا گویا کہ علامتی طور پر پوری امت کو یہ بتانا تھا کہ اس دین کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تیز رفتار سفر کا دور شروع کر دیا ہے۔ پیغمبر اسلام کو عالمی پیغمبر بنانے کے ساتھ ہی یہ امکان بھی کھول دیا گیا ہے کہ آپ کے امتی بسہولت آپ کے دین کی عالمی پیغام رسانی کر سکیں۔

سفر اسراء میں اس بات کا اشارہ تھا کہ اس نئے دور کا سب سے اہم پہلو کمیونی کیشن ہوگا نہ کہ سیاسی اقتدار۔ مگر موجودہ زمانہ میں جب یہ دور اپنے عظیم امکانات کے ساتھ ظاہر ہوا تو تمام دنیا کے مسلمان سیاسی اقتدار کے مسئلہ میں الجھ گئے۔ وہ دین خداوندی کی دعوت کو عام کرنے کے لیے جدید ذرائع ابلاغ کا استعمال نہ کر سکے۔

اس ناکامی کا اصل سبب حکمت نبوت سے محرومی ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہمارے علماء اور دانشور، اس حکمت نبوی سے بالکل بے خبر ہیں جس کی ممتاز مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر اسراء میں پائی جاتی ہے۔ جس وقت آپؐ کا یہ سفر ہوا، اس وقت یروشلم پر ایک مشرک بادشاہ کی حکومت قائم تھی۔ اس کے باوجود آپ بجسدہ الشریف وہاں گئے اور تمام نبیوں کے ساتھ مسجد اقصیٰ میں ایک خدا کی عبادت کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی ایک سنت الفصل بین القضیتین ہے۔ یعنی سیاسی اشو کو الگ کر کے دینی مواقع کو استعمال کرنا۔ مگر اس حکمت سے بے خبر ہونے کی بنا پر ہمارے تمام رہنما سیاسی مسائل میں الجھ گئے اور نئے دینی امکانات کو استعمال کرنے میں ناکام رہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، الرسالہ نومبر ۱۹۹۵)

۲۸ اگست کا دن خالی تھا۔ اس لیے آج تفصیل کے ساتھ یروشلم کے مختلف حصوں کو دیکھا۔ مجھے خاص دلچسپی اس حصہ سے تھی جو عرب سکٹر کہا جاتا ہے اور جس میں تمام مقامات مقدسہ واقع ہیں۔ اس علاقہ میں کثرت سے تنگ گلیاں ہیں۔ اس لیے ہم نے گاڑی چھوڑ دی تا کہ اس کے ہر حصہ میں داخل ہو کر اس کو دیکھا جا سکے۔ ایک چیز بڑی عجیب تھی کہ اس علاقہ کی دیواروں پر

کثرت سے عربی زبان میں نعرے لکھے ہوئے تھے۔ یہ تقریباً ویسا ہی منظر تھا جو پرانی دہلی کی دیواروں پر پوسٹر کی صورت میں نظر آتا ہے۔ یہ تمام کے تمام جنگ جویانہ نعرے تھے۔ مزید یہ کہ وہ ہاتھ سے بدخط انداز میں لکھے ہوئے تھے اور بمشکل پڑھے جاتے تھے۔ ان راستوں سے مسلسل مرد اور عورت گزر رہے تھے مگر میں نے اپنے سوا کسی کو بھی نہیں پایا جس کو ان نعروں سے کوئی دلچسپی ہو یا وہ ان کو پڑھنے کے لیے ایک لمحہ وہاں رکنا پسند کریں۔ چند نعرے یہ تھے :

قاتلو اعداء الله

الارض لنا و المقدس لنا

التحية كل التحية لشهداء الخليل

العيد لمن مات شهيداً

تحية لكل قطرة دم سالت دفاعا

تحية الى المعتقلين الابطال ــــ فتح

یہ پورا علاقہ تاریخی علاقہ ہے۔ یہاں قدم قدم پر عمارتوں کے اوپر ایسے بورڈ نظر آتے ہیں جو اس کی تاریخی حیثیت کی یاد دلاتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ایک عمارت کے گیٹ پر عربی میں لکھا ہوا نظر آیا : مكان مقدس، هنا بدأ يسوع آلامه۔ ایک پھاٹک پر عبرانی اور انگریزی میں لکھا ہوا تھا :

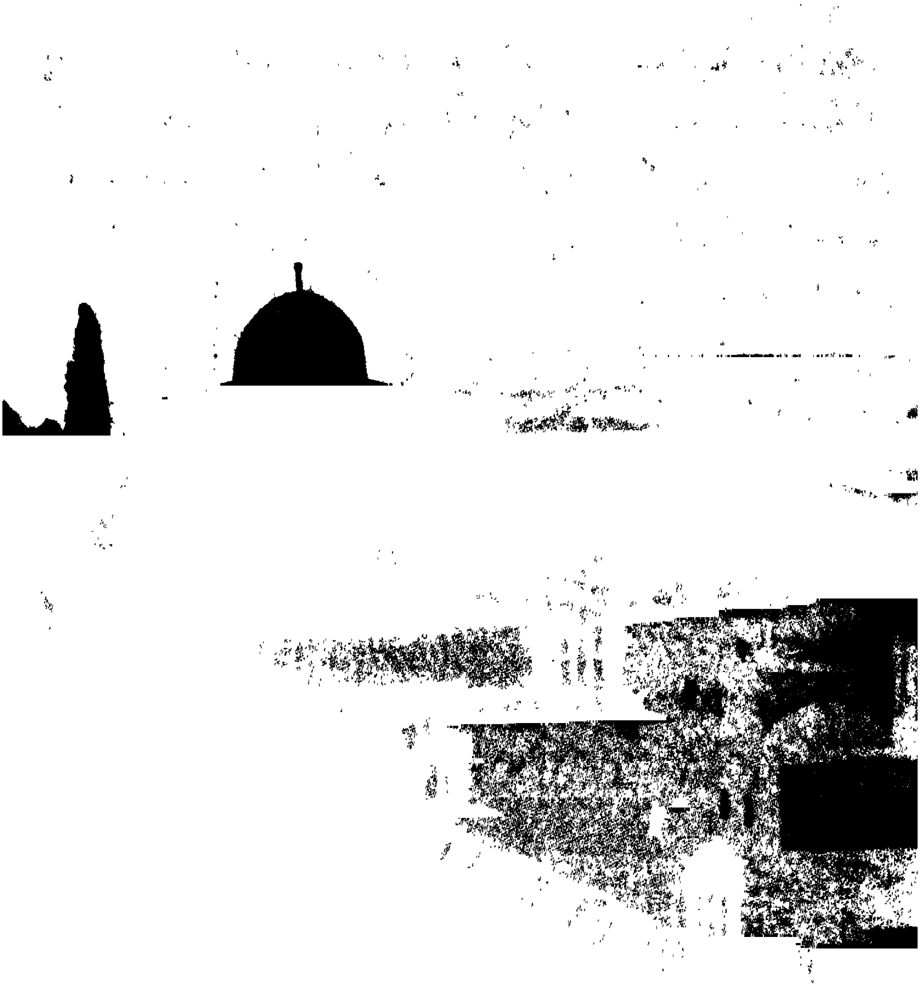
Tomb of the Pruphets, Haggai and Maleachi

ایک جگہ لکھا ہوا تھا : Birthplace of Virgin Marry ایک جگہ لکھا ہوا تھا : ساحة النبي داؤد (En-Nabi Dawoud Squire) مسلم نوعیت کے بورڈ بھی جگہ جگہ دکھائی دیے۔ مثلاً ایک عمارت کے دروازہ پر لکھا ہوا تھا : ادارة الاوقاف والشئون الاسلامية (مدير اوقاف القدس) ایک جگہ لکھا ہوا تھا : جامع الزاوية النقشبندية۔ اس علاقہ میں زیادہ تر دکانیں فلسطینیوں کی ہیں۔ ایک دکان کے آگے بنیان کے اوپر یہ الفاظ چھپے ہوئے تھے : بحبك يا فلسطين (اے فلسطین میں تجھ سے پیار کرتا ہوں)

۲۸ اگست کو دوبارہ میں اپنے ساتھی کے ہمراہ تاریخی مقامات دیکھنے کے لیے نکلا۔ ہم نے اپنا گاڑی چھوڑ دی تاکہ ہم گلیوں اور تنگ راستوں میں بھی جا سکیں اور زیادہ سے زیادہ مقامات







کو دیکھیں۔ ہم ایک ڈھلوان راستہ پر چل رہے تھے کہ سامنے سے ایک فلسطینی مسلمان آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ اس کا بچہ بھی تھا جس کی عمر غالباً دس سال ہوگی۔ بچہ اپنے ہاتھ میں زیتون کی شاخیں لیے ہوئے تھا۔ اس نے ایک شاخ مجھ کو اور ایک شاخ میرے ساتھی کو پیش کی۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ زیتون کی شاخ امن کی علامت ہے اور وہ اپنی امن پسندی کے اظہار کے لیے یہ شاخ ہمیں دے رہا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ وہ انسان کی نمائندگی کر رہا ہو اور پوری انسانیت کی طرف سے کہہ رہا ہو کہ ان بے فائدہ جھگڑوں کو بند کرو اور ہمیں امن کے ساتھ رہنے دو۔

۲۸ اگست کی دوپہر کو ایک اطالوی مسیحی کے ہمراہ کنیسۃ القیامہ (Church of Resurrection) دیکھا۔ یہ بہت بڑا ہے اور مسجد عمر سے ملا ہوا ہے۔ اس کے اندر وہ جگہ ہے جس کے متعلق عیسائی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہاں حضرت مسیح کو سولی دی گئی تھی۔ اس کو مقدس سپلکر (Holy Sepulchre) کہا جاتا ہے۔ یہاں عجیب و غریب منظر ہے۔ دیوار سے ملا ہوا حضرت مسیح کا قد آدم مجسمہ ہے۔ اس کے پیچھے صلیب کی لکڑی ہے۔ اس لکڑی کے ساتھ آپ کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں میں کیل ٹھونکی ہوئی ہے جس سے خون نکل رہا ہے۔ گردن میں پھانسی کی رسی ہے۔ آپ کا جسم مردہ کی مانند لٹک رہا ہے۔

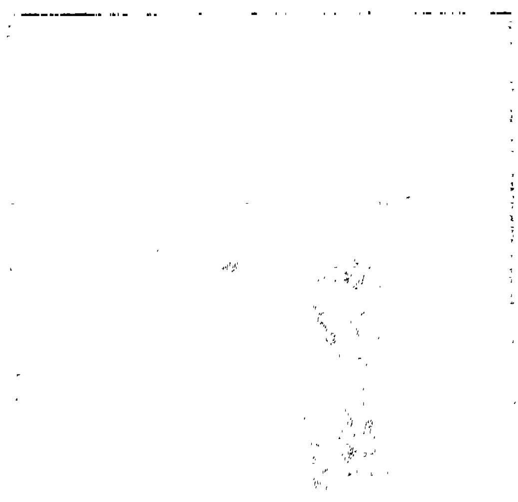
اسی کے ساتھ چرچ میں کئی اور مقدس مقامات ہیں۔ وہ مقام جہاں مسیحی عقیدہ کے مطابق، حضرت مسیح کے جسم کو صلیب سے اتار کر رکھا گیا تھا۔ یہاں ایک چبوترہ ہے جس کو عورتیں چومتی ہوئی نظر آئیں۔ ایک اور مقام ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ تین دن کے بعد حضرت مسیح دوبارہ زندہ ہو کر یہاں نمودار ہوگئے۔ اور یہاں سے پھر آسمان میں چلے گئے۔

۲۸ اگست کی شام کو دیوار گریہ (Wailing wall) دیکھی۔ یہ مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کے احاطہ کی دیوار سے ملی ہوئی ہے۔ دیوار کے ساتھ ملا ہوا وسیع میدان ہے جس میں ایک رسی تان کر عورت اور مرد کا علاقہ الگ کر دیا گیا ہے۔ بہت سے یہودی مرد اور عورت دیوار کے پاس کھڑے ہو کر پیشانی کے ساتھ دیوار سے چپکے ہوئے تھے اور دعائیں مانگ رہے تھے۔

لاطینی زبان میں قبر کے لیے سپلکر (Sepulchre) کا لفظ ہے۔ یروشلم میں مسیحی عقیدہ کے

حالاں، حضرت مسیح کی جو قبر ہے، اس کو مقدس مزار (Holy Sepulchre) کہا جاتا ہے۔ ایسٹر سے پہلے آنے والے جمعہ کو مسیحی حضرات گڈ فرائڈے کہتے ہیں اور اس کو حضرت مسیح کے مصلوب ہونے کی یادگار کے طور پر مناتے ہیں۔ ہر سال گڈ فرائڈے کو یروشلم کے "مقدس مزار" پر بڑی تعداد میں مسیحی لوگ جمع ہوتے ہیں۔ اس میں جو تقریبات کی جاتی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ صلیب کی صورت میں پھانسی کی لکڑی کھڑی کی جاتی ہے۔ اور ایک آدمی اس پر چڑھ کر ڈرامائی انداز میں اپنے آپ کو مصلوب کرتا ہے (ملاحظہ ہو، نیچے کی تصویر)

۲۸ اگست کو شام کا کھانا ہوٹل "امریکن کالونی" میں تھا۔ یہ ایک تاریخی ہوٹل ہے۔ اس کے بیشتر کارکن فلسطینی ہیں۔ اس میں ایک لمبی گیلری ہے جس میں فلسطین کی پچھلی تاریخ کو



Mexican Roman Catholic worshippers re-enacting Jesus Christ crucifixion during the annual Good Friday procession at the Holy sepulchre in Jerusalem on Friday.

تصویروں کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ ترکی عہد کی بہت سی تصویریں یہاں خوب صورت فریم میں لگی ہوئی ہیں۔ سب سے زیادہ نمایاں تصویر فلسطین کے ترک حکمراں پاشا کی تھی۔ وہ ایک شاندار گھوڑے پر بیٹھے ہیں۔ میں دیر تک اس کو دیکھتا رہا، گھوڑا اسٹرلنگ کی ایک عجیب علامت ہے۔ جو شان گھوڑے کی سواری میں ہے وہ کسی بھی دوسری سواری میں نہیں۔

ہم لوگ کھانا کھا چکے تو شیشہ کے گلاس نما برتن میں آئس کریم لا کر سب کے سامنے رکھی گئی۔ میں چمچہ اٹھا کر کھانا چاہتا تھا کہ ہوٹل کا ایک نوجوان کارکن اچانک آیا، اس نے میری آئس کریم اور چمچہ تیزی سے اٹھا لیا، اور پھر دوسری آئس کریم اور دوسرا چمچہ لا کر رکھ دیا۔ فوری طور پر میں اس کا راز سمجھ نہ سکا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ آئس کریم میں الکحل کی آمیزش تھی۔ نوجوان نے میری صورت سے سمجھا کہ یہ مسلمان ہیں۔ چنانچہ فوری طور پر اس نے الکحل کے بغیر دوسری آئس کریم تیار کی اور جلدی سے لا کر اس کو میرے سامنے رکھ دیا اور پچھلی آئس کریم کھانے سے مجھ کو بچا لیا۔

اس نوجوان سے مل کر میں نے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ فلسطینی مسلمان ہے اور اس کا نام بہجت ہے۔ میں نے اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ وہ عربی بولتا تھا اور بظاہر نہایت ذہین اور مستعد نوجوان تھا۔

یورپ کے ایک تعلیم یافتہ مسیحی جو اکثر یروشلم آتے رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میری معلومات کے مطابق، بہت تھوڑے یہودی ہیں جو مسجد اقصیٰ کو توڑ کر اس کی جگہ سلیمانی ہیکل دوبارہ بنانے کی بات کرتے ہیں۔ بیشتر یہودی اس کے مخالف ہیں۔ مذہبی یہودیوں کے نزدیک دو ہزار سال پہلے جب رومن اس میں داخل ہوئے اور اس کو ڈھا دیا تو اب یہ جگہ ناپاک ہو چکی ہے۔ مسیحا جب آئیں گے تو وہی دوبارہ اس کو پاک کریں گے۔ دوسرے یہ کہ یہودیوں کے یہاں عبادت گاہ کا خاص مقصد سوختنی قربانی پیش کرنا ہوتا ہے۔ تعلیم یافتہ یہودی اس قسم کی قربانی کو غیر مہذب سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ بھی نہیں چاہتے کہ ہیکل دوبارہ تعمیر ہو۔ اور وہاں اس قسم کے غیر مہذب کام دوبارہ کیے جانے لگیں۔

عرب علاقہ میں چلتے ہوئے ایک جگہ کچھ فلسطینی بچے نظر آئے۔ قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ کورس (chorus) کی صورت میں ایک پرجوش ترانہ (انشودۃ حماسیۃ) گا رہے ہیں۔ یہ شعر کی

اصطلاح میں ایک ترجیع تھا جس میں ہر چند مصرعوں کے بعد اس شعر کی تکرار ہوتی تھی کہ آؤ ہم جنگ کریں، آؤ ہم جنگ کریں۔ کیوں کہ جنگ ہی رشد و فلاح کا راستہ ہے:

هَلُمُّوا نُقَاتِل هَلُمُّوا نُقَاتِل فَإِنَّ القِتَالَ سَبِيلُ الرَّشَادِ

یہ ترانہ شریعت کے خلاف بھی ہے اور عقل کے خلاف بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ۸ھ میں دس ہزار صحابہ کے ساتھ مدینہ سے مکہ کی طرف مارچ کیا تو ایک سردار کی زبان سے نکلا: الیوم یوم الملحمۃ (آج گھمسان کی جنگ کا دن ہے) آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ آج رحمت کا دن ہے (الیوم یوم المرحمۃ)

وہ عقل کے خلاف اس لیے ہے کہ موجودہ زمانہ کی تبدیلیوں نے جنگی اقدامات کے بجائے پر امن جد و جہد کو طاقت کا سرچشمہ بنا دیا ہے۔ میں نے سوچا کہ فلسطینی قیادت، اگر حدیث کے الفاظ میں اپنے زمانہ سے باخبر (بصیراً بزمانہ) ہوتی تو وہ اپنی نئی نسل کو جنگ کے بجائے امن کا سبق دیتی۔ اور آج برعکس طور پر، ہر فلسطینی بچہ کی زبان پر یہ الفاظ ہوتے:

هَلُمُّوا نُسَالِم هَلُمُّوا نُسَالِم فَإِنَّ السَّلَامَ سَبِيلُ الرَّشَادِ

(آؤ امن کی روش اختیار کریں آؤ امن کی روش اختیار کریں۔ کیونکہ امن ہی رشد و کامیابی کا راستہ ہے)

ایک عرب عالم سے جہاد (بمعنی قتال) کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ قرآن میں جنگ کا حکم اسلام کی اشاعت کے لیے دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بات صحیح نہیں۔ قرآن میں کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ جنگ کر کے اسلام کی اشاعت کرو۔ قرآن میں صرف یہ ہے کہ فتنہ کو ختم کرنے کے لیے ان سے جنگ کرو (۲: ۱۹۳)

اس آیت میں فتنہ سے مراد مذہبی جبر (religious persecution) ہے۔ جب مذہبی جبر ختم ہو جائے تو جنگ کا حکم اپنے آپ ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے نماز کے لیے تیمم کی اجازت دی جائے جب کہ پانی نہ ہو۔ پھر جب پانی آ جائے تو اپنے آپ تیمم کی اجازت ختم ہو جائے گی۔ آب آید تیمم برخاست۔

میں نے کہا کہ بخاری میں یہ روایت ہے کہ فتنۂ ابن الزبیر کے زمانہ میں کچھ مسلمانوں نے اپنی اس جنگ کے لیے قتال برائے ختم فتنہ کی آیت کو استعمال کیا تو اس وقت حضرت عبد اللہ بن عمر نے

اس کی تردید کی۔ انھوں نے کہا کہ فتنہ کو اصحاب رسول نے جنگ کر کے ختم کر دیا (وقد فعلنا) اور جب فتنہ ختم ہو گیا تو اب جنگ کس لیے (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۸/۱۴۰)

میں نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن عمر کے اس قول کے مطابق خلافت راشدہ کے بعد ہی اس فتنہ (مذہبی جبر) کا خاتمہ ہو گیا جس کے خلاف جنگ کا حکم دیا گیا تھا۔ اور جب مذہبی جبر ختم ہو جائے تو اس کے بعد پر امن دعوت اسلام کا زمانہ آجاتا ہے نہ کہ غیر ضروری طور پر متشددانہ جنگ کا۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو لڑائیاں کی ہیں وہ ملک گیری کی لڑائیاں تھیں نہ کہ حقیقی معنوں میں جہاد فی سبیل اللہ۔

۲۹ اگست ۱۹۹۵ کی صبح کو دوبارہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ مسجد الاقصیٰ اور بیت المقدس کی زیارت کے لیے روانہ ہوا۔ میرے ساتھ ایک مسلمان اور دو مسیحی تھے۔ ہم لوگ ایک گیٹ پر پہنچے۔ وہاں اسرائیلی پولیس کے دو آدمی تھے۔ انھوں نے عربی اخلاق کے مطابق گفتگو کی۔ مرحبا، صباح الخیر، اھلاً وسھلاً جیسے کلمات سے ہمارا استقبال کیا۔ مگر انھوں نے کہا کہ اس گیٹ سے صرف مسلم جا سکتے ہیں۔ آپ کے مسیحی دوست کو سیاحوں والے گیٹ سے داخلہ ملے گا۔ ہم لوگ چلتے ہوئے دوسرے گیٹ پر پہنچے تو وہاں بھی پولیس کے دو آدمی تھے اور انھوں نے بھی دوبارہ یہی جواب دیا۔ پھر ہم لوگ روانہ ہو کر تیسرے گیٹ پر پہنچے تو وہاں بھی ہم کو یہی جواب دیا گیا۔ آخر کار ہم چوتھے دروازے پر (دیوار گریہ کے قریب) پہنچے۔ وہاں سب کو بیک وقت داخلہ دیا گیا۔ دکتور محمد امین اسماعیلی (المغرب) نے کہا: القضیۃ کلھا مادیۃ۔ چوں کہ مسلمانوں کے لیے داخلہ فری ہے۔ مگر غیر مسلم سیاحوں کو داخلہ کے لیے ٹکٹ لینا پڑتا ہے، اس لیے ان کے داخلہ کے لیے ایک گیٹ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک مسلمان کا تعلق ہے، وہ کسی بھی دروازہ سے بغیر ٹکٹ داخل ہو سکتے ہیں۔

آج میں دوسری بار مسجد اقصیٰ میں داخل ہوا اور دو رکعت نماز ادا کی۔ اس وقت اسرائیل کے اعتبار سے ۹ بجے صبح کا وقت تھا اور ہندستان کے لحاظ سے ساڑھے گیارہ بجے کا۔ نماز پڑھتے ہوئے دل بھر آیا۔ سجدہ میں روتے ہوئے دعا کے یہ الفاظ نکلے کہ خدایا، زمانہ کا فرق تیرے نزدیک کوئی فرق نہیں۔ تو میرے لیے زمانی دوری کو ختم کر دے۔ مجھ کو اس مقدس جماعت کی صفوں میں شریک کر دے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں امامت کر رہے تھے اور ان کے پیچھے انبیاء صف باندھ کر نماز ادا کر رہے تھے۔

اس کے بعد ہم لوگ بیت المقدس (قبۃ الصخرۃ) میں داخل ہوئے۔ اس کا سنہری گنبد
اس وقت سورج کی روشنی میں نہایت شان کے ساتھ چمک رہا تھا۔ وہاں بھی دو رکعت نماز ادا
کی اور اپنے لیے اور دوسرے لوگوں کے لیے دعائیں کیں۔

شیخ الازہر جاد الحق علی جاد الحق نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ میں نے کبھی بھی قدس جانے
کے لیے نہیں سوچا جب کہ وہ اسرائیلی قبضہ کے تحت ہو۔ اللہ کے حکم سے میں اس کی آزادی کے
بعد وہاں جاؤں گا (لم افکر ابداً فی زیارۃ القدس وھی تحت الاحتلال الاسرائیلی۔ وسوف
ازورھا باذن اللہ بعد تحریرھا) الدعوۃ، الریاض، العدد ۱۴۷۴، ۲۵ شعبان ۱۴۱۵ھ، ۲۶ جنوری ۱۹۹۵، صفحہ ۲۵

مگر شیخ جاد الحق علی جاد الحق ۷۹ سال کی عمر میں ۱۵ مارچ ۱۹۹۶ کو قاہرہ میں انتقال کر گئے۔
اور وہ قدس کی زیارت نہ کر سکے۔ اس سفر کے دوران میں نے جب مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھی اور
وہاں ان غیر معمولی کیفیات کا تجربہ کیا جو کسی بھی دوسرے مقام پر ممکن نہیں، تو میں نے سوچا کہ
شیخ الازہر کا فیصلہ کوئی صحیح فیصلہ نہیں تھا۔ دینی رزق کے حصول میں سیاسی قبضہ کو مانع بنانا
سنت رسول کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں نماز پڑھی جب کہ وہ مشرکین
کے قبضہ میں تھا۔ اسی طرح آپ نے سفر معراج میں مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کی۔ حالاں کہ اس وقت
اس پر ایران کے مشرک بادشاہ کی حکومت قائم تھی۔ شاید لوگوں کو روحانی یافت کی قیمت نہیں
معلوم، اس لیے وہ سیاسی قضیوں کو غلو آمیز اہمیت دے کر اپنے آپ کو اس نعمت سے محروم
کیے ہوئے ہیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، فکر اسلامی کا باب، الفصل بین القضیتین)

موجودہ زمانہ میں بین اقوامی طور پر مسلّم قانون کے تحت ہر آدمی کو یہ آزادی ہے کہ وہ جہاں چاہے
جائے مگر مذکورہ غلط پالیسی کی بنا پر ساری دنیا کے مسلمانوں نے یروشلم کا سفر ترک کر رکھا ہے۔ اس کا
بھیانک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مسلمانوں کو یروشلم اور اسرائیل کے حقیقی حالات کا سرے سے پتہ ہی نہیں۔
ساری دنیا کے مسلمان ایک ایسے دشمن کے خلاف لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں جس کے بارہ میں خود ساختہ
پروپیگنڈوں کے سوا انھیں کچھ اور نہیں معلوم۔ حتی کہ آمد و رفت نہ ہونے کے نتیجہ میں انھیں یہ بھی نہیں
معلوم کہ قدس کیا ہے اور مسجد اقصیٰ کیا ہے۔ دنیا کے تقریباً ۹۹ فی صد مسلمان قدس ہی کو
مسجد اقصیٰ سمجھتے ہیں۔ جب کہ دونوں نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے الگ ہیں بلکہ ان کی نوعیت

بھی ایک دوسرے سے مکمل طور پر مختلف ہے۔

ایک فلسطینی نوجوان نے فلسطین کی آزادی کی تحریک کے لیے خطاب میں القدس مسن ابناء القردة والخنازیر کے الفاظ استعمال کیے۔ یعنی قدس کو بندروں اور سوروں کی اولاد سے پاک کیا جائے۔ میں نے کہا کہ صحابہ کے فیصلہ کے تحت رسول اور اصحاب رسول نے یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے نکالا۔ مگر اس کے لیے انھوں نے آپ جیسے الفاظ استعمال نہیں کیے۔ رسول اللہ نے سادہ طور پر فرمایا: اخرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب۔ اور آپ لوگ رسول کی اتباع کے نام پر اس قسم کی غیر شرعی اور غیر اخلاقی زبان استعمال کر رہے ہیں۔

حیدر آباد کے ایک صاحب مرزا مشکور بیگ اپنے کسی کام کے تحت اسرائیل میں مقیم ہیں۔ انھوں نے اپنے کچھ تاثرات حیدر آباد کے روزنامہ سیاست (۵ نومبر ۱۹۹۵) میں چھپوائے ہیں۔ ان کا ایک جزء یہ ہے: اسرائیل کے ہر باشندہ کو ۱۸ سال کی عمر ہوتے ہی ریوالور رکھنے کی اجازت ہو جاتی ہے۔ جس طرح ہمارے حیدر آباد میں ہر گلی میں ایک "شیر" ہوتا ہے جو گلے کے بٹن کھلے رکھ کر سینہ تان کر صرف کمزوروں کو دباتا ہے جس کو حیدر آبادی زبان میں "ابو شیر" کہتے ہیں۔ وہ یہاں نہیں ہے کیوں کہ ہر ایک مسلح ہے۔ کمزور بھی اور طاقت ور بھی۔ اور دونوں ایک دوسرے سے ڈرے ہوئے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اسرائیل میں ہر یہودی کو قانونی طور پر ریوالور رکھنے کی عام اجازت ہے مگر یہ لوگ اس کو صرف غیروں پر استعمال کرتے ہیں نہ کہ اپنے لوگوں پر۔ لیکن مذکورہ بیان کے مطابق، اس چیک کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہر ایک کے پاس ہتھیار ہے۔ اگر ہر ایک کے پاس ہتھیار ہونا چیک بن جاتا ہو تو کراچی اور افغانستان میں یہ واقعہ کیوں نہیں پیش آیا جہاں ہر ایک کے پاس ہتھیار ہونا باہمی خانہ جنگی کا سبب بن گیا۔ اصل یہ ہے کہ یہودی ایک تعلیم یافتہ اور باشعور قوم ہیں۔ ان کی یہی صفت اس بات کے لیے روک بن گئی ہے کہ ایک یہودی اپنا ہتھیار دوسرے یہودی کے خلاف استعمال نہ کرے۔

یہاں کا ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۶۹ میں ساری دنیا کے یہودیوں نے چندہ جمع کیا تھا تاکہ یروشلم میں ایک بہت بڑا اسناگاگ تعمیر کیا جائے۔ یہ رقم ایک بلین امریکن ڈالر پر مشتمل تھی۔

یہ پوری رقم چیف ربائی کی خدمت میں پیش کی گئی۔ لیکن چیف ربائی نے عبادت گاہ کی تجویز کو رد کرتے ہوئے کہا: خدا ساری دنیا کا مالک ہے۔ ساری شان و شوکت اسی کے لیے ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں اس کے لیے ایک بلین ڈالر کی رقم کا محل تعمیر کرنے والے۔ اس کی بندگی تو ہر جگہ سوتے جاگتے کی جا سکتی ہے۔ خدا کو جاننے کے لیے علم ضروری ہے۔ جاؤ اس رقم سے ایک تعلیمی ٹرسٹ بناؤ تاکہ کوئی یہودی بے علم نہ رہے۔ اس طرح دنیا کا سب سے بڑا تعلیمی ٹرسٹ ۹۷۰ میں اسرائیل میں وجود میں آیا۔

اسرائیل میں یہ کہا جاتا ہے کہ خدا کے بعد سب سے بڑا درجہ تعلیم کا ہے۔ یہاں تعلیم کو ہوا اور پانی کی طرح فری کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر فرد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔

یروشلم موجودہ زمانہ میں یہودیوں کا مرکز ہے۔ یہاں بہت سے یہودیوں سے ملاقات ہوئی اور ان سے باتیں ہوئیں۔ میرا احساس یہ تھا کہ یہودی کوئی غیر انسانی مخلوق نہیں ہیں۔ وہ بھی اسی طرح انسان ہیں جس طرح دوسرے بہت سے انسان ہیں۔ وہ بھی اپنے اندر ایک فطرت رکھتے ہیں۔ اسی طرح موجودہ اختلافی زمانہ میں بھی بہت سے یہودی مسلمان ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک تازہ مثال پاکستان کے مشہور کھلاڑی عمران خان کی بیوی جمائما کی ہے۔ وہ لندن کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ مگر اسلام کی تعلیمات نے انھیں متاثر کیا۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس وقت وہ پاکستان میں رہ رہی ہیں۔ اور اب ان کا لباس قمیص اور شلوار اور دوپٹہ ہے۔

یہودیوں سے گفتگو کے دوران محسوس ہوا کہ ان کے بھی مفادات ہیں جس طرح ہمارے مفادات ہیں۔ تاہم وہ بھی اسی طرح عقلی دلائل کے آگے جھکتے ہیں جس طرح دوسرے انسان عقلی دلائل سن کر جھک جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہودیوں کے سلسلہ میں ہم کو زیادہ فطری نقطۂ نظر اختیار کرنا چاہیے۔ یعنی ہم انھیں "دشمن" کے روپ میں دیکھنے کے بجائے "مدعو" کے روپ میں دیکھیں۔ اور فطرت کے اسلوب میں انھیں دین حق کا مخاطب بنائیں۔

یروشلم کے چند روزہ قیام کے دوران بہت سے ادارے اور عبادت خانے دیکھنے کا موقع ملا۔ مسلمانوں کے بھی اور غیر مسلموں کے بھی۔ میں نے پایا کہ عیسائی حضرات کے یروشلم میں کثیر تعداد میں بہت بڑے بڑے چرچ ہیں۔ یہاں ان کے شاندار ادارے ہیں۔ انھوں نے جلسوں اور میٹنگوں

کے لیے نہایت عمدہ قسم کے ہال بنا رکھے ہیں۔ مگر جہاں تک میں معلوم کر سکا فلسطینی مسلمانوں کے یہاں اس طرح جدید معیار کے اعلیٰ ادارے موجود نہیں۔ اس کی وجہ غالباً دونوں کے مزاج کا فرق ہے۔ عیسائی حضرات تعمیری شعبوں میں اپنے کو مستحکم بنانے میں لگے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے ذہن سیاست اور اقتدار سے اتنا زیادہ مانوس ہیں کہ وہ یہ سوچ نہیں پاتے کہ یہاں کوئی اور بھی کام ہے جس میں انہیں مشغول ہونا چاہیے۔

یہ دراصل فکری پس ماندگی کی علامت ہے۔ قدیم زمانہ میں سیاسی ادارہ ہی واحد سب سے بڑا ادارہ سمجھا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں سیاسی ادارہ نے ثانوی حیثیت حاصل کر لی ہے باشعور قوموں نے اس تبدیلی کو جان کر اس کے مطابق اپنی تعمیر کر لی۔ مگر مسلم رہنما اور دانشور سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے سیاست کی چٹان سے اپنا سر ٹکرا رہے ہیں۔ بے شمار قربانیوں کے باوجود وہ کوئی بھی حقیقی چیز حاصل نہ کر سکے۔

مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگ اکثر جذباتی انداز میں کہتے ہیں کہ: مَنْ لِلْقدس؟ یعنی کون ہے جو قدس کے لیے کچھ کرے۔ یہ جملہ بظاہر یہ تاثر دیتا ہے جیسے کہ قدس کا میدان خالی پڑا ہوا ہے اور وہاں کوئی کچھ نہیں کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ بات صد فیصد بے بنیاد ہے۔

۱۹۴۸ میں شیخ حسن البنا نے قاہرہ میں جلوس نکالا جس میں ایک لاکھ مصری شریک تھے۔ اس کا نعرہ تھا: لبیک یا فلسطین (اے فلسطین ہم حاضر ہیں) پھر کئی بار باقاعدہ مسلم فوجوں نے اسرائیل سے جنگ کی۔ اس کے علاوہ فلسطینیوں کی عسکری تنظیمیں ہر روز قربانی دے کر اس محاذ پر لڑائی لڑ رہی ہیں۔ اس کی آخری حد یہ ہے کہ پر جوش فلسطینی اپنے جسم کے ساتھ بم باندھ کر اسرائیلی آبادی میں گھس جاتے ہیں۔ یہ خودکش بمبار خود بھی ہلاک ہوتے ہیں اور بہت سے اسرائیلیوں کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ وغیرہ۔

ایسی حالت میں مَنْ لِلْقدس کا جذباتی نعرہ سراسر بے معنی ہے۔ اس قسم کے دانش وروں کی غلطی یہ ہے کہ وہ فلسطینی جدوجہد کا نتیجہ نہیں دیکھ رہے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ اس محاذ پر جدوجہد بھی نہیں ہو رہی ہے۔ حالاں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جدوجہد تو سرفروشانہ حد تک جاری ہے۔ مگر عملاً وہ سب کی سب بے نتیجہ ثابت ہو رہی ہیں۔ یا بہ قرآنی الفاظ میں، حبط اعمال کا

شکار ہو رہی ہیں۔ گویا کہ جو چیز مقصود ہے وہ بلا جدوجہد کا نتیجہ ہے نہ کہ خود جدوجہد۔

ہندستان اور اسرائیل کے وقت میں ڈھائی گھنٹہ کا فرق ہے۔ ۲۹ اگست کی صبح کو مقامی وقت کے اعتبار سے آٹھ بجے ہیں۔ میری گھڑی ہندستان کے اعتبار سے ساڑھے دس بجے کا وقت بتا رہی ہے۔ سورج میلوں تک کے پورے ماحول کو آخری حد تک روشن کیے ہوئے ہے۔ میں اپنے کمرہ میں لگے ہوئے "قد دیوار" شیشوں کے پیچھے کھڑا ہوا باہر شہر قدس کا منظر دیکھ رہا ہوں ——— یہ حضرت داؤد ؑ کے محل کے کھنڈر ہیں۔ یہاں حضرت سلیمان ؑ کے محل کا کھنڈر تھا۔ یہ بیت المقدس ہے جس کو عبد الملک بن مروان اموی نے بنوایا تھا۔ یہ وہ رومی عدالت ہے جہاں حضرت مسیح ؑ کے خلاف فیصلہ سنایا گیا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت مریم کی پیدائش ہوئی۔ یہ مسجد اقصیٰ ہے جہاں پیغمبر اسلام ؐ نے تمام نبیوں کے ساتھ باجماعت نماز ادا کی۔ یہ مسجد عمر ہے جہاں فتح فلسطین کے بعد حضرت عمر فاروق رضؓ نے نماز ادا فرمائی۔ اسی طرح پورے علاقوں میں جگہ جگہ نبیوں کے نام کی تختیاں لگی ہوئی ہیں۔ سبھی مذہبی فرقے ان نبیوں اور بزرگوں کا احترام کرتے ہیں، مگر یہی فرقے آپس میں ایک دوسرے کا احترام کرنے کے لیے تیار نہیں۔

فلسطین کا مسئلہ پچھلے پچاس سال سے پوری مسلم دنیا، خصوصاً عرب دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ اس دور کا عرب لٹریچر فلسطین کی باتوں سے پُر ہے۔ لکھنے اور بولنے والوں نے نہایت جذباتی انداز میں اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ ایک عرب شاعر الزرکلی نے کہا کہ صلاح الدین کو دوبارہ ہمارے درمیان لاؤ اور حطین یا حطین جیسا معرکہ دوبارہ تازہ کرو:

هاتِ صلاح الدين ثانيةً فينا — جدد حطين او شبه حطينا

ایک اور عرب شاعر احمد مطار جو آج کل لندن میں رہتے ہیں، ان کی نظم کے دو شعر یہ ہیں:

القدس للدنيا قمر — في القدس قد نطق الحجر

لا مؤتمر لا مؤتمر — انا لا اريد سوى عمر

(قدس دنیا کے لیے چاند ہے۔ قدس میں پتھر بھی بول پڑا۔ مجھے کانفرنس نہیں چاہیے۔ میں تو صرف عمر کو چاہتا ہوں)

مگر عملی اعتبار سے دیکھا جائے تو فلسطین کے محاذ پر اب تک کچھ بھی حاصل نہ کیا جا سکا۔

موجودہ زمانہ میں ساری دنیا کے مسلمان امریکہ سے نفرت کرتے ہیں، اور اس کو اسلام کا

دشمن نمبر ایک کہتے ہیں۔ اس کا سبب، ایک فلسطینی نوجوان کے الفاظ میں یہ ہے کہ — امریکہ یہودی اسرائیل کے وجود و بقا کا واحد راز ہے (الدعم الامریکی ھو سر استمرار اسرائیل وبقاءھا)

عجیب بات ہے کہ عین اسی وقت ساری دنیا کے مسلمان امریکہ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کوئی براہ راست طور پر اور کوئی بالواسطہ طور پر۔ آج بھی ایک مسلمان یہ کہنے میں فخر محسوس کرتا ہے کہ میں نے امریکہ کا سفر کیا، یا میرا بیٹا امریکہ میں سٹل ہو گیا ہے۔ مزید یہ کہ جو مسلمان امریکہ میں باقاعدہ بس گئے ہیں ان کا حال یہ ہے کہ ان کی نئی نسل امریکی شہری ہونے پر فخر کرتی ہے۔ مکہ سے نکلنے والے العالم الاسلامی کی (۹ ذوالقعدہ ۱۴۱۶ھ) رپورٹ کے مطابق، امریکہ کے ایک مسلم نوجوان نے کہا کہ مجھے اس پر فخر ہے کہ میں ایک امریکی مسلمان ہوں:

I am proud to be an American Muslim.

یہی دو عملی موجودہ دنیا کے مسلمانوں کی اصل کمزوری ہے۔ جس روش کو اصولی طور پر وہ ماننے کے لیے تیار نہیں، اسی روش کو نہایت اطمینان کے ساتھ ان کے تمام چھوٹے اور بڑے عملاً اختیار کیے ہوئے ہیں۔

عرب علاقہ میں کئی بار جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک جگہ کچھ عرب نوجوان آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ وہاں کھڑے ہو کر ہم لوگ انھیں دیکھنے لگے۔ پھر میں ایک نوجوان کے قریب گیا۔ گفتگو کے دوران اس نے جو باتیں کہیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ صہیونی مقبوضہ فلسطین کو ایک عظیم قید خانہ میں تبدیل کر رہے ہیں (الصھاینۃ یحوّلون فلسطین المحتلۃ الی سجن کبیر)

میں نے کہا کہ آپ لوگ یہود کی طاقت کو جانتے ہیں مگر فطرت کی طاقت سے آپ لوگ بے خبر ہیں۔ اگر کوئی یہودی کہے کہ "ہم پورے فلسطین کو ایک قید خانہ بنا دیں گے" تو آپ کو اس کے جواب میں کہنا چاہیے کہ ایک پورے ملک کو قید خانہ بنانا کوئی سادہ بات نہیں، یہ خدا کے مقرر کیے ہوئے نظام فطرت سے لڑنا ہے۔ اور نظام فطرت سے لڑنا نہ کسی منی پاور کے لیے ممکن ہے اور نہ کسی سپر پاور کے لیے۔

دنیا کے کسی بھی حصہ میں کسی بھی مسلمان سے بات کی جائے تو وہ فلسطینی عربوں کے اوپر

اسرائیل کے متعصبانہ مظالم کی بات کرے گا۔ بطور واقعہ یہ بات صحیح ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس شکایت اور احتجاج کا کوئی نتیجہ ہے۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ فلسطینی عربوں کا موقف اپنی جگہ پر درست ہے مگر جب وہ جنگ کی طاقت نہیں رکھتے تو وہ اپنی تحریک متشددانہ انداز پر کیوں چلاتے ہیں۔ جب کہ بار بار کے تجربہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ ایک اسرائیلی بس پر بم مارتے ہیں تو اسرائیل پوری عرب بستی پر بمباری کرکے اس کو تباہ کر دیتا ہے۔

ساؤتھ افریقہ کے پریسیڈنٹ نیلسن منڈیلا (Nelson Mandela) نے فلسطینیوں کی حمایت میں ایک بیان دیا اور حماس کے نمائندوں سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو تمام عرب خوش ہو گئے۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے کہا کہ نیلسن منڈیلا کے ان الفاظ سے زیادہ قابل قدر خود ان کا عملی نمونہ ہے۔ ان کو بھی اپنے ملک میں فلسطین جیسے حالات کا سامنا تھا۔ مگر انھوں نے اپنی پوری تحریک پرامن انداز میں چلائی۔ یہاں تک کہ وہ کامیاب ہو گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فلسطینیوں کو نیلسن منڈیلا کے اس تجربہ سے سبق لینا چاہیے۔

ایک بار میں نے ایک عرب اسکالر کو بتایا کہ میں ایک انٹرنیشنل پیس کانفرنس میں جانے والا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ یہ پیس کانفرنسیں بالکل بے کار ہیں۔ یہ لوگ انصاف کے سوال کو نظر انداز کرکے امن قائم کرنا چاہتے ہیں حالاں کہ انصاف کے بغیر امن ممکن نہیں۔ مگر یہ ایک غیر حقیقی بات ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امن کا تعلق انصاف سے نہیں ہے۔ امن کا مقصد انصاف حاصل کرنا نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد صرف مواقع عمل تلاش کرنا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ معاہدہ کے ذریعہ امن حاصل کیا۔ حالاں کہ وہ واضح طور پر انصاف کے خلاف تھا۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد انصار نے "منا امیر ومنکم امیر" کا مطالبہ واپس لے کر امن حاصل کیا۔ حالانکہ وہ انصاف کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں جب بھی امن حاصل کیا گیا ہے، انصاف کے سوال کو نظر انداز کرکے حاصل کیا گیا ہے۔ انصاف تو اس جدوجہد کا ثمرہ ہے جو امن کے بعد جاری کی جاتی ہے۔ وہ خود امن کے اندر براہ راست طور پر شامل نہیں ہوتا۔

سفر کے دوران ایک فلسطینی عرب سے گفتگو ہوئی۔ میں نے امن کی اہمیت پر زور دیا

اور تشدد کو بے فائدہ بتایا۔ انھوں نے کہا کہ ہم تشدد کے خلاف ہیں۔ مگر ہم جو امن چاہتے ہیں
وہ عمل کے ساتھ ہو (نحن نتبذ العنف ولكننا نريد سلاما عادلا)

یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے طبقہ کا نعرہ ہے۔ یہی بات
ہندستانی زبان میں بھی بولا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مسلم انگریزی میگزین (ریڈینس
۲۴-۳۰ مارچ ۱۹۹۶) نے اس موضوع پر ایک پرجوش آرٹیکل شائع کیا ہے۔ اس کا خلاصہ کرتے ہوئے
میگزین نے اپنے ٹائٹل کے اوپر اس طرح جلی حرفوں میں نمایاں کیا ہے ــــ امن بغیر
انصاف، دور کا خواب ہے:

Peace sans justice—a distant dream

یہ الفاظ بظاہر خوب صورت معلوم ہوتے ہیں مگر عملی اعتبار سے وہ سراسر بے معنی ہیں۔ کیونکہ
موجودہ دنیا میں امن کبھی بھی نظری انصاف کی بنیاد پر نہیں ملتا، حتی کہ پیغمبر کو بھی نہیں۔ امن یہاں
جب بھی کسی کو ملتا ہے صورت موجودہ پر راضی ہونے کی بنیاد پر ملتا ہے نہ کہ بوقت صلح غیر حاصل
شدہ انصاف کو حاصل کرنے کی بنیاد پر۔ پیغمبر کی زندگی میں اس کی ایک واضح مثال حدیبیہ کا معاہدۂ
امن ہے۔ اس کا حصول صرف اس وقت ممکن ہو سکا جب کہ پیغمبر نے صورت موجودہ (اسٹیٹس کو)
پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

۱۹۱۷ میں برٹش امپائر نے فلسطین کی تقسیم کا ایک فارمولا بنایا جو عام طور پر بالفور ڈیکلریشن
کے نام سے مشہور ہے۔ اس تقسیم میں فلسطین کا صرف ایک تہائی حصہ اسرائیل کو دیا گیا تھا اور
اس کا دو حصہ عربوں کے لیے خاص کیا گیا تھا جس میں پورا کا پورا یروشلم بھی شامل تھا مگر اس
وقت کی مسلم قیادت نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ایک عرب عالم نے اس کو قبول کر لینے
کی بات کہی تو اس پر عرب مفاد سے غداری کا الزام لگایا گیا چنانچہ وہ شخص یہ شعر کہہ کر مر گیا ــــ
عنقریب میری قوم جان لے گی کہ میں نے اس کو دھوکا نہیں دیا ہے، اور رات خواہ کتنی ہی لمبی ہو جائے
صبح بہر حال آکر رہتی ہے:

سیعلم قومی انی لا أغشهم ومهما استطال الليل فالصبح واصل

اس وقت کی مسلم قیادت نے اگر اسٹیٹس کو (حالت موجودہ) کو قبول کر لیا ہوتا تو فلسطینیوں کی حالت

ضرورت ہوتی۔ مزید یہ کہ وہ اس ناقابل بیان تباہی سے بچ جاتے جو پچھلے پچاس سال سے عرب سے اسرائیل تک ختم نہیں ہوتی۔

حقیقت یہ ہے کہ نزاعی مسائل کو حل کرنے کا واحد ممکن فارمولا یہی ہے۔ دسمبر ۱۹۹۴ میں میری ملاقات اقوام متحدہ کے ایک ذمہ دار سے ہوئی۔ انھوں نے ذاتی ملاقات میں مجھ سے پوچھا کہ بوسنیا اور کشمیر کے مسئلہ کا حل کیا ہے۔ میں نے کہا، دونوں کے لیے واحد نکاتی فارمولا صرف یہ ہے ــــ حالت موجودہ کو قبول کر لیجئے۔

I have one-point formula for both—accept the status quo.

فلسطینیوں نے یاسر عرفات کی قیادت میں اسرائیل کے یہودیوں سے جو صلح ستمبر ۱۹۹۵ میں کی ہے اس پر مسلم دنیا میں مختلف رائیں ظاہر کی گئی ہیں۔ سعودی عرب کے مشہور عالم شیخ ابن باز نے اس کو درست قرار دیا ہے۔ اس پر کچھ لوگوں نے اعتراض کیا اور کہا کہ قرآن کے مطابق یہودیوں سے مودت اور موالات جائز نہیں۔ اس کا جواب دیتے ہوئے شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز نے کہا ہے کہ یہودیوں اور دوسرے کافروں سے صلح ان کے ساتھ مودت اور موالات کو لازم نہیں کرتی (الصلح مع الیہود أو مع غیرہم من الکفرۃ لا یلزم مودتہم ولا موالاتہم)

الریاض ۲۵ شعبان ۱۴۱۵ھ / جنوری ۱۹۹۵ء

شیخ ابن باز کے اس فتوے سے اسلام کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ کوئی گروہ خواہ بظاہر وہ دشمن اسلام کیوں نہ ہو، اس کے ساتھ صلح کا معاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ معاہدہ اس کے ساتھ مودت اور موالات کو مستلزم نہیں ہوگا۔ دو چیزوں میں فرق کرتے ہوئے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ دیکھنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم سنت ہے اور اس پر آپ نے بار بار عمل فرمایا ہے۔ مزید یہ کہ یہ ایک حکمت حیات ہے، اور اس حکمت کی رعایت کے بغیر اس دنیا میں کوئی بڑی کامیابی نہیں ہوسکتی۔

پی ایل او جس کو تقریباً ۰۰۰،۰۰،۵۰، ۴ فلسطینیوں کی نمائندہ تنظیم بتایا جاتا ہے، ۱۹۶۴ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس تنظیم کا مقصد اس کے ابتدائی چارٹر کے مطابق یہ تھا ــــ اسرائیل کا استیصال اور صہیونی تحریک کا مکمل خاتمہ۔

مگر عملاً بالکل برعکس صورت پیش آئی۔ یہاں تک کہ یہ تحریک اپنے اعلان کردہ مقصد میں اس حد تک ناکام ہوئی کہ تقریباً ۳۰ سال بعد ۲۴ اپریل ۱۹۹۶ کو فلسطینی نیشنل کونسل کی میٹنگ غزہ میں ہوئی۔ اس میں اتفاق رائے سے قدیم چارٹر کی اس دفعہ کو اس سے حذف کر دیا گیا۔

مسلم پریس نے عام طور پر یاسر عرفات کے زیر قیادت فلسطینی تنظیم کے اس فیصلہ کی مذمت کی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ٹھیک یہی قابل مذمت فعل ان دوسرے مسلم رہنماؤں نے بھی عملاً کر رکھا ہے جو ابھی تک مسلم پریس میں قابل تعریف سمجھے جاتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے تقریباً تمام مسلم رہنماؤں نے یہی کیا ہے کہ ابتداءً وہ "باطل کی کامل تخریب" کے پرشور نعروں کے ساتھ اٹھے اور اب انھیں لوگوں نے ہر جگہ اس باطل کے ساتھ موافقت کا انداز اختیار کر رکھا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ فلسطینی قیادت نے پسپائی کا یہ فیصلہ اعلان کے ساتھ کیا، جبکہ بقیہ مسلم رہنما بلا اعلان اسی مصالحانہ روش کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔

پاکستانی اخبار نوائے وقت کے شمارہ ۱۶ مارچ ۱۹۹۶ میں ایک خبر جلی سرخیوں کے ساتھ نظر سے گزری۔ انسداد دہشت گردی کی عالمی کانفرنس کے خاتمہ پر حماس کی طرف سے اسرائیل کے خلاف ایک اعلان کیا گیا جو مذکورہ اخبار میں اس سرخی کے ساتھ چھاپا گیا: یہودیوں کو سکون کی نیند نہیں سونے دیں گے۔

میں نے اس خبر کو پڑھا تو میرے دل نے کہا کہ یہ اعلان ادھورا ہے۔ فلسطینی تنظیم حماس کا اعلان مکمل طور پر ان الفاظ میں ہونا چاہیے: یہودیوں کو سکون کی نیند نہیں سونے دیں گے، خواہ ہم کو وہ موت کی نیند سلا دیں۔

ایک صاحب کو مجھ سے کافی عقیدت ہے۔ کانفرنسوں میں کئی بار ان سے ملاقات ہو چکی ہے۔ اس بار ملاقات ہوئی تو انھوں نے جلدی سے میرا ہاتھ چوم لیا۔ اس کو دیکھ کر ایک بزرگ نے فرمایا: کیا یہ اسلام میں جائز ہے۔ میں نے کہا کہ اس قسم کی چیزیں عادت و عرف کے تحت ہوتی ہیں۔ ان کا جائز اور ناجائز سے کوئی تعلق نہیں۔

ابن کثیر نے باب "فتح بیت المقدس علی یدی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ" کے تحت لکھا ہے

عمرؓ جب شام پہنچے تو ابو عبیدہؓ اور دوسرے سردار ان سے ملے۔ مثلاً خالد بن الولیدؓ، یزید بن ابی سفیان۔ پھر ابو عبیدہ سواری سے اتر کر پیدل چلے اور عمر بھی سواری سے اتر کر پیدل چلے ——— پھر ابو عبیدہ نے اشارہ کیا تاکہ عمر کا ہاتھ چومیں، تو عمر نے چاہا کہ ابو عبیدہ کا پاؤں چوم لیں۔ چنانچہ ابو عبیدہ رک گئے اور عمر بھی رک گئے (البدایہ والنہایہ ۵۵/۷)

۲۹ اگست ۱۹۹۵ کی صبح کو افتتاحی اجلاس تھا۔ وہ یروشلم کے نوٹرڈیم (Notre Dame) ہال میں ہوا۔ اسٹیج کے پیچھے حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے تھے:

Community of St. Egidio
International Meetings: People and Religions
Together in Jerusalem: Jews, Christians and Moslems

معاً فی القدس: یھود و مسیحیین و مسلمین

تقریروں کا خلاصہ یہ تھا کہ تینوں مذہب (یہودیت، مسیحیت، اسلام) کو پر امن طور پر مل کر رہنا چاہیے۔ کیوں کہ ہم ایک وسیع انسانی برادری کے افراد ہیں:

We are all members of one large human family.

یہودی مقرر نے کہا کہ ہم روزانہ اپنی تین وقت کی عبادت میں اور دوسرے مواقع پر "شلوم" کہتے ہیں جس کا مطلب امن ہے۔ اس نے کہا کہ امن یہودیت کا بنیادی اصول ہے۔ امن ہے تو سب کچھ ہے، امن نہیں تو کچھ بھی نہیں:

With peace every thing, without peace nothing.

شیخ عبد السلام مدیر اوقاف القدس نے اپنی تقریر میں اسٹیج کو منبر الحب کہا۔ ان کا عربی لہجہ بہت اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ انھوں نے موضوع سے متعلق قرآن کی مختلف آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ انھوں نے کہا کہ قدس کا نام ہی بتاتا ہے کہ اس علاقہ کو ہر قسم کی اخلاقی برائیوں سے پاک ہونا چاہیے۔ آیت لا ینال عہدی الظالمین کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جو عہد پر قائم رہے اس کے لیے بھلا ہے اور وہ جو عہد سے نکل جائے وہ اس سے نکل گیا۔ شریع [illegible] ان سالم [illegible] شریعت ہی ہماری شریعت ہے، جب تک وہ منسوخ نہ ہو۔ [illegible] کے معنی کوشش [illegible] ہیں۔ اگر کوئی موت کے لیے [illegible]

غیر مسلم کی طرف سے قتال کیا جائے تو دفاعی بھی دفاع کرے گا۔ ان کا پورا انداز پرجوش جذباتی تھا۔ صدر اجلاس نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا یعنی شلوم سلام۔

۲۹ اگست کو دوپہر کے سیشن میں کئی تقریریں تھیں۔ ربی ڈیوڈ روزن (David Rosen) نے اپنی پرجوش انگریزی تقریر میں یروشلم کی زبردست تعریف بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ دنیا میں جو حسن اتارا گیا اس کا دس میں سے نو حصہ یروشلم کو دیا گیا اور باقی ایک حصہ ساری دنیا میں تقسیم کیا گیا۔ انھوں نے یہودیوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم یہاں صرف رہنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ اس لیے ہیں کہ ہم یروشلم سے محبت کریں:

We are here not just to live in Jerusalem, but to love Jerusalem.

آج کے سیشن میں میں نے آدھ گھنٹہ کا ایک پیپر پیش کیا۔ اس انگریزی پیپر کا خلاصہ یہ تھا کہ یروشلم میں تین مذاہب (یہودیت، عیسائیت اور اسلام) کے درمیان جو نزاع پیدا ہو گئی ہے اس کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت پر عمل کر کے حل کیا جا سکتا ہے۔ وہ ہے میرے لفظوں میں ——— الفصل بین القضیتین یا عدم الخلط بین الشیئین ہے۔ معراج کے موقع پر پیغمبر اسلام خدائی انتظام کے تحت مکہ سے یروشلم آئے اور یہاں مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کی۔ اس وقت یروشلم پر مشرک ایرانیوں کی حکومت تھی۔ آپ نے سیاسی اشو کو مذہب سے الگ رکھا۔ اگر آپ ایسا نہ کرتے تو اس وقت آپ ایک ایسی مسجد میں نماز نہ ادا کرتے جو عملاً غیر مسلموں کے سیاسی اقتدار کے تحت تھی (یہ مقالہ پوری شکل میں الرسالہ نومبر ۱۹۹۵ میں دیکھا جا سکتا ہے)

یہودی علماء اور دانشوروں کی باتوں اور ان کی تقریروں کو سن کر مجھے احساس ہوا کہ ان کے اندر وہ نفسیات مزید اضافہ کے ساتھ موجود ہے جو موجودہ مسلمانوں میں ہے۔ یعنی "فخر کے ساتھ کہو ہم یہودی ہیں" میں نے سوچا کہ اس کا راز کیا ہے۔ میری سمجھ میں آیا کہ اس کا راز یہ ہے کہ بائبل میں دور اول کے یہودیوں کے بارہ میں جو باتیں ہیں اس کو وہ اپنے اوپر چسپاں کر رہے ہیں۔ اور بعد کے زوال یافتہ یہودیوں کے بارہ میں جو باتیں ہیں اس کو انھوں نے نظر انداز کر رکھا ہے۔ ٹھیک ایسا ہی خود مسلمان بھی کر رہے ہیں۔ قرآن و حدیث میں دور اول کے اہل ایمان کے بارہ میں جو باتیں ہیں موجودہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو اس کا مصداق بنا رکھا ہے۔ اور اس

میں جو باتیں بعد کے زوال یافتہ مسلمانوں کے بارہ میں کہی گئی ہے، اس سے اس طرح چشم پوشی اختیار کرلیتے ہیں جیسے کہ وہ کسی اور گروہ کے بارہ میں ہوں۔

ایک یہودی دانشور جو آج کل امریکہ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی تجویز تو بڑی اچھی ہے، مگر کیا یہ ممکن بھی ہے۔ میں نے کہا کہ یقینی طور پر ممکن ہے۔ اور وہ اس طرح کہ آپ فلسطینی عربوں کو وہی شہری حقوق اور وہی مذہبی آزادی دینے کے لیے تیار ہو جائیں جو آپ خود امریکہ میں حاصل کیے ہوئے ہیں۔ امریکہ میں آپ کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ وہاں آپ کو یکساں شہری حقوق ملے ہوئے ہیں۔ یہی آپ دل سے فلسطینیوں کو دے دیں۔ اس کے بعد یہ تجویز سراسر قابل عمل ہو جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ صرف تھوڑے لوگ ہوتے ہیں جو سیاسی آرزوئیں اپنے سینہ میں لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ بیشتر لوگوں کی دلچسپی صرف اس سے ہوتی ہے کہ انھیں یکساں شہری حقوق حاصل ہوں۔ وہ آزادانہ طور پر اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ ان کے لیے تعلیمی اور اقتصادی ترقی کے مواقع کھلے ہوئے ہوں۔ ان کو اپنے ماحول میں عزت واحترام ملا ہوا ہو۔ اگر کوئی حکومت عام شہریوں کو یہ چیزیں دے دے، جیسا کہ امریکہ اپنے شہریوں کو دیے ہوئے ہے تو سیاسی شورشیں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔

میں نے سنا تھا کہ اسرائیل میں خوف وہراس کا ماحول ہونے کی وجہ سے وہاں ہارٹ اٹیک کے واقعات بہت ہوتے ہیں۔ اس کی ایک تصدیق غالباً یہ تھی کہ میں نے ایک اشتہار دیکھا اس میں بتایا گیا تھا کہ اسرائیل میں ایک نئی ہارٹ لائن ٹکنالوجی ڈولپ کی گئی ہے۔ اس کے مطابق آدمی کے ٹیلی فون سے جیبی سائز کا ایک ٹرانسمیٹر وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ ممکن ہو جاتا ہے کہ بوقت ضرورت آدمی فی الفور میڈیکل سنٹر سے ربط قائم کر سکے اور ذاتی طور پر میڈیکل سنٹر پہنچے بغیر اس کی ای سی جی جانچ ہو جائے اور فوری طور پر وہ طبی مشورہ حاصل کر سکے۔ اس اشتہار کے چند الفاظ یہ تھے:

Heart attacks are still today's No. 1 Killer,
But Heartline can help in saving lives.

اسرائیل کے شہری مسلسل طور پر اپنے کو غیر محفوظ محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے تحفظ کے لیے اسرائیلی ریاست ہر سال اپنے بجٹ کا بہت بڑا حصہ خرچ کرتی ہے۔ اسرائیلی حکومت کو یہ مہنگا خرچ منظور ہے مگر اس کو یہ منظور نہیں کہ وہ فلسطینیوں کو ان کا جائز حق دے دے اور اس طرح فلسطین میں عدم تحفظ کی صورت حال کا خاتمہ کر دے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ بجٹ والا مسئلہ صرف خرچ کا مسئلہ ہے، جب کہ حقوق دینے کا مسئلہ ان کے لیے قومی وقار کا مسئلہ ہے اور تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ قومیں اپنے وقار کا جھنڈا کسی حال میں نیچے اتارنے پر راضی نہیں ہوتیں خواہ اس کے نتیجہ میں انھیں سو گنا زیادہ بڑے نقصان کو برداشت کرنا پڑے۔

اطالوی مسیحی تنظیم (Community of St. Egidio) کی طرف سے یروشلم میں جو انٹرنیشنل کانفرنس (۲۹–۳۰ اگست ۱۹۹۵) منعقد کی گئی، اس کا شعار یہ تھا:

Together in Jerusalem: Jews, Christians and Moslems

اس کانفرنس میں ۳۰ اگست کی صبح کو "راونڈ ٹیبل" کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے درمیان ایک پولیٹکل ڈائیلاگ تھا۔ اس میں فلسطینیوں کی طرف سے مسٹر فیصل حسینی شریک تھے جو سابق مفتیِ اعظم فلسطین کے صاحبزادے ہیں۔ اسرائیل کے نمائندہ کی حیثیت سے اس کے اکونمی اور پلاننگ شعبہ کے منسٹر مسٹر یوسی بیلن موجود تھے۔ درمیانی مددگار کی حیثیت سے اٹلی کے سینیر جرنلسٹ مسٹر اریگو لیوی تھے۔

۳۰ اگست کی صبح کو میں یروشلم کے نوٹرڈیم سنٹر (Notre Dame Centre) پہنچا تو وہاں کے وسیع ہال میں ایک طرف سامعین کی کرسیاں مکمل طور پر بھری ہوئی تھیں۔ دوسری طرف اسٹیج پر ایک لمبی میز تھی جس پر تین کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک فلسطینی نمائندہ کے لیے، دوسری اسرائیلی نمائندہ کے لیے، اور تیسری درمیانی کرسی اطالوی صدر کے لیے۔ میز پر ناموں کی تختیاں حسب ذیل ترتیب کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں:

Yossi Beilin—Arrigo Levi—Feisal Husseini

ٹھیک دس بجے تینوں صاحبان پیچھے کے دروازہ سے ہال میں داخل ہوئے۔ میری نشست اگلی کرسی پر مین اسٹیج کے سامنے تھی، اس لیے میں ان کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ پُر شوق سامعین

کے اہم اور ویڈیو کیمروں کی بھاری کے درمیان دونوں کی سیاسی گفتگو شروع ہوئی۔
پہلے صدر جلسہ نے کچھ ابتدائی باتیں کیں۔ اس کے بعد دونوں نمائندوں کے درمیان گفتگو ہوئی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اسرائیلی نمائندہ کا یہ کہنا تھا کہ فلسطین کے سیاسی جغرافیہ کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب اس کو قبول کرکے آپ یہاں اپنی زندگی کی تشکیل کیجئے۔ فلسطینی نمائندہ کا مطالبہ تھا کہ یروشلم کے معاملہ پر نظر ثانی کی جائے۔ اس کو کھلا شہر قرار دیا جائے۔ اور یہاں فلسطینیوں اور یہودیوں کی دوگونہ راجدھانی قائم کی جائے:

One open city with two capitals.

مگر دونوں اپنے اپنے موقف پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ میٹنگ کا مقرر وقت ختم ہو گیا۔
گفتگو کے دوران واضح طور پر محسوس ہوتا تھا کہ اسرائیلی نمائندہ زیادہ ذہین اور ماہر ہے۔ اس کے مقابلہ میں فلسطینی نمائندہ ہر اعتبار سے کمتر ثابت ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر اسرائیلی نمائندہ نے بتایا کہ میں نے پچھلے ہفتہ اریحا جا کر مسٹر یاسر عرفات سے ملاقات کی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے ایک طرف ہم سے امن معاہدہ کیا ہے، اور دوسری طرف فلسطینی مسئلہ پر آپ جہاد کی باتیں بھی کر رہے ہیں۔ یہ تضاد کیوں۔ فلسطینی نمائندہ نے اس کے جواب میں کہا کہ اسلام میں جہاد کا مطلب صرف قتال نہیں ہے۔ انھوں نے حدیث (رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر) سنا کر کہا کہ اسلام میں زیادہ بڑا جہاد تو نفس کا جہاد ہے اور جہاد بالسیف چھوٹا جہاد ہے۔ انھوں نے جہاد اکبر کا انگریزی ترجمہ (bigger jihad) کیا اور جہاد اصغر کا ترجمہ (smaller jihad) میں سمجھتا ہوں کہ یہ جواب بھی نادرست تھا اور یہ ترجمہ بھی نادرست۔

پچھلے دن کے اجلاس میں میں نے اپنا پیپر پیش کیا تھا جس میں کہا تھا کہ اس خطہ میں امن قائم کرنے کے لیے پولیٹکل اشو اور مذہبی اشو کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ جلسہ کے اطالوی صدر نے آخر میں اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہی اس نازک مسئلہ کا حل ہے۔ میرے پاس اپنے پیپر کی ایک نقل موجود تھی۔ میں نے فوراً اٹھ کر صدر جلسہ کو وہ نقل دے دی۔ انھوں نے فوراً ہی اس کی مزید فوٹو کاپی کروائی۔ ایک اپنے پاس رکھی اور بقیہ فلسطینی اور اسرائیلی نمائندوں کو دی۔

فلسطین کے موجودہ مسئلہ کا آغاز برطانی گورنمنٹ کے بالفور ڈیکلریشن (۱۹۱۷) سے ہوتا ہے۔ یہ ڈیکلریشن سر بالفور (Arthur James Balfour) کی طرف منسوب ہے جو اس وقت لانی گورنمنٹ میں فارن سکریٹری تھا۔ اس وقت برطانیہ کے سامنے ایک ہی نوعیت کے دو مسئلے تھے۔ ایک یہ کہ آئرلینڈ کے لوگ ہوم رول مانگ رہے تھے۔ دوسری طرف برطانیہ (اور دوسرے وں کے یہودی) یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ فلسطین کو یہودیوں کا ہوم لینڈ بنا دیا جائے۔

بالفور نے آئرلینڈ کے قوم پرستوں کے لیے جو پالیسی بنائی وہ تھی ——— ہوم رول کو نرمی سے ختم کرنا (Killing home rule by kindness) مگر فلسطین کے لیے اس کی پالیسی یہ تھی کہ ودی تنظیم کے مطالبہ کو پورا کرتے ہوئے فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ چنانچہ ۲ نومبر ۱۹۱۷ کو حکومت برطانیہ کی طرف سے بالفور ڈیکلریشن کی صورت میں اعلان کیا گیا کہ فلسطین میں ودیوں کے لیے ایک نیشنل ہوم (قومی وطن) قائم کیا جائے گا۔

تاہم یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ برطانیہ کا یہ اقدام کسی اسلام دشمنی کی بنا پر تھا۔ یہ تمام تر پنے سیاسی مفاد کے لیے کیا گیا۔ ۱۹۱۷ میں جب روس میں اشتراکی انقلاب آیا تو چوں کہ اس کی ادت میں زیادہ تر یہودی شامل تھے۔ برطانیہ کے سیاست دانوں نے یہ سمجھا کہ وہ یقیناً یہودی ریک (Zionism) کی حمایت کرے گی۔ روس کو اپنے موافق بنانے کے لیے انھوں نے ضروری ھا کہ وہ یہودی مطالبہ کو مان لیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح انھیں عالمی سطح پر یہودیوں کی ہمدردی ی حاصل ہو جائے گی۔ اس طرح کے اور بھی کئی اسباب تھے جس کی بنا پر برطانی سیاست دانوں نے یہ رائے قائم کی کہ یہودی مطالبہ کو مان لینا ان کے ایمپائر کے حق میں مفید ہوگا۔ اگرچہ یہ رائے لمحی تاثر کے تحت تھی نہ کہ کسی گہرے تدبر کے تحت۔

کچھ لوگوں نے یہ رائے دی ہے کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کی شکل یہ ہے کہ یروشلم کو ایک ا شہر (Open City) قرار دے دیا جائے۔ یعنی یروشلم پر کسی بھی فریق کا کامل سیاسی اقتدار نہ ۔ بلکہ اقوام متحدہ کی ماتحتی میں اس کا انتظام چلایا جائے۔ اس انتظام کی حکمت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس طرح ہر مذہب کے لوگوں کو وہاں آزادانہ داخلہ (free access) کی اجازت مل جائے گی۔ ص طور پر یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کو جن کے مقدس مذہبی مقامات یروشلم میں واقع ہیں۔

یہ چیز بجاے خود نظریاتی طور پر کتنی ہی خوب صورت ہو مگر عملاً وہ ممکن نہیں۔ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اصل مقصود مذہبی مقصد کے لیے آزادانہ داخلہ ہے اور وہ بالفعل ہر ایک کو یروشلم میں حاصل ہے۔ یہ آزادی اسرائیل کی کسی عنایت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ زمانی تبدیلی کی بنا پر ہے موجودہ زمانہ میں مذہبی آزادی کا جو انقلاب آیا ہے اور جس کی ضمانت خود اقوام متحدہ نے دے رکھی ہے۔ اس نے ناقابل تنسیخ انداز میں اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ ہر شخص ہر جگہ جا سکے۔ شرط صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ وہ جہاں بھی جائے ہر جگہ وہ امن کی روش پر قائم رہے۔

۳۰ اگست کی شام کو سی این این (CNN) کے نمائندہ جیرولڈ کیسل (Jerrold Kessel) اور ان کی ٹیم نے ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ابتداءً انھوں نے صرف پانچ منٹ کے انٹرویو کے لیے کہا تھا۔ مگر جب انٹرویو شروع ہوا تو وہ آدھ گھنٹہ تک مسلسل بات کرتے رہے۔ انھوں نے آخر میں کہا کہ آپ کا انٹرویو بہت دل چسپ رہا۔

تمام سوالات اسلام کے بارہ میں تھے۔ ان کے سوالات کسی قدر جارحانہ ہوتے تھے۔ مگر میں خدا کے فضل سے نہایت معتدل انداز میں ان کا جواب دیتا رہا۔ ایک سوال یہ تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اپنا رول ختم کر چکا ہے۔ میں نے کہا کہ میرا تو خیال یہ ہے کہ اسلام ازسرنو اپنا رول ادا کرنے کے لیے ابھر رہا ہے۔ کچھ سال پہلے تک لوگ کمیونسٹ آئیڈیالوجی پر اعتماد کیے ہوئے تھے۔ مگر سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد اب ساری دنیا میں ایک قسم کا نظریاتی خلا (ideological vacuum) پیدا ہو گیا ہے۔ اس خلا کو صرف اسلام ہی پُر کر سکتا ہے۔

انھوں نے کہا کہ بظاہر تو اسلام اس خلا کو پُر کرتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ میں نے کہا کہ مجھے تو اس کے برعکس یہ نظر آ رہا ہے کہ آج اسلام ساری دنیا کا مرکزِ توجہ بن گیا ہے۔ آپ کے ملک میں ہیوی ویٹ چیمپین (ٹائسن) نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ برطانیہ میں ایک بہت اونچے خاندان کی لڑکی (جمائما) اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئی ہے۔ فرانس میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص (گارودی) نے قبول اسلام کا اعلان کر دیا ہے، وغیرہ۔

کناڈا کی ٹی وی کمپنی (Villagers Communication) کے نمائندہ اسٹیو ڈیم (Steve Dawn Deme) اور ان کی پارٹی نے ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ان کے سوالات زیادہ تر

مسلمانوں کی موجودہ حالت کے بارے میں تھے۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہم کو چاہیے کہ مسلمانوں کو اسلام کی روشنی میں دیکھیں نہ کہ مسلمانوں کی روشنی میں اسلام کو:

You have to judge Muslims by Islam and not vice versa.

تیسرا انٹرویو بی بی سی (ٹی وی) کی خاتون نمائندہ جانا بیرس (Jana Beris) کا تھا مگر وقت کی کمی کے باعث وہ بہت مختصر رہا۔

مسلمانوں میں روایتی طور پر یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ یہودی بحیثیت قوم ہمیشہ کے لیے حقیر اور ذلیل کر دیے گئے ہیں۔ قتادہ نے کہا کہ تم کسی بھی ملک میں کسی یہودی سے ملو تو تم پاؤ گے وہ لوگوں میں سب سے زیادہ ذلیل ہے (لا تلقی یهودیا فی بلد الا وقد وجدته اذل الناس) تفسیر ابن کثیر ۱/۲۹۲

موجودہ زمانہ میں معاملہ اس کے برعکس دکھائی دیتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں یہودی لوگوں کے درمیان کم از کم ظاہری طور پر باعزت جگہ پائے ہوئے ہیں اور مسلمان عملاً ہر جگہ بے قیمت ہو رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اقبال نے کہا:

یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود

ممکن ہے کہ ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ (البقرہ ۶۱) سے مراد یہودیوں کی وہ نسل ہو جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی معاصر تھی۔ اور مسلمان اس شعر کے مصداق ہوں:

وہ زمانہ میں معزز تھے مسلماں ہو کر ہم ہوئے خوار و زبوں تارکِ قرآں ہو کر

اسحاق ناخون (Yitzhak Navon) پہلا اسرائیلی صدر ہے جس نے ستمبر ۱۹۸۰ میں مصر کا دورہ کیا۔ اس کو قاہرہ کے قصر عابدین میں ٹھہرایا گیا تھا۔ اسرائیلی صدر نے قاہرہ کے استقبالیہ جلسہ میں فصیح عربی میں تقریر کی۔ اس میں اس نے مصریوں کو دعوت دی کہ وہ اسرائیل آئیں اور وہاں آزادانہ طور پر لوگوں سے ملیں ــــ اگر آپ ہم کو دوست سمجھیں تو دوست دوست سے ملتا ہے۔ اور اگر آپ ہم کو دشمن سمجھیں تو عربی مثل ہے کہ اپنے دشمن کو پہچانو:

اذا کنتم تعتبروننا اصدقاء فالصدیق یزور صدیقه و اذا کنتم تعتبروننا اعداء فالمثل العربی یقول: اعرف عدوك۔

الرسالہ

Al-Risala

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

خصوصی شمارہ

فلسطین نمبر — دوسری قسط

نئی کتابیں



Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, Near Dargah
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic@ [illegible]

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 8
One year Rs. 90, Two years Rs. 170,
Three years Rs. 250, Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham [illegible]
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY
MAKTABA AL-RISALA
[illegible] Ocean Ave., [illegible] Brooklyn
New York NY 11230 Tel. [illegible]

Printed and published by [illegible]

مسلم اخبارات [illegible] [illegible]
فلسطینیوں کو [illegible] دیتے ہیں [illegible] [illegible]
کی بربریت۔

لیکن اگر آپ دوسرے اخبارات کو دیکھیں تو [illegible] صورت حال کا بھی اندازہ ہوگا [illegible] ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] کی بربریت کسی فلسطینی پر محض فلسطینی ہونے کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ اس کے [illegible] بنا پر ہوتا ہے۔ جو فلسطینی صرف اپنے کام سے کام رکھنا چاہتے ہیں، وہ آج بھی اسرائیل میں پرامن طور پر رہ رہے ہیں۔ مگر جو فلسطینی سیاسی حریف بنتے ہیں یا تشدد کا عمل کرتے ہیں ان کے اوپر پولیس بھی کارروائی کرتی ہے۔ پولیس یہی کارروائی خود یہودیوں پر بھی اس وقت کرتی ہے جب کہ وہ سیاسی ہنگامہ کریں یا تشدد اور تخریب کاری کریں۔

موجودہ زمانہ میں مسلم صحافت نے ہر جگہ ایک مجرمانہ رول ادا کیا ہے۔ ہر ملک میں اور ہر زمانہ میں خیر اور شر ساتھ ساتھ موجود رہتے ہیں۔ یعنی منفی واقعات بھی اور مثبت واقعات بھی۔ موجودہ زمانہ کے مسلم اخبارات نے یہ کیا کہ انھوں نے ہر جگہ صرف منفی پہلوؤں کی رپورٹنگ کی اور مثبت پہلوؤں کو سرے سے بیان ہی نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ کے مسلمان اپنے ملک اور اپنے سماج کے بارے میں منفی ذہنیت کا شکار ہوگئے۔ وہ یہ سمجھنے لگے کہ دنیا کی قومیں ان کی دشمن ہیں اور ان کے خلاف سازش کرنے میں مشغول ہیں۔ چنانچہ وہ تمام قوموں کے خلاف نفرت اور عداوت کی نفسیات میں مبتلا ہوگئے۔ اسی نفسیات کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر ملک میں، بشمول فلسطین مسلمانوں کے لیے بہترین مواقع موجود ہیں مگر وہ ملے ہوئے مواقع کے درمیان ان کو استعمال کرنے سے محروم ہیں۔

ایک مسلم دانشور جنھوں نے فلسطین کے مسئلہ پر کئی کتابیں لکھی ہیں، ان سے میں نے کہا کہ اسرائیلی حکومت لوگوں کو ویزا دینے میں بڑی فراخ دل ہے [illegible] نے طنزیہ انداز میں جواب دیا: اس کا سبب تو واضح ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ [illegible] زیادہ

[illegible] ان کی تقلید کر سکیں۔

[illegible] ایک مثال ہے جس کے [illegible] تعاون [illegible] مرزا [illegible] 1991 میں انھوں نے
[illegible] اسرائیل کا [illegible] (16-30 جون 1991) کا [illegible] کیا۔ اس سفر کے بعد
[illegible] انھوں نے ایک آرٹیکل لکھا جو نیوز فرام اسرائیل (News from Israel) کے شمارہ
[illegible] 1991 میں شائع ہوا ہے۔ یہ پرچہ بمبئی میں واقع اسرائیلی قونصل
[illegible] (Consulate of Israel) کی طرف سے شائع کیا جاتا ہے۔ مسٹر [illegible] 1991 کے مذکورہ آرٹیکل کے
[illegible] اقتباسات [illegible] جو یہاں نقل کیے جا رہے ہیں۔

اس آرٹیکل کو پڑھنے کے بعد میں نے ایک صاحب سے کہا کہ جو مسلمان اس طرح کی باتوں پر فخر کرتے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ مسلم ملکوں کو آمادہ کریں کہ وہ بھی اپنے یہاں ایسے واقعات پیدا کریں جن کو لوگ آکر دیکھیں اور پھر واپس جاکر اس کی تعریف میں مضامین شائع کریں۔ جیسا کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تھا۔ اس وقت دنیا بھر کے لوگ بغداد اور قرطبہ اور غرناطہ کو دیکھنے کے لیے آتے تھے اور پھر واپس جاکر اپنے ہم وطنوں سے اس کا شاندار تذکرہ کرتے تھے۔

حدیث میں آیا ہے کہ خالفوا الیہود (یہود کے خلاف عمل کرو) اس کا مطلب اس عمر [illegible] میں آیا۔ یہاں "یہود" کا لفظ علامتی معنی میں ہے۔ یہ حدیث یہود کی گروہی مخالفت کے معنی میں نہیں ہے۔ وہ دراصل ظاہر پرستی والے دین کے خلاف ہے جو دورِ زوال میں یہود کے اندر بہت زیادہ آگئی تھی۔

حدیث میں ہے کہ یہود جوتا پہن کر نماز نہیں پڑھتے، اس لیے تم اس کے خلاف کرو۔ چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جوتا پہن کر نماز پڑھی (مشکاۃ المصابیح 1/249) اسی طرح آپ نے افطار میں تعجیل کرنے کی ہدایت فرمائی اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ یہودی افطار میں تاخیر کرتے ہیں [illegible] (سنن ابی داؤد 2/316)

اس کا مطلب [illegible] یہ ہے کہ یہود کے یہاں دین کی داخلی روح ختم ہو گئی تھی البتہ وہ ظواہر کا خوب اہتمام [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] سمجھتے ہیں [illegible] کے بارے میں [illegible]

[illegible] مطلب ہے۔

[illegible] سخت ظلم و ستم ہوتا تھا۔ [illegible]
[illegible] ایک عسکری طاقت تھا۔ جہاں اس وقت عیسائی [illegible]
[illegible] مقابلہ میں رومی لشکر کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد بیت المقدس
[illegible] میں قلعہ بند ہو گیا [illegible] محاصرہ کر لیا [illegible] لوگ مجبور ہو گئے
اور صلح کی پیش کش کی۔ ان کی شرط یہ تھی کہ خلیفہ خود مدینہ سے یہاں تشریف لائے۔

حضرت عمر فاروق مدینہ سے روانہ ہو کر جابیہ پہنچے۔ پھر وہاں سے بیت المقدس گئے۔ عیسائیوں کی اطاعت گزاری پر مصالحت ہوئی۔ اس معاہدہ کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں آئی ہے۔ اس کی دفعات میں سے ایک دفعہ یہ تھی کہ ان کے عبادت خانے ڈھائے نہیں جائیں گے اور نہ ان میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ ان کے دین کے معاملہ میں ان پر کوئی جبر کیا جائے گا (ولا تہدم ولا ینتقص منہا [illegible] ولا یکرہون علی دینہم)

حضرت عمر فاروق بیت المقدس کے کنیسۃ القیامہ میں داخل ہوئے۔ عصر کی نماز کا وقت آ گیا تو آپ نے نماز پڑھنا چاہا۔ پادری نے کہا کہ یہیں پڑھ لیجئے۔ مگر حضرت عمر نے اندر نماز نہیں پڑھی بلکہ باہر نکل کر سیڑھی پر اکیلے نماز پڑھی۔ یہ دیکھ کر پادری نے کہا کہ اگر آپ چرچ کے اندر نماز پڑھتے تو مسلمان اس کو نظیر بنا لیتے اور کہتے کہ یہاں خلیفہ عمر نے نماز پڑھی ہے۔

جنرل وائزمان اسرائیل کی کیبنٹ کا ایک ممبر تھا۔ وہ مصر سے دوستی کی باتیں کرتا تھا۔ ایک صاحب نے اس کا قول عربی میں اس طرح نقل کیا کہ اعتماد باہمی اور مفاہمت ہی کی حکمت تمام مشکلات کے حل کا راستہ ہے (التفاهم [illegible])
[illegible]
[illegible] (On Earo [illegible]) [illegible]

[illegible] کی [illegible] ملکوں کے
[illegible]
[illegible] اسلام [illegible] چند عربوں سے [illegible]
[illegible] چند عربوں کا [illegible] فروش
[illegible]

یہ [illegible] ایک پہلو ہے اس حدیث کا جس میں آپ نے یہ پیش گوئی کی کہ ——— یہود بہتر فرقوں میں بٹ گئے، اور تم ان سے بھی زیادہ فرقوں میں بٹ جاؤ گے۔

میری سمجھ میں آیا کہ ہر جگہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جو تباہ کن جھگڑے پیدا ہوتے ہیں وہ صرف باہر والوں کی شرکت سے پیدا ہوتے ہیں۔ جھگڑا پیدا ہونے کے بعد اگر معاملہ صرف مقامی لوگوں تک محدود رہے تو دونوں فریق فطرت کی رہنمائی میں کام کرتے ہیں اور [illegible] مسئلہ کو حل کر لیتے ہیں۔ مگر جب جھگڑا باہر کے "لیڈروں" کے ہاتھ میں چلا جائے تو بات بگڑ جاتی ہے۔ اور معمولی نزاع ناقابل حل مسئلہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

فلسطین کے مقامی مسئلہ کو سب سے پہلے اخوانیوں نے عالمی مسئلہ بنایا۔ [illegible]۴۹ میں شیخ حسن البنا نے جذباتی نعرے، تقریریں کر کے قاہرہ میں ایک لاکھ مصریوں کو جمع کیا اور قاہرہ کی سڑکوں پر لبیک یا فلسطین لگاتے ہوئے جلوس نکالا۔ یہ بیرونی مداخلت اضافہ ہی بڑھتی رہی۔ مگر اس کے نتیجہ میں عملاً جو ہوا وہ صرف یہ کہ ذلت اور ناکامی میں ناقابل تلافی حد تک اضافہ ہو گیا۔

ترکی کی خلافت کے لیے ہندوستان میں دھواں دھار تحریک چلانا، پاکستان کے لیے ان علاقوں میں ہنگامہ کھڑا کرنا جہاں پاکستان بننے والا نہ تھا۔ بابری مسجد کو اجودھیا کے مقامی مسئلہ سے نکال کر سارے انڈیا بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کا مسئلہ بنانا۔ [illegible] کے سوال کو [illegible] کشمیری مسلمانوں اور ہندوستانی مسلمانوں سے بڑھا کر سارے عالم کے مسلمانوں کا سوال بنا دینا۔ یہ [illegible] نہیں ہے بلکہ صرف نادانی ہے۔ اور اس نادانی نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو [illegible] نقصان پہنچایا ہے۔

... میں ایک اسلامک آرٹ میوزیم ہے۔ اس میں [illegible] کے ۲۰ اسلامک آرٹ رکھے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک لائبریری بھی ہے جس میں قیمتی کتابیں جمع کی گئی ہیں۔

اس میں ایک قیمتی تصویر ہے۔ اس تصویر میں مغل حکمراں شاہجہاں کو تخت پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ کو اوپر اٹھا کر خدا سے دعا کر رہا ہے گویا زبان حال سے کہہ رہا ہے ——— میں اگرچہ بادشاہ ہوں، مگر خدا کے آگے میں بھی عام انسانوں کی طرح ایک محتاج انسان ہوں۔

اسی طرح اس میں کلیلہ و دمنہ کا ایک فارسی نسخہ ہے۔ اس میں کلیلہ و دمنہ کے واقعات کو رنگین تصویروں کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ وغیرہ۔

کویت کے عربی ہفت روزہ المجتمع (۴ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ، یکم اگست ۱۹۹۵) میں المحامی خالد سیف (کردستان، العراق) کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے قبۃ الصخرہ اور المسجد الاقصی کی تصویریں چھاپی ہیں۔ اور لکھا ہے کہ دونوں الگ الگ عمارتیں ہیں مگر ۸۰٪ فی صد مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں ایک ہیں اور قبۃ الصخرہ ہی مسجد اقصی ہے

(ان ۸۰٪ من المسلمین یعتقدون بان مسجد قبۃ الصخرۃ هو المسجد الاقصی)

عجیب بات یہ ہے کہ خود مذکورہ مضمون نگار نے بھی قبۃ الصخرہ کو "مسجد قبۃ الصخرہ" لکھا ہے، حالاں کہ وہ سرے سے مسجد ہے ہی نہیں۔

انھوں نے لکھا ہے کہ جب بھی مسجد اقصیٰ یا فلسطین کا ذکر ہوتا ہے تو ذہن فوراً سنہری رنگ کے قبۃ الصخرہ کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلم دنیا کے ذرائع اعلام جب بھی فلسطین کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہمیشہ وہ قبۃ الصخرہ کی تصویر دکھاتے ہیں۔ حتی کہ خود فلسطینی بھی اپنے جلسوں میں جو لوح لگاتے ہیں اس پر بھی قبۃ الصخرہ (بیت المقدس) کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ ہمارے یہاں فلسطین کے موضوع پر ایسی کتابیں چھپی ہیں جن کے ٹائٹل پر قبۃ الصخرہ (بیت المقدس) کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اور اس کے نیچے لکھا ہوا ہے: وا اقصاہ۔

مضمون نگار نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ایسا یہودی سازش کے تحت ہوا

۴- [illegible] سے بھی معمور (ابیعۃ عن المعین یجہد حق القلب)
[illegible] مسجد اقصیٰ کو مسلمانوں کی ملکیت سے دور کر دیں، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ان
کے [illegible] ۔ اور [illegible] جب ان کو اٹھائیں گے تو مسلمانوں کی غیرت کی
[illegible] شمار کی گئی ہے۔

اس قسم کی [illegible] معاملہ نہیں ہے، بلکہ بعض کا عقیدت
تمام ہی مسلمان اس مسئلہ کی حقیقی نوعیت سے بے خبر ہیں۔

یہودیوں کی سب سے زیادہ مقدس چیز دیوار گریہ ہے، اور مسلمانوں کی
سب سے زیادہ مقدس چیز مسجد اقصیٰ۔ عجیب بات ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل
متصل ہیں۔ ذیل کی تصویر مسجد اقصیٰ کا خارجی منظر پیش کرتی ہے۔ اوپر کے حصہ میں اس کا گنبد
اور اس کی چہار دیواری ہے۔ اور نیچے اس سے بالکل ملی ہوئی دیوار گریہ ہے جس کا ایک جزو
تصویر میں دکھائی دے رہا ہے۔



دیوارِ گریہ (Wailing Wall) کا موجودہ نام مغربی دیوار (Western Wall) ہے [illegible] رومیوں نے اس کو ۷۰ء میں تباہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس کی مرمت [illegible] ہے جو اب اس سے ملی ہوئی ہے۔ اس کے اوپر [illegible] فصیل بنی ہوئی ہے جو مسجد اقصیٰ کا احاطہ کیے ہوئے ہے:

The wall now forms part of a larger wall that surrounds the Muslim Dome of the Rock and Al-Aqsa mosque. (EB/X/627)

اس دیوار کی لمبائی ۵۰ میٹر ہے اور وہ ۲۰ میٹر اونچی ہے۔ یہود کا عقیدہ ہے کہ خدا کی رحمت کبھی اس مغربی دیوار سے جدا نہیں ہوتی۔ یہود بڑی تعداد میں یہاں دعا مانگنے کے لیے آتے ہیں۔

مصری لطیفہ بنانے میں بہت مشہور ہیں۔ انھوں نے ایک لطیفہ بنایا کہ امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر جب یروشلم گئے تو اس وقت کے اسرائیلی وزیر اعظم مناہن بیگن ان کو لے کر دیوارِ گریہ کے پاس گئے۔ یہودیوں کی نظر میں یہ ان کی سب سے زیادہ مقدس جگہ ہے۔ وہاں پہنچ کر جمی کارٹر نے دعا کی۔ انھوں نے اپنی دعا میں کہا کہ اے خدا! عربوں کو اور اسرائیل کو امن تک پہنچنے میں مدد دے۔ بیگن جو پاس ہی کھڑے تھے، انھوں نے فوراً کہا آمین۔ اس کے بعد جمی کارٹر نے کہا کہ خدایا! مصر کو اور اسرائیل کو پر امن طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی توفیق دے۔ بیگن نے کہا آمین۔ اس کے بعد جمی کارٹر نے کہا کہ خدایا! اسرائیلیوں کو بتا دے کہ وہ عربوں کو وہ تمام علاقے واپس کر دیں جن پر انھوں نے ۱۹۶۷ کی جنگ میں قبضہ کیا ہے۔ یہ سنتے ہی بیگن کا لہجہ بدل گیا۔ انھوں نے کہا کہ جنابِ صدر، میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آپ ایک دیوار سے بات کر رہے ہیں۔

یہ لطیفہ خود عربوں کا مرثیہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ۱۹۶۷ تک جو علاقے انھیں حاصل تھے ان کو انھوں نے کیوں کر کھو دیا۔ یہ صرف اپنی پُرجوش حماقت سے۔ مصر کی عرب قیادت نے نہر سوئز کو قبل از وقت قومی ملکیت میں لینے کا احمقانہ اقدام کر کے سارے یورپ کو اپنا مخالف بنا لیا۔ اس کے بعد صحرائے سینا سے اقوام متحدہ کے مشاہدین کو واپس کر کے اسرائیل کے لیے اقدام کے دروازے کھول دیے۔ اس طرح کی کچھ اور نادانیوں نے اسرائیل کو موقع

بلکہ یورپ کی مدد سے مصر پر حملہ کرے اور اس کی فوجی طاقت کو توڑ دے۔

[illegible] قرب قیامت [illegible] جو اسے از خود حاصل تھے۔

مسلمان عام طور پر قدس کے مسئلہ کو قبلۂ اول کی بازیابی کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ مگر یہ بات کسی اعتبار سے بھی درست نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ۱۳ سال تک کعبہ کی طرف رخ کرکے عبادت کرتے رہے۔ اس لیے "قبلۂ اول" کا لفظ اگر کسی کے لیے بولا جا سکتا ہے تو وہ خود کعبہ ہے۔ ہجرت کے بعد تقریباً ۱۶ مہینہ تک آپ نے بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھی۔ اس کے بعد تحویل قبلہ کا حکم آیا اور ہمیشہ کے لیے کعبہ مسلمانوں کا قبلۂ عبادت بن گیا۔ اس تاریخ کے مطابق، بیت المقدس قبلۂ درمیانی ہے نہ کہ قبلۂ اول۔

دوسری اہم تر بات یہ ہے کہ قدس میں جو اصل اسلامی سبق ہے، وہ قومی یا سیاسی یا جغرافی نوعیت کا نہیں ہے۔ وہ ان جھگڑوں سے مکمل طور پر الگ ایک اور سبق ہے۔ اور وہ مدعو کی تالیف قلب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد بیت المقدس کو قبلہ کیوں بنایا۔ اس کی وجہ مسلّم طور پر یہود کی تالیف قلب تھی جو رسول اللہ کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے مدینہ پہنچے تو آپ کے لیے دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ سابق کی طرح کعبہ کو قبلہ بنائیں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ مدینہ کے یہود کی پیروی کریں جو بیت المقدس کی طرف رخ کرکے عبادت کرتے تھے۔ آپ نے قدس کا انتخاب فرمایا، اس طمع میں کہ یہود آپ کی طرف مائل ہوں گے اور ایمان لائیں گے (فاختار القدس طمعاً في ايمان اليهود واستمالتهم) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، ۱۵۰/۲

گویا قدس کا اصل سبق یہ ہے کہ مدعو کی رعایت یہاں تک کرو کہ ان کے قبلہ کو اپنا قبلہ بنالو۔ آج اگرچہ ہمیں قبلہ بدلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم بہت سے دوسرے معاملات ہیں جن میں مدعو قوموں کی رعایت کرکے انھیں اسلام کے قریب لایا جا سکتا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان اس سنت رسول سے مکمل طور پر بے خبر ہیں، خواہ وہ فلسطین کے مسلمان ہوں یا دوسرے ملکوں کے مسلمان۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان غیر مسلم قوموں سے ہر جگہ رقابت قائم کیے

ہوتے ہیں۔ یہ گویا [illegible] کے ہم اثرات ہیں۔

ایک یہودی عالم جو اچھی عربی جانتا تھا، اس نے کہا کہ قدیم [illegible] کہ ہماری کتابوں میں نہیں بلکہ خود آپ کی مقدس کتاب قرآن میں بھی [illegible] حق بتایا گیا ہے۔ جب کہ قرآن میں کہیں نہیں لکھا ہے کہ قدس مسلمانوں کو دے دیا گیا۔

اس نے کہا کہ آپ لوگ قدس کو قبلۂ اول کہتے ہیں مگر وہ قبلۂ اول کہاں ہے وہ تو قبلہ عارضی تھا۔ آپ کے پیغمبر پہلے کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ پھر وقتی طور پر کچھ دنوں بیت المقدس کو قبلہ بنایا اور اس کے بعد پھر کعبہ کو قبلہ بنالیا۔ آپ کے عقیدہ کے مطابق آپ کے پیغمبر نے یروشلم آکر یہاں نماز پڑھی۔ اس وقت یہاں غیر مسلموں کی سیاسی حکومت قائم تھی۔ آپ بھی ہماری سیاسی حکمرانی کے تحت یہاں آکر نماز پڑھیے۔ ہم آپ کو نہیں روکتے۔

میں نے جواب دیا کہ اس مسئلہ پر مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان سنجیدہ انداز میں ڈائیلاگ ہونا چاہیے۔

پاکستان میں اگر آپ جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہاں ہر چیز کو اسلامائز کر دیا گیا ہے۔ حتی کہ ایک فلم کمپنی اپنی کسی فلم کو ریلیز کرنے والی ہوگی تو اس کا اشتہار ان الفاظ میں شائع کیا جائے گا —— "ان شاء اللہ، اگلے جمعہ کو ہماری نئی فلم ریلیز کی جائے گی"

یہی معاملہ اسرائیل کا ہے۔ وہاں ہر چیز کو یہودی رنگ میں رنگ دیا گیا ہے۔ مثلاً یروشلم کی ایک جدید کالونی کا نام قریۂ داؤد (David's Village) ہے۔ ایک اور کالونی کا اشتہار میں نے دیکھا۔ اس کے اوپر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا کہ ارض موعود میں آپ کا اپارٹمنٹ :

Your own apartment in the promised land

ایک اخبار میں ایک اسرائیلی کمپنی کا اشتہار دیکھا۔ جس کا کام تل ابیب میں نجی جائدادوں کا انتظام (property management) کرنا ہے۔ اشتہار میں گھر کی دیکھ بھال اور اس کے انتظام کے سلسلہ میں جن باتوں کا ذکر تھا، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ —— اور ہم حفاظت کا انتظام کرتے ہیں :

We arrange security

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسرائیل میں کس طرح عام لوگ غیر محفوظ حالات میں زندگی گزارتے ہیں۔ یہودی جانتے ہیں کہ وہ صرف اسرائیل (فلسطین) کے اوپر زندہ نہیں رہ سکتے۔ انھیں ساری دنیا سے اپنی زندگی کی خوراک حاصل کرنا ہے۔ ایک یہودی تاجر نے کہا —— عالمی تجارت ہمارا مستقبل ہے :

Global business is our future.

قدیم زمانہ میں کوئی ملک زیادہ تر اپنے مقامی ذرائع پر انحصار کرتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں جدید کمیونی کیشن کے ظہور میں آنے کے بعد صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔ آج یہ ممکن ہوگیا ہے کہ آپ ایک چھوٹے سے خطۂ زمین پر بیٹھ کر ساری دنیا میں اپنے کاروبار کو پھیلائیں، اور ساری دنیا سے اپنے لیے رزق کا سامان حاصل کریں۔

ادارے چلانے کا روایتی طریقہ یہ ہے کہ اس کے ممبران کی ایک جگہ میٹنگ ہو۔ اس میں تبادلۂ خیال کے بعد زیر بحث مسئلہ میں کوئی بات طے کی جائے اور پھر اس پر عمل درآمد کیا جائے۔ اب یہ طریقہ دیر طلب قرار پا چکا ہے۔

یہودیوں نے موجودہ زمانہ میں ایسے عالمی ادارے قائم کیے ہیں جس کے ممبر صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو نہایت باشعور ہوں۔ یہ لوگ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں مگر دوری کے باوجود ان کے اجتماعی فیصلہ میں ایک یا دو دن سے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ یہ معجزہ جدید کمیونی کیشن کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔

مثلاً عالمی پریس میں ایک چیز چھپتی ہے جو یہودی مفاد سے ٹکراتی ہے۔ اب یہ ادارہ یہ کرتا ہے کہ فوراً بذریعہ فیکس اس کی نقل تمام ممبروں کے نام ساری دنیا میں بھیج دیتا ہے۔ یہ لوگ اپنے تبصرے دوبارہ فوری طور پر بذریعہ فیکس ادارے کو بھیج دیتے ہیں۔ اب یہ تمام کاغذات ایک ایکسپرٹ شخص کو پہنچا دیے جاتے ہیں۔ وہ ان کا مطالعہ کرکے فوری طور پر اپنا تحریری ردعمل ادارہ کو دے دیتا ہے۔ ادارہ اس تحریر کو دوبارہ تمام ممبران کے نام فیکس کر دیتا ہے۔ چند گھنٹوں میں تمام ممبران کی رائیں دوبارہ بذریعہ فیکس ادارہ کے صدر دفتر میں وصول ہوجاتی ہیں۔ ان کو

سامنے رکھ کر [illegible] اسپرٹ اپنی تحریر کو دوبارہ تیار کرتا ہے۔ [illegible]
[illegible] جاتا ہے۔ اس طرح گویا ایک یا دو دن میں یہودی [illegible]
بھری گئی ہے کہ [illegible] دعوتی مقصد کے تحت اس قسم کا ایک [illegible]
کرے گا۔ یہ ادارہ جدید کمیونی کیشن کو استعمال کر کے ان شاء اللہ عالمی اسلامی دعوت کی مہم
چلایا کرے گا اور اس سلسلہ کے ضروری کام انجام دے گا۔ اور یہ سب کچھ رسمی میٹنگ کے
بجائے ٹیلی فون، فیکس، انٹرنٹ کے ذریعہ انجام پائے گا۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

یروشلم میں مخصوص انداز کی ایک یادگار تعمیر کی گئی ہے۔ اس کا انگریزی نام (Homage to Jerusalem) ہے۔ اس کو تین مذہبوں کا یروشلم کہا جاتا ہے:

Jerusalem: The Three Religions

اس میں تینوں سامی مذہب کے علامتی تقدس بنائے گئے ہیں۔ ان کو بتاتے ہوئے ایک یہودی نے کہا:

It represents elements that Judaism, Islam and Christianity have in common.

ایک صاحب سے مہدی سوڈانی کا تذکرہ ہوا۔ انھوں نے کہا کہ مہدی سوڈانی نے اگرچہ عوام کی بھیڑ اپنے گرد اکٹھا کر لی تھی۔ مگر وہ کوئی معتدل آدمی نہیں تھے۔ انھوں نے بتایا کہ مصر کے حکمراں محمد علی پاشا نے ۱۸۳۵ میں سوڈان پر حملہ کیا تھا۔ مہدی سوڈانی کو اس کی خبر ملی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ دریائے نیل کے راستہ سے سوڈان پہنچنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مریدوں کی مجلس میں کہا کہ وہ دریائی راستہ سے سوڈان پہنچنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ خدا کی قسم، میں دریا کا سارا پانی پی کر اس کو خشک کر دوں گا (ما اللہ شرب البحر ۔۔)

فلسطین (اسرائیل) کا ایک شہر حیفہ ہے۔ یہاں پانچ مذہب کے لوگ رہتے ہیں اور ہر مذہب کی عبادت گاہیں اور مذہبی ادارے وہاں موجود ہیں ——— یہودی، مسلمان، عیسائی، دروزی اور بہائی۔ عرب مسلمانوں کی تعداد ۱۰ فی صد سے کچھ اوپر ہے۔ ایک یہودی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آپ دیکھئے، یہ سب لوگ کس طرح رواداری کے ساتھ یہاں رہ رہے ہیں،

...they share a unique spirit of tolerance.

بہائی فرقہ دنیا میں پانچ ملین ہے۔ حیفہ میں ماؤنٹ کارمل کے اوپر اس کا مرکز ہے جس کا سنہرا گنبد دور سے دکھائی دیتا ہے۔ بہائی مذہب ایران میں ۱۸۴۴ میں وضع کیا گیا۔ اس کے بانی بہاء اللہ تھے۔ حکومت ایران سے ان کا اختلاف ہوا۔ حکومت نے ان کے ۲۰ ہزار آدمیوں کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد اس مذہب کو ماننے والے دنیا کے مختلف ملکوں میں پھیل گئے۔ اسرائیل کے قیام کے بعد ۱۹۴۸ میں انھوں نے یہاں اپنا مرکزی دفتر قائم کیا۔ ۱۹۵۳ میں یہ موجودہ عمارت بن کر مکمل ہوئی۔ ایک بہائی نے کہا :

Our relations with the Israelis are proper and friendly.

اسرائیل میں بہائیوں کی تعداد ایک سو سے کچھ زیادہ ہے۔ تاہم ان کے افراد بڑی تعداد میں یہاں زیارت* کے لیے آتے رہتے ہیں۔ بہائی اپنے مذہب کو یونیورسل مذہب کہتے ہیں۔ ان کے یہاں شادی بیاہ پر کوئی پابندی نہیں۔ وہ وحدت ادیان کی وکالت کرتے ہیں۔ ایک بہائی نے کہا :

It doesn't matter what you believe, the scientific fact is that we are all brothers inhabiting the same world. We believe that all religions have validity and we accept them.

اسرائیل کے زمانۂ قیام میں کئی بار میں نے دیکھا کہ یہودی کس طرح یہاں ایک شاندار زندگی گزار رہے ہیں۔ "کیا یہ وہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے" میں نے سوچا۔ میری سمجھ میں آیا کہ لعنت کا کوئی لازمی تعلق خوش حالی یا بدحالی سے نہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ کوئی فرد یا قوم خدا کے نزدیک لعنت زدہ ہو مگر موجودہ دنیا میں وقتی طور پر وہ شاندار قسم کی مادی زندگی حاصل کر لے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ملعون ہونے کا مطلب رحمتِ الٰہی سے محروم ہونا ہے۔ جس فرد یا گروہ پر خدا کی لعنت ہو وہ بے حسی کا شکار ہو جائے گا۔ خدا کی نظر میں اس کا ہر عمل بے قیمت ہو جائے گا، خواہ بظاہر وہ کوئی درست عمل کیوں نہ دکھائی دیتا ہو۔

یہودی نفسیات فخر کی نفسیات ہے۔ ان کی ہر بات میں فخر کا احساس جھلکتا ہے۔

[illegible] (thaspen) کے نام سے اپنے ادارہ کی نمائندگی کرتے ہوئے [illegible]
[illegible] تک اسرائیل آئے تاکہ دیکھیں کہ یہودیوں نے [illegible]
[illegible] اپنی قومی شناخت کو برقرار رکھ سکیں ؛

Even the Dalai Lama visited Israel to see what technique the Jews developed to survive and maintain their identity.

میں خود اریحا (Jericho) نہ جا سکا۔ ایک کرسچین سیاح جو اریحا (مسلم علاقہ) تک گیا تھا۔ اس نے کہا کہ میں سمجھتا تھا کہ سرحد پر زبردست پہرہ ہوگا۔ لیکن مجھے تعجب ہوا جب میں نے دیکھا کہ وہاں ایک گارڈ ہے جس کو ہماری جانچ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس نے شلوم کہہ کر ہمارا استقبال کیا ؛

Expecting the border to be heavily guarded, I was surprised to see a disinterested guard, who upon seeing us welcomed us with a shalom.

فلسطین کا ایک حصہ صحرا ہے۔ یہ صحرا ہزاروں سال سے یوں ہی پڑا ہوا تھا۔ موجودہ زمانہ میں یہ معلوم ہوا کہ پانی سے محرومی کسی زمین کو ریگستان بناتی ہے۔ اگر پانی فراہم کیا جا سکے تو ریگستان کو سرسبز علاقہ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ یہودی نے اس نئی دریافت سے فائدہ اٹھایا اور فلسطین کے صحرائی علاقہ کے بڑے حصہ کو کھیت اور باغ میں تبدیل کر دیا۔ ایک اسرائیلی نے اپنے مضمون میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فخر کے ساتھ لکھا تھا کہ ہم نے ڈرِپ آبپاشی کے طریقہ کو ترقی دے کر ریگستان کو سرسبز و شاداب بنا دیا :

That a country can be transformed from barren desert to a lush wonderland, can be attributed to the miracle of drip irrigation.

ایک سیاح جس نے فلسطین کے صحرائی علاقہ کو دیکھا تھا۔ اس نے کہا کہ ہم یہاں آئے تھے کہ صحرا کو دیکھیں گے مگر یہاں ہمیں سبزہ دیکھنے کو ملا :

We had come here to see desert, but, instead, we found greenery.

یہاں ایک ہوٹل الحمرا ریستوراں ([illegible] Restaurant) [illegible] ہے۔ وہ بہت

[illegible] ظلم میں قائم ہے۔ میں اس ظلم کا سبب معلوم نہ کر سکا۔ تاہم اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسطین (اسرائیل) پر مسلم تہذیب کا اثر زیادہ ہے۔

اسرائیل اور اردن کے درمیان ایک انوکھی جھیل ہے جس کو البحر المیت (Dead Sea) کہتے ہیں۔ وہ سطح سمندر سے ۱۳۰ میٹر نشیب میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۳۰۰ مربع میل ہے۔ اس کے پانی میں نمک اور معدنیات کی آمیزش عام سمندروں سے چار گنا زیادہ ہے۔ حتی کہ آدمی اس کے اندر داخل ہو تو وہ غرق نہیں ہوتا۔ رومی حکمران وسپاسین (Vespasian) ۶۹-۷۹ء میں فاتحانہ طور پر فلسطین میں داخل ہوا۔ اس کو بتایا گیا کہ بحر مردار کا پانی اتنا گاڑھا ہے کہ اس میں داخل ہونے والا آدمی اوپر ہی اوپر تیرتا رہتا ہے۔ اس نے تجربہ کے لیے کچھ یہودی قیدیوں کو اس کے اندر پھنکوا دیا :

When the Roman Emperor Vespasian heard of this, he had some Jewish prisoners thrown into the water to see if they could float.

جغرافیہ کے علماء، بحر مردار جیسی انوکھی جھیل (سمندر) کو سطح زمین کی قدیم تبدیلیوں کے عہد (holocene epoch) کی ایک یادگار سمجھتے ہیں۔ مگر وہ یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ تبدیلیوں کے اس دور میں، جو کہ پچھلے دس ہزار سال کی ارضی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے، اس میں صرف بحر مردار ہی استثنائی طور پر ایسی وسیع جھیل کی صورت میں کیوں تبدیل ہو گیا۔ جب کہ اس کا بھی ثبوت ملا ہے کہ ایک عرصہ پہلے تک وہ عام جھیل کی مانند تھا۔

اصل یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں یہاں قوم لوط آباد تھی۔ اس کے اندر برائیاں پیدا ہوئیں تو حضرت ابراہیم کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام ان کی اصلاح کے لیے بھیجے گئے۔ مگر قوم سرکش ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ دو ہزار سال قبل مسیح میں ایک شدید زلزلہ آیا۔ زمین کے اندر کا آتش گیر اجزاء بھڑک کر جل اٹھے۔ پورا علاقہ تباہ ہو کر رہ گیا۔

ہندستان ٹائمس (۱۰ ستمبر) کے درمیانی صفحہ پر مسٹر این سی مینن (مقیم واشنگٹن) کا مضمون فلسطین کے مسئلہ پر تھا۔ اس کا عنوان تھا ——— اور امن کا وقت :

And a time of peace

مضمون نگار نے ۱۳ ستمبر ۱۹۹۳ کو واشنگٹن میں وائٹ ہاؤس [illegible]
یاسر عرفات اور اسرائیلی وزیر اعظم اسحاق رابن کے درمیان ایک معاہدہ [illegible]
[illegible] اس معاہدۂ امن کو بے نظیر مفاہمت (unprecedented accommodation)
سے تعبیر کیا ہے۔

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ اس قسم کا نسبتاً کم اہم معاہدہ ۱۹۷۹ میں سابق مصری صدر انور السادات اور سابق اسرائیلی وزیر اعظم مناحم بیگن کے درمیان ہوا تھا۔ اس وقت یاسر عرفات نے انور سادات کو غدار (traitor) بتایا تھا اور کہا تھا کہ وہ اس قابل ہیں کہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ مگر آج خود یاسر عرفات، سادات کی اسی سنت پر زیادہ بڑے پیمانہ پر عمل کر رہے ہیں۔

یاسر عرفات اب اگر امن کی پالیسی کو ضروری سمجھتے ہیں تو ان کے لیے اپنی اس رائے پر عمل کرنا کوئی غلط بات نہیں۔ مگر ایسی صورت میں انھیں یہ اعلان بھی کرنا چاہیے کہ اس سے پہلے انھوں نے فلسطین کے بارہ میں جو پالیسی اختیار کی وہ درست نہ تھی۔ اور انور السادات کو برا بتانا بھی ایک سنگین غلطی تھی۔ غلطی کا اعتراف نہ کرنا ان کے لیے خود سب سے بڑی غلطی ہوگی۔

ابن عساکر (۹۰۰ — ۵۲۷ھ) مشہور محدث اور مورخ ہیں۔ انھوں نے مسجد اقصیٰ کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کا نام ہے: الجامع المستقصی فی فضائل المسجد الاقصیٰ۔ یہ غالباً اس موضوع پر سب سے زیادہ جامع کتاب ہے۔

قبطی چرچ کے پوپ نے ۴ جولائی ۱۹۹۵ کو ایک بیان میں کہا کہ یہودی اب شعب مختار (Chosen people) کی حیثیت نہیں رکھتے۔ مسیحیت کے ظہور کے بعد اب ان کی یہ حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ میں نے ایک عیسائی اسکالر سے کہا کہ یہ بات جزئی طور پر صحیح ہے۔ کیوں کہ پیغمبر اسلام کے ظہور کے بعد خود مسیحیت کی حیثیت بھی ختم ہو چکی۔ اور اب خدا کا مختار گروہ وہ ہے جو دین محمدی کو اختیار کرے۔ اس نے توجہ کے ساتھ میری بات سنی اور پھر کہا: مگر کیا محمد (ص) ایک عالمی پیغمبر تھے۔

ایک صاحب سے جہاد (بمعنی قتال) کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کا کہنا ہے کہ اسلام میں جہاد صرف دفاع کے لیے ہوتا ہے۔ مگر دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

[illegible] جنگ کا قول ہے کہ اقدام خود بہترین دفاع ہے :

Offence is the best defence.

میں نے کہا کہ آپ لوگوں کو صرف پرانے زمانہ کی باتیں معلوم ہیں۔ نئے زمانہ کی آپ کو کچھ خبر نہیں۔ یہ سب مقولے اس زمانہ کے ہیں جب کہ جنگ صرف دو فوجوں کے درمیان ہوتی تھی۔ عام شہری اس کے نقصان سے بچے رہتے تھے۔ مگر آج کی جنگ پورے ملک میں تباہی برپا کرتی ہے۔ اب نہ اقدامی جنگ کا کوئی نتیجہ ہے اور نہ دفاعی جنگ کا۔ اب تو صرف تدبیر کا راستہ انسان کے لیے باقی رہ جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ انٹرنیشنل فیڈریشن آف ریڈ کراس اینڈ ریڈ کریسنٹ سوسائٹیز نے جنیوا سے اس سلسلہ میں ایک جائزہ (World Disasters Report 1995) چھاپا ہے۔ اس کے مطابق، دوسری عالمی جنگ کے بعد ۵۹ جنگوں میں جو لوگ شدید طور پر اس سے متاثر ہوئے ان میں ۹۵ فی صد تعداد غیر فوجی شہریوں سے تعلق رکھتی تھی :

Ninety-five percent of the victims were civilians.

ایسی حالت میں جنگ دو طرفہ تباہی کے ہم معنی بن کر رہ گئی ہے۔

اگست ۱۹۶۹ میں یروشلم کی مسجد اقصی میں آتش زدگی کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد ساری دنیا میں مسلمانوں کی طرف سے اس کے خلاف احتجاج کیا گیا۔

۲۹ اگست کی شام کو دہلی کے آسمان نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ یہ مسلمانوں کے دو جلسے تھے جو ایک ہی تاریخ کو ایک ہی مقصد کے تحت مگر دو الگ الگ شامیانوں کے نیچے کیے گئے۔ دونوں کا مقام جامع مسجد دہلی کے قریب کا آزاد پارک تھا۔ ایک جلسہ شام کو ۵ بجے ہوا اور دوسرا ساڑھے نو بجے شب میں۔

دونوں جلسوں کا مقصد ایک تھا۔ مسجد اقصی کی آتش زدگی کے خلاف یوم احتجاج منانا۔ دونوں جلسوں میں اپنے اپنے حلقہ کے لوگ اکٹھا ہوئے۔ میں دونوں ہی میں شریک تھا۔ میں نے سنا کہ دونوں جلسوں میں اسرائیل کے خلاف پر جوش تقریریں ہو رہی ہیں۔ ان تقریروں کا خلاصہ یہ تھا کہ —— اے عربو! متحد ہو کر اسرائیل کا مقابلہ کرو۔

آج بھی جلسے سے فارغ ہو کر جب میں ہوٹل کے [illegible]
شاید میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری تھے اور زبان سے [illegible] نکل رہے تھے
[illegible] بھی نہیں دے سکے اور وہ متحد ہو کر مقابلہ کریں [illegible]
حال میں فلسطین کی سیاسی جدوجہد کے بارے میں ایک کتاب ایک برطانوی مصنف نے شائع کی ہے۔ اس انگریزی کتاب کے مصنف کا نام گراہم اشر ہے:

Palestine in Crises: The Struggle for Peace and Political Independence
by Graham Usher

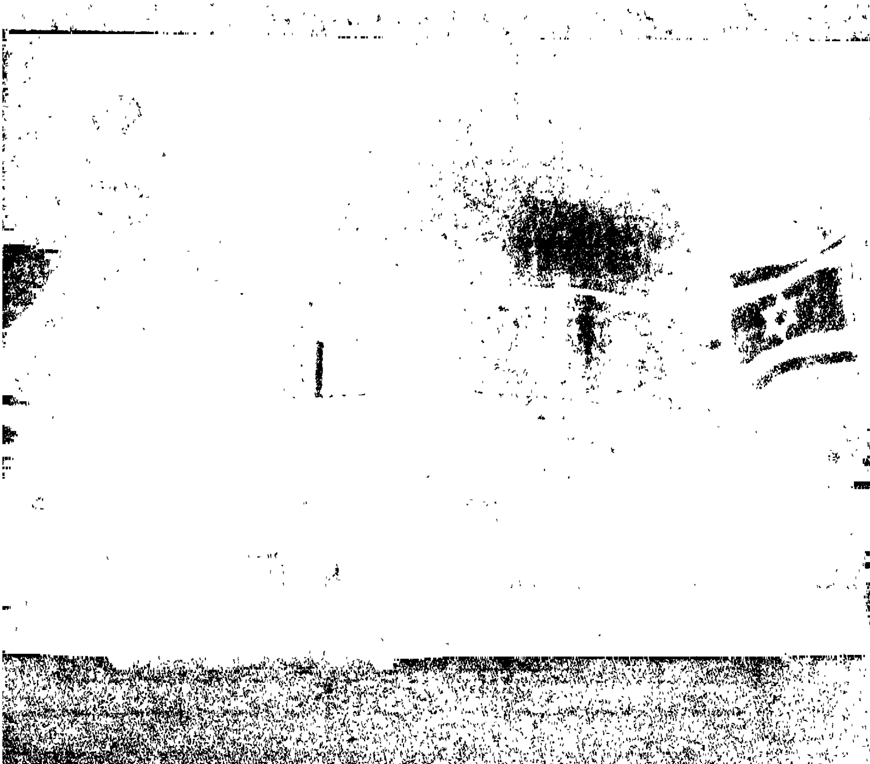
یہ کتاب ان فلسطینیوں یا ان عربوں میں پسند کی جا رہی ہے جو یاسر عرفات کی کوششوں سے زیادہ اتفاق نہیں کرتے۔ اس کتاب میں برطانی مصنف نے لکھا ہے کہ یاسر عرفات کی پالیسیوں کے نتیجہ میں فلسطین کو جو امن حاصل ہوا ہے، وہ وقتی اور مصنوعی ہے۔ اور وہ امریکہ اور اسرائیل کی شرطوں پر قائم ہوا ہے نہ کہ عربوں کی شرطوں پر۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ گراہم اشر کی یہ بات کوئی زیادہ اہم بات نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے جو معاہدہ کیا تھا وہ بھی وقتی تھا اور وہ تمام تر فریق مخالف کی شرطوں پر کیا گیا تھا۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کے حق میں فتح مبین بن گیا۔ اصل یہ ہے کہ یہ دنیا مقابلہ کی جگہ ہے یہاں اصل اہمیت صلح کی دفعات کی نہیں ہے۔ بلکہ اصل اہمیت یہ ہے کہ صلح کے بعد مستقبل کی تعمیر کے لیے آپ کتنی اہلیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ کسی بھی صلح کو مستقبل کے نتائج کے اعتبار سے دیکھنا چاہیے نہ کہ حال کی لفظی دفعات کے اعتبار سے۔ میں نے کہا کہ الفاظ ہمیشہ تاریخ کے تابع ہوتے ہیں، تاریخ کبھی الفاظ کے تابع نہیں ہوتی۔

مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگ ساری دنیا میں یہ غلطی کر رہے ہیں کہ وہ اپنے مسائل کو قول سدید (الاحزاب ۷۰) کی زبان میں پیش نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ ان کو جذباتی بلکہ غیر واقعی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی بھی ملی یا قومی مسئلہ میں مسلمانوں کے درمیان حقیقت پسندرائے نہیں ملتی۔ ساری دنیا کے مسلمان ذہنی اعتبار سے غیر واقعی ذہنی فضا میں جی رہے ہیں اور جو لوگ غیر واقعی فضا میں جیتے ہوں وہ کبھی اپنے معاملات کی صحیح منصوبہ بندی نہیں کر سکتے

فلسطینی مسئلہ بھی اسی ذہنیت کا شکار ہوا ہے۔ اس کی ایک مثال [illegible] کی تصویر میں دیکھی جا سکتی ہے۔
کویت سے ایک عربی ہفت روزہ نکلتا ہے جس کا نام المجتمع ہے۔ اس کو جمعیۃ الاصلاح الاجتماعی نے [illegible] میں جاری کیا تھا۔ اس کے شمارہ ۳۰ مئی ۱۹۹۵ کے صفحہ اول پر ایک نمایاں تصویر شائع کی گئی ہے۔ یہ بیت المقدس کی تصویر ہے۔ اس کے ایک طرف اسرائیلی جھنڈا لگا ہوا ہے، اور دوسری طرف ایک اسرائیلی فوجی گن اٹھائے ہوئے کھڑا ہے۔ یہ تصویر واضح طور پر مصنوعی ہے۔ جھنڈا اور فوجی کی تصویر الگ سے کاٹ کر یہاں چپکائی گئی ہے۔ بیت المقدس کے پاس ایسی کوئی چیز حقیقۃً موجود نہیں۔

عربی اخبارات و رسائل میں مسلسل "القدس" کے بارے میں مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مگر وہ زیادہ تر جذباتی انداز میں لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ بظاہر ایسا محسوس



[illegible] ہو گئے ... کے حق میں ... [illegible]

[illegible] الاقدس کے شمارہ میں ۱۹۷۲ ء میں ایک مضمون چھپا ہے جس کا عنوان [illegible]
[illegible] بھی بیت المقدس کے مسئلہ کے بارہ میں۔ اس مضمون کے ساتھ ایک تصویر بھی [illegible] چھاپی گئی ہے جو یہاں نقل کی جاتی ہے۔ یہ تصویر واضح طور پر قبۃ الصخرہ کی ہے۔ مگر اس کے نیچے لکھا ہوا ہے: مسجد اقصیٰ کو عرب سیادت کے تحت واپس لانا بالکل ضروری ہے۔

جب میں دہلی سے یروشلم کے لیے روانہ ہوا تو میرے ذہن میں بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی واضح تصویر نہ تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید دونوں ایک ہی ہیں۔ چنانچہ وہاں کی کانفرنس میں پیش کرنے کے لیے میں نے جو پیپر تیار کیا اس میں بھی میں نے مسجد اقصیٰ لکھ کر اس کے آگے بریکٹ میں بیت المقدس لکھ دیا تھا۔ گویا کہ دونوں ایک ہی ہیں۔

یہ غلط فہمی کوئی انفرادی نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ۹۹ فی صد مسلمان اس معاملہ میں اسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ دونوں کے بارے میں کوئی واضح شعور نہیں رکھتے۔ حتیٰ کہ یہ غلط فہمی بہت پہلے سے چلی آ رہی ہے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ اس امت کا معاملہ مستقیم رہے گا یہاں تک کہ

اُٹھا لیا جائے۔ دوسری کتب حدیث میں بھی یہ روایت الفاظ کے فرق کے ساتھ آئی ہے۔ اور بعض طرق میں یہ الفاظ ہیں: یقاتلون علی ابواب بیت المقدس وما حوله لا یضرهم خذلان من خذلهم ظاهرین الی یوم القیامة (فتح الباری ۳۰۶/۱۳) یعنی امت کے یہ اہل حق بیت المقدس کے دروازوں پر اور اس کے آس پاس قتال کریں گے۔ ان کا کوئی حریف انھیں نقصان نہ پہنچا سکے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے۔ ایک اور روایت: لا تزال عصابة من امتی یقاتلون علی امر الله قاهرین لعدوهم لا یضرهم من خالفهم حتی تأتیهم الساعة (صفحہ ۳۰۶)

اس روایت میں قتال سے مراد جنگ نہیں ہے، بلکہ غیر حربی کوشش ہے۔ (فتح الباری ۳۰۶/۱۳)

اس سے معلوم ہوا کہ بیت المقدس کے علاقہ میں ابدی طور پر مسلمانوں کا غلبہ مقدر کردیا گیا ہے۔ اس حدیث کے مطابق، حکومت اسرائیل کے قیام کے باوجود اس غلبہ کو قائم رہنا چاہیے۔

قرآن میں دو جگہ یہود کے ایک مخصوص گروہ (نہ کہ تمام یہودی نسل) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مسلسل سرکشی اور نافرمانی کی پاداش میں ان پر لعنت کی اور ان کو ذلیل و خوار بندر بنا دیا (سورۃ البقرۃ آیت ۶۵، سورۃ الاعراف آیت ۱۶۶) سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۰ میں یہ اضافہ ہے کہ اس گروہ کو بیک وقت بندر اور خنزیر بنا دیا گیا۔ البتہ اس سلسلہ میں ابتدا سے مفسرین کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے کہ بندر اور خنزیر بنا دینے سے کیا مراد ہے۔ بعض اس کو حقیقی جسمانی تبدیلی (physical transformation) کے معنی میں لیتے ہیں اور بعض اس کو مجازی طور پر صرف فکری اور مزاجی تغیر (moral metamorphosis) قرار دیتے ہیں۔

مشہور تابعی مجاہد کا قول ہے کہ اصلاً ان کے دل مسخ کیے گئے نہ کہ خود ان کو (جسمانی اعتبار سے) بندر بنا دیا گیا۔ یہ بعینہ اسی طرح کی ایک تمثیل ہے جیسی تمثیل یہود کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے (سورۃ الجمعہ ۵) میں بیان کی ہے کہ وہ اس گدھے کی مانند ہیں جو اپنے اوپر کتابوں کا بوجھ لادے ہوئے ہو [illegible]

[illegible] ضعفه. كمثل الحمار يحمل اسفارا [illegible]

[illegible] محمد اسد نے مجاہد کے اسی قول کو سامنے رکھتے ہوئے [illegible]

[illegible] کونوا قردۃ خاسئین کا ترجمہ (Be as apes despicable)

کیا ہے۔ یعنی ہو جاؤ بندروں کی مانند ذلیل و خوار۔ اس کے علاوہ حاشیے میں مجاہد کے قول کو بھی

اس طرح نقل کیا ہے:

'Only their hearts were transformed, that is, they were not really transformed into apes: this is but a metaphor (mathal) coined by God with regard to them, similar to the metaphor of "the ass carrying books." (*The Message of the Qur'an*, translated and Explained by Muhammad Asad, Dar al-Andalus, Gibralter, p. 228.)

تاہم اس لفظی بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر مسخ کو حقیقی جسمانی تبدیلی کے معنی میں لیا جائے تب بھی اس ضمن میں دو باتیں تمام مفسرین کے یہاں متفق علیہ ہیں۔ ایک یہ کہ صحیح حدیث کے مطابق نہ یہود بندر اور خنزیر کی نسل سے ہیں نہ یہ جانور یہود کی نسل سے، بلکہ دونوں اللہ تعالیٰ کی مستقل مخلوق ہیں۔

علامہ ابن کثیر نے ابو داؤد الطیالسی کے واسطے سے عبد اللہ بن مسعود کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا بندر اور خنزیر مسخ شدہ یہود کی نسل ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو لعنت زدہ ٹھہرا کر اسے مسخ کیا ہو اور پھر اس سے کوئی نسل چلی ہو۔ بلکہ یہ تو ایک مستقل مخلوق ہے جو واقعۂ مسخ کے پہلے سے موجود تھی۔ چنانچہ جب یہود پر خدا کا غضب نازل ہوا اور ان کو مسخ کر دیا تو ان کو انھیں کے جیسا بنا دیا (سألنا رسول الله صلى الله عليه وسلم عن القردة والخنازير أهي من نسل اليهود؟ فقال: «لا، ان الله لم يلعن قوما قط فيمسخهم فكان لهم نسل». ولكن هذا خلق كان، فلما غضب الله على اليهود فمسخهم جعلهم مثلهم») مختصر تفسیر ابن کثیر ۱/۵۳۱ — ۵۳۰م

دوسرے یہ کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ و تابعین سے صراحۃً منقول ہے کہ کوئی مسخ شدہ قوم تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہی، نہ اس نے کچھ کھایا، نہ کچھ پیا، اور نہ

[illegible] کا یہ سلسلہ جاری رہا الم یعنی مسخ قطفوئ ثلاثة ایام،
[illegible] ولم ینشیف ولم یبنیل (مختصر تفسیر ابن کثیر ۳/۲۰۷)

مسجد اقصیٰ کے گرد و پیش میں جو آبادی ہے وہاں زبان کو مستثنیٰ کر کے بڑی حد تک پرانی دہلی کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ بھیڑ، گندگی، بدنظمی، شور و غل، بچوں کی اچھل کود، دیواروں پر حکومت کے خلاف احتجاجی نعرے وغیرہ ـــــ آزادیٔ فلسطین کے لیے وہاں جو تنظیمیں زیادہ سرگرم ہیں ان میں ایک حرکۃ المقاومۃ الاسلامیۃ ہے جس کا مختصر نام (short form) حماس ہے۔ یہ ایک جذباتی اور انتہا پسند تنظیم ہے۔ اسی کے زیر قیادت، دسمبر ۱۹۸۷ کو ایک مخصوص حادثہ (القطورۃ) کے بعد وہ پرشور تحریک وجود میں آئی جو اخبارات میں الانتفاضۃ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے تحت فلسطینی لڑکوں اور نوجوانوں کو اکسایا گیا کہ وہ جہاں کہیں بھی کسی یہودی کو دیکھیں پتھر مار کر اس کا چہرہ زخمی کر دیں۔ جن لڑکوں نے اس تحریک میں حصہ لیا انھیں پرفخر طور پر اولاد الحجارۃ کہا جاتا ہے۔

جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح ایک طاقت ور فوج کے مقابلہ میں "پتھر" اٹھانا بلاشبہ ایک مجنونانہ حرکت ہے۔ مگر اپنے اس طریق کار پر حماس کو اتنا یقین ہے کہ اس کے بقول عربوں کے تمام ٹینک اور میزائل بھی وہ کارنامہ انجام نہ دے سکے جو ان کے پتھر نے کر دکھایا، وہ پتھر جو "غاصب" کے چہرہ کو لہولہان کر دیتا ہے (کل الدبابات وکل صواریخ العرب، ماساوت حجراً، حجراً یُدمی وجہ المحتل")

اس علاقہ میں جس طرف سے بھی گزر ہوا اکثر دیواریں حماس کی طرف سے لکھے گئے جذباتی نعروں (شعارات) سے رنگین نظر آئیں۔ مثلاً: ـــ نعم للحجر، لا للمؤتمر، پتھر کے لیے ہاں، کانفرنس کے لیے نہیں (یعنی ہمارا مسئلہ صرف پتھر کے ذریعہ لڑ کر حل ہو سکتا ہے نہ کہ امن کانفرنسوں میں بات چیت کے ذریعہ)

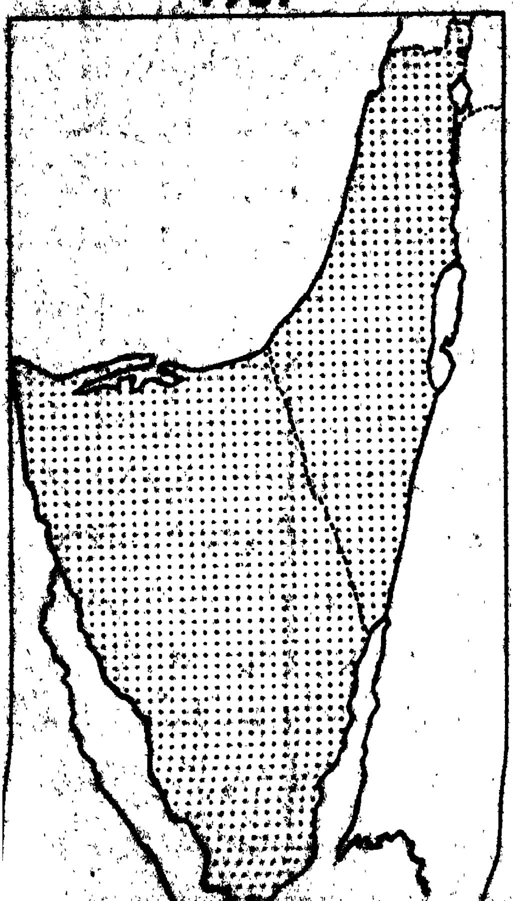
ـــ بالقوۃ وبالقوۃ فقط نحرر فلسطین، طاقت اور صرف طاقت کے ذریعہ ہی سرزمین فلسطین کو آزاد کرایا جا سکتا ہے۔

ـــ جند حماس للأقصیٰ حراس، حماس کی فوج اقصیٰ کی محافظ۔

rough

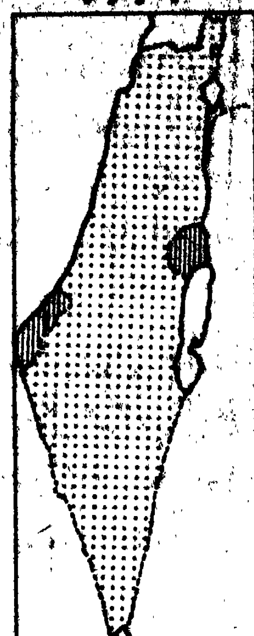
istory

1967



Map showing the territories occupied by Israel
ring the war of 1967. The occupied territories
of Sinai (Egypt) were evacuated in 1982.

1994



Map of Palestine after the Oslo Accord, showing the present Palestinian Authority

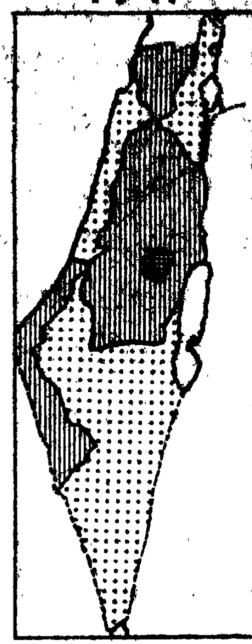
Palesti
Rece

1936



Map of Partition of Palestine recommended by the Royal (Peel) Commission

1947



Map of Partition plan under United Nations Resolution 181 (11)

194



Map of Palestin 1948 Arab-Isr

Arab State **Jewish Territories** **Neutral Zone**

[illegible] مع شعب اليهود [illegible] [illegible]
(ترجمہ) [illegible] کی کش مکش ہے نہ کہ (جغرافیائی) حدود کی کش مکش۔

[illegible] الجهاد في سبيل الله -- هو الحل الراجح والاسلوب الفعال [illegible]
القردة والخنازير -- وما الحلول والمبادرات السلمية الا [illegible]

بندروں اور خنزیروں کی اولاد کے ساتھ معاملہ کرنے کے لیے جہاد فی سبیل اللہ ہی قابل ترجیح حل اور موثر ترین طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ پُرامن نوعیت کے سارے حل اور ہیں قدمیاں سیلاب کے جھاگ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

حماس کے یہ نعرے ایک طرف اس کے مزاج اور طریق کار اور دوسری طرف عصر حاضر کے تقاضوں سے اس کی المناک بے خبری کا پتہ دیتے ہیں۔

یہاں ایک بات قابلِ غور ہے کہ عرب اخبارات میں عام طور پہ یہودیوں کو ازراہ تحقیر احفاد القردة والخنازير یعنی بندروں اور خنزیروں کی اولاد کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر حماس کے ایک نعرہ میں بھی یہ الفاظ آئے ہیں۔ مگر ایسا کہنا حد درجہ سرکشی اور جہالت کی بات ہے۔ کیوں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث، صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کے مسلک کے بالکل برعکس ہے۔

ایک حدیث میں مومن کو نرم پودے (کمثل الخامة الزرع) سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جب ہوا چلتی ہے تو وہ اس سے ہم آہنگ ہو کر دائیں یا بائیں طرف جھک جاتا ہے۔ اور ہوا کا زور گھٹنے کے بعد بدستور اپنی جگہ سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس منافق سخت تنے کی مانند ہوتا ہے جو ہوا کے ایک ہی جھٹکے میں اپنی جگہ سے اکھڑ کر گر جاتا ہے۔ دوسری طرف قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر تمہارے مخالفین صلح پر آمادہ ہوں تو تم بھی اللہ پر توکل کرتے ہوئے اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ۔ اگر مخالفین مصالحت کے بہانے تمہیں دھوکا دینے کا ارادہ رکھتے ہیں تب بھی اللہ تمہارے لیے کافی ہو جائے گا (الانفال ۶۲-۶۱)

مذکورہ حدیث اور آیت کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے قائدین نے، خصوصاً مسئلۂ فلسطین کے معاملہ میں، نہ تو حقیقی دانش مندی کا ثبوت دیا نہ حقیقی توکل کا۔ دانشمندی

ہوجاتا جب ساری دنیا میں امن کا چرچا ہو رہا ہوتا اور قومی وحدت اقوامی مقامات کو پہنچا
اپنے ہتھیار کے ذریعہ حل کرنا چاہتے۔ وہ مسئلہ جو سیاسی بن چکا ہو اس کو وہ جنگ و قتال
ہتھیاروں سے حل کرنا چاہتے۔ وہ معرکۂ حطین کی تجدید کے بجائے معاہدۂ حدیبیہ
کی تجدید کو اپنی پالیسی بناتے۔ دوسری طرف توکل علی اللہ کا تقاضا یہ تھا کہ عہد شکنی کے امکانی خ
کے باوجود "اغیار" کی طرف سے صلح کی ہر پیش کش کو فوراً قبول کر لیتے۔ مگر چونکہ بر وقت ان دونو
میں سے کوئی ایک بات بھی متحقق نہ ہو سکی، اس لیے جان و مال کی بے پناہ قربانیوں کے علی الرغم آ
تک ہمارے تمام مسائل، بشمول مسئلہ فلسطین، غیر حل شدہ پڑے ہوئے ہیں، بلکہ وہ مزید پیچیدہ
ہو چکے ہیں۔

فلسطین کے ایک اخوانی نوجوان نے کہا کہ اسلام صرف عبادت نہیں ہے، وہ دین
ہے اور ریاست بھی۔ اس لیے اس الدین کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس حکومت ہو
اسلامی قوانین کو نافذ کرے اور دشمنانِ خدا کے معاملہ میں مسلمانوں کی حمایت کرے اور دشمنو
کی سازشوں سے انھیں بچائے یہ ایک فریضہ ہے مگر اکثر مسلمان اس فرض سے غافل ہیں۔ الاخ
المسلمون مسلمانوں کو اسی کی طرف بلاتی ہے کہ وہ اس فریضہ کو ادا کریں اور اسلامی قوانیو
پوری طرح نافذ کریں :

الاسلام ليس عبادة فقط ولكنه دين ودولة ـ وهذا الدين لا بد له من دو
تطبق الاسلام وتحمي المسلمين من اعداء الله وترد كيد الاعداء عنهم ـ فه
واجب لكن كثيرا من المسلمين غافلون عن هذا الواجب ـ والاخوان يدعو
لتحقيق هذا الواجب والعمل على تطبيق الشريعة والحكم بالاسلام ـ

میں نے کہا کہ یہ پورا نظریہ ایک غلط تفسیر دین پر قائم ہے۔ الاسلام دین و دولة ا
کی ایک بند ماز تفسیر ہے۔ زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ الاسلام دین و دعوة۔ یعنی ذاتی زندگی :
دین دار بننے کے بعد مسلمان پر جو دوسری ذمہ داری ہے وہ دعوت ہے نہ کہ حکومت۔ عباد
اور دعوت ذمہ داری ہے، اور حکومت اللہ تعالیٰ کا ایک عطیہ۔ حکومت و اقتدار اسلامی عما
هدف نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی حاصل ہوتا ہے اور کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ میں نے کہ

[illegible] میں نے اپنی کتاب [illegible]
فلسطین [illegible] کے نام سے [illegible] چھپ چکا ہے۔

ایک فلسطینی نوجوان نے کویت کی دستوری تحریک کا حوالہ دیا کہ اس نے [illegible]
[illegible] اور [illegible] کے خلاف [illegible] میں فرق کیا جائے جوکہ [illegible]
(الحركة الدستورية الاسلامية في الكويت طالبت بالتفريق بين [illegible]
الشعب فمقاومة الاحتلال)

میں نے کہا کہ اس قسم کے فرق دماغوں میں ہوتے ہیں وہ عملی زندگی میں نہیں ہوتے
اور جب دو فریق کے درمیان نزاع کی صورت پیدا ہوجائے تو اسلام اور عقل دونوں کا تقاضا
یہ ہے کہ اس وقت ذہنی معیار کو پس پشت ڈال کر یہ دیکھا جائے کہ عملی صورت حال کے مطابق کیا
ممکن ہے اور کیا ممکن نہیں۔

میں نے کہا کہ عملی بنیاد پر مذکورہ فیصلہ کو میں درست سمجھتا ہوں، آپ اگر ذہنی معیار پر
اصرار کریں گے تو آپ وہ تو نہیں پائیں گے جو آپ پانا چاہتے ہیں۔ البتہ جو کچھ آپ کو ملا ہوا ہے
اس کو بھی آپ کھو دیں گے۔

عرب اخبارات و رسائل اس قسم کے عنوانات سے بھرے رہتے ہیں:

بقاء القدس في يد اسرائيل يعني ان الاستعمار الصهيوني قائم
(قدس کا اسرائیل کے ہاتھ میں باقی رہنا یہ معنی رکھتا ہے کہ صہیونی استعمار قائم ہے)
مدينة القدس الشريف تناديكم (قدس آپ کو پکار رہا ہے)
ان العرب سيرمون اسرائيل في البحر (عرب اسرائیل کو سمندر میں پھینک دیں گے)
القدس الشريف: بين مؤامرة التهويد وطمس هويتها الاسلامية
(قدس تھویدی سازش اور اس کے اسلامی تشخص کو مٹانے کی کوشش کے درمیان)

یروشلم میں مسجد اقصیٰ کے قریب ڈیڑھ ایکڑ کے رقبہ میں ایک مسجد اور مرکز ہے۔ اس کا نام
الزاوية الفريدية ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غیر منقسم ہندستان کے ایک صوفی بابا فرید گنج شکر
آٹھ سو سال پہلے یہاں زیارت کے لئے آئے تھے۔ اس وقت فلسطین میں عثمانی ترکوں کی حکومت

تھے جنھوں نے ۱۱ لاکھ روپیہ کو مسجد کے ... جب کہ ہندستانی نوابوں کے تحفے ... کے اور محل میں یہاں رکھی گئی ہیں۔

یہاں پہلے خواجہ نذیر حسن انصاری کو اس وقت کی ہندستانی حکومت نے ۱۹۲۲ میں یہاں سے ایڈمنسٹریٹر کے طور پر بھیجا تھا۔ ۱۹۵۲ میں ان کی وفات ہوگئی۔ اب ان کے پوتے نذیر حسن انصاری وقف کے ٹرسٹی ہیں۔ انڈیا سے اس ٹرسٹ کو چھ ہزار روپے سالانہ کی امداد دی جاتی ہے۔

یروشلم کی موتمر کا دعوت نامہ مجھے مل چکا تھا۔ اس کے بعد فروری ۱۹۹۳ میں میرا ایک سفر رباط (المغرب) کے لیے ہوا۔ وہاں الجزائر کے ڈاکٹر محمد السلیمانی سے ملاقات ہوئی۔ ان سے ذکر ہوا تو انھوں نے کہا کہ آپ کو یروشلم کی موتمر کا دعوت نامہ ہرگز قبول نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے پوچھا کیوں۔ انھوں نے کہا کہ آپ کا وہاں جانا اسرائیل کی تصدیق کے ہم معنی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ میری تمنا تھی کہ میں قدس میں داخل ہو کر اللہ کے لیے سجدہ کروں جہاں پیغمبروں نے سجدہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی نیت کچھ بھی ہو مگر عملاً تو وہ اسرائیل کی تصدیق بن جائے گا۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا یہ طرزِ فکر سراسر ایک غیر مسنون طرزِ فکر ہے۔ قدیم مکہ میں تقریباً وہی صورت پیش آئی جو موجودہ زمانہ میں فلسطین میں پیش آئی ہے۔ قریش نے رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ پر سخت مظالم کیے، یہاں تک کہ ان کو ان کے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا، اور پھر مکہ کے اوپر اپنا مجرمانہ اقتدار قائم کر لیا۔ اس کے بعد یہ واقعہ ہوا کہ مکہ میں دشمنانِ اسلام کا اقتدار باقی رہتے ہوئے رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ نے عمرہ کے لیے مکہ کا سفر کیا۔ پہلی بار اہلِ مکہ نے داخل نہیں ہونے دیا تو اگلے سال دوبارہ سفر کیا اور مکہ میں داخل ہو کر کعبہ کا طواف کیا جس میں اب ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے اور پھر کسی احتجاج یا ٹکراؤ کے بغیر مدینہ واپس گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوچ وہ ہوتی جو آپ حضرات کی سوچ ہے، یعنی مکہ میں داخلہ کو آپ دشمن کے اعتراف کے ہم معنی سمجھتے تو آپ کبھی بھی مکہ میں داخل نہ ہوتے۔

اس واقعے سے رسول اللہ کی ایک خاص سنت اخذ ہوتی ہے۔ اور وہ ہے دو چیزوں کو ایک دوسرے میں نہ ملانا۔ یعنی یہ بھی رسول اللہ کی ایک سنت ہے کہ دو مختلف چیزوں کو ایک

[illegible]

میں نے کہا کہ آپ جیسے لوگوں کی سوچ غلط ہے جیسا کہ رسول [illegible]

ہمارے معنوں میں مثبت انداز میں سوچتے تھے (حدیث [illegible]

[illegible] یحب الکلمۃ الحسنۃ)

ایک زمانہ تھا کہ عرب دنیا میں الاخوان المسلمون کے سیاسی فکر کی دھوم تھی [illegible]

فکر کی سطحیت لوگوں پر واضح ہونے لگی ہے۔ چنانچہ اہل علم میں اس کے ناقدین پیدا ہو [illegible]

ہیں۔ ایک صاحب نے مصر کے دکتور عبد الصبور مرزوق (پیدائش ۱۹۲۸ء) کا قول نقل کیا

یہ بے معنی نہیں ہے کہ ہم اسلامی حکومت کا مطالبہ کریں اور حال یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہاتھ

کا ہاتھ پھیلا ہوا ہے۔ وہ خوراک اور ہتھیار اور کپڑے اغیار سے مانگتا ہے۔ ہم ہر معاملہ میں

کے محتاج ہیں۔ اور اگر وہ چاہیں تو اپنی گاڑیاں ہمیں نہ دیں اور ہم دوبارہ گدھے [illegible]

کی سواری کی طرف لوٹ جائیں:

الیس من العبث ان نطالب بدولۃ اسلامیۃ و ید المسلمین السفلی فتطلب

فیہا الطعام و السلاح و الملابس و نظل حالۃ علی غیرنا و لو شاؤا حبسوا عنا السیارات

مثلا و رجعنا للبغال و الحمیر۔

میں نے کہا کہ یہ درست ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان علم سے لے کر کردار تک ایک [illegible]

ہوئی قوم بن چکے ہیں۔ مفت کے پٹرو ڈالر سے حاصل کی ہوئی ظاہری چمک دمک کو ہٹا دیں

تو اندر سے وہ ہر اعتبار سے کھوکھلے نظر آئیں گے۔ ایسی حالت میں حکومت اور خلافت [illegible]

باتیں کرنا وقت کا ضیاع ہے نہ کہ کوئی حقیقی کام۔

ایک سنجیدہ قلم کے عرب عالم سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے موجودہ زمانہ کے مسلم [illegible]

پر تنقید کرتے ہوئے کہا: ھم یخلقون للعقدۃ بطریقۃ تجعل العقدۃ [illegible]

معقدۃ [illegible] (وہ گرہ کو اس طرح کھولنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ایک گرہ کو [illegible]

بنا دیتی ہے)

میں نے کہا کہ یہی بات برصغیر ہند کے [illegible] [illegible] ہے۔ [illegible]

[illegible] وہ اسے اس نے ایک گڑ کو کی گڑ بنا دیا۔ تقسیم کی تحریک، شدھ یا نو تحریک [illegible] وغیرہ اس کی قریبی مثالیں ہیں۔

یروشلم کی کانفرنس میں شرکت کے لیے روم سے بار بار ٹیلی فون آئے۔ میں وہاں جانے کے لیے صرف اس لیے تیار ہوا تھا کہ اس طرح مجھ کو مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کا موقع ملے گا۔ تاہم ایک خدشہ بھی لگا ہوا تھا۔ عرب اخبارات مسلسل اس کی جو تصویر پیش کر رہے تھے، اس سے میں نے سمجھا تھا کہ مسجد اقصیٰ کے چاروں طرف اسرائیل کی بہت بڑی فوج کھڑی ہوئی ہوگی۔ ا[illegible] ممکن ہے کہ وہ مجھے اندر داخل ہونے کی اجازت ہی نہ دیں اور میں نامراد ہو کر وہاں سے لوٹ آؤں۔

عرب اخبارات نے اس معاملہ میں اتنا غلو کیا ہے کہ انھوں نے فرضی تصویریں چھاپ کر پورے معاملہ کو غلط رنگ میں پیش کیا (اس کی کچھ تفصیل اس سفرنامہ میں موجود ہے)

جہاں تک میں نے سمجھا ہے فلسطینیوں کے ساتھ اسرائیل کی دشمنی اصلاً سیاسی دشمنی ہے نہ دینی دشمنی۔ مگر فلسطینیوں نے اور عربوں نے انتقامی جذبہ کے تحت دونوں میں فرق نہیں کیا۔ انھوں نے اسرائیل کو اپنا سیاسی دشمن بتانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا شروع کیا کہ وہ مذہبی اعتبار سے خود اسلام کا دشمن ہے۔ ان حضرات کے یہ بیانات قرآن کے اس حکم کے خلاف ہیں کہ دشمنی کے وقت بھی انصاف کی روش پر قائم رہو (المائدہ ۸)

یروشلم کی کانفرنس میں شرکت پر مجھ کو کئی سخت تبصرے سننے پڑے۔ ایک صاحب نے کہا ——— آپ بھی آخرکار یہودی سازش کا شکار ہو گئے:

You too at last fell victim to Zionist Conspiracy.

میں نے کہا کہ آپ لوگ کتنی آسانی سے اس طرح کے جملے کسی کے بارہ میں بول دیتے ہیں حالاں کہ وہ اسلام میں جائز ہی نہیں۔ اس طرح کے تبصرے محض ظن و قیاس ہیں نہ کہ دلیل۔ ظن کی بنیاد پر آپ کسی کے بارہ میں اچھی رائے تو ظاہر کر سکتے ہیں، مگر ظن کی بنیاد پر بری رائے ظاہر کرنا یقینی طور پر حرام ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی کے بارے میں اس طرح کا جملہ نہیں کہا۔

عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں پر یہودی سازش کا تصور اس طرح غالب ہے کہ وہ ہر واقعہ میں یہودی سازش کو کام کرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ حتی کہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ موجودہ صدی کے آغاز میں ترکی کی عثمانی خلافت یہودیوں کی سازش سے ختم ہوئی۔ جیسا کہ شعر ہے:

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا   سادگی اپنوں کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

حیرت ہے کہ یہ بات وہ لوگ بھی کہتے ہیں جو حکمتِ قرآن (Quranic Wisdom) کے علمبردار ہیں۔ حالاں کہ یہ بات قرآن کی تردید کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ اگر تم تقویٰ اور صبر کرو تو دشمنوں کی سازش تمہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچائے گی (آل عمران ۱۲۰)

اس قرآنی ارشاد کی روشنی میں ہمیں ملی مصائب کے بارہ میں کہنا چاہیے کہ وہ ہمارے اندر تقویٰ اور صبر کے فقدان کا نتیجہ تھا نہ کہ حقیقۃً کسی کے سازشی منصوبہ کا نتیجہ۔

ایک عرب عالم سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ مسلمان کیوں ایسا کر رہے ہیں کہ ہر جگہ حکومتوں سے متشددانہ ٹکراؤ کر کے اپنے آپ کو مروا رہے ہیں۔ اس قسم کی ہلاکت خیز پالیسی تو نہ عقل کے مطابق ہے اور نہ اسلام کے مطابق۔

انھوں نے کہا کہ جب اہل حق سے ان کا حق چھینا جائے گا تو لازم ہے کہ وہ اس کو واپس حاصل کریں۔ آپ جانتے ہیں کہ لوگ جب ہر قسم کا علاج کر چکے ہوتے ہیں تو آخر میں وہ داغنے والے طریق علاج کو استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ ایک غیر پسندیدہ علاج ہے۔ ہم نے موجودہ طریقہ کو اسی وقت اختیار کیا جب کہ ہم مجبور ہو گئے۔ مشکل کو وہی اختیار کرتا ہے جو مضطر ہو:

اذا سُلبَ اهل الحق حقهم فلا بد ان يستعيدوه۔ واذا اضطر الناس الى استنفد كل وسائل العلاج فإن آخر العلاج الكي، ولو انه علاج غير مستحب۔ ولن نلجأ اليه الا إذا اضطررنا، فلا يركب الصعب الا المضطر۔

میں نے کہا کہ موجودہ حالات میں تشدد کا طریقہ علاج نہیں ہے بلکہ وہ خودکشی ہے۔ اور عملاً آج یہی ہو رہا ہے۔ انھوں نے دوبارہ سوال کیا کہ پھر یہ مسلمان کیا کریں۔ میں نے کہا کہ انہیں دو میں سے ایک کام کرنا چاہیے۔ یا تو وہ سیاسی اقتدار کے مسئلہ کو علی حالہ چھوڑ کر دوسرے

[illegible] تعمیر و ترقی کی جدوجہد کریں جس کا میدان ہر ملک میں پوری طرح موجود ہے۔ [illegible] سیاسی جدوجہد کو ضروری سمجھتے ہیں تو [illegible] سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے خالص پُرامن انداز میں اپنی تحریک چلائیں۔ جیسے انڈیا میں مہاتما گاندھی نے اور ساؤتھ افریقہ میں نیلسن منڈیلا نے کیا۔ مسلمان پُرتشدد جدوجہد کا طریقہ چھوڑ کر پُرامن جدوجہد کا طریقہ اختیار کر لیں۔ میں نے کہا کہ موجودہ مسلمانوں کا کیس اضطرار کا کیس نہیں ہے وہ غلط چوائس لینے کا کیس ہے۔ ان کے لیے ایسر کو اختیار کرنے کا موقع پوری طرح موجود تھا۔ مگر انھوں نے ناقابل فہم نادانی کے تحت اعسر کو اپنے لیے اختیار کر لیا۔ حالانکہ وہ واضح طور پر سنتِ رسولؐ کے خلاف ہے۔

اورنگ زیب نے اپنے باپ شاہ جہاں کو ۱۶۵۸ء میں گرفتار کر لیا، اور آگرہ کے قلعہ میں اس کو قید کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار شاہ جہاں نے پریشانی کا خط لکھ کر اورنگ زیب کے پاس بھجوایا۔ اورنگ زیب نے اس کے جواب میں فارسی کا ایک مصرعہ لکھ کر بھیج دیا ——— زخمی چڑیا جب جال میں پھنس جائے تو اس کو برداشت سے کام لینا چاہیے:

مرغ بسمل چوں بہ دام افتد تحمل بایدش

اس کا مطلب، دوسرے لفظوں میں یہ تھا کہ حقیقت پسندی سے کام لیجئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فلسطین کا معاملہ جو اتنا زیادہ بگڑ گیا اس کا سبب یہی تھا کہ اس معاملہ میں مسلم رہنماؤں نے حقیقت پسندی سے کام نہیں لیا۔ حسن البناء سے لے کر یاسر عرفات تک بلا استثناء ہر عالم اور ہر قائد اس معاملہ میں غیر حقیقت پسندانہ رہنمائی دیتا رہا۔ یہاں تک کہ مسلمان ذلت اور تباہی کی آخری حد پر پہنچ گئے۔

۱۹۴۸ میں اقوام متحدہ نے جو تقسیم کی تھی اس میں فلسطین کا نصف سے زیادہ حصہ عربوں کے پاس تھا۔ اسی کے ساتھ پورا یروشلم بھی انھیں حاصل تھا۔ مگر مسلم قیادت نے پرجوش طور پر اس تقسیم کو نامنظور کر دیا۔ اس کے بعد دونوں فریقوں کے درمیان لامتناہی جنگ چھڑ گئی جس کا سارا فائدہ یہودیوں کو ملا اور سارا نقصان مسلمانوں کے حصہ میں آیا۔

اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جاتا تو کرنے کا کام یہ تھا کہ فلسطین کے ملے ہوئے حصہ میں

مرحلہ کی حکومت قائم کی جائے اور اس کے ... [illegible]
ایک پیچیدگی ... کے تمام لوگ سرگرم ہو جائیں ... [illegible]
... کے ... مصروف ہیں۔

ایک وقت تھا کہ مصر کے قومی صدر جمال عبدالناصر اور دوسرے عرب لیڈر یہ کہتے تھے کہ ہم اسرائیل کو سمندر میں پھینک دیں گے (لنلقي بشعب اسرائيل في البحر) لیبیا کے کرنل معمر القذافی اتنے جوش میں تھے کہ انھوں نے اپنے ساتھی میجر جلود کو چین بھیجا کہ وہاں سے ایٹم بم خرید کر لاؤ تاکہ اس کو اسرائیل کے اوپر گرا کر ہمیشہ کے لیے اس کو ختم کر دیا جائے۔ یاسر عرفات اور دوسرے تمام لیڈر اسی قسم کی پر جوش بولی بول رہے تھے۔

مگر آج صورت حال بدل چکی ہے۔ یاسر عرفات پچھلی سیٹ پر چلے گئے۔ یہاں لیبیا سے قریبی واقفیت رکھنے والے ایک صاحب نے کہا کہ کل کے معمر قذافی کے مقابلہ میں آج کے قذافی مکمل طور پر بدل چکے ہیں (القذافي اليوم يختلف تماما عن قذافي الامس)

یہ بات خود قذافی کی طرف سے پریس میں آچکی ہے۔ المجلہ کے نمائندے عبدالرحمن الراشد اور عبداللطیف المناوی نے لیبیا جا کر معمر قذافی کا ایک انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں قذافی نے کہا کہ پہلے ہم آزادی فلسطین کے بارہ میں جنگ کی باتیں کیا کرتے تھے۔ لیکن انقلابات کی صورت حال نے ثابت کیا ہے کہ یہ ضروری نہیں جس چیز کو بدلنا ہے وہ خود ہمارا طریق کار ہے۔ (یعنی بات چیت کا طریقہ) جہاں تک جنگ فلسطین کا معاملہ ہے تو اس سلسلہ میں جنوبی افریقہ کو دیکھئے۔ جہاں جنگ کے بغیر اسی نوعیت کا مسئلہ حل کر لیا گیا۔ آزادی فلسطین کے لیے بھی ضروری نہیں کہ ہم جنگ چھیڑیں، اگر فلسطینی لوگ اپنی سرزمین میں واپس آجائیں اور ان کی ۵ یا ۶ ملین تعداد یہودیوں کے ساتھ ایک جمہوری نظام حکومت میں شرکت پر راضی ہو جائے تو آخر کار ان کا مسئلہ مکمل طور پر حل ہو جائے گا (الرسالہ مئی ۱۹۹۵)

اس سے پہلے قذافی مسلح جد و جہد کے زبردست حامی تھے، حتی کہ انھوں نے ... [illegible] کر احناشت ابون دم۔ مگر ہلاکت خیز تجربے کے بعد اب نہ صرف قذافی بلکہ فلسطین کے ... [illegible] سے لے کر فلپائن کے نور مسواری تک ہر ایک مسلح جد و جہد کی بولی چھوڑ کر پر امن جد و جہد ... [illegible] ہے۔

زیادہ اہم مسئلہ

ریحاوام زیوی (Rehavam Zeevi) اسرائیل کی فوج میں ایک آرمی جنرل تھے۔ ان کی عمر اب ۶۴ سال ہے۔ فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ پالٹکس میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس وقت وہ اسرائیل کی پارلیمنٹ (Knesset) کے ممبر ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو اسرائیل میں پروٹرانسفر (protransfer) کہا جاتا ہے۔ یعنی اس نظریہ کے حامی کہ عربوں کو فلسطین سے نکال کر انھیں دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے۔

امریکی میگزین نیوز ویک (Newsweek) کے نمائندہ اشٹینگر (Theodor Stanger) نے ان سے اسرائیلی پارلیمنٹ کے دفتر میں ملاقات کر کے ان کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال وجواب یہ تھا: (نیوز ویک ۱۲ نومبر ۱۹۹۰ صفحہ ۵۶)

س: کیا آپ فلسطینیوں کے ساتھ امن چاہتے ہیں؟

ج: فلسطینی لوگوں کے لیے واحد حل یہودیوں سے علیحدگی ہے۔ ہر قوم اپنے باپ دادا کی زمین کی طرف لوٹنے کا حق رکھتی ہے۔ ہم یہودی اپنے باپ دادا کی زمین کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ فلسطینیوں کے باپ دادا یہاں سعودی عرب، سوڈان اور لیبیا سے آئے تھے (اس لیے وہ دوبارہ وہاں لوٹ جائیں)

س: کیا آپ دس لاکھ سے اوپر ان فلسطینیوں کو زبردستی بسوں اور ٹرکوں میں بھریں گے اور انھیں لے جا کر باہر ڈال دیں گے؟

ج: مسٹر زیوی نے جواب دیا کہ نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ عرب ممالک انھیں اپنے یہاں بلالیں یا فلسطینی خود ایسا کریں کہ وہ ڈیڑھ لاکھ، دو لاکھ سالانہ کی تعداد میں یہاں سے جانا شروع کریں۔ چند سال کے بعد یہاں کوئی مسئلہ نہ ہوگا:

In a few years, there would be no problem. (p. 56)

یہ ایک انتہا پسند یہودی کی بات ہے۔ اس طرح کے انتہا پسند افراد ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ نہ صرف دوسری قوموں میں بلکہ خود مسلمانوں میں بھی ایسے انتہا پسند افراد مل سکتے ہیں۔ مگر ایسے انتہا پسند افراد کبھی کسی قوم میں قابل لحاظ مقام حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کے لیے صرف برا انجام مقدر ہے۔

[illegible] سال تک اس [illegible] کے [illegible] الفاظ [illegible] درج کے [illegible]
درج ہو جائیں۔

[illegible] کے جھونکے رہتے ہیں اور بار بار [illegible] چلتا رہتا ہے —— یہ حل ایسے [illegible]
پھیلا دی گئی ہے، اور بلا شبہہ ایسے مسائل کا اس سے بہتر کوئی حل نہیں۔

۱۹۷۰ کے اواخر میں مصر کے مقتول صدر انور سادات نے اسرائیل کے ساتھ امن [illegible] کے لیے پیش قدمی کی۔ جس کے نتیجہ میں بالآخر فریقین نے اس معاہدہ پر دستخط کیے جو کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس سلسلہ میں مصر اور اسرائیل کے درمیان جو بات چیت ہوئی اس کی سرپرستی سابق امریکی صدر جمی کارٹر (Jimmy Carter) نے کی تھی۔ نیز انھیں کے حسب منشا معاہدہ کا آخری مسودہ تیار کیا گیا، جس کا پورا نام یہ تھا:

A Framework for Peace in the Middle East Agreed at Camp David

اس معاہدہ کی دفعہ نمبر ۲ کی شق (C) مغربی کنارہ اور غازہ پٹی میں فلسطینیوں کی حکومت خود اختیاری (Self-governing authority) کے بارہ میں تھی۔ مگر اس کی عبارت نہایت مبہم اور بالواسطہ انداز میں (باسلوبِ غامض وغیر مباشر) لکھی گئی تھی۔ اس وقت محمد ابراہیم کامل مصر کے وزیر خارجہ تھے۔ اسی کے ساتھ امن مذاکرات کے دوران وہ سادات کے خصوصی ایڈوائزر بھی تھے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے اس پہلو پر توجہ دلاتے ہوئے سادات سے کہا کہ معاہدہ میں یہ بات بالکل واضح اور براہِ راست الفاظ میں درج ہونی چاہیے کہ فلسطینی مقررہ حدود کے اندر اپنی آزاد اور خود مختار حکومت کی تشکیل کا حق رکھتے ہیں۔ اس کے جواب میں سادات نے کہا کہ خود مجھے اس کا احساس ہے اور اس معاملہ کی مزید وضاحت کے لیے میں نے جمی کارٹر سے بات چیت بھی کی تھی۔ لیکن انھوں نے کہا کہ اسے یوں ہی رہنے دیا جائے۔ کیونکہ اس کو بدلنے کی صورت میں مجھے اس کی قیمت اپنی کرسیٔ صدارت سے ادا کرنی پڑے گی:

'It would cost me my chair.'

(السلام الضائع في اتفاقيات كامب ديفيد، مطبوعات دار الشرق الاوسط، صفحہ [illegible])

انسان کے طور پر ایک حق کا اعتراف اس لیے نہیں کرتا کہ اس کے نتیجہ میں وہ دنیا کے وقتی اعزاز و اقتدار کی کرسی سے محروم ہو جائے گا۔ حالاں کہ مرنے کے بعد جب انسان پہنچے گا خدائے اعلیٰ کے دربار میں سچائی کی کرسی (مقعد صدق) پر صرف وہی لوگ بٹھائے گئے ہیں جنھوں نے دنیا میں اعلانِ حق کی خاطر اپنی کرسی کھو دی تھی۔ تو وہاں وہ اپنی کرسی اور اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جائے گا۔ مگر اس وقت اس کے حصہ میں حسرت و افسوس کے سوا کچھ نہیں آئے گا کیوں کہ آخرت کی کامیابی کے لیے وہی قربانی مطلوب ہے جو دنیا میں پیش کی گئی ہو۔ آخرت کے لیے آخرت میں قربانی کی پیش کش خود اپنے خلاف حجت قائم کرنا ہے یہ انسان کو عذاب کا مستحق بناتا ہے نہ کہ انعام و اکرام کا۔

ایک عرب اسکالر نے گفتگو کے دوران بتایا کہ مختلف ملکوں کے بارہ میں عالمی سطح پر جو تازہ اعداد و شمار سامنے آئے ہیں، ان میں تمام عرب ممالک کو بلا استثناء علمی اعتبار سے فاقہ زدہ (الدول الجائعة علمياً) قرار دیا گیا ہے جب کہ ان کے مقابلہ میں اسرائیل کو جدید ٹکنالوجی کا حریص ملک (دولة نهمة تكنولوجيا) بتایا گیا ہے۔ یہی فرق ایک لفظ میں عربوں کی ہر محاذ پر مسلسل شکست کا واحد سبب ہے۔ قدیم زمانے میں کہا جاتا تھا —— جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ آج "لاٹھی" کی جگہ سائنس اور ٹکنالوجی نے لے لی ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں "بھینس" پر براہِ راست یا بالواسطہ قبضہ اسی کا ہوتا ہے جس کے پاس سائنس اور ٹکنالوجی کی طاقت ہے۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ میں سائنس کو طاقت کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ایسی حالت میں سائنس میں پس ماندہ قوم کا برتر قوم سے جنگ کرنا صرف خودکشی ہے نہ کہ جہاد فی سبیل اللہ۔

ایک یہودی سے گفت گو ہوئی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور عربی زبان اچھی جانتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کہا جاتا ہے کہ آپ لوگ پورے علاقہ پر اسرائیلی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں مدینہ اور خیبر بھی شامل ہے۔ اس نے کہا کہ یہ اسرائیل کی کوئی قومی پالیسی نہیں۔ کچھ یہودی انفرادی طور پر اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔

پھر اس نے کہا کہ بالفرض یہودیوں کا ایسا ہی خیال ہو تب بھی آپ لوگ اس کو اتنا

[illegible] کیوں دیتے ہیں۔ ہم [illegible]
[illegible] انشاء اللہ ساری دنیا میں ایک اسلامی حکومت قائم ہو کر رہے گی [illegible]
[illegible] کے مطابق، دوسرے [illegible]
[illegible] ہے بلکہ ہم دنیا کے جس حصہ میں بھی ہوں ہر جگہ یہی اسلامی حکومت کا [illegible]
بنانا ہے [illegible] ہمیں اس قسم کی باتوں پر کوئی پریشانی نہیں۔

میں نے پوچھا کہ آپ کے پریشان نہ ہونے کی وجہ کیا ہے۔ اس نے کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ الاخوان المسلمون مصر میں ۱۹۲۸ میں قائم ہوئی۔ اس طرح اس کے قیام کو تقریباً ستر سال ہو رہے ہیں۔ ستر سال کے عرصہ میں وہ خود اپنے ملک مصر میں بھی اپنے تصور کی اسلامی حکومت قائم نہ کر سکی۔ پھر اس رفتار سے پوری دنیا کو اسلام کا سیاسی ماتحت بنانے کے لیے تو سات ہزار سال بھی ناکافی ہیں۔ ایسی حالت میں ہم ابھی سے اس کے لیے کیوں پریشان ہوں۔

قرآن میں واقعہ اسراء کے ذکر کے تحت ارشاد ہوا ہے: سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حولہ لنریہ من آیاتنا (بنی اسرائیل ۱) اس آیت میں ایک سوال یہ ہے کہ لنریہ من آیاتنا (تاکہ رسول کو ہم اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں) سے کیا مراد ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کو بارکنا سے جوڑا ہے۔ یعنی قدس کے آس پاس کی برکتیں دکھائیں۔ لیکن زیادہ صحیح رائے ان لوگوں کی ہے جنھوں نے اس کو اسریٰ سے جوڑا ہے اور کہا ہے کہ اس سے مراد آپ کو ایک رات میں مکہ سے مسجد اقصیٰ لے جانا ہے جو ایک مہینہ کی مسافت پر واقع ہے (اسراؤہ من مکۃ الی المسجد الاقصیٰ فی لیلۃ وھو مسیرۃ شھر) القرطبی ۱۰/۲۱۲

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اس آیت میں ایک اہم سبق تھا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم دانش وروں نے اور مسلم علماء نے نہ اس کو سمجھا اور نہ وہ اس کو استعمال کر سکے۔

یہ اسراء در اصل فطرت کے اس عظیم امکان کو دکھانا تھا جس کو ہم تیز رفتار کمیونی کیشن کہتے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس نئے دور کے سرے پر پیدا کیے گئے۔ اس لیے آپ کو مخصوص اہتمام کے تحت اس فطری طاقت کو پیشگی طور پر دکھا دیا گیا۔ [illegible] اس

[illegible] ہوجائے اور جب یہ امکان اپنی پوری شکل میں ظاہر ہو تو اس کو دین کی خدمت میں استعمال کرے۔

مگر موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں اور مسلم دانش وروں نے قدس کے سیاسی پہلو کو دیکھا، مگر اس سے زیادہ وسیع تر اور عظیم تر پہلو (جدید کمیونی کیشن) کی حقیقت کو وہ سمجھ نہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست کی چٹان سے تو وہ نصف صدی سے ٹکرا رہے ہیں مگر کمیونی کیشن کی جدید طاقت کو دعوت کے لیے استعمال کرنا ان کے لیے ممکن نہ ہو سکا۔

پاکستان کے لوگ پاکستان کو ملک خداداد کہتے ہیں۔ مثلاً لاہور کے ایک اسلامی ماہنامہ (اپریل ۱۹۹۶) میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کا قیام اللہ کی ایک آیت اور معجزہ ہے۔ اس کی پشت پر اکابرین ملت کی چار سو برس کی کوششیں ہیں۔ پاکستان خدائی تدبیر کے تحت وجود میں آیا۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی درج ہے کہ پاکستان جو اسلام کے لیے بنا تھا وہ اسلام کو چھوڑ کر سیکولرزم کی طرف بگٹٹ رواں دواں ہے۔ اسی رسالہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پاکستان مکمل طور پر یہودی نرغہ میں ہے۔ یہودی سازشوں نے اس کا رخ اسلام کے بجائے سیکولرزم کی طرف کر دیا ہے۔ حالاں کہ اس کے بعد پاکستان کے علاحدہ ملکی وجود کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا۔

یہ رسالہ قرآنک وزڈم کا علم بردار ہے۔ مگر مذکورہ بات کا قرآنک وزڈم سے کوئی تعلق نہیں۔ کیوں کہ قرآن میں تو یہ تصور دیا گیا ہے کہ خدا کی تدبیر ہر مخالف تدبیر پر بالاثابت ہوتی ہے، وان کان مکرھم لتزول منہ الجبال۔ مگر پاکستان کے قرآنی دانشور یہ خبر دے رہے ہیں کہ پاکستان میں نعوذ باللہ خدائی تدبیر پر یہودی تدبیر غالب آگئی۔

کہنے والے ایسی عجیب بات کیوں کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اس کا سبب خود تشکیلِ پاکستان میں ہو سکتا ہے۔ اور جب آدمی ایک غلطی کو نہ مانے تو اپنی غلطی کو درست کرنے کے لیے وہ مزید ایسی غلطیاں کرتا ہے جو پہلے سے بھی زیادہ غیر معقول ہوتی ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر کی قبر یروشلم میں مسجد اقصیٰ کے قریب ہے۔ مولانا محمد علی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ بیمار تھے۔ چنانچہ لندن کے ایک

مطابق ۴ جنوری ۱۹۳۱ کو لندن میں انتقال ہو گیا۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کو بیت المقدس میں دفن [illegible]
ادا کی گئی۔ پھر ۹ جنوری کو جہاز کے ذریعہ ان کی میت لندن سے یروشلم لائی گئی۔ جب [illegible]
[illegible] جب ان کی میت پورٹ سعید پہنچی تو مصر کے وزیر اعظم [illegible]
میں لے گئے۔ وہاں دوبارہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ شہزادہ محمد علی نے تلاوت کر کے ایک [illegible]
پر رکھا۔ اس کے بعد جب میت یروشلم پہنچی تو جنازہ میں تقریباً دس ہزار آدمی شریک تھے۔
مفتی اعظم آگے آگے چل رہے تھے۔ مسجد اقصیٰ پہنچ کر جنازہ کی آخری نماز ادا کی گئی۔ محمد علی
کی سوانح عمری میں یہ الفاظ درج ہیں: "اولین قبلۂ اسلام کا سینہ پھٹ گیا اور وہ اس میں
سما گیا۔ ان کے جسد خاکی کی آخری آرام گاہ وہ ارض قدس ہوئی جس کو قرآن نے الذی بارکنا
حولہ کہا ہے"۔ اس تدفین پر اقبال نے کہا:

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

قرآن میں ہے کہ لقد انزلنا الیکم کتابا فیہ ذکرکم (الانبیاء ۱۰) اس کی تشریح سہل بن عبداللہ نے یہ کی ہے کہ ہم نے تمہارے اوپر قرآن اتارا۔ اس میں وہ عمل بتایا گیا ہے جس میں تمہارے لیے زندگی ہے (العمل بما فیہ حیاتکم) القرطبی ۱۱/۲۷۳

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس آیت کے مطابق، یقیناً فلسطین کے مسئلہ کا حل بھی قرآن میں مذکور ہونا چاہیے۔ پھر میں نے کہا کہ اس معاملہ میں واضح رہنمائی قرآن میں موجود ہے، اور وہ یہ آیت ہے: ان یمسسکم قرح فقد مس القوم قرح مثلہ وتلک الایام نداولها بین الناس (آل عمران ۱۴۰)

اس آیت میں اسلامی تاریخ کے اس واقعہ کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اور اصحاب رسول کو بدر کے دن مشرکوں کے اوپر غالب کیا۔ اس کے بعد احد کے دن اللہ نے ان کے دشمنوں کو ان کے اوپر غلبہ دے دیا (اظہر اللہ عز وجل نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ علی المشرکین یوم بدر و اظہر علیہم عدوہم یوم احد) تفسیر الطبری ۴/۱۰۵

اس وقت مسلمانوں میں غم اور مایوسی کے جذبات پیدا ہوئے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے کہا گیا کہ آخرت کی نعمتیں تو صرف اہل ایمان کے لیے ہیں۔ مگر دنیا کا نظام امتحان اور

آزمائش کے اصل مقام کو بدل دیا گیا ہے۔ اس لیے یہاں ظالم اور مظلومیت کا تجربہ باری باری ہر ایک کو کرایا جاتا ہے، تاکہ ہر ایک کی ہر پہلو سے آزمائش ہو سکے [illegible]
جعلنکم

یہی بات ایک فارسی شاعر نے ان الفاظ میں کہی ہے کہ ——— دانش مند چڑیا جب جال میں پھنس جائے تو اس کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے:

مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

تحمل کا مطلب پسپا اندازی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جذباتی ردعمل سے بچ کر صابرانہ منصوبہ بندی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں تمام مسلم دانشور اور رہنما فلسطین کی بازیابی کے مسئلہ کو ملت مسلمہ کا مسئلہ نمبر ایک بتاتے ہیں۔ مگر عین اسی وقت تمام دنیا کے مسلمان باہمی لڑائیوں میں اپنی بہترین طاقت ضائع کر رہے ہیں۔ اس میں متشددانہ جنگ اور غیر متشددانہ جنگ دونوں شامل ہیں۔ مزید ستم یہ ہے کہ ہر ایک اپنے کو خادم دین اور مجاہد اسلام سمجھ رہا ہے۔

ایران اور عراق دونوں مسلسل فلسطین کے خلاف پرشور بیان دیتے رہتے ہیں۔ مگر دونوں آٹھ سال (۱۹۸۰ - ۱۹۸۸) تک خوں ریز قسم کی باہمی لڑائی لڑتے رہے۔ اس جنگ کے زمانہ کے ایرانی لیڈر آیت اللہ خمینی کے حامی کہا کرتے تھے کہ قدس کا راستہ بغداد ہو کر جاتا ہے (الطریق الی القدس یمرّ ببغداد) عین اسی وقت عراقی لیڈر صدام حسین کے حامی بلند بانگ طور پر یہ کہتے تھے کہ قدس کا راستہ تہران ہو کر جاتا ہے (الطریق الی القدس یمرّ بطہران)
دوبارہ صدام حسین نے ۱۹۹۰ میں کویت پر فوج کشی کر دی۔ اب صدام حسین کے حامی یہ کہنے لگے کہ قدس کا راستہ کویت ہو کر جاتا ہے (الطریق الی القدس یمرّ بالکویت)

اس قسم کے الفاظ فلسطین کے مسئلہ سے دل چسپی کا ثبوت نہیں ہیں۔ بلکہ صرف مسلم رہنماؤں کی استحصالی ذہنیت کا ثبوت ہیں۔ یہ صرف ان کے جرم میں اضافہ کرتے ہیں، وہ ان کو کسی انعام کا مستحق نہیں بناتے۔

۲۱ اگست ۱۹۹۵ کی شام کو واپسی ہوئی۔ یروشلم سے تل ابیب تک کا راستہ

[illegible] ہوا کہ قریب سے اس کی [illegible]

تل ابیب پہنچ کر ہم لوگ ٹھہریں گے [illegible]

[illegible] ہوں۔ یہ ایک ماڈرن شہر ہے۔ یہ میڈیٹرینین کے کنارے واقع ہے [illegible] سب سے بڑا شہری مرکز ہے۔ یہ ایک قدیم بستی کو ترقی دے کر موجودہ [illegible] بنایا گیا ہے۔ تل ابیب اور حیفا اور یروشلم میں اسرائیلی آبادی کا تقریباً [illegible] حصہ رہتا ہے۔

ایل آل کی ایرہوسٹس اخبارات دے رہی تھی۔ یہ انگریزی اور عبرانی کے اخبارات تھے۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے اسرائیلی تاجر نے عبرانی اخبار لیا۔ اس تقریب سے ان سے عبرانی زبان کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ اسرائیل میں سب سے بڑا عبرانی اخبار یدیعوت (Y'edioth) ہے۔ اس کے معنی ہیں تازہ خبریں۔ اس کے بعد نمبر ۲ کا اخبار معاریو (Maariv) ہے۔ عبرانی زبان دائیں سے بائیں کی طرف لکھی جاتی ہے۔ اس کے طرز تحریر کا ایک نمونہ یہ ہے :

חברת אל על שמחה להציג בפניכם תרגילי "התעמלות כסא", שנועדו לשפר את הרגשתכם בזמן הטי
את התרגילים, המיועדים לאנשים בריאים, מומלץ לבצע מספר פעמים במשך הטיסה (5-6 פעמים כל
בקצב איטי). את התרגיל האחרון רצוי לבצע כשעה לפני הנחיתה. אין להתעמל מיד לאחר הארוחה, א
כשעה וחצי אחריה, תרגילים 1, 2, 3, ו-7 יש לבצע לשני הצדדים. תיהנו!

مذکورہ تاجر سے میں نے پوچھا کہ عبرانی تو ایک مردہ زبان تھی۔ پھر اتنی کم مدت میں وہ اسرائیل کی ایک زندہ قومی زبان کس طرح بن گئی۔ اس نے کہا کہ عبرانی اگرچہ ہمارے یہاں عام استعمال میں نہیں تھی۔ مگر عام طور پر لوگ عبرانی کو سمجھتے تھے۔ کیوں کہ دعا اور عبادت میں وہ اس کو روزانہ استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ جب اس کو قومی زبان بنانے کا فیصلہ کیا گیا تو آسانی سے عبرانی زبان قومی زبان کے طور پر رائج ہوگئی۔ اور یہ صرف ایک شخص کی کوششوں سے ہوا۔

پاکستان میں کچھ رہنماؤں نے چاہا کہ عربی زبان وہاں کی قومی زبان بن جائے مگر وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ حالاں کہ پاکستان میں بھی تمام مسلمان عربی کو دعا اور عبادت کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ یہودیوں کو صرف عبرانی کے الفاظ نہیں سکھائے جاتے تھے بلکہ اس کا مطلب بھی انھیں پڑھایا گیا تھا۔ پاکستان کے مسلمانوں کو صرف [illegible] تھے۔ اس کے مفہوم سے [illegible] تھے۔

جہاز میں پہلی بار اسرائیل ایرلائنز (EL-AL) کا میگزین بابت جولائی - اگست ۱۹۹۵ دیکھا۔ اس میں کثرت سے مکانات کے اشتہارات تھے۔ مختلف کمپنیوں کے بنائے ہوئے مکانات کی خوب صورت تصویریں تھیں اور ان کے نیچے اس طرح کے خوش کن الفاظ لکھے ہوئے تھے :

Your dream home in Israel

یعنی اس خوب صورت کامپلکس میں اپنے لیے ایک اپارٹمنٹ حاصل کیجیے اور دنیا کی جنت میں رہنے کا لطف اٹھائیے۔ میں نے ایک اسرائیلی مسافر کو یہ اشتہارات دکھا کر اس کا تاثر پوچھا۔ اس نے کہا کہ ہم نے خوب صورت قسم کے رہائشی مکانات تو ضرور بنا لیے ہیں۔ مگر ایک نامعلوم خوف ہر یہودی کے دماغ میں ہوتا ہے کہ کیا معلوم کہ کب کہاں ایک بم پھٹ جائے۔

میں نے سوچا کہ موجودہ دنیا میں پرمسرت زندگی ممکن ہی نہیں۔ یہاں ہر حال میں کوئی نہ کوئی حزن لگا رہتا ہے۔ اس لیے حقیقی معنوں میں پرمسرت زندگی صرف آخرت کی جنت ہی میں ممکن ہے جہاں خدا اپنی برتر طاقت سے حزن کو حذف کر دے گا — اذہب عنا الحزن (فاطر ۳۴)

بمبئی ایرپورٹ پر مسز سوزن جیکب (Ms Susan Jacob) نے پریشان کیا تھا۔ اس کے بعد اسرائیلی کمپنی کا ایک نوجوان آیا۔ اس نے اپنا نام نیویل مستری (Naville Mistry) بتایا۔ اس نے مزید بتایا کہ اس کا باپ پارسی ہے اور اس کی ماں کیتھولک عیسائی ہے، ماں کے اثر سے لڑکا بھی عیسائی ہو گیا ہے۔ اس نوجوان نے ایرپورٹ پر میری رہنمائی کی۔ اس نے میرا بیگ اصرار کرکے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مجھ کو آخری گیٹ تک پہنچایا۔

سفر سے واپسی کے بعد مولانا انیس لقمان ندوی کا خط (۸ جولائی ۱۹۹۶) ملا۔ وہ آجکل ابوظبی میں مقیم ہیں۔ یہ خط فلسطین کے مسئلہ سے متعلق ہے اس لیے اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے :

ابوظبی میں قیام کے دوران پچھلے چھ مہینوں میں سو سے زیادہ عربوں سے ملاقات ہوئی۔ جن میں مقامی باشندوں کے علاوہ مصر، فلسطین، شام اور دیگر ملکوں سے آئے ہوئے وافدین بھی شامل ہیں۔ ان کے ساتھ جن موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی ان میں مسئلہ فلسطین سرفہرست ہے۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] سب کچھ میرا احساس ہے کہ [illegible]

[illegible] نے فلسطین کو ایک دینی اور شعوری مسئلہ بنا دیا ہے۔ [illegible] فلسطین کے مسئلے [illegible] والا ہر شخص خواہ وہ عرب ہو یا غیر عرب عام طور پر یہی سمجھتا ہے کہ آزادیٔ فلسطین [illegible] کے مجاہدانہ جوش و خروش کا اصل محرک دینی احساس اسلامی ہے۔ مگر عربوں کے ساتھ [illegible] قریب سے ان کی نفسیات اور مزاج کا تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ "جہاد فلسطین" کا حقیقی محرک دینی حمیت یا اسلامی غیرت سے زیادہ عربوں کی قومی نخوت اور [illegible] [illegible] ہے۔

مسئلہ فلسطین غالباً واحد مسئلہ ہے جس کے بارہ میں عرب دنیا کا تقریباً ہر شخص حساس ہے۔ بلکہ یہی ایک معاملہ ایسا ہے جس میں وہاں کا سیکولر اور اسلام پسند طبقہ دونوں ایک دوسرے کا ہمنوا ہے حالاں کہ دوسرے تمام معاملات میں ان کا حال یہ ہے کہ پہلا گروہ دوسرے کو انتہا پسندی اور دہشت گردی کا الزام دیتا ہے تو دوسرا گروہ پہلے کو کافر اور ملحد قرار دیتا ہے۔ اگر آزادیٔ فلسطین کا اصل محرک اسلامی غیرت و حمیت کو قرار دیا جائے تو پھر اس واقعہ کی توجیہہ ناممکن ہو جاتی ہے کہ کیوں ایسے لوگ بھی اس "جہاد" میں اسلام پسندوں کے شانہ بشانہ شریک ہیں جنھیں یہ کافر اور ملحد سمجھتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حسن البناء اور شاہ فیصل کی طرح عرب حکام اور عوام دونوں کے درمیان ایک تعداد ایسے افراد کی پائی جاتی ہے جن کے لیے فلسطین پر یہودی قبضہ ان کی دینی غیرت کو چیلنج ہے اور فلسطین کی بازیابی کے لیے کوشش کرنا ایک اسلامی ذمہ داری۔ مگر عربوں کی اکثریت کے لیے یہ حقیقتہً عرب قومیت (العروبة) کو چیلنج کرنے کا مسئلہ ہے۔ یہ بات ان کے لیے حد درجہ ناقابل برداشت ہے کہ یہود، جو تعداد میں انتہائی قلیل ہیں اور سیکڑوں برس تک ان کے محکوم رہے ہیں، وہ ان کے اپنے ایک ملک پر اس طرح قابض ہو جائیں کہ بقیہ ممالک کے لیے ان کا وجود خطرہ بن جائے۔ عربوں کی قومی نخوت اس کا تحمل نہیں کر سکتی کہ وہ یہود کے مقابلہ میں پست ثابت ہوں یا یہود ان کے پڑوس میں ان کے ہم سطح اور ہمسری کی حیثیت سے آزادانہ زندگی گزاریں۔ ایک لفظ میں پورا اصل مسئلہ یہودی نسل پرستی (صیہونیت) کے

ل عرب قومیت (العروبة) کی بالادستی کے درمیان کش مکش کا مسئلہ ہے۔

چونکہ تقریباً ڈیڑھ ہزار برس تک یہود کے اوپر عرب کا غلبہ اور تسلط رہا ہے۔ اس
ی کے نصف اول تک عرب دنیا میں یہود کی حالت کم و بیش وہی تھی جو قرآن کے ان الفاظ
بیان ہوئی ہے کہ "حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون" مگر جب حالات
لے اور نئے دور میں طاقت اور غلبہ کے جدید وسائل کو بروقت استعمال کرکے یہود نے
لی طور پر اپنے آپ کو مستحکم کر لیا۔ جب کہ عرب دنیا ایسا کرنے میں ناکام رہی۔ اور بالآخر یہود
طین کے اوپر قابض ہو کر عربوں کے لیے مستقل خطرہ بن گئے تو نہایت شدت کے ساتھ ان کے
جذبات بھڑک اٹھے۔ ذہنی اور نفسیاتی طور پر وہ سخت تناؤ اور جھنجلاہٹ اور احساس
ی کا شکار ہو گئے۔ اسی جھنجلاہٹ اور احساس کمتری کو دور کرنے کے لیے وہ ایک طرف
نے عظیم ماضی کا تذکرہ کرتے ہیں اور دوسری طرف یہود کو احفاد القردۃ والخنازیر (بندر
ر خنزیر کی اولاد) اور اسی طرح کے دوسرے حقارت آمیز ناموں سے پکارتے ہیں۔ دوسرے
لفظوں میں یہ کہ وہ یہود کو اپنے ماضی کے آئینہ میں دیکھ کر یہ جھوٹی تسکین حاصل کرتے ہیں کہ ہمیں
کے اوپر برتری اور بالادستی حاصل رہی ہے۔ مگر وہ اپنے حال کا تقابل یہود کے حال سے
ہیں کرتے۔ کیوں کہ ایسا کرنے میں ان کے اندر جھنجلاہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ ان کی قومی نخوت
واقعہ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ ان کی غفلت اور دوسروں کی زمانہ شناسی کے نتیجہ میں
فاد القردۃ والخنازیر کہیں براہ راست ان کے اوپر غالب ہیں اور کہیں بالواسطہ طور
مسلط ہیں۔

آج کل عرب دنیا کی اسلامی تنظیموں خصوصاً آزادی فلسطین کے لیے سرگرم تنظیم حرکۃ المقاومۃ
الاسلامیۃ (حماس) میں ایک نیا رجحان ابھر رہا ہے۔ وہ یہ کہ اس تنظیم کے افراد اپنے جسم پر بم
ھ کر دشمن کے کسی ٹھکانے یا کسی اہم سرکاری یا عسکری اہمیت کے حامل دفتر میں کود پڑتے
۔ ان کے جسم سے بندھا بم جب پھٹتا ہے تو وہ خود تو ہلاک ہوتے ہی ہیں مگر اپنے ساتھ
ی کئی اور بہت سے افراد اور املاک کو تباہ کر دیتے ہیں۔ عام آدمی اگر ایسا عمل کرے تو اسے
[illegible]

بجائے شہادت طلبی (یعنی استشہاد) ہو۔ [illegible] سلسلہ میں ایک [illegible]
کا ایک مفصل مقالہ کویت کے ہفت روزہ المجتمع (۱۸ جون ۱۹۹۶) صفحات ۴۸-۴۹ میں چھپا
ہے۔

مذکورہ مقالہ میں یوسف القرضاوی نے مختلف دلائل کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حماس کے نوجوانوں کا یہ اقدام شہادت طلبی کا عمل ہے نہ کہ خودکشی کا۔ کیوں کہ وہ دشمن کو خوف زدہ کرنے (ارھاب العدو) کی ایک جدید اور موثر تکنیک ہے۔ دوسرے یہ کہ ان نوجوانوں کا مقصد محض خدا کی رضا جوئی ہے اور اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف کبھی کارروائی پر اگر کوئی اس طرح اپنے کو ہلاک کرتا ہے تو یہ لاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کا مصداق ہلاکت نہیں بلکہ شہادت ہے۔ جس طرح صحابہ کرام کے بارے میں آتا ہے کہ مختلف غزوات میں انھوں نے اپنے آپ کو دشمن کے نرغہ میں ڈال دیا اور بالآخر شہید ہو گئے۔

اس سلسلہ میں دو باتیں ملحوظ رکھنی چاہئیں۔ اولاً یہ کہ صحابہ وغیرہ نے بعض غزوات میں جو یہ کیا کہ میدانِ جنگ میں دیوانہ وار کود پڑے اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ انھوں نے ایسا میدانِ جنگ میں کیا جہاں عملاً جنگ برپا تھی۔ نہ کہ ایسی جگہ جہاں دشمن کے علاوہ بھی بہت سے غیر متعلق لوگ موجود ہیں۔

دوسرے یہ کہ صحابہ نے اگرچہ شہادت کے شوق میں جاں بازی دکھائی۔ مگر اس جاں بازی میں جتنا ان کا لڑکر مر جانے کا امکان تھا اتنا ہی امکان اس بات کا بھی تھا کہ وہ لڑکر دشمن کو ماریں گے اور فتح یاب ہو کر لوٹیں گے۔ قرآن کے الفاظ میں وہ جب قتال کرتے تھے تو یا دشمن کو قتل کرتے تھے یا دشمن کے ہاتھوں قتل ہوتے تھے (فیقتلون و یقتلون) گویا صحابہ کے اقدام میں احتمالی طور پر دو بہتر نتائج (احدی الحسنیین) پوشیدہ تھے۔ یعنی وہاں فتح اور شہادت دونوں کا پچاس پچاس فیصد امکان رہتا تھا۔ مگر اس کے برعکس حماس وغیرہ کے موجودہ اقدام کا نتیجہ یقینی موت ہے۔ ایسی صورت میں اس کو صحابہ کے جاں بازانہ اقدام کے مشابہ قرار دینا قیاس مع الفارق ہے۔ قرآن و حدیث اور آثار صحابہ میں اس بات کے حق میں کوئی دلیل موجود نہیں کہ جہاں پیشگی طور پر صد فی صد موت یقینی ہو ایسے موقع پر اقدام درست ہے۔

یہ مشترک بات ہے کہ اسلام کا ایک متفقہ اصول ہے کہ جہاد کے معاملہ میں مسلمانوں کی داخلی قوت اصل معیار ہے۔ اگر داخلی اعتبار سے مسلمان مستحکم ہیں تو جہاد کا اقدام کیا جائے گا مگر داخلی استحکام مطلوبہ معیار سے کم ہے تو اسی تناسب سے جہاد کے حکم میں تخفیف ہو جائے گی۔ ابتداءً اہل اسلام اپنے ایمان اور اللہ و رسول کے ساتھ محبت و وفاداری میں بہت بڑھے ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے سے دس گنی طاقت کے مقابلہ میں جہاد کا حکم دیا۔ مگر جب اس پہلو سے اہل اسلام کی صفوں میں کمزوری آگئی تو اللہ تعالیٰ نے اس میں تخفیف کر دی اور صرف اپنے سے دوگنی قوت کے مقابلہ میں اقدام کی اجازت دی۔ یہ تخفیف اس گروہ کے لیے کی گئی جن کو صحابہ کہا جاتا ہے اور جو نبی آخر الزماں کے ساتھ تھا۔ آج کوئی قائد یا گروہ یہ دعویٰ کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا کہ وہ کسی بھی اعتبار سے پیغمبر یا آپ کے اصحاب سے زیادہ مستحکم اور طاقت ور ہے۔ چنانچہ آج مسلمانوں کے اوپر تخفیف کا اصول بدرجۂ اولیٰ منطبق ہوتا ہے (الئن خفف عنکم ...)

۳ جون کو مغرب کی نماز کے بعد دو عرب طالب علموں سے ملاقات ہوئی۔ ایک کا نام محمد داؤد تھا جو فلسطین کے رہنے والے ہیں اور ابوظبی کے مدرسہ بن درید میں اول ثانوی میں پڑھتے ہیں۔ فون (459025)۔ دوسرے کا نام عمار مصطفیٰ تھا جو مدرسہ ربعی بن عامر، ابوظبی، میں زیر تعلیم ہیں۔ فون (458752) گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ وہ ابھی ابھی اپنا سالانہ امتحان دے کر فارغ ہوئے ہیں۔ اور اب ان کی گرمی کی چھٹیاں شروع ہوئی ہیں۔

میں نے کہا کہ اسکول کا امتحان تو معمولی امتحان ہوتا ہے اس کو چند ہفتوں یا مہینوں کی محنت کے ذریعہ پاس کیا جا سکتا ہے۔ مگر ایک بہت بڑے امتحان میں پوری عرب دنیا پچھلے پچاس برس سے مبتلا ہے لیکن ابھی تک وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔ یہ امتحان فلسطین کو یہود کے قبضہ سے آزاد کرانے کا مسئلہ ہے۔

پھر میں نے کہا کہ آپ لوگوں کا تعلق اس نسل سے ہے جسے اکیسویں صدی میں میدانِ عمل میں اترنا ہے۔ شاید آپ لوگ اس امتحان میں کامیاب ہو جائیں جس میں پچھلی تین نسلیں مسلسل ناکام ہوتی رہی ہیں۔ میں نے ان سے سوال کیا کہ فلسطین کو آزاد کرانے کے سلسلہ میں

آپ لوگوں کا کیا خیال ہے اسے طاقت کے ذریعے آزاد کیا جا سکتا ہے [illegible]
[illegible] ان شاء اللہ [illegible]

یہ سوال میں نے ایک کاغذ پر لکھ کر دو تین نوجوانوں کو دیا [illegible]
غور کر کے مجھے بذریعہ ای میل تحریری یا بذریعہ ٹیلی فون زبانی اپنے جواب سے مطلع [illegible]
ہو سکے تو اس معاملہ میں اپنے والدین سے بھی مشورہ کر لیں۔

تین دن بعد میں نے خود ان کے گھر فون کیا۔ داؤد کے والد نے کہا کہ اپنے لڑکے کو میں نے امتحان کے زمانے میں بھی اتنا سنجیدہ غور و فکر اور مطالعہ میں غرق نہیں پایا جتنا وہ پچھلے تین روز سے آپ کے سوال کا جواب تیار کرنے میں محو ہیں۔ انھوں نے بڑا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ چھٹیوں میں ہم اپنے بچوں کو کوئی بامعنی سرگرمی یا کام نہیں دے پاتے۔ آپ نے بڑا اچھا کیا کہ ان کے خالی اوقات کو ایک بامعنی سرگرمی سے پر کر دیا (لقد احسنت بذلك فی ملأ فراغهم بنشاط هادف)

اس کے بعد داؤد سے براہ راست گفتگو ہوئی۔ وہ اپنا اور اپنے ساتھی حماد کا مشترک جواب مجھے فون پر پڑھ کر سنا رہے تھے۔ ان کے تفصیلی جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ سرزمین فلسطین کو یہود کے جابرانہ قبضہ سے طاقت کے سوا کسی اور ذریعہ سے آزاد نہیں کرایا جا سکتا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ دعوت طاقت کی متبادل یا قائم مقام ہو سکتی ہے (لا يمكن تحرير ارض فلسطين من الاحتلال اليهودي الغاشم الا بالقوة، ولا نظن ان الدعوة يمكن ان تكون بديلا حسن القوة او ان تحل محلها)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان ابھی تک دعوت کی تسخیری طاقت کا راز دریافت نہیں کر سکے ہیں۔ حالاں کہ تاریخ میں اسلام کی تمام عظیم فتوحات کا دروازہ دعوت ہی کے ذریعہ کھلا ہے۔ اگر اکیسویں صدی میں فلسطین اور اس جیسے دوسرے ملی اور عالمی مسائل کو حل کرنا ہے تو جدید مسلم نسل میں صحیح دعوتی شعور پیدا کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر ہمارے مسائل آئندہ کئی صدیوں میں بھی غیر حل شدہ پڑے رہیں گے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risala

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

نومبر ۱۹۹۶ ، شمارہ ۲۵۲

فہرست

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, Near DESU,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250, Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY
MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2581095

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

صفتِ مومن

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کسی ایک بل سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا: لا يلدغ المؤمن من جحر واحد مرتين (فتح الباری بشرح صحیح البخاری [illegible])

یہ حدیث تمثیل کی زبان میں یہ بتاتی ہے کہ مومن کسی غلط اقدام کا دوبارہ تجربہ نہیں کرتا۔ کسی معاملہ میں ایک بار کا غلط اقدام اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے کہ وہ دوسری بار اس کا اعادہ نہ کرے۔

مومن کے اندر یہ صفت کیسے آتی ہے۔ اس کا راز توبہ ہے۔ ایمان آدمی کے اندر جو ذہن پیدا کرتا ہے۔ اس ذہن کا ایک اہم پہلو توبہ ہے۔ توبہ کے لفظی معنی پلٹنے کے ہیں۔ یعنی آدمی اگر بھول سے ایک غلطی کر جائے تو فوراً ہی اس کے اندر اپنی غلط کاری کا احساس جاگ اٹھے۔ یہ احساس اتنا شدید ہو کہ وہ غلطی کی حالت سے لوٹ کر اصلاح کی حالت کی طرف آ جائے۔

ایمان یہ ہے کہ آدمی کے اوپر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ وہ اس دنیا میں آزاد نہیں ہے بلکہ وہ ایک قادرِ مطلق خدا کی نگرانی میں ہے۔ اور لازمی طور پر ایک ایسا دن آنے والا ہے جب کہ خدا اس کے تمام اعمال کا حساب لے۔ جب کسی آدمی پر یہ سنگین حقیقت منکشف ہوتی ہے تو وہ اس کو اس معاملہ میں انتہائی حد تک حساس بنا دیتی ہے کہ وہ کسی غلطی پر قائم نہ رہے۔ اگر کسی اتفاقی سبب سے اس سے کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے تو فی الفور اس کا اندرونی احساس جاگ اٹھتا ہے اور وہ غلطی سے توبہ کر کے اللہ کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔

غلطی پر اصرار نہ کرنے کا یہ جذبہ جو مومن کے اندر آخرت کی نسبت سے پیدا ہوتا ہے وہی دنیا کے معاملات میں بھی لازمی طور پر ظاہر ہونے لگتا ہے۔ یہ صفت مومن کی شخصیت کا ایک لازمی جز بن جاتی ہے۔ اسی طرح یہ صفت اس بات کی ضمانت بن جاتی ہے کہ وہ غلطی پر قائم رہ سکے۔ ایک غلط اقدام کے بعد وہ دوسری بار اس کا تجربہ نہ کرے۔

صحیح عمل سنجیدگی کا نتیجہ ہوتا ہے، اور غلط عمل غیر سنجیدگی کا۔ سنجیدہ انسان کرنے سے پہلے سوچتا ہے۔ وہ ہمیشہ محتاط روش کو اختیار کرتا ہے۔ اس لیے وہ غلط اقدام سے بچ جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں غیر سنجیدہ انسان بے سمجھی اور بے احتیاطی کے ساتھ عمل کرتا ہے، اس لیے اس کا اقدام غلط بھی ہوتا ہے اور بے نتیجہ بھی

عسر میں یسر

۹ دسمبر کو ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی کے ساتھ لاس اینجلیز گیا۔ وہاں کے اسلامک سنٹر میں چند گھنٹے۔ امریکی فوج کے تحت کیلی فورنیا میں آرمڈ فورسز ریڈیو اینڈ ٹیلی ویژن براڈ کاسٹ سنٹر کا ادارہ قائم ہے۔ اس کے نمائندہ کے طور پر مسٹر رچرڈ ڈیون پورٹ (Richard Davenport) وہاں آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا ادارہ مختلف قسم کے ویڈیو کیسٹ تیار کرتا ہے جو امریکی فوج کے لیے ٹیلی ویژن پر دکھایا جاتا ہے۔ یہ پروگرام امریکہ کی تمام فوجی تنصیبات (Bases) پر دیکھا جاتا ہے۔

اس وقت امریکہ کی تقریباً چار لاکھ فوج خلیج عرب کے علاقہ میں ہے۔ مزید فوج بھی وہاں بھیجی جا سکتی ہے۔ چنانچہ امریکی فوجی اسلام اور عرب کلچر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ خلیج میں امریکی فوجوں کی موجودگی سے ایک اچھی چیز یہ برآمد ہوئی ہے کہ بہت سے لوگ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں:

The one good thing that came out of this armed forces' presence in the Gulf is that many people are now interested to know more about Islam and Muslim people.

امریکہ کے فوجی ٹی وی کی یہ ٹیم اسی لیے لاس اینجلیز کے امریکی سنٹر میں آئی تھی کہ وہ اسلام کے تعارف پر ایک ویڈیو فلم تیار کرے۔ چنانچہ وہ اس کو تیار کر کے لے گئے اور اس کے بعد اسے امریکی ٹی وی پر فوجی نشریات کے پروگرام میں دکھایا گیا۔

خدا کی اس دنیا میں عُسر (مشکل) میں بھی یُسر (آسانی) کا امکان پایا جاتا ہے۔ یہاں ہر ڈس ایڈوانٹیج میں لازمی طور پر ایڈوانٹیج کا ایک پہلو موجود رہتا ہے۔

خلیج کی جنگ (۱۹۹۱ء) میں امریکی فوجیں عرب سرزمین میں اتر گئیں۔ اس بظاہر ناخوشگوار واقعہ میں ایک خوش گوار پہلو موجود تھا۔ اس کے دوران امریکیوں کا براہِ راست اختلاط مسلمانوں سے ہوا۔ اس کے بعد فطری طور پر امریکیوں میں یہ تجسس پیدا ہوا کہ وہ مسلمانوں کے مذہب کو جانیں۔ اس طرح یہ واقعہ اسلام کی تبلیغ کا ایک ذریعہ بن گیا۔

قناعت کیجیے

بنگلہ دیش کے سابق فوجی صدر جنرل محمد ارشاد ایک فوجی بغاوت کے ذریعہ اقتدار میں آئے۔ اس کے بعد دوسری فوجی بغاوت ہوئی۔ جس کے تحت قائم شدہ حکومت نے ان پر جرائم کے کئی مقدمات چلائے۔ پہلے غیر قانونی اسلحہ رکھنے کے الزام میں تیرہ برس قید کی سزا ہوئی تھی، مالی بدعنوانی کے تحت انھیں مزید سات سال کی سزا کا حکم سنایا گیا۔

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۸ جون ۱۹۹۳) میں اس سلسلے میں جو خبر چھپی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے: جنرل محمد ارشاد اور ان کی اہلیہ روشن کو ڈھاکہ کی خصوصی عدالت نے زمینوں کے لین دین کے سلسلہ میں بدعنوانیوں کا مرتکب قرار دے کر ۷، ۷ برس کی قید کی سزا سنائی۔ جنرل ارشاد نے کئی افراد کو ڈھاکہ کے قیمتی علاقہ میں زمینیں دلوائیں اور پھر ان کا کچھ حصہ ان افراد سے سستے داموں میں خرید کر اس زمین پر "جنتا ٹاور" کے نام سے ایک عمارت تعمیر کروائی اور اس پر خرچ ہونے والی رقم کا بڑا حصہ انھوں نے خود اپنی جانب سے ادا کیا۔ چوں کہ یہ رقم ان کی آمدنی سے زیادہ تھی، عدالت نے مذکورہ تمام آراضی اور جنرل ارشاد کی عمارت کو بحق سرکار ضبط کا حکم دے دیا ہے اب وہ اور ان کی بیوی دونوں جیل میں ہیں۔

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ انسان کی زندگی میں اس چیز کو کتنی زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جس کو دینی اصطلاح میں قناعت کہا جاتا ہے۔ جنرل ارشاد کا یہ افسوس ناک انجام اس لیے ہوا کہ وہ قناعت نہ کر سکے۔ انھوں نے جنرل کے عہدہ پر قناعت نہ کر کے صدر کے عہدے پر پہنچنا چاہا۔ انھوں نے چھوٹی زمین پر قناعت نہ کر کے بڑی زمین حاصل کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ایک منزلہ مکان پر قناعت نہ کر کے تیرہ منزلہ مکان کا مالک بننا چاہا۔

انھیں جو کچھ فطری طور پر ملا تھا، اگر وہ اسی پر قناعت کرتے تو وہ اطمینان کے ساتھ ایک پر مسرت زندگی گزار سکتے تھے، مگر وہ ملے ہوئے پر قناعت نہ کر کے نہ ملے ہوئے کی طرف دوڑے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزید کی حرص میں وہ ملے ہوئے سے بھی محروم ہو کر رہ گئے۔

زندگی کے مسائل کا حل قناعت ہے نہ کہ حرص۔

سنجیدہ انسان

امریکی میگزین پلین ٹروتھ کے سابق ایڈیٹر کا انتقال ۸۲ سال کی عمر میں ہوا۔ انھوں نے اپنے آخری وقت سے پہلے ایک میں میگزین کے ایڈیٹوریل میں لکھا تھا کہ اپنی لمبی عمر کے دوران میرا سابقہ ان گنت لوگوں سے پیش آیا۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ دنیا میں سب سے انوکھی چیز کیا ہے تو میں نہ ریڈیم کا نام لوں گا اور نہ پلیٹینیم کا۔ میں کہوں گا کہ دنیا میں سب سے زیادہ نادر اور کمیاب چیز سنجیدگی (sincerity) ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں بہت ہی کم ایسے انسان ملے جو فی الواقع سنجیدہ (sincere) تھے۔

سنجیدگی کیا ہے۔ سنجیدگی دراصل اسی صفت کا اخلاقی نام ہے جس کو مذہب کی اصطلاح میں اخلاص کہا جاتا ہے۔ سنجیدگی اور اخلاص میں درجے کا فرق تو ضرور ہے لیکن ان میں نوعیت کا کوئی فرق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سنجیدگی ہی کی ترقی یافتہ صورت کا نام اخلاص ہے۔

سنجیدہ انسان ذمہ دار اور محتاط انسان ہوتا ہے۔ اس دنیا میں حقیقتِ واقعہ کا اعتراف سب سے بڑا فعل ہے۔ اور حقیقتِ واقعہ سے مطابقت سب سے بڑا عمل، اور یہ اعلیٰ انسانی صفت ایک سنجیدہ انسان کے اندر اپنے کامل درجہ میں پائی جاتی ہے۔

سنجیدہ انسان ہمیشہ سچ بولتا ہے، کیوں کہ وہ جھوٹ بولنے کا تحمل نہیں کر سکتا۔ سنجیدہ انسان بولنے سے پہلے سوچتا ہے کیوں کہ بے فائدہ کلام اس کے مزاج کے مطابق نہیں۔ سنجیدہ انسان اپنے وعدے کو پورا کرتا ہے کیوں کہ وعدہ کرنے کے بعد اس کی خلاف ورزی اس کو اپنے قتل کے ہم معنی نظر آتی ہے۔ سنجیدہ انسان حق کا اعتراف کرتا ہے، کیوں کہ حق کی وضاحت کے بعد اس کا اعتراف نہ کرنا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ سنجیدہ انسان دلیل کے آگے جھک جاتا ہے۔ کیونکہ دلیل کے آگے نہ جھکنا اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ اس نے خود اپنے وجود کی نفی کر دی ہو۔ سنجیدہ انسان جس نظر سے اپنے آپ کو دیکھتا ہے اسی نظر سے وہ دوسروں کو بھی دیکھتا ہے۔ کیوں کہ دہرا معیار اختیار کرنا اس کو ایسا لگتا ہے جیسے کہ اس نے اپنی حیثیتِ انسانی کو ذبح کر دیا ہو۔ سنجیدہ انسان فطرت کا ایک حسین پھول ہے۔ وہ ایک ایسی بامعنی مخلوق ہے جس سے زیادہ بامعنی مخلوق اس کائنات میں کوئی دوسری نہیں۔

مستقبل بینی

مئی ۱۹۹۲ میں ایک صاحب آندھرا پردیش سے دہلی آئے۔ وہ بطور تحفہ ہمارے لیے آم بھی لائے تھے۔ آم کی ٹوکری پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ آم جب میں نے اپنے یہاں کے بازار سے لیے تو وہ بالکل اچھے تھے۔ مگر راستہ میں شدید گرمی پڑی جس کی وجہ سے اکثر آم خراب ہوگئے۔

میں خاموش رہا۔ اس وقت مجلس میں ایک "باغبان" بھی موجود تھے۔ انھوں نے آم کو دیکھتے ہوئے کہا کہ بھائی صاحب، یہ آم گرمی کی وجہ سے خراب نہیں ہوئے ہیں بلکہ آپ کی ایک غلطی کی وجہ سے خراب ہوئے ہیں۔

پھر باغباں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اپنے یہاں کی مارکٹ سے جب آم لیے تو کیا وہ پکے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ باغباں نے کہا کہ خراب ہونے کی وجہ یہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ پکے ہوئے آم مقامی استعمال کے لیے ہوتے ہیں۔ جب آم کو دور لے جانا ہو تو اس وقت کچے آم خریدے جاتے ہیں۔ اگر آپ نے کچے آم لیے ہوتے تو ایک آم بھی خراب نہ ہوتا۔ سب کے سب اچھی حالت میں یہاں تک پہنچ جاتے۔

اس واقعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاملات میں مستقبل بینی کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ جب بھی آپ ایک ایسا منصوبہ بنائیں جس کی تکمیل آئندہ ہونے والی ہو تو ایسی صورت میں صرف حال کا علم کافی نہیں۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ آپ مستقبل کو جانیں، آج کے دائرے سے اوپر اٹھ کر کل پیش آنے والے واقعات سے واقفیت حاصل کریں۔

منصوبہ حال میں بنایا جاتا ہے مگر اس کا نتیجہ ہمیشہ مستقبل میں نکلتا ہے۔ منصوبہ بندی حقیقۃً نام ہی مستقبل کی منصوبہ بندی کا ہے۔ اس قسم کا کامیاب منصوبہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ وقتی جوش کے بجائے سوچ سے کام لیا جائے، جذباتیت کے بجائے حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ حال کے مسائل کو اہمیت دینے سے زیادہ مستقبل میں پیش آنے والے حالات کا لحاظ کیا جائے۔

دوسروں کی رعایت

آپ سڑک پر اپنی گاڑی دوڑا رہے ہیں۔ سامنے سے دوسری گاڑی آتی ہوئی نظر آئی۔ اب آپ کے لیے دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ پہلے کی طرح بیچ سڑک پر اپنی گاڑی دوڑاتے رہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ اپنی گاڑی کو ایک طرف موڑ دیں اور سامنے والی گاڑی کے کنارے سے نکل جائیں۔

ایسے موقع پر آپ کیا کرتے ہیں۔ ایسے موقع پر آپ ہمیشہ یہ کرتے ہیں کہ اپنی گاڑی کو کنارے کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ اگر آپ بدستور اپنی گاڑی سیدھے رخ پر دوڑاتے رہیں تو آپ کی گاڑی سامنے والی گاڑی سے ٹکرا جائے گی۔ اس کے بعد آپ کا انجام یہ ہوگا کہ آپ منزل پر پہنچنے کے بجائے قبرستان میں پہنچ جائیں گے یا زخمی ہو کر اسپتال لے جائے جائیں گے۔ مگر جب آپ اپنی گاڑی کو کنارے کی طرف موڑ دیتے ہیں تو آپ کی گاڑی اور آپ دونوں محفوظ حالت میں منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔

یہی اس دنیا میں زندگی کا راز ہے۔ سڑک پر کوئی سواری اکیلی نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ اور بہت سی سواریاں سڑک پر دوڑ رہی ہوتی ہیں۔ اس لیے ہر ایک کو دوسرے کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ یہی معاملہ وسیع تر معنوں میں پوری انسانی زندگی کا ہے۔ موجودہ دنیا میں آپ اکیلے نہیں ہیں۔ بلکہ بہت سے دوسرے انسان بھی آباد ہیں۔ ہر ایک اپنی اپنی سرگرمیوں کو پوری طاقت کے ساتھ جاری کیے ہوئے ہے۔ ایسی حالت میں وسیع تر زندگی میں بھی کامیابی کا راز وہی ہے جو محدود معنوں میں سڑک کے سفر میں اختیار کیا جاتا ہے۔ یعنی دوسروں کی رعایت کرتے ہوئے اپنے مقصد کے لیے جدوجہد کرنا۔

آپ جس طرح اپنے جذبات کو جانتے ہیں اسی طرح آپ کو دوسرے کے جذبات کو بھی جاننا ہوگا۔ آپ جس طرح اپنے منصوبے کو جانتے ہیں اسی طرح آپ کو دوسروں کے منصوبے سے بھی واقف ہونا پڑے گا۔ آپ جس طرح اپنا فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اسی طرح آپ کو یہ بھی جاننا ہوگا کہ دوسروں کے کیا مفادات ہیں اور وہ کس طرح ان کو حاصل کرنا چاہتے ہیں —— اس دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو جاننے کے ساتھ دوسروں کو بھی جانیں۔

اغیار سے تعاون

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو یہ ایک بے حد نازک سفر تھا۔ یہ سفر مکہ کے مشرکین کے ظلم و تشدد کی وجہ سے کرنا پڑا تھا۔ اس کے باوجود اس سفر کے لیے آپ نے جس گائڈ کا انتخاب کیا وہ مکہ کا ایک غیر مسلم عبد اللہ بن اریقط تھا۔ اس غیر مسلم گائڈ نے آپ کی رہنمائی کرتے ہوئے آپ کو مکہ سے مدینہ پہنچایا۔

اس سنت سے معلوم ہوا کہ دوسروں سے تعاون لینے میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق کرنا درست نہیں۔ اس طرح کے تعاون کے معاملے میں اہلیت دیکھی جائے گی نہ کہ رشتہ اور مذہب۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی پالیسی ہمیشہ اختیار کی۔ مثال کے طور پر بدر کی لڑائی کے بعد ستر کی تعداد میں غیر مسلم گرفتار کرکے مدینہ لائے گئے۔ یہ لوگ اس زمانہ کے لحاظ سے پڑھے لکھے تھے۔ چنانچہ آپ نے اعلان کیا کہ ان میں سے جو شخص مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا اور پڑھنا سکھا دے اس کو ہم رہا کر دیں گے۔ اس طرح گویا اسلام کی تاریخ میں خود رسول اللہ کے حکم سے جو پہلا اسکول کھولا گیا اس کے تمام کے تمام ٹیچر غیر مسلم تھے۔

زندگی کے معاملات میں اس اصول کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ کسی کام میں ساتھی اور کارکن کا انتخاب کرتے ہوئے اگر یہ دیکھا جائے کہ وہ اپنے مذہب کا ہے یا غیر مذہب کا، یا اپنی برادری کا ہے یا غیر برادری کا، تو اس سے کام کا معیار ختم ہو جائے گا۔ اس طرح کبھی کوئی کام اعلیٰ معیار پر انجام نہیں دیا جا سکتا۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ کام کو کام کے طور پر دیکھا جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ جو کام کرنا ہے اس کام کے لیے زیادہ بہتر اور زیادہ کارآمد کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ایسے معاملات میں میرٹ کی بنیاد پر افراد کا انتخاب کیا جائے نہ کہ کسی اور بنیاد پر۔

میرٹ کی بنیاد انتخاب کرنے سے اصل کام کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اور جب کسی اور چیز کو انتخاب کی بنیاد بنایا جائے تو اسی چیز کو فروغ حاصل ہوگا جس کو انتخاب کی بنیاد بنایا گیا ہے۔

مقام نفوذ

مالی کو ایک پودا لگانا تھا۔ اس نے باغ میں ایک گڑھا کھودا۔ اس کی زمین نرم کرنے کے لیے اس نے گڑھے میں ایک بالٹی پانی ڈالا۔ کچھ دیر کے بعد پانی سوکھ چکا تھا۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہاں زمین کے نیچے ایک سوراخ تھا۔ اس سوراخ سے سارا پانی نیچے چلا گیا۔

یہ فطرت کا اصول ہے جس کو پانی نے عملی طور پر جرت کر دکھایا۔ پانی نے ایسا نہیں کیا کہ وہ گڑھے کی سخت جگہ پر ٹکرا کر وہاں اپنا راستہ بنانے کی کوشش کرے۔ بلکہ اس نے گڑھے کے اندر اپنے لیے ایک مقام نفوذ (penetration point) تلاش کیا۔ اور وہاں سے راستہ بنا کر اندر داخل ہوگیا۔

فطرت کا یہی اصول انسانی زندگی کے لیے بھی ہے۔ انسانی معاشرہ میں جب بھی آپ کو کوئی کام کرنا ہو خواہ وہ مادی معنوں میں کوئی دنیوی کام ہو یا اخروی معنی میں دعوت و تبلیغ کا کام، آپ کو سب سے پہلے اپنے ماحول کا مطالعہ کر کے یہ دیکھنا چاہیے کہ آپ کے لیے مقام نفوذ کیا ہے۔ وہ کون سا نقطہ ہے جہاں پر عمل کر کے آپ بآسانی اپنے لیے ایک گزرگاہ پا سکتے ہیں۔ جہاں سے اپنے عمل کا آغاز کر کے آپ اپنے لیے مستقبل کی وسیع تر راہیں تلاش کر سکتے ہیں۔

انسان جب بھی کوئی منصوبہ بناتا ہے تو اس کا ایک آخری نشانہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مکان تعمیر کرنا ہو تو اس کا آخری نشانہ اوپر کی چھت ہوگا۔ لیکن آپ اپنے مکان کی تعمیر اوپر کی چھت سے نہیں کر سکتے۔ آپ کو لازمی طور پر اپنے مکان کا آغاز اس کی بنیاد سے کرنا ہوگا۔

یہی معاملہ تمام انسانی کاموں کا ہے۔ ہر کام کا ایک نقطۂ آغاز ہے، اور دوسرا اس کا نقطۂ اختتام۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ دونوں چیزوں کے فرق کو سمجھے۔ وہ اس حقیقت کو جانے کہ ابتدائی مقام سے آغاز کر کے وہ اپنے مطلوب اختتام تک تو پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے منصوبہ کے اختتامی نقطہ سے آغاز کرنا چاہے تو وہ کہیں بھی نہیں پہنچے گا، خواہ وہ عمل کے نام پر صدیوں تک اپنی کوششیں جاری رکھے ــــــ یہی اس دنیا کے لیے خدا کا مقرر کیا ہوا قانون ہے۔

عمل کے نقطۂ اختتام کو جاننا جوش ہے۔ اور عمل کے نقطۂ آغاز کو جاننا ہوش۔

صحیح طرز فکر

قرآن کے مختلف بیانات پر غور کرنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حقیقت خواہ کتنی ہی واضح ہو، خواہ وہ خدا کی محفوظ کتاب (قرآن) میں بینات کی زبان میں ادا کی گئی ہو تب بھی ضروری نہیں ہے کہ آدمی اس کو صحیح طور پر جان لے اور اس کے مطابق صحیح طور پر اپنے آپ کو ڈھال لے۔ حقائق سے صحیح رہنمائی کے لیے صحیح ذہن کا ہونا لازمی طور پر ضروری ہے۔ اس لیے جو شخص اس دنیا میں ہدایت کی زندگی گزارنا چاہتا ہو اس کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے طرز فکر کو درست کرے۔

یہی وہ بات ہے جو قرآن میں مختلف آیتوں میں واضح کی گئی ہے۔ ایک آیت میں فرمایا کہ کہہ دو کہ ہر ایک اپنے شاکلہ پر عمل کرتا ہے اور تمہارا رب ہی بہتر طور پر جانتا ہے کہ کون شخص زیادہ درست راستہ پر ہے (قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ فَرَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَىٰ سَبِيلًا) الاسراء ۸۴

اس آیت میں شاکلہ سے مراد میلان طبع ہے۔ یعنی ہر آدمی اپنے میلان طبع کے مطابق رائے قائم کرتا ہے اور اپنے میلان طبع کے تحت قائم کی ہوئی رائے پر چلتا ہے۔ مگر صحیح میلان طبع وہ ہے جو خدا کی معرفت اور خدا کی ہدایت کے تحت بنا ہو۔

موجودہ دنیا میں صحیح یا غلط رویہ کے لیے یہی میلان طبع (شاکلہ) اصل فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ اسی کے اوپر ہدایت اور ضلالت کا مدار ہے۔ اس لیے جو شخص یہ چاہتا ہو کہ دنیا میں خدا کی پسند والی زندگی گزارے اور آخرت میں خدا کے پسندیدہ بندوں میں شمار کیا جائے اس پر لازم ہے کہ وہ سب سے زیادہ توجہ کے ساتھ اپنے شاکلہ کو درست کرے۔ کیوں کہ بگڑے ہوئے شاکلہ والا آدمی ہدایت سے بھی محروم رہے گا اور نتیجۃً اللہ کی نصرت و رحمت سے بھی۔

سوچنے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے متاثر ذہن کے تحت سوچنا اور دوسرا ہے غیر متاثر ذہن کے تحت سوچنا۔ جب بھی آدمی اپنے ذہن کے خانہ میں سوچے گا اس کی سوچ خلاف واقعہ ہو جائے گی۔ اور جب آدمی خارجی حقیقتوں کی رعایت کرتے ہوئے سوچے تو اس کی سوچ مطابق حقیقت سوچ ہوگی اور مطابق حقیقت سوچ ہی کا دوسرا نام صحیح سوچ ہے۔

ٹالرنس، فطرت کا اصول

ٹالرنس (رواداری، برداشت) ایک یونیورسل اصول ہے۔ شیر اور ہاتھی دونوں انتہائی بڑے جانور ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے حریف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر بھی دونوں ایک ساتھ جنگلوں میں رہتے ہیں۔ یہ صرف ٹالرنس کے ذریعہ ممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ جنگلوں میں دیکھا گیا ہے کہ ایک طرف سے ہاتھی آرہا ہو اور دوسری طرف سے شیر گزر رہا ہو تو دونوں اپنا اپنا راستہ بدل کر دائیں اور بائیں سے نکل جاتے ہیں۔ اگر دونوں اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ٹالرنس کا معاملہ نہ کریں تو دونوں آپس میں لڑنے لگیں، یہاں تک کہ دونوں لڑکر تباہ ہو جائیں۔

شیر اور ہاتھی کو یہ طریقہ فطرت نے سکھایا ہے۔ اسی طرح انسان کے جسم میں فطرت نے ٹالرنس کا نظام قائم کر رکھا ہے۔ میڈیکل سائنس میں اس کو حیاتیاتی ٹالرنس (biological tolerance) کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد ایک جسم حیوانی کی یہ صلاحیت ہے کہ وہ ایک چیز سے برا اثر لیے بغیر اس سے ربط کو یا جسم میں اس چیز کے داخل کیے جانے کو برداشت کرے:

The ability of an organism to endure contact with a substance, or its introduction into the body, without ill effects. (X/31)

جسم کی اسی صلاحیت پر امراض کے علاج کا پورا نظام قائم ہے۔ بیماری کے وقت جسم کے اندر ایسی دوائیں ڈالی جاتی ہیں جو مجموعی حیثیت سے جسم کے لیے مضر ہیں۔ مگر جسم خارجی چیزوں کے معاملہ میں اپنی ساری حساسیت کے باوجود ایسی دواؤں کو برداشت کرتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ ٹالرنس کا معاملہ کرتا ہے۔ اسی "حیاتیاتی ٹالرنس" کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ یہ دوائیں جسم میں داخل ہوکر اپنا اثر دکھائیں۔ وہ جسم کے اعضاء پر برا اثر ڈالے بغیر اس کے بیمار عضو پر عمل کرکے اس کو اچھا کر سکیں۔

ٹالرنس کا یہی طریقہ انسانی سماج میں بھی مطلوب ہے۔ جنگل کے جانور جو کچھ اپنی جبلت (instinct) کے تحت کرتے ہیں۔ اور انسانی جسم جو کچھ اپنی فطرت کے تحت کرتا ہے۔ وہی انسان کو اپنے شعور کے تحت کرنا ہے۔ اس کو اپنے سوچے سمجھے فیصلہ کے تحت ٹالرنس کا طریقہ اختیار کرکے دوسروں کے ساتھ زندگی گزارنا ہے۔

مستقبل کو جانیے

جان بیٹ (John Bate) سترھویں صدی عیسوی کا ایک برٹش مرچنٹ تھا۔ ۱۶۰۶ کا واقعہ ہے کہ اس نے باہر سے کچھ کشمش (Currants) امپورٹ کی۔ ملک میں داخل ہونے کے بعد جب اس کے سامان پر ٹیکس لگایا گیا تو اس نے ٹیکس کی رقم دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ یہ ایک شاہی ٹیکس ہے جس کو کنگ جیمز فرسٹ (۱۵۶۶-۱۶۲۵) نے خود اپنے اختیار سے جاری کیا ہے۔ پارلیمنٹ نے اس کے حق میں قانون نہیں بنایا ہے۔ انگلستان کے حکمراں جیمز فرسٹ نے شاہی مالیات کے مسائل کو حل کرنے کے لیے اس قسم کے کچھ ٹیکس نافذ کیے تھے۔

عدالت زیریں کے جج نے کنگ کے مطلق اختیار (absoltite power) کا حوالہ دیتے ہوئے اس ٹیکس کو جائز قرار دے دیا۔ جان بیٹ اس کے بعد عدالت عالیہ میں گیا۔ اس وقت سر ایڈورڈ کوک (Sir Edward Coke) عدالت عالیہ کے چیف جسٹس تھے۔ انھوں نے مقدمہ کی سماعت کرنے کے بعد جان بیٹ کے حق میں فیصلہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ بادشاہ کو پارلیمنٹ کی اجازت کے بغیر از خود کوئی ٹیکس عائد کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

جسٹس کوک کے اس فیصلہ پر بادشاہ بہت برہم ہوا۔ اس نے اپنے شاہی اختیار سے جسٹس کوک کو عدالتی عہدہ سے ڈسمس کر دیا، اور اپنے حکم کے تحت شاہی ٹیکس کے قانون کو دوبارہ بحال کر دیا (3/240-14)

اس واقعہ کو اب تقریباً چار سو سال گزر چکے ہیں۔ آج صورت حال مکمل طور پر بدل چکی ہے۔ آج برطانیہ میں اور دوسرے ملکوں میں مسلّم طور پر مان لیا گیا ہے کہ پارلیمنٹ سب سے بڑا قانونی ادارہ ہے۔ بادشاہ یا کوئی بھی شخصیت اس کے ماتحت ہے نہ کہ اس کے اوپر۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ ایسے الفاظ بول رہا ہے جو آئندہ بے حقیقت ہو جانے والے ہیں۔ ہر انسان ایسے عمل میں سرگرم ہے جس کی کوئی قیمت اس کو موت کے بعد کی زندگی میں ملنے والی نہیں۔ کامیاب وہ ہے جس کا قول و عمل آخرت کی دنیا میں باوزن ٹھہرے، اور ناکام وہ ہے جس کا قول و عمل آخرت میں بے وزن ہو جائے۔

شر میں خیر

شرک کیا ہے۔ شرک دراصل فطرت کی پرستش (nature worship) کا دوسرا نام ہے۔ ساتویں اور آٹھویں صدی کے اسلامی انقلاب نے جب شرک کے غلبہ کو ذہنوں سے ختم کیا تو اسی کے ساتھ فطرت کو مقدس سمجھ کر اس کو پوجنے کا ذہن بھی ختم ہو گیا۔ اب فطرت کی چیزیں پرستش کا موضوع نہ رہیں بلکہ تحقیق و تسخیر کا موضوع بن گئیں۔ اس طرح انسانی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا جو آخر کار جدید سائنسی اور ٹکنکل انقلاب تک پہنچا۔

فطرت کی بے لاگ تحقیق سے جب انسان کو حیران کن فتوحات حاصل ہوئیں تو قدرتی طور پر تحقیق و تفتیش کی عظمت لوگوں کے ذہنوں پر چھا گئی۔ اس طرح جو نیا رجحان پیدا ہوا اس کے زیر اثر ہر چیز کی تحقیق ہونے لگی۔ یہاں تک کہ مقدس مذہب بھی اس کے دائرۂ تحقیق سے نہیں بچا۔ مذہب کے عقائد، مذہب کی کتب اور مذہب سے تعلق رکھنے والی دوسری تمام چیزوں کی بھی کھلی تحقیق شروع ہو گئی۔

سونے کے ایک سو زیور سنار کے پاس جانچ کے لیے لائے جائیں۔ ان میں سے ۹۹ زیور مشابہ دھات کے بنے ہوئے ہوں۔ صرف ایک زیور خالص سونے کا ہو۔ اب سنار تو زیوروں کو جانچنے کے لیے ان سب کو آگ پر رکھے گا۔ مگر آگ پر رکھا جانا ۹۹ زیوروں کے لیے تو مسئلہ ہے لیکن ایک زیور کے لیے وہ کوئی مسئلہ نہیں۔ کیونکہ آگ کی تپش ۹۹ زیوروں کا بے حقیقت ہونا ثابت کرے گی۔ لیکن ایک زیور جو خالص سونے کا ہے، اس کا درجہ پہلے سے بھی زیادہ بڑھا دے گی۔

یہی معاملہ موجودہ زمانہ میں پیش آیا۔ تحقیق کے عمومی ذوق کے تحت جب مذاہب کی علمی جانچ شروع ہوئی تو اسلام بھی اس کی زد میں آ گیا۔ اسلام کو بھی اس کی وجہ سے کچھ "آنچ" پہنچی۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو اس "شر" کے اندر "خیر" کا عظیم پہلو چھپا ہوا تھا۔ کیوں کہ اس کھلی تحقیق نے خالص علم انسانی کے معیار پر یہ ثابت کر دیا کہ تمام مذاہب محرف، غیر معتبر اور غیر ثابت شدہ حالت کو پہنچ گئے ہیں۔ ان کے درمیان صرف ایک مذہب ہے جو ہر طرح قابل اعتبار اور ثابت شدہ ہے، اور وہ مذہب اسلام اور صرف اسلام ہے۔

مسلم معاشرہ میں جذباتیت کا مسئلہ

ہندستان کے مسلم معاشرہ میں بظاہر بہت سے مسائل دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو تمام مسائل کی جڑ صرف ایک نظر آئے گی۔ اور وہ مسلمانوں کی بےصبری یا جذباتیت ہے۔

مسائل زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ بے مسائل زندگی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب مسائل پیش آئیں تو کیا کیا جائے۔ اس کا جواب صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ جلد بازی چھوڑ کر صبر و تحمل کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یہ اصول قرآن میں واضح طور پر موجود ہے۔ چنانچہ فرمایا:

پس تم صبر کرو جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا
اور ان کے لیے جلدی نہ کرو (الاحقاف ۳۵)

انفرادی یا اجتماعی زندگی میں جب بھی کوئی مسئلہ پیش آئے تو اس کے مقابلہ میں ردعمل کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک ہے فوری اور جذباتی جواب (emotional response) اور دوسرا ہے سوچا سمجھا ہوا جواب (considered response)۔ پہلے قسم کے ردعمل کا نام عجلت ہے اور دوسرے قسم کے ردعمل کا نام صبر۔ عجلت ہر قسم کی ناکامی کا راز ہے۔ اور صبر ہر قسم کی کامیابی کا راز۔

زندگی کا نظام فطرت کے قانون پر چل رہا ہے۔ یہ قانون مسابقت اور کامپٹیشن ہے۔ اسی کو قرآن میں اس کے انتہائی مفہوم کے اعتبار سے عداوت کہا گیا ہے۔ (البقرہ ۳۶) کوئی بھی اس پر قادر نہیں کہ وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے اس نظام کو بدل سکے۔ مسابقت یا عداوت کا یہ معاملہ خود آدم کے زمانہ میں ہابیل اور قابیل کے نزاع کی صورت میں سامنے آگیا تھا۔ وہ تمام پیغمبروں کے ساتھ پیش آیا۔ اسی طرح وہ قیامت تک برابر جاری رہے گا۔

اب کرنا کیا ہے۔ کرنا یہ ہے کہ جب مسائل پیش آئیں تو مشتعل ہو کر جذباتی ہنگامہ آرائی نہ کی جائے۔ بلکہ اپنے آپ کو تھام کر سوچا جائے۔ اہل افراد سے مشورہ کیا جائے۔ دعا اور استخارہ کیا جائے۔ اس کے بعد ٹھنڈے ذہن کے تحت فیصلہ کر کے اس کے مطابق اپنے عمل کی منصوبہ بندی کی جائے۔ جذباتیت غیر منظم عمل ہے، اور صبر اس کے مقابلہ میں منظم عمل۔

بدقسمتی سے ہندستانی مسلمانوں نے پچھلے دو سو سال کے دوران ایک بار بھی صبر والے طریقہ پر

عمل نہیں کیا۔ انھوں نے ہمیشہ ایک ہی طریقہ اختیار کیا۔ کوئی خبر ملی، یا کوئی واقعہ پیش آیا تو فوراً اپنے جذباتی لیڈروں کی رہ نمائی میں بھڑک کر اس کے مقابلہ میں ہنگامہ آرائی کے لیے کھڑے ہوگئے۔ ردعمل کا یہ انداز فطرت کے قانون کے سراسر خلاف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دو سو سال کی لمبی مدت میں ہزاروں پرشور اقدامات اور بے شمار قربانیوں کے باوجود ان کا مسئلہ حل نہیں ہوا۔ بلکہ ان کا ہر جذباتی اقدام مسائل میں صرف اضافہ کا سبب بنتا چلا گیا۔

ہندستان کی دو بڑی تحریکوں کو اس کی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ انیسویں صدی میں انگریزوں کی آمد کے بعد مسلمانوں کو کچھ تلخ تجربے ہوئے۔ اس کے بعد مسلم رہ نماؤں میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ حتیٰ کہ مقدس بزرگوں تک کے حالات میں ہم پڑھتے ہیں کہ "حضرت کو انگریزوں سے بہت نفرت تھی"۔

نفرت صبر کا مظہر نہیں۔ بلکہ عجلت اور جذباتیت کا مظہر ہے۔ چنانچہ جب ہمارے رہ نماؤں کو انگریزوں سے نفرت ہوئی تو وہ اندھا دھند بس ان کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ انھیں اس کے سوا کوئی اور کام نظر نہ آیا کہ جس طرح بھی ہو، انگریزوں کی سیاسی غلامی ختم کر کے آزادی حاصل کریں۔

۱۹۴۷ میں آزادی کا یہ نشانہ پورا ہوگیا۔ مگر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل مزید اضافہ کے ساتھ باقی رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نفرت اور اشتعال کی بنا پر ہمارے رہ نما یہ سوچ نہ سکے کہ انگریزوں کا ہندستان سے واپس جانا بذات خود مسلمانوں کے مسائل کا حل نہیں بن جائے گا۔ بلکہ انھیں جدید تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو تیار بھی کرنا ہوگا۔

ہندو قوم آزادی کی جدوجہد کے ساتھ تعلیم، صنعت، تجارت وغیرہ میں بھی سرگرم رہی۔ چنانچہ آزادی آئی تو وہ آزادی کے مواقع کو استعمال کرنے کے قابل بھی ہو چکی تھی۔ اس کے برعکس مسلمان تعمیر وتیاری کے میدان میں پس ماندہ ہونے کی وجہ سے اس قابل نہ تھے کہ آزادی کے مواقع کو استعمال کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آزاد ہندستان کے ہر شعبہ میں ہندو بڑھ چڑھ گئے ہیں۔ اور مسلمانوں کے حصہ میں صرف یہ فریاد و ماتم آیا ہے:

یہاں تک گردش دور فلک سے پست ہونا ہے — کہ گرد راہ بھی کرتی پھرے گی شوخیاں ہم سے

اب دوسری بڑی تحریک کو لیجیے جو بالآخر ملک کی تقسیم پر منتج ہوئی۔ اس تحریک کا آغاز کس طرح ہوا۔

وہ ماحول پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو اپنے پڑوسی ہندوؤں سے کچھ تلخ تجربات پیش آئے۔ [illegible] کے سامنے باجا بجانا، "اشتعال انگیز" نعرے لگانا، وغیرہ۔ اس قسم کے تجربات کو لے کر مسلم لیڈروں نے جذباتی سیاست برپا کی۔ انھوں نے پوری قوم کو جذباتیت کا طوفان بنا دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندو متعصب ہیں۔ ہندوؤں کا الگ کلچر ہے۔ ہندو مسلمانوں کے لیے مسئلے پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے ہمیں ایک علاحدہ خطہ (مسلم لینڈ) چاہیے جہاں ہم اس قسم کے مسائل سے محفوظ رہ کر پرامن زندگی گزار سکیں۔

یہ جذباتی تحریک مسلمانوں میں اتنا زیادہ مقبول ہوئی کہ ملت کا بیشتر حصہ اس کے ساتھ ہو گیا۔ یہاں تک کہ مجبوراً ۱۹۴۷ میں ملک کو تقسیم کرنا پڑا۔

اب اگر نتیجہ کو دیکھئے تو وہ نہ صرف صفر ہے بلکہ الٹا نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ ہندستان کے مسلمانوں پر جو کچھ گزرا یا گزر رہا ہے وہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ مگر خود مسلم لینڈ (پاکستان) کی حالت کیا ہے۔ پچھلے پچاس سال سے وہاں شدید تر انداز کی لڑائی جاری ہے۔ پنجابی اور بنگالی کی لڑائی، مہاجر اور سندھی کی لڑائی، شیعہ مسلمان اور سنی مسلمان کی لڑائی۔ حتی کہ سپاہ صحابہ اور سپاہ محمدی کی لڑائی۔ وغیرہ۔

تقسیم کی تحریک کا یہ الٹا نتیجہ کیوں برآمد ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہندوؤں کی طرف سے جب کچھ تلخ تجربات ہوئے تو اس پر صبر وتحمل کے ساتھ غور نہیں کیا گیا۔ اگر صبر وتحمل کے ساتھ غور کیا جاتا تو معلوم ہوتا کہ یہ "ہندو" کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ انسان کا مسئلہ ہے۔ جہاں بھی کچھ انسان ہوں گے، خواہ وہ کئی مذہب کو ماننے والے ہوں یا ایک مذہب کو ماننے والے، لازماً ان کے درمیان نزاعات پیدا ہوں گے۔ نزاع اور چیلنج سے خالی سماج اس دنیا میں ممکن ہی نہیں۔

تقسیم کے علم بردار اگر غور کرتے تو وہ اس حقیقت کو جان لیتے۔ پھر وہ مسلمانوں سے کہتے کہ تم لوگ ملک کو بٹوا کر اگر علاحدہ مسلم لینڈ بنوا لو گے تو وہاں بھی نزاع جاری رہے گی۔ پھر [illegible] کرو گے۔ اس لیے صبر وتحمل کے ساتھ جینا سیکھو۔ زندگی کے مسائل کا حل [illegible] نہیں ہے۔ [illegible] برداشت میں ہے۔ مسلمانوں کو یہ سبق نہیں دیا اس لیے وہ پہلے بھی [illegible] رہے ہیں۔

یہ دو تاریخی مثالیں محض ایک [illegible] کے [illegible] پیش کی گئی ہیں۔ [illegible] مسلمانوں نے اپنے لیڈروں کی رہنمائی میں جتنی بھی تحریکیں [illegible] کے تحت اٹھیں اور جذبات ہی کے اوپر ختم ہو گئیں۔ [illegible]

اب مسلمانوں کو مزید تباہی سے بچانے کی واحد صورت یہ ہے کہ مذکورہ قرآنی آیت کی روشنی میں انھیں اس معاملہ میں باشعور بنانے کی کوشش کی جائے۔ انھیں بتایا جائے کہ مسئلہ پیش آنے کے بعد ایک اشتعالی یا جذباتی اقدام کرنا کسی مسئلہ کا حل نہیں۔ ایسا اقدام صرف برعکس نتیجہ والا (counter-productive) ثابت ہوگا اور ہماری تباہی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے تاکہ وہ معاملات کو زیادہ گہرائی کے ساتھ سمجھ سکیں۔ وہ باشعور انسان کی مانند جینے والے بنیں۔ وہ جذباتی نعروں اور گہری تدبیروں کے فرق کو سمجھیں۔ وہ اس راز کو سمجھیں کہ تباہ کن اچھل کود اور چیز ہے اور نتیجہ خیز اقدام اس سے بالکل مختلف دوسری چیز۔

مسلمانوں کو جب تک جذباتیت اور اشتعال پذیری کے موجودہ گڑھے سے نکالا جائے کسی بھی قسم کی کوئی ترقی ہرگز ممکن نہیں۔

جذباتیت کا یا جذباتی طریقہ کا مہلک ہونا ایک سادہ فطری حقیقت ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے کامن سنس ہی کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام قومیں ہمیشہ اس سے بچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مسلمان دنیا کی واحد قوم ہیں جو موجودہ زمانہ میں استثنائی طور پر جذباتیت کے مسئلہ سے دوچار ہیں۔ اس کی وجہ تمام تر وہ نااہل مسلم رہنما اور بے دانش مسلم دانشور ہیں جنھوں نے ناقابل فہم نادانی کے ساتھ اس قسم کی کارروائیوں کو جہاد بتایا۔ اور اس میں پیش آنے والی تباہی کو شہادت بتا کر اسے آخری حد تک گلوریفائی کیا۔

اس قسم کی باتیں کرنا رہنمائی نہیں ہے بلکہ رہزنی ہے۔ وہ دانش وری نہیں ہے بلکہ سراسر بے دانشی ہے۔ اس غلط ذہنی قیادت نے مسلمانوں کے ذہن کو اتنا زیادہ بگاڑ دیا ہے کہ اب اس کا کوئی فوری حل ممکن نہیں۔ ضرورت ہے کہ خاموشی کے ساتھ لمبی مدت تک مسلمانوں کی ذہنی تعمیر اور فکری اصلاح کی جائے۔ اس کے بعد ہی ان کے لیے کسی حقیقی مستقبل کی امید کی جا سکتی ہے۔

ہریانہ کا سفر

مسٹر وی سنگھ تیوتیا ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ انھوں نے کچھ اصولی اختلاف کی بنیاد پر اس عہدہ سے استعفا دے دیا۔ جسٹس تیوتیا نے اس کے بعد ایک پولیٹکل پارٹی بنائی ہے جس کا نام جن ستیا پارٹی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد کرپشن سے پاک ہندستان کی تعمیر کرنا ہے۔ ان کی پارٹی کے بھی ایجنڈے میں سے ایک صدفی صد تعلیم کا حصول ہے :

To achieve total literacy within a reasonable time frame.

جن ستیا پارٹی کی دعوت پر ہریانہ کا سفر ہوا۔

۱۹ مئی ۱۹۹۵ کی صبح کو دہلی سے گوڑ گاؤں کے لیے بذریعہ کار روانگی ہوئی۔ میرے ساتھ سپریم کورٹ کے سینیر ایڈووکیٹ مسٹر بلونت سنگھ ملک (Tel. 8955901) تھے۔ راستہ میں ان سے معلوماتی گفتگو ہوتی رہی۔

انھوں نے بتایا کہ وہ جاٹ برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہریانہ کے میو پہلے جاٹ تھے۔ پھر وہ مسلمان ہو گئے۔ مگر ان کا رہن سہن بڑی حد تک پہلے ہی کی طرح رہا۔ ہریانہ میں کہا جاتا ہے کہ : جاٹن کا کہا ہندو، میون کا کہا مسلمان۔ یعنی ایک ہی قوم ہے، وہ ہندو ہو تو جاٹ کہی جاتی ہے، اور مسلمان ہو تو اس کو میو کہتے ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے مسٹر محمد علی جناح کو چھوڑ کر، تمام بڑے بڑے مسلمان لیڈر متحدہ ہندستان چاہتے تھے۔ مثلاً حکیم اجمل خان، سر خضر حیات، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، وغیرہ۔ پھر ملک تقسیم کیسے ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے آپ سر چھوٹو رام کو پڑھئے۔ ان کے بارہ میں حسب ذیل کتاب بہت جامع اور مستند ہے :

Chhotu Ram—a political biography
by Madan Gopal

اس کتاب میں سر چھوٹو رام کا بیس صفحہ کا وہ خط بھی شامل ہے جو انھوں نے مہاتما گاندھی کو لکھا تھا اور جس میں مشورہ دیا گیا تھا کہ آپ کسی حال میں بھی بٹوارہ کو مت مانئے۔

سر چھوٹو رام ایک جاٹ لیڈر تھے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں سے اتنا زیادہ قریب تھے کہ عام طور پر ان کو "چھوٹو خان" کہتے تھے۔ رہتک میں جاٹ کالج کے سامنے ان کی سمادھی ہے۔ اس پر اردو رسم الخط میں اقبال کا یہ شعر لکھا ہوا ہے:

خدا کے بندے تو لاکھوں دیکھے پھرے بنوں میں ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

پنڈت لوگ سنسکرت کے سوا کوئی اور زبان سمادھی پر لکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ مگر مسٹر ملک نے بتایا کہ جاٹ لوگ بہت کم برہمن کے اثر میں ہیں۔ وہ درمیانی واسطے کے بغیر براہ راست خدا سے تعلق پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں جاٹ لوگ بہت آسانی سے اسلام میں داخل ہو گئے۔

آگے بڑھے تو جگہ جگہ دہلی کی تاریخی عمارتیں نظر آئیں۔ انھیں میں سے ایک انڈیا گیٹ تھا۔ موجودہ صدی

سے آزاد تھی۔ برٹش حکمرانوں نے اس علاقہ کی تعمیر کی اور ۱۹۱۲ میں ملک کی راجدھانی کلکتہ سے [illegible] منتقل کیا۔ اس وقت انڈیا گیٹ انگریزوں کے داخلۂ ہند کی علامت تھا۔ آج وہ ایک گزری ہوئی تاریخ کی یادگار ہے۔

دہلی کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ یہ شہر کسی وقت عظیم سلطنت دہلی کا مرکز تھا جو تیرھویں صدی سے سولھویں صدی تک قائم رہی۔ سلطنت دہلی کو سلطان محمد غوری نے قائم کیا تھا۔ بابر نے ۱۵۲۶ء میں سلطان ابراہیم کو شکست دے کر دہلی کی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ یہ سلطنت مزید وسعت کے ساتھ مغل خاندان میں ۱۸۵۷ء تک باقی رہی۔

جس زمانہ میں سلطنت دہلی عروج پر تھی، اسی زمانہ میں اسپین میں مسلم سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ ۱۴۹۲ء میں جب کہ اسپین کا آخری مسلم بادشاہ ابوعبداللہ قلعہ الحمراء کی کنجیاں مسیحی حکمراں فرنینڈ کے حوالے کر رہا تھا، عین اسی سال سکندر لودی اپنی سلطنت کی توسیع کے لیے جونپور کے علاقہ پر لشکر کشی کرنے میں مشغول تھا۔

علمی ترقی کا کام ہمیشہ حکومتوں کی سرپرستی اور تعاون سے ہوتا ہے۔ اسپین کی مسلم سلطنت کی سرپرستی میں علمی ترقی کا کام بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہا تھا۔ جب یہ سلطنت ختم ہو گئی تو وہاں کے علماء اسپین کو چھوڑ کر یورپ کے دوسرے ملکوں (اٹلی، فرانس، وغیرہ) جانے لگے۔ یہی لوگ تھے جنھوں نے یورپ کو تاریک دور سے نکال کر جدید ترقی کے دور میں پہنچانے کا ابتدائی کام کیا۔ اگر دہلی کی مسلم سلطنت یا اس زمانہ کی دوسری مسلم سلطنتیں اسپین کے علماء کی سرپرستی کرتیں تو غالباً یہ لوگ مسلم اسپین سے نکل کر دوبارہ کسی مسلم خطہ میں آجاتے اور یہاں اپنے ترقیاتی کام کی تکمیل کرتے۔ مگر اس زمانہ کی مسلم سلطنتوں کی واحد دلچسپی سیاسی توسیع سے تھی، اس لیے علمی توسیع کے لیے موافق زمین فراہم کرنے میں بھی وہ ناکام رہے۔

دہلی ہندستان کا تیسرا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کا رقبہ ۱۴۸۵ مربع کلومیٹر ہے۔ کہا جاتا ہے پہلی صدی قبل مسیح میں راجہ ڈھلو نے اس کا نام دہلی رکھا [illegible] اجڑی اور سات بار آباد ہوئی۔ کچھ محققین کہتے ہیں کہ یہ سولہ بار بسا اور اجڑا۔ دہلی کا قدیم ترین حوالہ مہابھارت میں پایا جاتا ہے۔ اس وقت اس کا نام اندرپرستھا تھا۔ یہ ۱۴۰۰ قبل مسیح کی بات ہے۔

مختلف بادشاہوں نے بار بار دہلی کو تاراج کیا ہے۔ تیمور ۱۳۹۸ء میں اپنی وحشی فوجوں کو لے کر دہلی میں داخل ہوا۔ اور تقریباً پورے شہر کو تباہ کر ڈالا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ہی دن میں اس نے پچاس ہزار آدمی قتل کروا دیے۔

تیمور (۱۴۰۵-۱۳۳۶) ابتداءً ایک معمولی سردار تھا۔ اس کے بعد اس نے دنیا کی ایک عظیم سلطنت قائم کی۔ اس نے منگولیا سے لے کر میڈیٹرینین تک کا وسیع علاقہ فتح کر ڈالا۔ مگر ۷۰ سال سے بھی کم عمر میں جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹوں اور پوتوں میں جانشینی کا جھگڑا کھڑا ہو گیا جس کے نتیجہ میں اس کی وسیع سلطنت دوبارہ سکڑ کر سمرقند کے علاقہ تک محدود ہو گئی۔

تیمور اپنے کو مسلمان کہتا تھا۔ وہ بے حد بہادر مگر مکمل طور پر جاہل تھا۔ اس نے محض فوجی طاقت کے بل پر ایک ایسا ایمپائر قائم کرنے کی کوشش کی جو اس کے مرتے ہی ختم ہو گیا۔ مزید یہ کہ اس فرضی ایمپائر کو قائم کرنے کے جنون میں اس نے ۱۴۰۲ میں سلطان بایزید کی یورپ کی جانب پیش قدمی کو روک دیا۔ ایک تاریخ بنتے بنتے رہ گئی (تفصیل کے لیے: عظمت اسلام صفحہ ۲۷۶-۲۷۷)

ہم لوگ دہلی سے ہریانہ جانے والی سڑک پر چل رہے تھے۔ راستہ میں ایک جگہ سڑک کے کنارے ٹرک الٹا ہوا نظر آیا۔ وہ وسیع شاہراہ پر تیزی سے دوڑ رہا تھا کہ ایک مقام پر ڈرائیور کی غلطی سے اس کا پہیہ سڑک کے نیچے چلا گیا۔ اور پھر اچانک وہ الٹ گیا۔ اس کا سفر معطل ہو کر رہ گیا۔

میں نے سوچا کہ ایسا ہی کچھ معاملہ مسلمانوں کا ہے۔ مسلمان زندگی کی شاہراہ پر تیزی سے رواں دواں تھے کہ ان کے نااہل لیڈروں کی غلطی سے ان کی گاڑی الٹ گئی۔ ٹرک کے لیے جو حیثیت ڈرائیور کی ہے، ٹھیک وہی حیثیت کسی انسانی قافلہ کے لیے لیڈر کی ہوتی ہے۔ لیڈر اگر اہل ہے تو گاڑی کو آگے لے جائے گا۔ اور لیڈر اگر نااہل ہے تو وہ پوری گاڑی کو خندق میں گرا دے گا۔

دہلی کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے ہم اس علاقہ میں داخل ہوئے جس کو مہرولی کہا جاتا ہے۔ اسی علاقہ میں قطب مینار واقع ہے جو اپنی نمایاں بلندی کی وجہ سے بہت دور تک مسافر کا تعاقب کرتا ہے۔ ایک طرف وہ ماضی کی عظمت کا نشان ہے اور دوسری طرف دنیا کی بے ثباتی کا نشان بھی۔

قطب مینار کو تیرھویں صدی کے آغاز میں قطب الدین ایبک نے بنوایا تھا۔ اس کی بابت

کتاب میں یہ الفاظ درج ہیں کہ — دہلی کا قطب مینار ابھی تک قطب الدین کی فتوحات کی یادگار ہے:

The Qutub Minar in Delhi still stands to commemorate his victories. (VII/362)

معز الدین محمد غوری کو ہندستان میں مسلم سلطنت کے بانیوں میں سمجھا جاتا ہے جنھیں ۱۲۰۶ء میں اس کو اس کے حریفوں نے قتل کر دیا۔ اگرچہ یہ واضح نہیں کہ اس کو قتل کرنے والے ہندو تھے یا مسلمان۔ قطب الدین ایک غلام تھا جو محمد غوری کے یہاں ملازمت میں آیا۔ ابتداءً وہ اصطبل کے کام میں تھا۔ پھر ترقی کرکے فوجی افسر بنا اور بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ ۱۱۹۳ء میں پرتھوی راج کو شکست دے کر اس نے دہلی پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد اس نے فتح کے نشان کے طور پر یہاں ایک اونچا مینار بنایا جو اس کے نام پر قطب مینار کہا جانے لگا۔

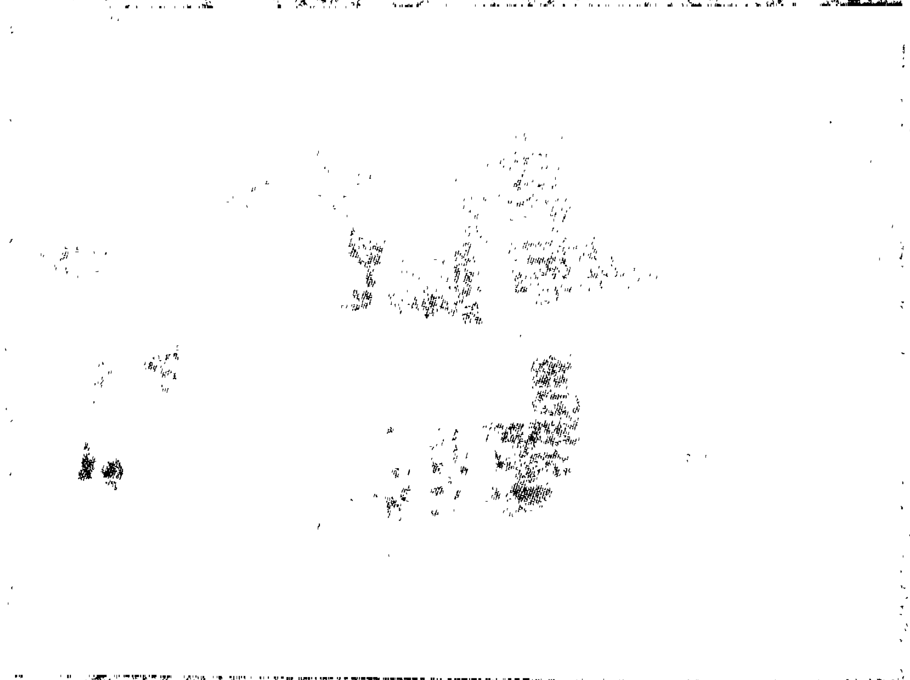
سلطان معز الدین محمد غور کے قتل (۱۲۰۶ء) کے بعد قطب الدین کو سلطان کا درجہ حاصل ہو گیا تاہم وہ زیادہ دنوں تک حکومت نہ کر سکا۔ گھوڑوں کے ایک کھیل میں وہ شدید طور پر زخمی ہو گیا اسی میں ۱۲۱۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

آٹھ سو سال پہلے جب عظیم قطب مینار بنایا گیا، اس وقت وہ فتح کا نشان تھا۔ مگر آج وہ صرف عبرت کا نشان ہے۔ اب اس کی حیثیت صرف تاریخی علامت کی ہے نہ کہ زندہ حقیقت کی۔

ترقی یافتہ ملکوں میں تاریخی عمارتوں کی دیکھ بھال کا نہایت خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔ انڈیا میں اکثر تاریخی عمارتیں غفلت کا شکار ہو رہی ہیں۔ انھیں میں سے ایک قطب مینار بھی ہے۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نے باقاعدہ پریس میں اپنی یہ شکایت دی ہے کہ قطب مینار کے باہر لال کوٹھی باؤنڈری کے پاس بہت سے مکانات ناجائز طور پر بنا لیے گئے ہیں۔ بار بار کی شکایت کے باوجود پولیس اس معاملہ میں کچھ نہیں کر رہی ہے۔ آرکیالوجی کے کارکن بھی جب ان تعمیرات کو ہٹانا چاہتے ہیں تو اس کے مالکان فوراً عدالت میں جا کر وہاں سے اس کے خلاف امتناعی حکم اسٹے حاصل کر لیتے ہیں۔ جبکہ قانون کے مطابق، باؤنڈری وال کے بعد سو میٹر تک کا علاقہ ممنوعہ علاقہ ہے۔ اور اس کے اندر اس قسم کی کوئی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔

According to ASI sources, over the last decade a number of houses have sprung up outside the monument's Lal Kothi boundary wall facing Mehrauli within the 230 metres area of what is known as the "archaelogical cordon." The first 30 metres from the boundary wall is a prohibited ara, the next 100 metres are restricted area and the rest 100 metres are regulated area. Officials said there should be no encroachment in this area.

گاڑی جب دہلی کے شہری حدود سے باہر پہنچی تو سڑک کے دونوں طرف بڑے بڑے فارم
ہاؤس دکھائی دینے لگے۔ یہ علاقہ دہلی اور گوڑگاؤں کے درمیان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہندستان کا
سب سے زیادہ مہنگا علاقہ ہے۔ یہاں صرف وہی خوش قسمت لوگ رہ سکتے ہیں جو کم از کم کروڑپتی ہوں۔
اس سے پہلے میں اس علاقہ میں چند بار آیا ہوں۔ یہ فارم ہاؤس دہلی کے کثافتی صحرا میں نخلستان
کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر آدمی بیک وقت فطرت کے ماحول میں بھی آجاتا ہے اور سکون
کے ماحول میں بھی۔ مگر اس قسم کی پرسکون زندگی صرف وہی لوگ پسند کرتے ہیں جو یا تو ریٹائرڈ



Encroachments near Qutab Minar complex. The picture shows a concrete building in the Qutab complex

[illegible] کام ہو۔ جو کام ہاتھ لگے [illegible] میں رہنا پسند نہیں کرتے۔

اس علاقے کے کئی قدیم باشندوں میں کسی میٹنگ یا فنکشن کے تحت مجھے بار بار جانے کا تجربہ ہوا کہ داخل ہونے کے بعد کچھ دیر تک تو یہاں بہت اچھا معلوم ہوتا ہے مگر کچھ دیر کے بعد گھٹن کی سی کیفیت محسوس ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ یہاں میرے لیے آرام تھا مگر یہاں میرے لیے کام نہیں تھا۔ اور انسان صرف آرام میں دیر تک مطمئن نہیں رہ سکتا۔ انسان کے مستقل سکون کے لیے اس کی پسند کا کام ہونا لازمی طور پر ضروری ہے۔

پون گھنٹہ بذریعہ روڈ سفر کرنے کے بعد ہم لوگ گوڑگاؤں کے مضافاتی علاقہ (قطب انکلیو) میں داخل ہوئے۔ یہاں جسٹس دیپ سنگھ تیوتیا کی وسیع رہائش گاہ (Tel. 0124-8-350797) پر میٹنگ کا انتظام کیا گیا تھا۔

جسٹس تیوتیا ایک جاٹ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جاٹ اور میو (مسلمان) ہریانہ کے علاقہ میں صدیوں سے ایک ساتھ رہتے آئے ہیں۔ مگر دونوں کے مزاج میں حیرت انگیز طور پر نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ جاٹ برادری کا مزاج کیا ہے، اس کو ایک میواتی کہاوت میں غالباً طنزیہ طور پر اس طرح بیان کیا گیا ہے:

جاٹ کہے سن جاٹنی یاہی گاؤں میں رہنا　　اونٹ بلیا لے گئی ہاں جی ہاں جی کہنا

میو لوگ اس کو فخر سمجھتے تھے کہ وہ کسی حکمراں کی اطاعت قبول نہ کریں۔ چنانچہ وہ دہلی کی ہر سلطنت سے لڑتے رہے، مسلم عہد میں بھی اور انگریزی عہد میں بھی۔ اپنی اس روش کی انھیں نہایت سخت سزا بھگتنی پڑی۔

مثلاً ۱۲۰۰ میں انھوں نے بلبن کی شاہی فوج کے اونٹ لوٹ لیے۔ بلبن اس خبر کو سن کر نہایت غضب ناک ہوا۔ وہ دہلی سے روانہ ہو کر میوات کے علاقہ میں پہنچا۔ یہاں اس نے [illegible] قتل و غارت گری جاری رکھی۔ بہت سے میو [illegible] طرح قتل کر دیے [illegible] کے ہاتھیوں سے کچلوا دیا [illegible] ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے۔ تقریباً [illegible] کی کھال کھنچوائی گئی۔ مگر میوؤں کی باغیانہ روش ختم نہ ہو سکی۔ انھوں نے دوبارہ بدامنی شروع کر دی۔

[illegible] فوج کے ساتھ اس علاقہ میں آیا اور میوؤں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ [illegible] بارہ ہزار مردوں اور عورتوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ (تاریخ میو چھتری، از مولانا حکیم عبدالشکور صاحب، صفحہ ۳۴۲-۳۴۳)

میوؤں کے اس مزاج کا انھیں یہ نقصان اٹھانا پڑا کہ ان کی ترقی رک گئی۔ جب کہ اسی علاقہ میں دوسرے لوگ ترقی کرتے رہے۔ یہ صرف پچھلے ۲۰ برسوں کی بات ہے کہ میوؤں نے بھی کچھ ترقی شروع کی ہے اور یہ اس وقت ہوا جب کہ انھوں نے ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر موافقت کا طریقہ اختیار کیا۔ تاہم یہ تبدیلی ابھی تک کچھ افراد کی سطح پر ہے نہ کہ پوری میو قوم کی سطح پر۔

اس سے پہلے ۲۲ فروری ۱۹۹۲ کو میں اس علاقہ میں آیا تھا۔ مسٹر احمد رشید شروانی نے یہاں ڈی ایل ایف کالونی میں اپنا ایک گھر بنایا ہے۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک کلب ہے۔ اس میں دو بڑے بڑے لان ہیں۔ اس لان کے درمیان کلب کی کھلی ہوئی عمارت اس طرح واقع ہے جیسے ایک وسیع ہرے بھرے باغ میں خوب صورت فارم ہاؤس بنا ہوا ہو۔

شروانی صاحب کی دعوت پر میں اور ناناصاحب دلیش مکھ اور ڈاکٹر مہیش شرما چند گھنٹے کے لیے یہاں آئے تھے۔ یہاں کے پرسکون ماحول میں شروانی صاحب کے ساتھ دن کا کھانا کھایا گیا۔ پھر ملک کے موجودہ حالات پر باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد ہم لوگ دہلی واپس چلے گئے۔

اس طرح کے کلب اور فارم ہاؤس ہندستان کے وسیع صحرا میں نخلستان کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ پروفیسر ہیرن مکرجی آزادی کے بعد بننے والی پہلی لوک سبھا کے ممبر تھے۔ نئی دہلی میں لوک سبھا کے اجلاس میں شرکت کے بعد جب وہ بذریعہ ٹرین کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے تو سڑک کے کنارے جگی جھونپڑی کے مناظر نے انھیں متاثر کیا۔ واپس پہنچ کر انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو خط لکھا کہ جگیوں میں رہنے والے یہ غریب لوگ اگر ہم سے پوچھیں کہ ہندستان کی آزادی سے ہم کو کیا ملا تو مجھ کو نہیں معلوم کہ ہمارا کیا جواب ہوگا۔

پنڈت جواہر لال نہرو (اس وقت کے وزیر اعظم ہند) نے براہ راست اس کا جواب نہ دیتے ہوئے پروفیسر ہیرن مکرجی کو لکھا کہ تم اپنے حساس ہونے کی قیمت ادا کر رہے ہو:

You are paying the price of being sensitive.

موجودہ ریاست ہریانہ کا ایک مشہور تیرتھ استھان کروکشیتر ہے جو دہلی [illegible] واقع ہے۔ کسی زمانہ میں وہ ہدایت پور کہا جاتا تھا۔ اب اس کا نام [illegible] ہے۔ یہ ایک مثال ہے جو علامتی طور پر بتاتی ہے کہ ہمارا ملک کہاں سے کہاں چلا جا رہا ہے۔

آزادی (۱۹۴۷) کے وقت ہریانہ نام کی کوئی ریاست انڈیا میں موجود نہ تھی۔ وہ [illegible] ۱۹۶۶ میں ہندستان کے نقشہ پر ظہور میں آئی۔ اس سے پہلے یہ علاقہ قدیم پنجاب میں شامل تھا۔ اس کے بعد لسانی ریاستوں کے مطالبات شروع ہوئے۔ وہ اتنی شدت پکڑ گئے کہ حکومت کو اس کے آگے جھکنا پڑا۔ چنانچہ ایک ایکٹ کے مطابق، پنجابی بولنے والا علاقہ پنجاب بن گیا اور ہندی بولنے والا علاقہ ہریانہ کہلایا۔ پنجاب کے علاقہ میں زیادہ تر سکھ آباد تھے، اور ہریانہ کے علاقہ میں زیادہ تر ہندو۔

ہریانہ کے علاقہ کو ہندو مذہب کی جائے پیدائش سمجھا جاتا ہے۔ کروکشیتر اسی ریاست میں واقع ہے۔ جہاں ہندو روایات کے مطابق، ارجن نے اپنی لڑائی لڑی تھی اور کرشن نے اپدیش دیا جو بھگوت گیتا کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۵۲۶ء میں پانی پت کی تاریخی لڑائی بھی اسی علاقہ میں ہوئی جس میں بابر نے ابراہیم لودی کو شکست دی تھی۔ وغیرہ

ہریانہ ایک ہندی اسپیکنگ ریاست ہے۔ اس کی سرحد دہلی سے ملی ہوئی ہے۔ ۱۹۷۱ کی مردم شماری کے مطابق، ریاست کی آبادی تقریباً ایک کروڑ (10,000,000) ہے۔ اس میں ۸۹ فی صد ہندو، چار فی صد مسلمان اور چھ فی صد سکھ ہیں۔ جین تقریباً ایک فی صد بتائے جاتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کا خیال ہے کہ ان کی موجودہ تعداد اس سے کافی زیادہ ہے [illegible] کی مردم شماری میں بتایا گیا تھا۔

ہریانہ کے وزیر آبپاشی و پارلیمانی امور مسٹر جگدیش نہرو [illegible] اس سلسلہ میں انھوں نے اپنا طویل سفرنامہ "میری بدیشی یاترا" کے نام سے [illegible] پڑھنے کا موقع ملا۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے:

"شام کے وقت میں اپنے ایک دوست [illegible] نے کناڈا کی شہریت حاصل کر لی ہے۔ اس وقت ان کے [illegible] تھے۔ جو کہ مختلف صنعتوں سے وابستہ تھے۔ مجھے [illegible] کا موقع ملا۔

[illegible] کہا کہ آپ بھارت کے ساتھ بیوپار بڑھائیں۔ اور بھارت میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگائیں۔ کیونکہ آپ کے فائدے کے ساتھ ساتھ بھارت کا بھی زیادہ وکاس ہو۔ گک جنگ وہ بھی بھارت میں سرمایہ کاری کرنے اور اپنا بیوپار بڑھانے کے لیے متفق تھے۔ لیکن انھوں نے مجھے بتایا کہ بھارت کی افسر شاہی اور انتظامیہ ویوستھا کے کارن ایسا نہیں کر رہے۔ انھوں نے یہ واضح کیا کہ ایڈمنسٹریٹو سطح پر بھارت میں بھرشٹاچار پھیلا ہوا ہے۔ امپورٹ، ایکسپورٹ کے لیے غیر ضروری کارروائیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور بلاوجہ تاخیر ہونے کے کارن ان کے بیوپار پر برا اثر پڑتا ہے۔ انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر ویوستھا میں سدھار لایا جائے تو وہ بخوشی بھارت سے اپنے تجارتی تعلقات بڑھائیں گے۔ میں نے بھی محسوس کیا کہ ان کی یہ بات ٹھیک ہے کاروبار شروع کرانے کا عمل آسان ہونا چاہیے تاکہ بیرونی [illegible] صنعت میں پیسہ لگانے میں نہ ہچکچائیں۔ (ہندسماچار، ۱۲ جون ۱۹۹۵)

ہریانہ کی ریاستی راجدھانی چنڈی گڑھ میں ہے۔ چنڈی گڑھ کو ہریانہ اور پنجاب کی مشترک راجدھانی کہا جاتا ہے۔

چنڈی گڑھ ہندستان کا واحد شہر ہے جو مکمل طور پر منصوبہ بند انداز میں بنایا گیا ہے۔ اس کا نقشہ سوئٹزرلینڈ کے سٹی پلاننگ کے مشہور ماہر لی کاربوزیر (Le Corbusier) نے بنایا تھا۔ چنڈی گڑھ کی تعمیر انگریزی دور میں پنجاب کی راجدھانی کے طور پر ہوئی۔ بعد کو ۱۹۶۶ میں جب زبان کی بنیاد پر پنجاب اور ہریانہ کی تقسیم ہوئی تو نزاع پیدا ہوئی کہ چنڈی گڑھ کو دونوں میں سے کس کے حصہ میں دیا جائے۔ آخرکار اس نزاع کو اس طرح ختم کیا گیا کہ اس کو دونوں ریاستوں کی مشترک راجدھانی بنا دیا گیا۔ گویا یہاں بھی تقسیم کا فارمولا اپنا کر مسئلہ کو حل کیا گیا۔

انیسویں صدی کے وسط میں جب انگریزوں نے دہلی کی سلطنت پر قبضہ کرنا چاہا تو سکھوں نے [illegible] کی اس کی وجہ سکھوں کی [illegible] کے [illegible] پیدا ہو گئی۔ چنانچہ جب ہندستان پر انگریزی [illegible] پنجاب [illegible] سکھوں اور [illegible] کے [illegible] ریاست میں [illegible] کی تحریک کی [illegible] تقسیم کے [illegible] چنانچہ سکھوں کو نہایت فیاضی کے ساتھ برٹش [illegible] دیا گیا۔ [illegible]

[illegible] لوگ بڑی تعداد میں برطانیہ کے شہروں میں موجود ہیں [illegible]

پہلی بار ۱۹۸۰ میں میں نے چندی گڑھ کا سفر کیا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر احسان اللہ [illegible]
چندی گڑھ میں رہتے تھے۔ میرا چند روزہ قیام انھیں کے مکان پر تھا۔ یہ ایک علمی سفر تھا۔ اس کا
مقصد نظریۂ ارتقاء کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا تھا۔

ہندستان میں سوالک پہاڑیوں میں قدیم جانوروں کے متحجرات۔ فاسلس۔ پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر احسان اللہ اس کی کھدائی کے انچارج تھے۔ سوالک پہاڑیاں چندی گڑھ سے بالکل قریب میں۔ یہاں پہنچ کر میں ان کے ساتھ سوالک پہاڑیوں میں گیا۔ وہاں متحجرات کا مشاہدہ کیا۔ اس کے علاوہ چندی گڑھ میں واقع نیچرل ہسٹری میوزیم کو تفصیل کے ساتھ دیکھا۔ نیز یہاں کی لائبریری میں ارتقاء سے متعلق لٹریچر کا مطالعہ کیا۔ اس مشاہدہ اور مطالعہ کے بعد میں نے وہ مضمون لکھا جو نظریۂ ارتقاء کے نام سے ماہنامہ زندگی (رامپور) کے شمارہ ذوقعدہ ۱۳۸۰ھ میں شائع کیا گیا۔

الجمعیۃ ویکلی کی ادارت (۷۴ – ۱۹۶۷) کے زمانہ میں میں نے میوات (ہریانہ، راجستھان) کے تقریباً ۲۰ سفر کیے تھے۔ ان اسفار میں اس علاقہ کے گاؤں گاؤں میں گیا تھا۔ ان سفروں کی روداد اولاً الجمعیۃ ویکلی میں چھپی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۸۸ میں ان کا مجموعہ "میوات کا سفر" کے نام سے شائع کیا گیا۔

اس دوران پہلی بار میں ۱۹۶۹ میں گوڑگاؤں آیا تھا۔ اس وقت میوات کے مشہور لیڈر چودھری یسین خان زندہ تھے۔ اگرچہ اب وہ بہت کمزور ہو چکے تھے۔ میوات کا سفر نامی کتاب میں ان سے پہلی ملاقات کی روداد اس طرح درج ہے :

"ہمارے سفر کی پہلی منزل گوڑگاؤں تھی۔ یکم اگست ۱۹۶۹ کی صبح کو جیپ کار رکشا مجھ کو اور مولانا عبدالرحیم بڈیڈوی کو چودھری محمد یسین صاحب کی قیام گاہ کی طرف لے جارہا تھا۔ ہماری باتوں کو سن کر رکشے والا اچانک بولا ——— "چودھری یسین ۔ ۔ ۔ ان کا حال تو یہ ہے کہ رات کو اکیلے تنہا جنگل چلے جاتے ہیں اور بھگوان کی دیا ان پر ایسی ہے کہ شیر ان کے تلوے چاٹتا ہے"

ہم لوگ چودھری یسین کے کمرہ میں پہنچے تو وہ بڑھاپے اور بیماری کی وجہ سے صاحب فراش ہو چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ وہ شخص جو کبھی میوات کا شیر کہا جاتا تھا، وہ اب نڈھال ہو کر بستر پر پڑا ہے۔ ان کی حالت کو دیکھ کر میں نے پوچھا کہ آپ کی عمر کیا ہوگی۔ انھوں نے جواب دیا : صحت بیس سال پہلے ہی۔

میں نے بجا طور پر کہا کہ کچھ اپنے تجربات بتائیے۔ مگر وہ کچھ بول نہ سکے۔ ہندستان کے مسلمانوں کے بارے میں انھوں نے سخت مایوسی کا اظہار کیا۔ ان کے نزدیک ان مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کرنا گویا مردہ شخص کو طاقت کا انجکشن لگانا ہے۔ (صفحہ ۴۴)

گروہ دون کی اس میٹنگ کا موضوع یہ تھا کہ کیا ملک کو سیاسی متبادل (Political alternative) مہیا کیا جاسکتا ہے۔ لوگوں نے اپنے اپنے خیالات پیش کیے۔

میں نے کہا کہ یہی بھارتیہ جنتا پارٹی کا نعرہ بھی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کانگرس کا سیکولرزم سوڈو سیکولرزم ہے۔ اور وہ خود ہندتو کی شکل میں اس کا متبادل پیش کرنا چاہتی ہے۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو سوڈو سیکولرزم کا متبادل ہندتو نہیں ہے۔ سوڈو سیکولرزم کا متبادل سچا سیکولرزم ہے۔ اس معاملے کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اگر آپ لوگ فی الواقع اس معاملہ میں سنجیدہ ہیں تو فی الحال اپنی ساری طاقت ہریانہ اسٹیٹ پر خرچ کیجئے۔ یہاں آپ ایک ایسا سسٹم بنائیے جہاں کسی درجہ میں ایسا ہو کہ دفتروں میں رشوت کے بغیر کام ہو۔ عدالتوں میں انصاف خریدے بغیر انصاف مل جائے۔ ہر نوجوان کو تعلیم کی سہولت حاصل ہو جائے۔ ریاست میں امن وامان کی حالت قائم ہو جائے۔ اگر ایک ریاست میں یہ باتیں قابل ذکر درجہ میں وجود میں آجائیں تو سارے دیش پر اس کا اثر پڑے گا اور پھر وہ وقت آئے گا جب کہ ہم ایک نئے ہندستان کی تعمیر میں کامیاب ہو جائیں۔

یہ میٹنگ اصلاً سیاسی موضوع پر بات چیت کے لیے بلائی گئی تھی۔ تاہم دوران گفتگو بہت سی دوسری باتیں بھی سامنے آئیں۔ جسٹس دیبی سنگھ تیوتیا نے کہا کہ ہر آدمی کو سچائی کا پتہ ہے، مگر کوئی ترغیب (temptation) آدمی کو پاگل کر دیتی ہے۔ میں نے کہا کہ اس بات کو ایک عربی مقولہ میں اس طرح کہا گیا ہے کہ کسی چیز کی محبت تم کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے (حبُّك الشيئ يعمي ويصم)

جن سنگھ پارٹی کے سکریٹری اپنی ایک بات کہتے ہوئے بار بار "حضرت صاحب" کا لفظ بولتے تھے۔ پہلے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ حضرت صاحب سے کیا مراد ہے۔ مگر جب انھوں نے مکہ، مدینہ کا نام لیا اور کچھ واقعات کے حوالے دیے تو معلوم ہوا کہ اس سے ان کی مراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ہے۔

میں نے اکثر پایا ہے کہ پڑھے لکھے حلقوں میں رسول اللہ [illegible]
پایا جاتا ہے۔ ایک مجلس میں ایک بار ایک صاحب نے کہا کہ اسلام [illegible]
ہے کہ مسلمان تعلیم میں پیچھے ہو گئے ہیں۔ اس مجلس میں مشہور قانون داں مسٹر رام جیٹھ ملانی بھی موجود
تھے۔ انھوں نے فوراً تردید کی۔ اور کہا کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ [illegible] ایک
پیغمبر اسلام کا ایک ایسا قول ہے جو آپ کو کسی کے یہاں نہیں ملے گا۔ آپ نے فرمایا کہ عالم کے
قلم کی سیاہی شہید کے خون سے زیادہ قیمتی ہے۔

آج (۱۹ مئی) کے انگریزی روزنامہ ہندستان ٹائمس میں میرا ایک مضمون چھپا تھا۔ اس کا
عنوان تھا — ہندستان کی تعمیر نو :

Towards a new India

اکثر لوگ اس مضمون کو آج صبح پڑھ چکے تھے۔ چنانچہ اپنے آپ وہ گفتگو کا موضوع بن گیا۔
لوگوں نے اس کو پسند کیا اور اس کے نکات سے اتفاق کیا۔

ایک صاحب نے الکشن کے ذریعہ پولیٹکل چینج کی حمایت میں تقریر کی۔ میں نے ان کے جواب
میں جیمز فری مین کلارک (James Freeman Clarke) کا یہ قول دہرایا کہ سیاست داں اور مدبر میں
یہ فرق ہے کہ سیاست داں اگلے الکشن کے لیے سوچتا ہے۔ اور مدبر اگلی نسل کے لیے سوچتا ہے :

The difference between a politician and a statesman is: a politician thinks of the next election, and a statesman thinks of the next generation.

میں نے کہا کہ جو لوگ محض الکشن جیتنے کے مقصد سے سیاست کے میدان میں آتے ہیں وہ
قوم کو زبردست نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان کے سامنے صرف یہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ الکشن
میں لوگوں کا ووٹ حاصل کر لیں۔ اس لیے وہ عوام کو بھڑکاتے ہیں۔ وہ عوام کے جذبات کا
استحصال کرتے ہیں۔ وہ الکشن کے مفاد کے لیے قومی مفاد کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ الکشن یا وقتی سیاسی مفاد کے لیے ہر پارٹی نے یہ کیا کہ اسکول اور
کالج کے لڑکوں کو کلاس سے باہر لے آئی۔ اس طرح اسکولوں اور کالجوں میں تعلیمی روایات ٹوٹ
گئیں۔ طلبہ تعلیمی سرگرمیوں کے بجائے وقتی سیاست کے ہنگاموں میں شریک ہونے لگے۔ یہ

میں حصہ لینے کے بجائے وہ سیاسی نوعیت کے کاموں میں دل چسپی لینے لگے۔ یہی خاص وجہ ہے جس نے موجودہ زمانہ میں تعلیمی معیار کو پست کر دیا ہے۔ حالاں کہ پہلے ایسا نہ تھا۔

گورداسپوریوں کی اس میٹنگ میں ایک عجیب بات میں نے یہ دیکھی کہ ہر ہندو اپنی گفتگو کے دوران اقبال کا کوئی شعر پڑھتے تھے۔ ہر ایک کے اندر میں نے اقبال کے لیے خاص احترام پایا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ خود پنڈت جواہر لال نہرو اپنی تقریروں میں اقبال کا یہ شعر بڑے ذوق و شوق سے پڑھا کرتے تھے :

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے باقی مگر ہے اب تک نام و نشاں ہمارا

میں نے سوچا کہ جب ہندوؤں کے دل میں اقبال کے لیے اتنا عزت و احترام تھا تو انھوں نے ہندوؤں سے کٹ کر علاحدہ مسلم اسٹیٹ بنانے کی تجویز کیوں پیش کی جس نے بالآخر پاکستان کی صورت اختیار کی۔ ایسی حالت میں تو چاہیے تھا کہ اقبال ہندوؤں کے ساتھ میل جول پر زور دیں اور ہندوؤں کے درمیان سفیر اسلام کا کردار ادا کریں۔

حال میں ایک جلسہ میں میری ملاقات مسٹر کے آر ملکانی سے ہوئی جو بھارتیہ جنتا پارٹی کے وائس پریسیڈنٹ ہیں۔ میں نے کہا کہ مسٹر جناح ملک کے بٹوارہ کے ذمہ دار تھے۔ مگر ہندوؤں سے بات چیت کے دوران میں نے محسوس کیا کہ ہندوؤں کو مسٹر جناح سے کوئی نفرت نہیں۔ حتی کہ بھارتیہ جنتا پارٹی والوں کو بھی نہیں۔ اس کا سبب کیا ہے۔ مسٹر ملکانی نے جواب دیا : جناح کے خیالات جو بھی ہوں، مگر وہ ایک دم دار آدمی تو تھا۔

جن لوگوں کے درمیان اسلام اور مسلمانوں کے لیے اس طرح نرم گوشہ موجود ہو، ان سے کٹ کر الگ ملک بنانا سراسر ایک غیر دانش مندانہ بات تھی۔ ایسے لوگوں کے درمیان کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، نہ یہ کہ غیر ضروری طور پر ان سے قطع تعلق کر لیا جائے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آج کا مسئلہ اعتماد کے بحران (Crisis of credibility) کا مسئلہ ہے۔ اعتماد بالکل ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے ایک آدمی اچھی بات کہتا ہے تو کوئی اس پر دھیان نہیں دیتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ صرف کہنے کے لیے ہے، کرنے کے لیے نہیں ہے۔

ایک صاحب جن کا تعلق جاٹ برادری سے تھا، انھوں نے کہا کہ جاٹ عام طور پر سید سے

ہوتے ہیں۔ حالات کبھی بگاڑ دیتے ہیں تو وہ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ [illegible] یہ ہے کہ حالات کی فطرت [illegible] بگاڑی نہیں ہے۔ اس لیے وہ ایسے ہیں۔ ہر آدمی ابتداءً فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اور فطرت ہمیشہ صحیح رہنمائی کرتی ہے۔ آدمی کو اگر اس کی پیدائشی فطرت پر رہنے دیا جائے تو وہ کبھی بگاڑ میں مبتلا نہیں ہوگا۔

ایک معمر ہندو نے کہا کہ لوگ خواہ مخواہ اورنگ زیب کو برا کہتے ہیں۔ اورنگ زیب سے اچھا تو کوئی رولر نہیں۔ وہ بے حد سادہ تھا اور اپنے ذاتی خرچ کے لیے وہ سرکاری خزانے سے کچھ نہیں لیتا تھا۔ بلکہ ٹوپیاں سی کر اس سے اپنا کام چلاتا تھا۔

ایک صاحب نے کہا کہ "میں محمڈن کو ہندوؤں سے الگ تو مانتا ہی نہیں۔ آپ قرآن کو لیجیے اور اپنشد کو لیجیے۔ دونوں کو پڑھتے جائیے۔ کہیں کوئی فرق ملے گا ہی نہیں۔

ایک صاحب نے ٹی این سیشن کی تعریف کی۔ انھوں نے کہا کہ آج دیہات کا آدمی بھی صبح اٹھ کر پوچھتا ہے کہ سیشن نے آج کیا کہا۔ میں نے کہا کہ یہ ایک منفی مقبولیت ہے۔ سیشن چونکہ اتھارٹی کے خلاف بولتے ہیں اس لیے وہ ہیرو بنے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ساری دنیا میں لوگ اتھارٹی کے خلاف تقریریں کرکے ہیرو بن جاتے ہیں۔ مگر اس قسم کی مقبولیت کا کوئی مثبت افادیت نہیں۔

یہاں تقریباً سبھی لوگ بھارتیہ جنتا پارٹی پر تنقید کر رہے تھے۔ ایک تعلیم یافتہ ہندو نے بتایا کہ میری بات چیت ان کے ایک بڑے لیڈر سے ہوئی۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ ہندو دھرم کی سروس نہیں کر رہے ہیں، بلکہ آپ لوگ اس کی ڈِس سروس کر رہے ہیں۔ میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ پورے ملک کی سطح پر دیکھا جائے تو ہندوؤں کی اکثریت بھارتیہ جنتا پارٹی کو پسند نہیں کرتی۔

اس کا ایک عمومی مظاہرہ بعد کو ۲۸ مئی ۱۹۹۶ کو ہوا۔ اس دن بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت پر پارلیمنٹ میں مباحثہ تھا۔ یہ پوری کارروائی عین اسی وقت ٹی وی [illegible] سارا ملک دیکھ رہا تھا۔ جن لوگوں نے پارلیمنٹ کے اس اجلاس کو دیکھا [illegible] قریب تمام ممبران بھارتیہ جنتا پارٹی کے خلاف بول رہے تھے۔ اور دو ہفتے کے وزیر اعظم [illegible] سے عاجز ہو رہے تھے۔ پارلیمنٹ میں جب ان کو حمایت نہ مل سکی [illegible]

بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

جسٹس دیپا سنگھ تو تیا نے بتایا کہ لاہور کے وکلا نے اپنی ایک تقریب میں مجھے اعلیٰ بوائے
کی حیثیت سے بلایا تھا۔ وہاں میں ہوٹل میں ٹھہرنے کے بجائے ایک پاکستانی وکیل کے یہاں ٹھہرا۔ اس
وکیل کے پورے خاندان نے میرے ساتھ جس طرح عزت اور محبت کا برتاؤ کیا وہ اتنا زیادہ تھا کہ
اس سے زیادہ میں سوچ نہیں سکتا۔

میں نے کہا کہ اگر آپ پاکستان کے اخبارات پڑھیں، یا پاکستان کا ٹی وی دیکھیں اور وہاں کا میڈیا سنیں تو آپ پائیں گے کہ وہاں کا پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا رات دن ہندستان کے خلاف نفرت کی باتیں پھیلا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات بتاتے ہیں کہ میڈیا خواہ کتنا ہی طاقت ور ہو، اس کی ایک حد ہے۔ اس حد پر جا کر میڈیا کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ حد خود انسان کی فطرت ہے۔ میڈیا کے تمام تر پروپگنڈے کے باوجود انسان کی فطرت پھر بھی زندہ رہتی ہے۔ کوئی بھی خارجی چیز ان کی فطرت کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔

مسٹر سوراجیہ سنگھ گوڑگاؤں ضلع کے رہنے والے ہیں۔ وہ ایک تنظیم سے جڑے ہوئے ہیں جو بندھوا مزدور کے خلاف تحریک چلا رہی ہے۔ چار سال پہلے وہ ہریانہ کے ایک مقام پر گئے جہاں ایک سو کے قریب بندھوا مزدور تھے۔ انھوں نے ان کو رہا کرانے کی کوشش شروع کی۔ مگر مالکوں نے انھیں اتنا مارا کہ ان کے دونوں پاؤں ٹوٹ گئے۔ اس کے بعد وہ کئی مہینہ تک اسپتال میں پڑے رہے۔

بندھوا مزدور خاتمہ قانون (Bonded Labour System (abolition) Act 1976) تقریباً ۲۰ سال پہلے پاس کیا گیا تھا۔ پچھلے سال گورنمنٹ نے اعلان کیا کہ ہم نے سوا دو لاکھ بندھوا مزدور رہا کرائے ہیں اور اب یہ سماجی برائی ملک میں بہت کم ہو گئی ہے۔ ہریانہ گورنمنٹ نے اعلان کیا کہ ریاست میں بندھوا مزدور سسٹم کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا ہے۔

مگر مسٹر سوراجیہ سنگھ نے بتایا کہ یہ سب پروپگنڈے کی باتیں ہیں۔ ان کے اندازہ کے مطابق ابھی بھی ملک میں ۵۰ لاکھ بندھوا مزدور موجود ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ابھی حال میں ہم نے ہریانہ کے ایک مقام سے ۹۲ بندھوا مزدور رہا کرائے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ قانون میں درج ہے کہ جہاں کہیں بھی بندھوا مزدور رکھنے کے الزام میں کوئی شخص پکڑا جائے تو سمری ٹرائل کر کے اس کا فوراً فیصلہ

کیا جائے اور مجرم کو کڑی سزا دی جائے۔ مگر آج تک کسی ایک شخص کو بھی سزا نہیں ملی۔ ایسی حالت میں یہ جرائم وغیرہ بنانے کا انتظام کیسے ختم ہوسکتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ صرف نوح اور دہلی کی بات نہیں ہے۔ ہر جگہ اسی طرح کی حالت ہے کہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو کوئی سزا نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ قوانین کی کثرت کے باوجود ابھی تک جرائم پر کنٹرول نہ کیا جاسکا۔

آج جمعہ کا دن تھا۔ میجر محمد عثمان (ریٹائرڈ) کے ساتھ گوڑگاؤں کی جامع مسجد میں جاکر جمعہ کی نماز ادا کی۔ اس مسجد کے امام حافظ جان محمد ہیں۔ وہ آٹھ سال سے یہاں امامت کر رہے ہیں۔ مسجد کے منتظم جناب ولی محمد ایڈووکیٹ ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میرے باپ کا نام بھوپت تھا۔ میرے دادا کا نام ہرلی تھا۔ یہ لوگ مسلمان تھے۔ میوات میں پہلے اسی طرح نام رکھے جاتے تھے۔ ابھی بھی میوؤں کے کلچر پر پڑوسی قوموں کی گہری چھاپ ہے۔ مثلاً قریب کے رشتوں میں نکاح نہ کرنے کا رواج انھیں غیر مسلموں سے میوؤں میں آیا ہے۔

راستہ میں میجر عثمان صاحب (۶۳ سال) نے بتایا کہ وہ ۱۹۴۹ میں فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا کہ سروس کے زمانہ کا کوئی تجربہ بتائیے۔ انھوں نے بتایا کہ میرے ساتھ پندرہ سو جوان ٹریننگ کے لیے بنگلور بھیجے گئے۔ یہ سب تقسیم کے زخم خوردہ تھے۔ شروع شروع میں ہر ایک شکایت کرتا تھا۔ ہر ایک دوسرے کے خلاف بولتا تھا۔ مگر چھ مہینہ ایک ساتھ رہنے کے بعد ہندو مسلم سب ایک ہوگئے۔ پہلے ہم اپنے کو مسلمان، ہندو، سکھ سمجھتے تھے۔ اب ہم ایک دوسرے کو صرف انڈین سمجھنے لگے۔ انھوں نے کہا کہ اختلاط سے اور مل جل کر رہنے سے سارا جھگڑا ختم ہوسکتا ہے۔ دوری غلط فہمیاں پیدا کرتی ہے، قربت غلط فہمیوں کو ختم کردیتی ہے۔

میجر عثمان صاحب نے ریٹائر ہونے کے بعد کام تلاش کرنے کی کوشش کی۔ انھیں محسوس ہوا کہ ان کی مرضی کا کام ملنا مشکل ہے۔ انھوں نے اس کا خیال چھوڑ دیا۔ اور اپنے لیے ایک اور مشغولیت تلاش کرلی۔ گوڑگاؤں میں دو ایکڑ زمین پر انھوں نے ایک اسکول کھول دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس کو وہ نمونہ کا اسکول بنائیں۔ یہ اسکول ہمارے راستہ میں سڑک کے کنارے تھا۔ چنانچہ چند منٹ کے لیے گاڑی روک کر ان کا اسکول دیکھا۔ فی الحال یہ اسکول ایک عارضی عمارت میں ہے۔ مگر مشکلات کے باوجود

پیرطولن صاحب کے حوصلے بلند ہیں۔ اور بلاشبہ اس دنیا میں کامیابی کے لیے سب سے بڑی چیز حوصلہ ہے۔

گوڑگاؤں کی جامع مسجد پہنچے تو وہاں کافی لوگ جمع تھے۔ شہر کے علاوہ اطراف کے لوگ بھی موجود تھے۔ نماز سے پہلے تقریباً آدھ گھنٹہ کی ایک تقریر کی۔ تقریر میں میں نے (المساجد بیوت المتقین۔ حدیث) کو موضوع بنایا۔

میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسجد تقویٰ کی تربیت کا مرکز ہے۔ اس کے بعد مسجد اور نماز اور عبادت کی تشریح کی اور بتایا کہ تقویٰ دنیا اور آخرت کی تمام کامیابیوں کا زینہ ہے۔ اگر لوگوں میں تقویٰ کی صفات آجائیں تو وہ اہل دنیا کے لیے محبوب بن جائیں گے اور پھر آخرت میں جنت کے مستحق قرار پائیں گے۔

نماز کے بعد تھوڑی دیر کے لیے امام صاحب کے کمرہ میں نشست ہوئی۔ یہاں ولی محمد صاحب ایڈووکیٹ اور دوسرے صاحبان سے مختصر گفتگو ہوئی۔

مسجد سے باہر نکلا تو ایک بڑا کئی منزلہ مکان سامنے تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا: "یاسین پلازا" لوگوں نے بتایا کہ یہ چودھری یٰسین صاحب کا مکان تھا۔ اس کو ان کے صاحبزادے چودھری طیب حسین نے ازسر نو بنوایا ہے۔ اس کی پانچ منزلیں ہیں۔ اوپر ان کی رہائش گاہ ہے۔ نیچے کے تمام حصے مارکٹ بنا دیے گئے ہیں۔

پہلی بار جب میں گوڑگاؤں آیا تھا تو اسی مکان میں چودھری یٰسین صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت وہ صاحب فراش ہو چکے تھے۔ جہاں تک یاد ہے، یہ قدیم وضع کا ایک خستہ مکان تھا۔ مگر اسی جگہ آج شاندار کئی منزلہ عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ علامتی طور پر یہ اس ملک میں مسلمانان ہند کی حالت کا نشان ہے۔ ۱۹۴۷ کی تقسیم کے وقت مسلمان جس معاشی حالت میں تھے اس سے آج وہ بہت زیادہ آگے جا چکے ہیں۔ اس پر ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

ایک صاحب نے گوڑگاؤں کی ایک ماڈرن مسلم فیملی کا قصہ بتایا۔ یہ لوگ انگریزی تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کے گھر میں انگریزی زبان ہی لکھی اور بولی جاتی ہے۔ ان کے لڑکے کی شادی ایک سابق گورنر کی لڑکی سے ہوئی۔ یہ لڑکی اگرچہ تعلیم یافتہ تھی، مگر اس کی تعلیم زیادہ تر اردو میں ہوئی تھی اور وہ اردو زبان بولتی تھی۔

بیاہتا لڑکے کی انگریزی تعلیم یافتہ دلہن کو پسند نہ تھی - [illegible]
چاہتی - مگر بہو اس معیار کو پورا نہ کر سکی - ایک دن ساس نے غصہ ہو کر بہو کے بارے میں کہا کہ [illegible]
انگریزی طریقہ اختیار کرے گی :

When she will become anglicised?

یہ قصہ میں نے ساتھیوں سے کہا کہ اس کے برعکس اگر ایسا ہوتا کہ مذکورہ مسلم خاندان ہندی داں خاندان ہوتا جیسا کہ آج کل اکثر جگہ ہو رہا ہے اور وہاں ایسی بہو آتی جو انگلش اسکول کی پڑھی ہوئی ہوتی اور انگریزی زبان بولتی تو شاید اس کی ساس ایسا نہ کرتی کہ وہ اس کو ہندی بولنے کی تلقین کرتی - اور جب وہ ہندی نہ بولتی تو ساس کہتی کہ یہ بہو آخر کب ہندی طریقہ اختیار کرے گی -

انگریزی زبان اور ہندی زبان میں اس فرق کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ایک کے بارہ میں ذہنی مرعوبیت ہے ، اور دوسرے کے بارہ میں ذہنی مرعوبیت نہیں -

نماز جمعہ سے فراغت کے بعد دوبارہ میجر عثمان صاحب کے ساتھ واپسی ہوئی - راستہ میں میں نے عثمان صاحب سے پوچھا کہ اپنی سروس کے زمانہ کے کچھ تجربات بتائیے - مجھے تعجب ہوا کہ عام رواج کے برعکس انھوں نے نہ تو ہند و تعصب کی بات کی - نہ یہ کہا کہ میرا پروموشن نہیں ہونے دیا گیا - میں فلاں یونٹ سے ریٹائر ہو سکتا تھا مگر مجھ کو میجر ہی کے درجہ پر باقی رکھا گیا - اس قسم کی شکایتی باتیں کرنے کے بجائے انھوں نے کہا کہ میری سروس نے مجھے سب کچھ دیا - اس معاملہ میں میرے پاس کلمۂ شکر کے سوا اور کچھ نہیں ہے -

پھر انھوں نے کہا کہ دیکھئے ، اسی سروس پر رہ کر میں نے اپنے بچوں کو تعلیم دلائی - آج میرے بچے سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں - میں ایک میو کا لڑکا تھا - مگر اس سروس نے مجھے افسر کے عہدہ پر پہنچا دیا - سروس نے مجھے سارا ہندستان دکھا دیا - میں گاؤں میں پیدا ہوا مگر اسی سروس کی بدولت آج میں شہر کے اندر اپنے ذاتی مکان میں رہتا ہوں - میرے پاس کار اور تمام ضرورت کی چیزیں موجود ہیں - مجھے کبھی کسی تعصب کا تجربہ نہیں ہوا - انھوں نے کہا : اگر آپ اپنے کو ٹھیک رکھیں تو تعصب والا اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا - میجر عثمان صاحب فرید آباد میں رہتے ہیں ، اور ان کا ٹیلی فون نمبر یہ ہے (Tel. 8-230291)

اس کے بعد ہم لوگ جسٹس تیواتیا کی رہائش گاہ پر پہنچے تو دوپہر کا کھانا میز پر رکھا جا چکا تھا۔ تمام چیزیں سادہ گھر کی بنی ہوئی تھیں۔ کھانا بالکل سادہ اور میرے مزاج کے عین مطابق تھا۔ کھانے کے بعد دیر تک مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال جاری رہا۔

شام کو گونڈا گاؤں سے دہلی کے لیے روانگی ہوئی۔ اس سفر میں مسٹر مول چند جین ساتھ تھے۔ وہ مدت تک ملکی سیاست میں رہے ہیں۔ ہریانہ کے منسٹر بھی بنے۔ مگر اب وہ ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں اور کرنال میں مال روڈ پر رہتے ہیں۔

انھوں نے بہت جوش کے ساتھ کہا کہ خرابی کی وجہ یہ ہے کہ لوگ بس اپنے سے باخبر ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے کو نہیں جانتے۔ مثلاً اسلام میں وحدت کا تصور جتنا گہرا ہے، کسی اور دھرم میں نہیں۔ اسی طرح اسلام میں جو مساوات ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ مگر لوگ بے بنیاد طور پر غلط فہمیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کے گنز (خوبیوں) کو جانیں تو سارا اختلاف ختم ہو جائے۔

مسٹر جین اردو جانتے ہیں۔ انھوں نے میٹنگ میں سب کے سامنے یہ بات کہی کہ اسلام میں جو خلیفہ ہوئے ہیں ان سے بڑھ کر اچھے حکمراں کی مثال نہیں دی جا سکتی۔ ہمارے یہاں راجہ جنک کا نمونہ بتایا جاتا ہے۔ مگر کون جانتا ہے کہ جنک کب تھے، اور تھے بھی یا نہیں۔ وہ کوئی ہسٹاریکل فیگر نہیں۔ مگر اسلامی خلیفہ تو تاریخی شخصیتیں ہیں۔

مغرب کے قریب ہم لوگ دہلی واپس آ گئے۔

دوسرا سفر

مول چند جین ہریانہ کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ وہ ایک فریڈم فائٹر ہیں۔ اس کے علاوہ منسٹر اور ایم پی اور مختلف بڑے عہدوں پر رہ چکے ہیں۔ اب ان کی عمر ۸۰ سال ہو چکی ہے۔

۲۰ اگست ۱۹۹۵ کو ان کا اکیاسی واں جنم دن تھا۔ اس موقع پر ان کے آبائی گاؤں سکندر پور ماجرا (کرنال) میں ایک عوامی تقریب منائی گئی۔ شری مول چند جین کو چوں کہ لائبریریوں کا بہت شوق ہے اور انھوں نے اپنے آبائی گاؤں سکندر پور ماجرا میں ایک اچھی لائبریری قائم کی ہے۔ اس لیے لوگوں نے طے کیا کہ اس بار مول چند جین کے جنم دن کو لائبریری دن کے طور پر منایا جائے۔ منتظمین کی طرف سے مجھے بھی اس موقع پر شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں یہ سفر پیش آیا۔

۲۰ اگست ۱۹۹۵ء کی صبح کو جسٹس دیپا سنگھ تیوتیا کے ساتھ روانہ ہوا۔ [illegible] ہوتے ہوئے ہم لال قلعہ کے پاس پہنچے۔ ہماری گاڑی لال قلعہ کی دیوار کے کنارے چل رہی تھی۔ [illegible] شاعر کا شعر یاد آیا جو اس نے اس تاریخی قلعہ کے بارہ میں لکھا تھا:

اے قلعۂ سرخ اے اثر شاہ جہانی　　برباد شدہ عظمت ماضی کی نشانی

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ کچھ لوگ لال قلعہ کو عظمت کی نشانی کے طور پر دیکھتے ہیں۔ مگر میں اس کو عبرت کی نشانی کے طور پر دیکھتا ہوں۔ جمنا کے کنارے بنا ہوا ۷۵ فیٹ اونچی دیواروں والا یہ عظیم قلعہ دریا کے سیلاب سے اپنے مکینوں کو بچا سکتا تھا۔ مگر اس میں یہ طاقت نہ تھی کہ وہ حقائق کے سیلاب سے ان کو بچا سکے۔ حقائق کا سیلاب ہر دوسری چیز سے زیادہ طاقت ور ثابت ہوتا ہے۔

دہلی سے نکل کر ہم ہریانہ میں داخل ہوئے۔ ہماری گاڑی سڑک پر دھکے کھاتی ہوئی چل رہی تھی جس میں جگہ جگہ گڑھا تھا۔ میں نے باہر دیکھا تو سڑک کے دونوں طرف دور تک سرسبز و شاداب زمینیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہریانہ ایک نہایت سرسبز اور مالامال ریاست ہے۔ مگر اس کی سڑک مفلسی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ یہ سارا کرشمہ اس لفظ کا ہے جو آزادی کے بعد ہر آدمی کے لیے ایک معلوم لفظ بن چکا ہے۔ یعنی پولیٹکل کرپشن۔ یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد یہ عظیم ملک ہمارے لیڈروں کو ملا تو انھوں نے اس کو لوٹ کا دسترخوان سمجھ لیا نہ کہ تعمیر و ترقی کا میدان۔ ایک ہندو بھائی نے کرپال سنگھ بیدار کا یہ شعر سنایا:

بیدار سحر کے ہوتے ہی کچھ اور سیاہی پھیل گئی　　آغاز ہمارا یہ کچھ ہے انجام ہمارا کیا ہوگا

سونی پت پہنچے تو ایک مقام پر سڑک بھینسوں سے بھری ہوئی تھی۔ ہماری گاڑی ان چلتی پھرتی کالی چٹانوں کے درمیان سے اس طرح گزر رہی تھی کہ ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ کوئی بھینس دھکا یا سینگ مار کر نئی ڈیلکس ماروتی کو نقصان پہنچا دے۔ تاہم گاڑی [illegible] کے ساتھ باہر آگئی۔ جسٹس تیوتیا نے کہا:

[illegible]

[illegible] انھوں نے بتایا کہ [illegible]
وہ بیرسٹری کی تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے [illegible]

جسٹس دیبی سنگھ تیوتیا کلکتہ ہائی کورٹ میں چیف جسٹس تھے۔ انھوں نے ایک اصول کی بنیاد پر ۱۹۹۸ میں اس عہدہ سے استعفا دے دیا۔ وہ ایک اصول پسند آدمی ہیں اور با اصول موقف (principled stand) کے لیے مشہور ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے ملکی حالات میں اصلاح کے لیے سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے جب الکشن کمیشن میں اپنی پارٹی (جن ستہ پارٹی) کو رجسٹر کرایا تو معلوم ہوا کہ ہندستان میں تقریباً چار سو پولیٹکل پارٹیاں رجسٹرڈ پارٹی کی حیثیت سے موجود ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ ان کی ابتدائی تعلیم لاہور میں اردو اسکول میں ہوئی۔ جب وہ تیسری کلاس میں پڑھتے تھے تو ان کے مسلمان استاد نے ایک شعر بتایا تھا جو اب تک انھیں یاد ہے :

کاٹ لینا ہر کٹھن منزل کا کچھ مشکل نہیں اک ذرا انسان میں چلنے کی ہمت چاہیے

Justice Debi Singh Tewatia
A-27, D.L.F. Qutub Enclave, Phase-I
Gurgaon, Tel. 0124-8-350797

کرنال کے نام سے بہت سی تاریخیں وابستہ ہیں۔ نادر شاہ (۱۶۸۸ - ۱۷۴۷) ایک ایرانی سردار تھا۔ اٹھارویں صدی میں وہ اسّی ہزار کی فوج کے ساتھ ہندستان میں داخل ہوا۔ فتوحات کرتے ہوئے فروری ۱۷۳۹ میں وہ کرنال پہنچا۔ یہاں اس نے مغل فوج کو فیصلہ کن شکست دی۔ اس کے بعد وہ دہلی میں داخل ہوا۔ یہاں کچھ مسلمانوں نے اس کے ایک فوجی کو مار دیا۔ اس پر وہ سخت برہم ہوا۔ اس نے دہلی میں قتل عام کا حکم دے دیا۔ دہلی کی سڑکوں اور گلیوں میں تیس ہزار آدمی قتل کر دیے گئے۔

نادر شاہ نے نہایت سفاکی کے ساتھ ہندستان میں اپنی حکومت قائم کی۔ تاہم آخر میں خود اس کے مخالف فوجیوں نے اس پر حملہ کرکے جون ۱۷۴۷ میں اسے مار ڈالا۔ نادر شاہ کی موت کے بعد اس کی حکومت بھی ختم ہو گئی۔

[illegible] نادر شاہ کی ایک تصویر رکھی ہے جو کسی مصور نے ۱۷۴۰ میں بنائی [illegible]

پھیلا اس کے خلاف سیاسی سازش کرنا ... [illegible] ... نادر شاہ نے ... [illegible]

مسلمانوں کا قتلِ عام کیا تھا دہلی کے ایک بزرگ نے اس پر یہ شعر کہا تھا کہ خود ... [illegible]

شامت تھی جس نے نادر کی صورت اختیار کر لی :

شامتِ اعمال ما صورتِ نادر گرفت

محمد بن قاسم عراق سے اپنی فوج لے کر سندھ آیا۔ اس وقت یہاں راجہ داہر کی حکومت تھی۔ اس نے نہایت آسانی سے ۷۱۲ء میں سندھ کو فتح کر لیا۔ اس سلسلہ میں جسٹس دیوی سنگھ تیوتیا نے بتایا کہ سندھ میں پہلے ایک جاٹ راجہ کی حکومت تھی (جسٹس تیوتیا خود بھی ایک جاٹ ہیں)۔ چچ نامی ایک برہمن اس راجہ کا وزیر تھا، اس وزیر نے محل کے بعض افراد کو ملا کر راجہ کو زہر دے دیا۔ اس کے مرنے کے بعد چچ راج گدی پر قابض ہو گیا۔ داہر اسی کا لڑکا تھا جو چچ کے مرنے کے بعد راج گدی پر بیٹھا۔

اس واقعہ کی بنا پر سندھ کے جاٹ لوگ چچ اور داہر سے بہت ناراض تھے۔ چنانچہ جب محمد بن قاسم سندھ میں داخل ہوا تو جاٹ سرداروں نے محمد بن قاسم کا ساتھ دیا۔ اس طرح داہر کے مقابلہ میں وہ بہت آسانی کے ساتھ کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد ان جاٹوں نے محمد بن قاسم کی اطاعت قبول کر لی اور محمد بن قاسم نے بھی ان کے ساتھ نہایت اچھے سلوک کیے۔ اسی واقعہ کو بعض ہندستانی مورخین نے اس طرح لکھا ہے کہ محمد بن قاسم کو کچھ بے وفا سرداروں کی غداری سے بہت مدد ملی :

> His work was greatly facilitated by the treachery of certain renegade chiefs. (p. 172)

تقریباً تین گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ہم لوگ سکندر پور ماجرا (کرنال) پہنچے۔ یہاں ایک اسکول کے وسیع ہال میں جلسہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ کرنال کے علاقہ کے عوام و خواص بڑی تعداد میں اس میں شریک ہوئے۔

یہاں اگرچہ ہریانہ کے دو منسٹر، کئی وکیل اور ڈاکٹر اور پروفیسر وغیرہ بھی آئے تھے۔ تاہم تعداد کے اعتبار سے وہ زیادہ تر ایک عوامی جلسہ تھا۔ مختلف دیہاتوں کے لوگ بڑی تعداد میں جمع تھے۔ جب میں پہنچا تو عورتوں اور بچوں اور بڈھوں کی ایک بھیڑ دکھائی دی۔ سب کسان طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

[illegible] ایک جلسہ جاری تھا۔
میں زیادہ تر کانفرنسوں میں جاتا رہا ہوں۔ وہاں سب کے سب پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں۔ مگر اس جلسے کا ماحول اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ میں ذاتی طور پر کانفرنس کا آدمی ہوں۔ میں عوامی جلسوں کا آدمی نہیں۔ تاہم میں نے سوچا کہ کانفرنسوں میں جو لوگ آتے ہیں وہ ملک کی آبادی کا کتنا فی صد حصہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دس فی صد سے زیادہ نہیں۔ ملک کے ۹۰ فی صد لوگ یا تو ناخواندہ ہیں یا نیم خواندہ۔

مگر عجیب بات ہے کہ ہندستان میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں وہ ۹۹ فی صد شہروں میں ہوتے ہیں۔ راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کے تحت دو سینیر پروفیسروں نے چھ ماہ کی تحقیق کے دوران شہری علاقہ اور دیہی علاقہ میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے اعداد و شمار جمع کیے۔ اس کی روشنی میں انھوں نے دونوں علاقوں کے فرق کو بتانے کے لیے ایک چارٹ بنایا ہے۔ یہ چارٹ بتاتا ہے کہ دونوں قسم کے علاقوں کے درمیان فساد کے اعتبار سے جو تناسب ہے وہ آئس برگ اور اس کی ٹپ جیسا ہے۔

یہاں کے جلسہ میں رام گوپال ایڈووکیٹ (پانی پت) سے ملاقات ہوئی۔ وہ اچھی اردو جانتے تھے۔ انھوں نے اپنے قلم سے میری ڈائری میں لکھا: میں ۱۹۱۴ میں پیدا ہوا۔ ہمارے گاؤں ہنسوارہ (پانی پت) میں سب مل جل کر رہتے تھے۔ مذہب و ملت کی بنا پر کوئی مت بھید نہیں تھا۔ ۱۹۳۹ سے میں شہر پانی پت میں رہنے لگا۔ یہاں شہر میں بھی کسی قسم کا مت بھید نہیں تھا۔ سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی تھے۔ پانی پت کے چودھری ممتاز حسین (ریٹائرڈ تحصیل دار) کا احسان نہیں بھول سکتا۔ میں نے ایف اے تک فارسی اور بی اے تک اردو میں تعلیم حاصل کی۔ باہر کی طاقت بٹوارہ کرنے میں کامیاب ہوگئی (۲۶ اگست ۱۹۹۵)

جلسہ میں جو کارروائیاں ہوئیں ان میں سے ایک یہ تھا کہ گاؤں کی بچیوں نے مل کر گانا گایا اور اس طرح مہمانوں کا سواگت کیا۔ ایک شعر یہ تھا:

ہم بھی دعائیں مانگیں گے لمبی عمر آپ کی کرتار کرے

بہت سے لوگ نوٹوں کا ہار بنا بنا کر لائے اور مہمانوں کو پہنا کر ان کا خیر مقدم کیا۔ یہ تمام نوٹ جو تقریباً

پچاس ہزار روپے کے تھے۔ مقامی لائبریری میں دے دیے گئے۔ [illegible]
کو لائبریری آندولن کے طور پر منایا جا رہا ہے۔ یہ قصبہ جیسے بنا [illegible] سال پہلے [illegible]
ایک لائبریری بنائی گئی تھی۔ اب وہ ترقی کر کے کافی بڑی ہو گئی ہے۔ اس علاقہ میں [illegible] لائبریریاں
قائم ہو گئی ہیں جن سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مول چند جین کا کہنا ہے کہ ——— "تعلیم [illegible]
کے بنا ادھوری ہے"

اس جلسہ میں تقریباً پچاس لڑکوں کو انعامات دیے گئے۔ کسی کو بیگ، کسی کو فلن کیس، وغیرہ۔ یہ انعامات انھیں پڑھنے کا شوق بڑھانے کے لیے دیے گئے۔

شری مول چند جین نے تقریر کی تو پوری تقریر کے دوران تفصیل کے ساتھ اپنی لائبریری تحریک کا پس منظر بتایا۔ انھوں نے کہا کہ لوگوں کو اگر آپ نکمّے کاموں سے بچانا چاہتے ہیں تو ان کو پڑھنے میں لگائیے۔ اسی لیے میں نے طے کر رکھا ہے کہ کوئی پڑھے یا نہ پڑھے، مجھے ہر ہر گاؤں میں لائبریری بنانا ہے۔ میں جو لائبریریاں بنا رہا ہوں ان میں دوسرے مضامین کے ساتھ ہر مذہب کی کتابیں بھی ہوتی ہیں۔ قرآن کا ترجمہ اور پیغمبر صاحب کی لائف بھی ہماری لائبریری میں موجود ہے۔ یہاں ہماری لائبریری میں چار ہزار سے زیادہ منتخب کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ انھوں نے مطالعہ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا: ہماری سمسیائیں کیوں پیدا ہوئیں، ان کا سمادھان کیا ہے، یہ سب آپ کو کتابوں کے پڑھنے سے ملے گا۔ ہریانہ میں پنچایتیں بنا دی گئی ہیں۔ مگر اکثر پنچایتوں کے سرپنچ ان پڑھ ہیں۔ ایسی حالت میں پنچایت کیسے سپھل ہو سکتی ہے۔

سکندر پور ماجرا میں ۱۹۴۷ کے بعد ۸۰ فی صد مکان کچے تھے۔ آج یہاں سب کے سب مکان پکے بنے ہوئے ہیں۔ یہ گاؤں والوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ لائبریری کی وسیع عمارت بھی پختہ دو منزلہ بنی ہوئی ہے۔

جلسہ کے خاتمہ پر لوگوں نے اپنے اپنے عطیات کا اعلان کیا۔ کسی نے ۱۰۱ روپیہ دیا، کسی نے ۵۰۱ روپیہ، کسی نے چھ ہزار روپیہ۔ کسی نے گیارہ ہزار روپیہ کا اعلان کیا، کسی نے ۲۰ ہزار روپیہ دیا۔ ایک صاحب نے اکیاون ہزار روپیہ کا اعلان کیا۔ مجموعی طور پر پانچ لاکھ روپے سے زیادہ کی رقم جمع ہوئی۔ ایک غریب آدمی نے اپنی جیب سے ایک روپیہ نکال کر دیا۔ "انجمن اسلامیہ"

سے بھی ایک ہزار روپے بطور چندہ دیا۔

یہ تمام رقم شری موہن چند جین کو ذاتی طور پر ان کی سالگرہ کی نسبت سے دی گئی تھی مگر انھوں نے اسی وقت پوری رقم لائبریری تحریک کو دے دی۔ یہ جلسہ ایک اسکول کی عمارت میں تھا۔ اس کی دیوار پر ہندی میں لکھا ہوا تھا: ستیہ کی ہی جیت ہوتی ہے۔

اس میں خاص سبق یہ تھا کہ سماج کے سربرآوردہ افراد کی طرف سے اس قسم کا فلاحی کام کیا جائے تو فوراً اس کو قبولیت مل جاتی ہے اور لوگوں کا تعاون اسے مل جاتا ہے۔ شری موہن چند جین اس علاقہ کے ایک معروف آدمی ہیں۔ وہ ہریانہ میں منسٹر بھی رہ چکے ہیں۔ اس بنا پر انھوں نے جب لائبریری تحریک اٹھائی تو فوراً اس تحریک کو لوگوں کا تعاون حاصل ہو گیا۔ سکندرپور ماجرا کے اس جلسہ میں ہریانہ کے وزیر تعلیم بھی شریک تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ ہریانہ کے جس گاؤں میں بھی لائبریری قائم کی جائے گی تو سرکار کی طرف سے اس کو ہر ممکن امداد دی جائے گی۔

وزیر تعلیم نے بتایا کہ میں نے جاپان کا دورہ کیا۔ ایک دن میں وہاں کی ایک فیکٹری میں گیا جہاں کافی عورتیں کام کرتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہر عورت اپنے سر پر سفید پٹی اور ہاتھ میں کالی پٹی باندھے ہوئے ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کس لیے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہمیں کارخانہ سے شکایت ہے اس لیے آج ہم اسٹرائک کر رہے ہیں۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ پھر آپ لوگ کام پر کس لیے جا رہی ہیں۔ انھوں نے جواب دیا: اسٹرائک الگ ہے اور کام الگ۔ اگر ہم کام نہیں کریں گے تو اس سے دیش کا نقصان ہوگا۔

پروفیسر ہری سنگھ نے کہا کہ میں نے قرآن کا ترجمہ بار بار پڑھا ہے۔ قرآن میں جس گائے کو کاٹنے کا ذکر ہے، اس کا ایک خاص رنگ بتایا گیا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو ہم نیل گائے کے نام سے جانتے ہیں۔ میں خود کہتا ہوں کہ نیل گائے کو مارنا چاہیے۔ وہ فصل کو بہت برباد کرتی ہے۔

ایک بوڑھے ہندو نے کہا کہ ہم بچپن میں سنتے آئے تھے کہ مسلمان بہت برے ہیں۔ کیوں کہ وہ گوشت کھاتے ہیں:

Muslims are bad, because they are meat eater.

اس کے بعد میرا داخلہ ایک کالج میں ہوا۔ وہ ہندو کالج تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ہندو بھی میٹ کھاتے

میں۔ جہاں وہاں معیاری تھی۔ ایک گاؤں میں پانچ اسی ڈیری [illegible]
کر خود آپ نیا جیسا میں دونوں قسم کے لوگ ہیں۔ اس تجربے کے بعد مسلمانوں سے [illegible]
ایک ریٹائرڈ ہندو جج نے کہا کہ یہ سب تو اس وقت کی باتیں ہیں جب کہ زندگی [illegible]
کا انحصار گائے پر [illegible] کرتی تھی۔ اب گائے کی اقتصادی قابلیت (economic viability) ختم ہو چکی۔ اب ہل بیل کی جگہ ٹریکٹر آگیا ہے۔ اس لیے اب اس قسم کی بحثوں کو بھی ختم ہو جانا چاہیے۔ اب گائے بھی ویسی ہی ایک جانور ہے جیسے کہ دوسرے جانور۔

واپسی دوبارہ جسٹس دیپ سنگھ تیوتیا کے ساتھ ہوئی۔ راستہ میں مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ جسٹس تیوتیا کی ابتدائی تعلیم لاہور میں ہوئی۔ ۱۹۹۲ میں وہ پاکستان گئے تو وہاں کے لوگوں نے ان سے بے حد محبت کا اظہار کیا۔ وہاں وہ بالکل اپنوں جیسے ماحول میں رہے۔ انھوں نے بتایا کہ واپسی میں جب وہ لاہور سے دہلی آنے والے جہاز پر سوار ہوئے تو جہاز میں ان کی ملاقات ایک ۸۰ سالہ پاکستانی سے ہوئی۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ لکھنؤ جا رہے تھے۔ بوڑھے پاکستانی نے کہا کہ "میں اپنے بیٹے کو اپنی جنم بھومی دکھانے جا رہا ہوں"۔ انھوں نے مزید کہا کہ جب میں لکھنؤ کی زمین پر پہنچتا ہوں جو میرا آبائی وطن ہے تو میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

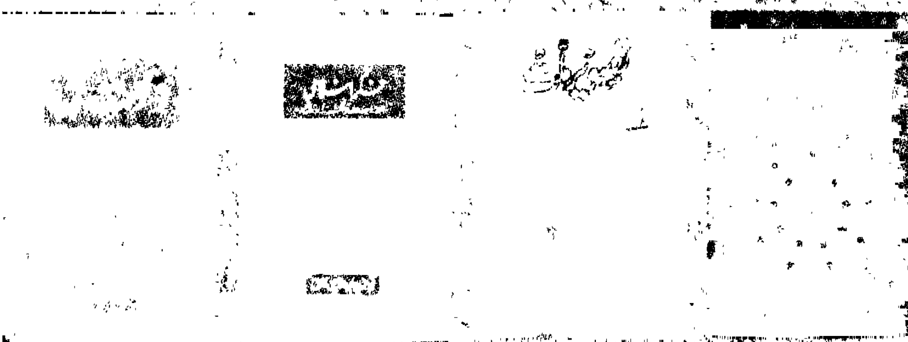
جسٹس تیوتیا نے اپنے سفر پاکستان کے بارہ میں اس قسم کے مختلف تجربے بتانے کے بعد کہا کہ ۱۹۴۷ میں یہاں جو جغرافی تقسیم ہوئی اس نے انسانی تقاضوں کو کچل ڈالا۔ اب ضرورت ہے کہ برصغیر کے ملاپ (sub-continental reconciliation) کا پراسس جاری کیا جائے۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ سیاست وہی ہے جو حالات کے اعتبار سے قابل عمل ہو۔ موجودہ حالات میں مذہبی سیاست قابلِ عمل نہیں۔ کیوں کہ اس کے موافق ذہنی فضا ملک میں موجود نہیں۔ اس وقت ہم جن حالات کے درمیان ہیں اس میں قابل عمل سیاست صرف ایک ہے، اور وہ سیکولر سیاست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی سیاست فیل ہو گئی، اور اسی طرح ہندستان میں بھی ہندتو کی سیاست فیل ہو گئی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ دونوں میں سے کسی بھی ملک میں اس وقت مذہب کے اصولوں پر سیاست چلانے کے مواقع موجود نہیں۔ اگر کسی کو مذہبی نظام لانا ہے تو سب سے پہلے اس کو سماج کے اندر مذہبی ماحول بنانا پڑے گا۔

واپسی میں ہم لوگ سونی پت سے گزرے۔ یہاں کچھ دیر کے لیے چودھری رزق رام ایڈووکیٹ (Tel: 122-760) کے مکان پر ٹھہرے۔ ۸۲ سال کی عمر میں بھی وہ کافی سرگرم نظر آئے۔ ہم لوگ کسی اطلاع کے بغیر یہاں پہنچے تھے۔ جسٹس تیوتیا نے کہا کہ ہم لوگ پیشگی اجازت لیے بغیر آپ کے یہاں آ گئے۔ انھوں نے مسکرا کر جواب دیا: آمدن بہ ارادت، رفتن بہ اجازت۔

چودھری رزق رام نے ایک عجیب بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ سونی پت بہت قدیم سے آباد ہے۔ مکہ کا قبیلہ قریش سونی پت ہی کا تھا۔ پہلے اس کا نام کروونس (Kurevans) تھا۔ یہاں سے یہ گروہ لوگ عرب میں آباد ہو گئے۔ اس کے بعد وہ قریش کہے جانے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا: حضرت صاحب اسی قبیلہ میں پیدا ہوئے۔ ۲۰ اگست کی شام کو ۵ بجے کو یہ بات انھوں نے اپنے مکان پر کہی۔

۱۹ مئی ۱۹۹۵ کی رات کو عشاء کی نماز کے وقت ہم لوگ دہلی واپس آ گئے۔



دو نئی کتابیں

۱۔ دعوت حق کے نام سے ایک نئی کتاب تیار ہوئی ہے۔ یہ کتاب ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں دعوت کی اہمیت، اس کے احکام، نیز دعوتی واقعات اور موجودہ زمانہ میں اس کے امکانات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

۲۔ دوسری نئی کتاب کا نام ہے، اسلام ایک تعارف۔ یہ کتاب پونے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں اسلام کا عمومی تعارف کیا گیا ہے۔ پوری کتاب

خبرنامہ اسلامی مرکز

۱- اپریل ۱۹۹۷ کے آخری ہفتہ میں صدر اسلامی مرکز نے بھوپال کا سفر کیا۔ یہاں [illegible] اکیڈمی کے تحت [illegible] روزہ پروگرام میں شرکت کی۔ اس کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۲- آلٹرنیٹیو ڈویلپمنٹ سنٹر، جے پور کے چیرمین پرہلاد سنگھ شیخاوت (فون ۲۸۲۰۰۳) نے ۷ مئی ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو "اسلام اور ہندستان" کے موضوع پر تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ کلچرل اتحاد کی بنیاد پر ملکی اتحاد قائم کرنے کا نظریہ ایک خیالی نظریہ ہے جو کبھی کامیاب ہونے والا نہیں۔ کسی بھی سماج میں اتحاد کا راز کلچر کی یکسانیت نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ سماج کے افراد باشعور ہوں۔ وہ اس راز کو جانیں کہ اختلاف ایک فطری حقیقت ہے۔ اس دنیا میں اختلاف کے باوجود مل جل کر رہنے سے اتحاد قائم ہوتا ہے۔ اتحاد کا تعلق ذہنی سوچ سے ہے نہ کہ کسی قسم کے خارجی مظاہر سے۔

۳- ٹائمس آف انڈیا کے چیف سب ایڈیٹر مسٹر کرشن کٹی نے ۱۰ مئی ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق اسلام کی بنیادی تعلیمات سے تھا۔ مثلاً آخرت، عبادت، وغیرہ۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ اسلام میں خدا اور بندے کے درمیان کوئی تیسرا وسیلہ نہیں مانا گیا ہے۔ اسلام کے مطابق ہر آدمی براہ راست خدا کی نگرانی میں ہے، اور خدا ہر ایک کے بارے میں اپنے براہ راست علم کے مطابق فیصلہ کرے گا۔

۴- ۱۷ مئی ۱۹۹۷ کی شام کو گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا جس میں تعلیم یافتہ مسلمان شریک ہوئے۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے [illegible] تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام میں اصل اہمیت دعوتی ہے۔ دعوت کے مقابلہ میں ہر دوسرا مصلحت کی حیثیت ثانوی ہے۔

۵- مسٹر وکرم دت اور ان کی پارٹی نے ۲۰ مئی ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا [illegible] کے

پہلے ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس کا موضوع ناقص الاعضاء انسانوں کے مسائل پر مشتمل تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اسلام میں یہ تصور نہیں ہے کہ ناقص الاعضاء آدمی اپنے پچھلے جنم کی کسی غلطی کو بھگت رہا ہے اس لیے وہ قابلِ احترام نہیں ہے۔ بلکہ اسلام میں ایسا آدمی دوسروں سے زیادہ قابلِ احترام سمجھا جاتا ہے چنانچہ ایک بار پیغمبر اسلام ؐ کے پاس کچھ سردار لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس درمیان میں ایک نابینا شخص آ گئے۔ پیغمبر سرداروں سے بات کرتے رہے اور نابینا کی طرف التفات نہیں کی۔ اس پر قرآن کی سورہ نمبر ۸۰ میں تنبیہ اتری۔

۶۔ نیوز اینڈ ویوز الائنس کے چیف ایڈیٹر نسیم نقوی نے ۱۲ جون ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا خصوصی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع زیادہ تر سوامی وویکانند سے متعلق تھا۔ ایک مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا کہ مختلف مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کے لیے وحدتِ ادیان کا نظریہ قابلِ عمل نہیں۔ شہنشاہ اکبر کی طاقت، ڈاکٹر بھگوان داس کا علم اور مہاتما گاندھی کی قیادت اس کو حاصل کرنے میں پوری طرح ناکام رہی۔ اس مقصد کے لیے بہترین فارمولا وہ ہے جو سوامی وویکانند نے دیا:

یعنی ایک کو مانو اور کسی سے نفرت نہ کرو (فالو ون اینڈ ہیٹ نن)

۷۔ ہندی اخبار دینک جاگرن کے کرسپانڈنٹ مسٹر اویناش مشرا نے ۱۳ جون ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ۱۹۴۷ سے پہلے اور ۱۹۴۷ کے بعد کے بارے میں ذاتی مشاہدات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم دونوں ابتدائی طور پر اپنی فطرت پر ہوتے ہیں۔ اگر انھیں بہکایا نہ جائے تو وہ بھائی بھائی کی طرح ہی زندگی گزاریں۔ یہ دراصل بہکانے والے لیڈر ہیں جو ان کو فطرت کے راستہ سے ہٹا دیتے ہیں۔

۸۔ [illegible] ٹرسٹ (مدراس) کی طرف سے راج گھاٹ نئی دہلی میں ۲۰ جون ۱۹۹۷ کو ایک جلسہ ہوا۔ اس کا موضوع مذاہب میں عبادت کا تصور تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور اسلامی عبادت اور نماز کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ابتدا (تقریباً) تین مہینے تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

	ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 90		ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs. 170		دو سال	[illegible] / £18	$18 / [illegible]
تین سال	Rs. 250		تین سال	$50 / £25	25 / £12
پانچ سال	Rs. 400		پانچ سال	[illegible] / £40	40 / [illegible]
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500		خصوصی تعاون (سالانہ)	[illegible]	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

Al-Risala

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, Near DESU,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 8
One year Rs. 90, Two years Rs. 170,
Three years Rs. 250, Five years Rs. [illegible]
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham [illegible]
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-[illegible]

DISTRIBUTED IN USA BY
MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., [illegible] Brooklyn,
New York NY 11230 Tel. [illegible]

Printed and published by [illegible] on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at [illegible]

دسمبر ۱۹۹۷، شمارہ ۲۵۳

قوتِ مرہبہ

واعدوالہم مااستطعتم من قوۃ و من رباط الخیل ترہبون بہ عدو اللہ وعدوکم (الانفال ۶۰)

اور ان کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے تیار رکھو قوت اور پلے ہوئے گھوڑے کہ اس سے تمہاری ہیبت رہے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر۔

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان کے لئے اگر کسی کی طرف سے عداوت کا مسئلہ پیدا ہو تو اس وقت اصل کام اِعداد ہو گا نہ کہ جہاد (بمعنی قتال)، بوقت عداوت اگر حریف طاقتور ہو اور اہل ایمان ان کے مقابلہ میں کمزور ہوں تو ایسی حالت میں حریف سے جنگ چھیڑنا عملی نتیجہ کے اعتبار سے خودکشی کے ہم معنی ہے، اور خودکشی اسلام میں حرام ہے۔ کسی بھی جنگ کا مقصد کوئی مثبت نتیجہ حاصل کرنا ہوتا ہے نہ کہ حریف کو یہ موقع دینا کہ وہ مزید جارحیت کر کے اہل ایمان کو تباہ کر ڈالے۔ اور ان کا زور توڑ دے۔ جہاد اسلام میں بامعنی عمل کا نام ہے نہ کہ خودکشی کے اقدام کا۔

مزید یہ کہ اعداد (تیاری) کا مقصد اصلاً قتال نہیں ہے بلکہ اِرہاب ہے۔ یعنی حریف کو اس حد تک خوف زدہ کرنا کہ وہ جارحانہ کارروائی کا ارادہ ترک کر دے، اور اس طرح امن و امان کی حالت بدستور باقی رہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں تیاری کا اصل معیار تیر اور تلوار نہیں ہے بلکہ، قرآن کے الفاظ میں، قوتِ مرہبہ ہے۔ یعنی وہ قوت جس میں ہیبت کا پہلو پایا جائے۔ موجودہ زمانہ ایک بدلا ہوا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں "ارہاب" کی صفت جنگی ہتھیاروں میں نہیں ہے بلکہ علم اور اقتصادیات میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوویت یونین ۱۹۹۱ میں ٹوٹ گیا کیوں کہ اس کے پاس اگرچہ جنگی ہتھیاروں کا ڈھیر تھا، مگر اقتصادی اعتبار سے وہ کھوکھلا ہو گیا تھا۔

موجودہ زمانہ میں علم اور اقتصادیات کی طاقت ہی اصل طاقت ہے۔ یہی وہ قوتِ مرہبہ ہے جو موجودہ مسلمانوں کو بھرپور طور پر حاصل کرنا چاہئے۔

قانون فطرت

اسپین میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کو عام طور پر صلیبی جنگوں کا انتقام بتایا جاتا ہے۔ صلیبی جنگیں تیرھویں صدی کے آخر میں ختم ہوئی تھیں۔ مولانا شبلی نعمانی نے پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴) تک ہونے والے اس قسم کے تمام واقعات کی یہی ایک توجیہ قرار دیتے ہوئے کہا تھا:

کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتح ایوبی   دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

مسلم دانشوروں میں یہی ذہن اب تک باقی ہے۔ چنانچہ فلسطین سے لے کر بوسنیا تک کے تمام واقعات کو دوبارہ وہ اسی انتقامی توجیہ کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ مگر یہ توجیہ قرآن اور قانون فطرت دونوں کے خلاف ہے۔

ابن خلدون کا زمانہ عین وہی تھا جب کہ اسپین میں مسلم سلطنت کا زوال ہوا۔ اس نے اپنے مقدمہ میں تاریخ اور فطرت کا یہ قانون بتایا کہ ہر سلطنت یا ہر عروج یافتہ قوم آخر کار زوال کا شکار ہوتی ہے (ملاحظہ ہو مقدمہ ابن خلدون کا باب: ان الدولۃ لہا اعمار طبیعیۃ کما للاشخاص) صفحہ ۱۷۰۔

اصل یہ ہے کہ اس دنیا کا نظام چیلنج کے اصول پر بنایا گیا ہے۔ اس کو قرآن میں کہیں تلک الایام نداولہا بین الناس کہا گیا ہے اور کہیں اس کو بعضکم لبعض عدو کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہاں ایک قوم کا ابھرنا دوسری قوم کے لیے چیلنج بنتا ہے۔ اس چیلنج سے مغلوب قوم کی صلاحیتیں جاگتی ہیں۔ وہ اٹھ کر غالب قوم کو زیر کرتی ہے۔ اس طرح غالب اور مغلوب کے درمیان مختلف صورتوں میں مسابقت جاری رہتی ہے۔ یہی مسابقت یا چیلنج تمام انسانی ترقیوں کا واحد ذریعہ ہے۔ اس عمل کے دوران کبھی ایک قوم گرتی ہے اور کبھی دوسری قوم، تاہم مجموعی اعتبار سے انسانیت کا سفر ترقی کی طرف جاری رہتا ہے۔ مغلوب قوم پیش آمدہ چیلنج کا مقابلہ کرکے دوبارہ غالب آسکتی ہے۔ لیکن فریاد اور احتجاج کا طریقہ اس کو خدا کی دنیا میں کہیں پہنچانے والا نہیں۔

انتقامی توجیہ صرف نفرت کے جذبات ابھارتی ہے۔ اس کے برعکس فطرت پر مبنی توجیہ آدمی کے اندر یہ جذبہ پیدا کرتی ہے کہ وہ پیش آمدہ چیلنج کا مقابلہ کرے اور اس طرح اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو دوبارہ مزید اضافہ کے ساتھ حاصل کرلے۔

اتحاد یا بھیڑ

شائستہ اکرام اللہ (عمر ۸۰ سال) مسٹر محمد علی جناح کی گہری معتقد رہی ہیں۔ انھوں نے ان کے تحت کام کیا ہے۔ وہ ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۴ تک پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کی ممبر رہی ہیں۔ ۱۹۶۴ سے ۱۹۶۷ تک وہ مراکو میں پاکستان کی سفیر تھیں وغیرہ۔

ریڈرس ڈائجسٹ (مئی ۱۹۹۱) میں ان کا ایک مضمون مسٹر محمد علی جناح کے بارے میں چھپا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے مسٹر جناح سے متعلق مختلف یادداشتیں نقل کی ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ابتداءً ہندستان کے مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ نہ تھے۔ مگر مسٹر جناح کی قیادت کا یہ کرشمہ تھا کہ ۴۶-۱۹۴۵ کا الکشن ہوا تو ہندستانی ریاستوں میں ۸۵ فی صد مسلم سیٹوں پر مسلم لیگ کا قبضہ ہو گیا۔

انھوں نے لکھا ہے کہ قائد (مسٹر جناح) یہ کہا کرتے تھے کہ انھوں نے ایک بھیڑ کو ایک قوم کی صورت دی ہے۔ آج پاکستان کے داخلی جھگڑوں کو دیکھتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم دوبارہ بھیڑ کی حالت کی طرف واپس چلے گئے ہیں:

The Quaid used to say that he had fashioned a nation out of a mob, Today, seeing all our internal squabbles, I sometimes think that we have gone back to being a mob.

لوگ اکثر یہ غلطی کرتے ہیں کہ وہ جلسہ گاہ میں لوگوں کے جمع ہونے کو اتحاد سمجھ لیتے ہیں۔ حالاں کہ موجودہ قسم کے جلسے حقیقۃً بھیڑ کی وقتی یکجائی کے ہم معنی ہیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ بھیڑ کا ایک متحد قوم بننا جلسہ جلوس سے بالکل علاحدہ چیز ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان مثبت سطح پر یکساں سوچ آجائے۔ ان کے اندر مستحکم کردار پیدا ہو جائے۔ وہ اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے دوسروں کا ساتھ دینے پر راضی ہوں۔ ان کے اندر یہ مزاج پیدا ہو جائے کہ ذاتی مفادات سے اوپر اٹھ کر بلند تر انسانی مقاصد کے لیے جینے لگیں —— اتحاد وہ ہے جو روزانہ کی حقیقی زندگی میں دکھائی دے نہ کہ وقتی قسم کے جلسہ اور جلوس میں۔

کمزور بھی طاقتور

جارج بیدالٹ (۱۸۹۹–۱۹۸۳) ایک فرانسیسی سیاست داں ہے۔ اس کے خیالات سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ تاہم اس کا ایک قول بہت با معنی ہے۔ اس نے کہا کہ کمزور آدمی کے پاس ایک ہتھیار ہوتا ہے، اور وہ ان لوگوں کی غلطیاں ہیں جو یہ سمجھیں کہ وہ طاقتور ہیں:

The weak have one weapon, the errors of those who think they are strong.
—George Bidault

اس دنیا میں سب سے بڑی کمزوری اپنے آپ کو طاقت ور سمجھ لینا ہے۔ جو آدمی اپنے کو طاقت ور سمجھنے لگے وہ ضرور غلطیاں کرے گا۔ ایسے آدمی کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ طاقت کے گھمنڈ میں تدبیر سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ اور جو آدمی تدبیر کی طرف سے بے پروا ہو جائے اس کے لیے شکست یقینی ہے۔ کیوں کہ اس دنیا میں کوئی بھی شخص اتنا طاقت ور نہیں کہ اس کو تدبیر کی ضرورت باقی نہ ہو۔

جب بھی کوئی آدمی یہ محسوس کرے کہ اس کا حریف طاقت کے زعم میں آکر اس کو ستا رہا ہے تو آدمی کو سمجھ لینا چاہیے کہ اب خود اس کا حریف اس کو اپنے خلاف ہتھیار فراہم کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کو چاہیے کہ وہ حریف کی سرگرمیوں سے بخوبی واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

آدمی کو اس کا مطالعہ لازمی طور پر اس نتیجہ پر پہنچائے گا کہ حریف کے اندر فلاں کمزوری پیدا ہو گئی ہے اور وہ دھیرے دھیرے بڑھ رہی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اس کمزوری کو جانے اور اس کو بھرپور طور پر استعمال کرے۔ وہ یقینی طور پر حریف کو زیر کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

اس دنیا میں کمزور بھی طاقتور ہے، اور طاقتور بھی کمزور۔ خدا نے کسی بھی شخص کو یہ حیثیت نہیں دی کہ وہ مطلق طور پر کمزور ہو جائے یا وہ مطلق طور پر طاقتور بن جائے۔ اس دنیا میں ہر ایک کو یہ موقع حاصل ہے کہ وہ بظاہر ناموافق ماحول میں بھی کامیابی کے مواقع پالے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اس نے اپنی خدا داد عقل کو درست طور پر استعمال کیا ہو۔

دہرا کردار

ایک ہفت روزہ مسلم اخبار (۲۲-۱۶ مئی ۱۹۹۹) کا اڈیٹوریل چھپا ہے جس کا عنوان تھا: مسلم نفرت مہم (Hate-Muslim Campaign)

اس اڈیٹوریل میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے افراد کی ان تقریروں اور تحریروں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں مسلمانوں کے خلاف پروپگنڈا ہوتا ہے اور مسلمانوں کے اوپر دشنام طرازی کر کے ان کے خلاف نفرت اور عناد پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

یہ کسی ایک مضمون کی بات نہیں۔ مسلمانوں کے تمام اخبارات، تمام رسالے اور تمام کانفرنسوں میں ہر روز اسی قسم کی باتیں کہی جارہی ہیں۔ مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ مسلسل اسی کام میں مشغول ہے۔ اب اس کام پر تقریباً ۵۰ سال سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو ان تمام تقریری اور تحریری کوششوں کا کوئی بھی فائدہ نہیں ہوا۔ "مسلم دشمن عناصر" پہلے سے بھی زیادہ شدت اور وسعت کے ساتھ اپنے پروپگنڈے کی مہم جاری رکھنے میں کامیاب نظر آرہے ہیں۔

یہ مسلمانوں کے حق میں "حبط اعمال" کی ایک صورت ہے۔ یعنی کوشش کی سطح پر عمل کرنے کے باوجود ان کے اعمال کا بالکل بے نتیجہ ہو جانا۔

اس کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں جس کو قرآن میں تطفیف کہا گیا ہے۔ یعنی اپنے لیے ایک معیار، اور دوسرے کے لیے اس سے مختلف دوسرا معیار۔ ملک میں ایک "مسلم نفرت مہم" وہ ہے جو ہندوؤں کی طرف سے چلائی جارہی ہے۔ ایسی مہم کے خلاف لکھنے اور بولنے کے لیے تمام مسلمان مجاہد بنے ہوئے ہیں۔ دوسری "مسلم نفرت مہم" وہ ہے جو ایک مسلمان کی طرف سے دوسرے مسلمان کے خلاف چلائی جاتی ہے۔ یہ دوسری مہم یہاں بہت بڑے پیمانہ پر جاری ہے۔ مگر اس دوسری مہم کی مذمت کرنے والا ساری ملت اسلامیہ میں کوئی نہیں۔ حتی کہ جو لوگ مسلم نفرت مہم کے نام پر ہندوؤں کے خلاف جھنڈا اٹھاتے ہیں، وہ خود کسی نہ کسی مسلمان کو نشانہ بنا کر اس کے خلاف نفرت پھیلانے کی مہم جاری کیے ہوئے ہیں ــــــ اس قسم کا دہرا کردار ایک جرم ہے۔ اور جرم کردار کے مجرمانہ فعل پر خدا کے یہاں سزا کی وعید ہے نہ کہ نصرت اور انعام کا وعدہ۔

تعارف کا مسئلہ

ایک مقولہ ہے۔ جیسا سماجی تعارف ویسا سماجی معاملہ۔ یعنی آدمی اپنے ماحول میں جس طرح اپنے آپ کو متعارف کرے گا اسی کے مطابق ماحول میں اس سے معاملہ کیا جائے گا۔ یہ ایک ایسا عام اصول ہے جس میں شاید کوئی استثناء نہیں۔ ایک بار میں دہلی سے حیدرآباد جارہا تھا۔ دہلی ایرپورٹ پر جب میں سیکورٹی چیک کے لیے اندر داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ دوسرے مسافروں کے بیگ کھول کر دیکھے جارہے ہیں۔ میرے ساتھ ایک چھوٹا سا بیگ تھا جس میں صرف ایک جوڑا کپڑا تھا اور قرآن کا ایک نسخہ۔ چوں کہ میرے خیال کے مطابق میرے بیگ میں کوئی چیکنگ والی چیز نہیں تھی میری زبان سے نکلا۔ کیا اس کو کھولنا ہوگا۔ میز کے دوسری طرف پولیس کی وردی میں کھڑے ہوئے آدمی نے کسی قدر درشت لہجہ میں کہا کہ کیوں نہیں (Why not)

میں نے فوراً اپنا بیگ کھول دیا۔ آدمی نے میرے بیگ کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس میں اسے کوئی قابل اعتراض چیز نظر نہیں آئی۔ آخر میں اس نے اس میں رکھی ہوئی کتاب اٹھائی اور پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن۔ جیسے ہی میری زبان سے قرآن کا لفظ نکلا آدمی کا موڈ بالکل بدل گیا۔ جو آدمی پہلے سختی اور غیریت کے لہجہ میں بول رہا تھا وہ نرمی اور تواضع کے لہجہ میں بولنے لگا۔

یہ فرق کیوں پیش آیا۔ اس کی وجہ سادہ طور پر یہ تھی کہ پہلے میں مذکورہ شخص کی نظر میں صرف صاحب بیگ تھا، مگر بعد کو میں اس کی نظر میں صاحبِ قرآن بن گیا۔ جب تک میں اس کی نظر میں صاحب بیگ تھا، وہ مجھ کو عام مسافروں کی نظر سے دیکھ رہا تھا لیکن جب اس نے مجھ کو صاحب قرآن کے روپ میں دریافت کیا تو اس کی نظر میں میری نوعیت بدل گئی اب وہ مجھ کو ایک اور نظر سے دیکھنے لگا۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا ماحول آپ کے ساتھ اچھا معاملہ کرے تو ضروری ہے کہ آپ اس کے مطابق اپنی تصویر بنائیں۔ اپنے ماحول کے اندر آپ اپنے کو جس طرح متعارف کریں گے اسی کے مطابق ماحول بھی آپ کے ساتھ معاملہ کرے گا، نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔

فرق کو جاننا

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن خیر کی باتیں سننے سے کبھی سیر نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ جنت تک پہنچ جائے (ترمذی)

دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ حکمت کی بات مومن کا گمشدہ مال ہے۔ پس وہ جہاں اسے پائے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے (الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن فحیث وجدھا فھو احق بھا) جامع الاصول فی احادیث الرسول ۸/

یہاں حکمت کی بات سے مراد صرف وہ بات نہیں ہے جو قرآن اور حدیث میں ہو بلکہ ہر وہ صحیح بات ہے جو کسی جگہ پائی جائے۔ اس سے مراد دراصل دانش مندی (Wisdom) کی بات ہے۔ اور دانش مندی کی بات کسی بھی شخص کے ذریعہ مل سکتی ہے۔ حتی کہ ایک جاہل اور ظالم آدمی کے ذریعہ بھی۔ دانش مندی کی بات دراصل فطرت کی بات ہوتی ہے۔ اور اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے دانش مندی کی ہر بات اسلام کی اپنی ہی بات ہے۔ اور مومن کو اسے خود اپنی چیز سمجھ کر لے لینا چاہیے۔

اس کی وضاحت کے لیے یہاں ایک مثال نقل کی جاتی ہے۔ ایک عیسائی عالم نے خدا سے دعا کی تو اس نے اپنی دعا میں یہ الفاظ کہے۔ اے خدا مجھے وہ طاقت دے کہ میں جس چیز کو بدل سکتا ہوں اس کو بدلوں اور وہ تحمل دے کہ میں اس چیز کے ساتھ رہ سکوں جس کو میں بدل نہیں سکتا اور وہ دانش مندی کہ میں فرق کو جانوں :

Oh God give me the strength to change the things which I can, and the serenity to live with things I cannot change, and the wisdom to see the difference.

یہ بات اپنی حقیقت کے اعتبار سے کسی عیسائی یا غیر عیسائی کی بات نہیں ہے بلکہ وہ فطرت کی بات ہے۔ اور اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے دانش کی ہر بات خود اسلام کی بات ہے۔ مومن کو چاہیے کہ دانش کی ہر بات کو خود اپنی بات سمجھ کر قبول کر لے۔

فطری روش

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے مکہ میں ایک اختلافی واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کا ذکر مورخ کی کتابوں میں اس طرح آیا ہے :

وقعت فتنة من بطنين من قريش فجمع ابو سفيان كبارهم وقال هل لكم يا معشر قريش في الحق او ما هو افضل منه. فقال القوم وهل من شئ افضل من الحق فقال ابو سفيان نعم انه العفو فقام القوم وتصالحوا۔

قریش کے دو خاندانوں کے درمیان خون بہانے کا واقعہ ہوا۔ اس کے بعد ابو سفیان نے ان کے بڑوں کو جمع کیا۔ اور کہا۔ اے قریش کے لوگو، تم کو اپنا حق لینا ہے یا وہ جو اس سے بہتر ہے لوگوں نے کہا کیا حق وصول کرنے سے بھی بہتر کوئی چیز ہے۔ ابو سفیان نے کہا کہ ہاں وہ معاف کر دینا ہے۔ اس کے بعد لوگ اٹھے اور آپس میں صلح کر لی۔

عرب جاہلیت کا یہ واقعہ دراصل فطرت انسانی کا واقعہ ہے اس وقت عرب کے لوگ اپنی فطرت پر قائم تھے، وہ فطری انسانی اوصاف سے متصف تھے اور جب کوئی انسان یا کوئی گروہ اپنی ابتدائی فطرت پر قائم ہو تو اس کا وہی حال ہوتا ہے۔ جس کی ایک تصویر مذکورہ واقعے میں دکھائی دیتی ہے۔

کسی سماج میں قتل کی قسم کا کوئی بڑا واقعہ پیش آجائے تو فوراً لوگوں کے اندر انتقام کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں مگر زیادتی کا انتقام لینا کوئی اصلاحی کام نہیں۔ یہ ایک برائی کو دو برائی میں تبدیل کرنا ہے۔ اس لیے خیر کی بات یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو معاف کر دیں اور ٹوٹے ہوئے انسانی رشتے کو آپس میں جوڑ لیں۔

زیادتی کا انتقام لینا پوری آبادی کو منفی عمل کا کارخانہ بنا دیتا ہے اس کے برعکس جب عفو اور درگزر کا طریقہ اختیار کیا جائے تو بھڑکے ہوئے جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ منفی ماحول دوبارہ مثبت ماحول میں تبدیل ہو جاتا ہے زندگی کا قافلہ جو بظاہر ایک رکاوٹ سے دوچار ہو گیا تھا، وہ دوبارہ اپنے سفر پر رواں دواں ہو جاتا ہے۔

حکمت معاملہ

ایک تعلیم یافتہ مسلمان ایک سرکاری دفتر میں اچھی سروس پر تھے۔ ان کے افسر سے ان کا جھگڑا ہو گیا۔ وہ گھر لوٹے تو ان کے دماغ میں سخت ٹینشن تھا۔ ان کو ڈر تھا کہ افسر ان کی سروس بک خراب کر دے گا اور اس کے نتیجہ میں ان کا پروموشن رک جائے گا۔ ٹینشن کی وجہ سے ان کے سر میں اتنا سخت درد ہوا کہ وہ گھر آکر بستر پر لیٹ گئے اور اس کے بعد کوئی کام نہ کر سکے۔

ان سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ آپ نے جو کیا وہ درست نہ تھا۔ ان کو ایک حدیث سنائی۔ ایک قبیلہ کا سردار مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جاؤ اس کا استقبال کرو۔ اس موقع پر آپ نے ایک اصولی بات یہ فرمائی کہ: انزلوا الناس منازلہم۔ یعنی لوگوں کے ساتھ ان کے مرتبہ کے مطابق کرو (حیاۃ الصحابہ ۲/۲۰۹)

شریعت کے احکام سب کے سب فطرت پر مبنی ہیں۔ یہ خود فطرت کا تقاضا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کا لحاظ کریں۔ کوئی شخص جب دوسرے شخص سے معاملہ کرے تو وہ اس طرح کرے کہ دوسرا شخص اس کو اپنی تحقیر محسوس نہ کرے۔ ہر شخص یہ سمجھے کہ اس کو اس کے رتبہ کے مطابق مناسب عزت (due respect) دی جا رہی ہے [illegible] سماج میں باہمی محبت بڑھتی ہے اور [illegible]

یہ فطرت کا ایک اصول ہے [illegible] جاتا رہا ہے۔ اسی کو ایک انگریزی مثل میں [illegible]

[illegible]

یہ گویا معاملات کی حکمت [illegible] انتہائی ضروری ہے جس [illegible] نہیں بن سکتا۔

ناکامی نہیں

پیغمبرانہ فکر کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ وہ نہیں کو بھی ہے کی صورت میں دیکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے دنیا کو اس ڈھنگ پر بنایا ہے کہ یہاں کوئی چیز آخری طور پر مشکل نہیں بلکہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی بھی شامل ہے۔ زندگی کی یہ حقیقت قرآن میں ان لفظوں میں بتائی گئی ہے کہ پس بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے (الانشراح)

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ سفر میں کسے طائف جاتے ہوئے پیغمبر اسلام ایک ایسے پہاڑی راستے سے گزرے جو تنگ اور دشوار گزار تھا۔ آپ نے پوچھا کہ اس راستہ کا نام کیا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ الضیقہ (مشکل) آپ نے فرمایا نہیں بلکہ اس کا نام الیسریٰ (آسان) ہے۔

یہ واقعہ پیغمبرانہ طرز فکر کو بتاتا ہے۔ پیغمبر دنیا کی ہر چیز کو خدا کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو مشکل بھی آسانی کے روپ میں دکھائی دیتی ہے۔ کیوں کہ خدا نے اپنی دنیا کو اسی قانون کے تحت بنایا ہے کہ یہاں ہر مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہمیشہ موجود رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ کو اپنے وطن میں سخت ترین مشکل سے سابقہ پیش آیا۔ اس کے باوجود آپ نے دنیا کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ یہ ایک ایسا مسلّم واقعہ ہے جس سے انکار کرنا ممکن نہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ رسول کی زندگی میں تمہارے لیے اسوہ ہے (الاحزاب) یہ اسوہ یا نمونہ کسی محدود معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ زندگی کے ہر معاملے کے بارے میں ہے۔ آپ نے جس طرح نماز اور روزہ کا طریقہ بتایا اسی طرح آپ نے اپنے عمل سے یہ بھی بتایا کہ مسائل کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ اور مشکل کو آسان کس طرح بنایا جائے۔

پیغمبر اسلام نے اپنے عمل سے موجودہ دنیا کے بارہ میں اس امکان کی ممتاز ترین مثال قائم کی [illegible] حالات میں اعلیٰ ترین کامیابی حاصل کی۔ حتی کہ آپ نے اپنے دشمنوں کو اپنا ساتھی [illegible]

فطری طریقہ

جب بھی کوئی تعمیری کام کا ایسا منصوبہ سامنے لایا جائے جس کا عملی نتیجہ بظاہر دیر میں
نکلنے والا ہو تو لوگ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ اس میں تو بہت وقت لگے گا، اور ہم بھی بے نتیجہ کام کا موقع
نہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک الٹا تصور ہے۔

گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو دیرطلب منصوبوں سے گریز کر کے مختصر تدبیروں کی طرف دوڑنا منزل پر
پہنچنے کی مدت کو اور لمبا کرنا ہے۔ دیرطلب منصوبہ تو بہرحال ایک دن مکمل ہو جاتا ہے مگر مختصر
راستوں پر دوڑنا صرف وقت ضائع کرنا ہے۔ کیوں کہ ایسے راستے کبھی اپنے مسافر کو منزل تک نہیں
پہنچاتے۔

جو شخص درخت کی بڑی بڑی شاخوں کو گاڑ کر اچانک اپنے سامنے ایک ہرا بھرا باغ دیکھنا
چاہتا ہو، اس کو پودے لگا کر باغبانی کا طریقہ بتائیے تو اس کی سمجھ میں اس قسم کی تجویز کبھی نہیں
آئے گی۔ وہ کہے گا کہ یہ تو بہت لمبا منصوبہ ہے۔ حالاں کہ اگر مستقبل کے لحاظ سے دیکھئے تو خود اس کا
منصوبہ غیر متناہی طور پر لمبا ہے۔ کیوں کہ شاخیں گاڑنے والے کو تو ہزار سال میں بھی باغ دیکھنا نصیب
نہیں ہو سکتا۔ جب کہ پودے لگانے والے کے لیے بہرحال ایک ایسا وقت آتا ہے جب کہ وہ ہرے
بھرے باغ کا مالک بن جائے، خواہ یہ وقت ۲۵ برس بعد آئے یا پچاس برس بعد۔

جس طرح باغبانی میں کوئی شارٹ کٹ نہیں، اسی طرح زندگی کی تعمیر میں بھی کوئی
شارٹ کٹ نہیں۔ یہ کام بہرحال طویل المدت منصوبہ ہی کے ذریعہ ہوگا، خواہ ہم اس کو آج شروع
کریں، یا آج کے بہت دنوں بعد اس وقت شروع کریں جب کہ کام کا پہلا قیمتی موقع ہمارے
ہاتھ سے نکل گیا ہو۔

فطرت کا یہ طریقہ کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ وہ خود خدا کا بنایا ہوا ہے۔ جس
خدا نے دنیا کو بنایا ہے اسی نے اس کے لیے یہ قانون بھی وضع کیا ہے۔ انسان جس
طرح اپنے رہنے کے لیے کوئی اور دنیا پیدا نہیں کر سکتا، اسی طرح اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ
اپنے لیے کوئی اور قانون وضع کر سکے۔

دوسرا چانس

پٹنہ میں ایک ڈگری کالج ہے جس کو ایک ہندو سنستھا چلاتی ہے۔ اس میں لکچرشپ کی ایک جگہ نکلی۔ جن لوگوں نے درخواست دی ان میں سے ایک مسلمان بھی تھے۔ انٹرویو ہوا تو ایک ہندو امیدوار کو چن لیا گیا۔ مسلم امیدوار ناکام کر دیے گئے۔

مذکورہ مسلمان سے میری ملاقات ہوئی تو وہ بہت جھنجلائے ہوئے تھے۔ انھوں نے اس کو تعصب کا معاملہ سمجھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس کے خلاف اخبار میں لکھیں اور مذکورہ کالج کے تعصب کو اکسپوز کریں۔ میں نے انھیں منع کیا۔ میں نے کہا کہ ابھی تو آپ نے صرف ایک چانس کو کھویا ہے۔ زندگی میں ہمیشہ ایک چانس کے بعد دوسرا چانس ہوتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ پہلے چانس کے کھوئے جانے پر بد دل نہ ہو بلکہ دوسرے چانس کا انتظار کرے۔

ایک سال کے بعد پھر اسی کالج میں ایک لکچرر کی جگہ نکلی۔ اس کا اعلان اخبار میں چھپا تو مذکورہ مسلمان نے دوبارہ اس کے لیے اپنی درخواست بھیج دی۔ اس بار ایسا ہوا کہ لکچرشپ کی اس جگہ کے لیے مذکورہ مسلمان کے علاوہ دو ہندو امیدوار بھی تھے۔ دونوں کو دو طاقتور ہندوؤں کا سپورٹ حاصل تھا۔ یہ ایک نازک مسئلہ تھا۔ کالج کے ذمہ دار دونوں ہندوؤں کو نہیں لے سکتے تھے اور ان میں سے ایک کو لینے کا مطلب یہ تھا کہ دوسرے ہندو امیدوار کا سپورٹر ناراض ہو جائے۔ اس نزاکت کا حل انھوں نے یہ تلاش کیا کہ دونوں ہندوؤں کو چھوڑ کر مذکورہ مسلمان کو منتخب کر لیا۔ یہ مسلمان ابھی تک اسی کالج میں کام کر رہے ہیں اور اب انھوں نے دلی میں اپنا ذاتی گھر بنا لیا ہے۔

یہی زندگی میں کامیابی کا راز ہے۔ اگر آپ سے پہلا چانس کھو جائے تو آپ ہرگز بد دل نہ ہوں۔ بلکہ سادہ طور پر صرف یہ کریں کہ دوسرے چانس کا انتظار کریں۔ اگر آپ ایسا کر سکیں تو یقینی طور پر دوسرا چانس آپ کے لیے آئے گا اور جو کامیابی آپ کو پہلی کوشش میں نہیں ملی تھی وہ بلاشبہ دوسری کوشش میں آپ کو مل جائے گی۔ دنیا مواقع سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں ہر ایک موقع کے بعد دوسرا موقع آتا ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے ایک شام کے بعد روشن صبح۔

رمضان کا روزہ

۵ جنوری ۱۹۹۰ کو دہلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب میں روزہ پر ایک اجتماع تھا، اس میں جناب سید حامد صاحب نے کہا کہ ایک بار دہلی میں ایک جلسہ تھا جس میں مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی بھی موجود تھے۔ اس موقع پر ایک تقریر ڈاکٹر تارا چند کی بھی تھی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ سال کا پورا ایک مہینہ روزہ میں بتانے کا جو طریقہ مسلمانوں میں ہے اس کے بارہ میں مسلمانوں کو نظر ثانی کرنا چاہیے۔ یہ اپنی کارکردگی کو گھٹا لینے کے ہم معنی ہے۔ یہ طریقہ مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں ایک مستقل رکاوٹ ہے۔

میں نے اپنی تقریر میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ ایک غیر معقول اعتراض ہے۔ علمی حیثیت سے اس کے اندر کوئی وزن نہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہ روزہ کوئی فاقہ کشی (starvation) نہیں ہے۔ روزہ دار ایک مہینہ کے دوران صرف یہ کرتا ہے کہ وہ دن میں نہ کھا کر رات کو کھاتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بعض فرقے ایسے ہیں جو ۲۴ گھنٹے میں صرف ایک بار کھاتے ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے ہر قسم کی ترقیاں حاصل کی ہیں۔ پھر ایک مہینہ کے لیے دن کے بجائے رات کو کھانا کیسے ترقی میں رکاوٹ بن جائے گا۔

روزہ دراصل اپنی غذائی عادتوں (food habits) پر کنٹرول کرنے کا نام ہے۔ اس کو ایک لفظ میں غذائی تنظیم (regulated eating) کہہ سکتے ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ یہ جسمانی صحت کے لیے بہترین طریقہ ہے۔ منظم انداز میں خوراک لینے والے ہمیشہ صحت مند رہتے ہیں اور زیادہ کام کرتے ہیں۔ اس کے برعکس غیر منظم خوراک لینے والے لوگ اپنی صحت کو خراب کر لیتے ہیں اور نتیجۃً اپنی کارکردگی کی مقدار کو بھی گھٹا لیتے ہیں۔

ماہ رمضان کے روزہ کا مطلب شاید مذکورہ قسم کے لوگ یہ لے لیتے ہیں کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایک مہینہ تک مسلسل کھانا اور پینا چھوڑ کر فاقہ کی زندگی گزاریں۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ اسلامی حکم کا مطلب صرف یہ ہے کہ عام حالت میں اگر لوگ دن کو کھاتے ہیں اور رات کو نہیں کھاتے

تو رمضان میں وہ ایک مہینہ کے لیے وہ اس ترتیب کو بدل دیں۔ یعنی دن میں نہ کھا کر رات کے اوقات میں کھائیں۔ روزہ کی صورت میں اس قسم کی تبدیلی جسمانی اعتبار سے بھی مفید ہے اور روحانی اعتبار سے بھی۔

ماہ رمضان کے روزہ کے بارہ میں یہ اصولی اور نظریاتی بات تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اصولی اور نظریاتی اعتبار سے ماہ رمضان کے روزہ کے بارہ میں مذکورہ قسم کا اعتراض بالکل بے بنیاد ہے۔ اس کے حق میں کوئی واقعی دلیل موجود نہیں۔

مگر یہ صرف اصول اور نظریے کی بات نہیں۔ عملی واقعات بھی اس کو بالکل بے بنیاد ثابت کر رہے ہیں۔ عملی واقعات سے میری مراد (روزہ داروں) کی تاریخ ہے مسلمان پچھلے چودہ سو سال سے سال میں ایک مہینہ روزہ رکھتے چلے آرہے ہیں۔ مگر تاریخی واقعات بتاتے ہیں کہ اس روزہ نے کسی بھی درجہ میں ان کو کمزور نہیں کیا۔

اسلام کے دور اول میں اصحاب رسول کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی۔ یہ سب کے سب روزہ دار تھے، مگر انھوں نے تاریخ کا اہم ترین انقلاب برپا کیا۔ یہ اصحاب رسول روزہ دار قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں عرب قبائل، رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر سب کے سب غیر روزہ دار لوگ تھے۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان ٹکراؤ پیش آیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ غیر روزہ داروں کے اوپر روزہ دار قوم نے کھلی فتح حاصل کی۔

اس کے بعد روزہ دار مسلمانوں نے بڑے بڑے معرکے سر کیے، اور وقت کی سب سے بڑی سلطنت قائم کی۔ ایک شاعر نے بجا طور پر کہا ہے کہ:

نہ تھا پلہ کسی ملت کا دنیا میں گراں ہم سے

پھر یہی روزہ دار لوگ تھے جنھوں نے بغداد میں اس وقت کا سب سے بڑا علمی مرکز قائم کیا۔ انھوں نے اسپین میں وہ علمی ترقیاں کیں جو بعد کو یورپ کے سائنسی انقلاب کی بنیاد بنی۔

حقیقت یہ ہے کہ روزہ آدمی کو کمزور نہیں کرتا۔ روزہ آدمی کو ذہنی اور جسمانی دونوں اعتبار سے طاقت ور بناتا ہے۔ نظریاتی مطالعہ بھی اس کی تصدیق کر رہا ہے اور تاریخ کا عملی مطالعہ بھی۔

مہاراشٹر کا سفر

اکتوبر ۱۹۹۳ میں مہاراشٹر کا سفر ہوا۔ بھارتیہ ودیا بھون کی دعوت پر پہلے بمبئی میں ان کے پروگرام میں شرکت کی۔ اس کے بعد وہاں سے پونہ گیا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۹۳ کی شام کو دہلی سے روانگی ہوئی۔ ۶ اکتوبر کی شام کو دوبارہ دہلی واپس آیا۔ اس سفر کی مختصر روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

دہلی سے بمبئی کے لیے جہاز کا وقت ساڑھے پانچ بجے شام تھا۔ ایر پورٹ پر انتظار گاہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ عملہ کے ایک باوردی آدمی نے نرمی کے ساتھ سوالیہ انداز میں کہا: حیدرآباد۔ میں نے کہا کہ نہیں، بمبئی۔ یہ ایر پورٹ پر ایک نیا تجربہ تھا۔ جب تک انڈین ایر لائنز کی اجارہ داری تھی، اس کے عملہ کے لوگ خوش اخلاقی کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ان کی کمپنی کے جہاز کے سوا کسی اور جہاز کا انتخاب مسافر کے لیے نہیں ہے۔ اب جب کہ میدان میں بہت سی پرائیویٹ کمپنیاں آگئی ہیں۔ تو کسی "خوش اخلاقی ہفتہ" کے بغیر ایر پورٹ پر خوش اخلاقی آگئی ہے۔

زندگی کا فطری نظام مسابقت پر قائم ہے۔ آزادی کے بعد سوشلزم نے اس فطری ماحول کو یہاں ختم کر رکھا تھا۔ اب ۴۵ سال کھو کر ہمارے لیڈروں کو عقل آگئی ہے اور وہ قوم کی گاڑی کو صحیح رخ پر چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگرچہ ۴۵ سال میں بگاڑ اتنا زیادہ بڑھ چکا ہے کہ بظاہر اس صدی کے خاتمہ تک کسی حقیقی اصلاح کی امید نہیں۔

ایر پورٹ پر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے یا چلتے ہوئے نظر آئے۔ کوئی اچھی تندرستی کا مثال تھا۔ کوئی خوش پوشی کا نمونہ تھا۔ کوئی دولت مندی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ کسی کے اردگرد اعلیٰ کے اسباب نظر آتے تھے۔ میں دل فگاری کے جذبات کے ساتھ لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک آہ کے ساتھ میری زبان سے نکلا: لوگ نعمتوں سے سرشار ہیں مگر کوئی نہیں جس کے چہرہ پر منعم کے شکر کی جھلک دکھائی دیتی ہو۔

دہلی سے بمبئی کے لیے انڈین ایر لائنز کی فلائٹ ۴۰۵ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز اپنے مقررہ وقت پر روانہ ہوا۔ راستہ میں انڈین ایر لائنز کا فلائٹ میگزین سوآگت (دسمبر ۱۹۹۲)

[illegible]
[illegible] دیا گیا تھا کہ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ سرمایہ اور مشین کے علاوہ کسی بھی آرگنائزیشن کی کامیابی
اس کے افرادی وسائل کی کوالٹی پر بھی منحصر ہے :

It is an accepted fact that, besides money materials and machines, the success of any organisation also depends upon the quality of its human resources. (p. 63)

مگر میں کہوں گا کہ یہ "بھی" کا معاملہ نہیں ہے بلکہ "ہی" کا معاملہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ بزنس ہو یا اور کوئی کام، ہر میدان میں کامیابی کے لیے اصل اہم عنصر لائق انسان ہے۔ لائق انسان کی اہمیت حقیقی ہے اور بقیہ چیزوں کی اہمیت اضافی۔

جہاز کے اندر مطالعہ کے لیے کئی اخبارات موجود تھے۔ دی آبزرور (۳۰ ستمبر) کے صفحہ اول پر ایک رپورٹ ہندستانی ریاستوں کے بارہ میں تھی۔ اس سلسلہ میں بتایا گیا تھا کہ ۱۸۳۹ء میں جب کہ برٹش کمپنی آف انڈیا کا دور تھا۔ ایک انگریز مسٹر بیرن (P. Barron) نے پہلی بار نینی تال کی جھیل کو دریافت کیا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ ایک یوروپین کالونی کے لیے بہترین جگہ ہے۔ مسٹر بیرن خوشی سے جھیل کے اندر داخل ہوگیا۔ اس کا سفید فام جسم جب مقامی لوگوں نے پانی کے اندر سے نکلتے ہوئے دیکھا تو لوگوں نے سمجھا کہ یہ وشنو بھگوان ہیں جو پانی کے اندر سے پرکٹ ہوگئے ہیں۔ مگر اس کے رپورٹر مسٹر کماریش چکرورتی کے الفاظ میں، اترکھنڈ کے لوگوں کے لیے آج جس وشنو بھگوان کی ضرورت ہے وہ صنعتی سرمایہ کاری ہے :

The Vishnoo which the people of Uttarakhand require in the 1990s is large-scale industrial investment.

گویا کہنے والا یہ کہہ رہا ہے کہ وشنو دور قدیم کا دیوتا تھا۔ اب دور جدید میں ہم کو مشینی دیوتا کی ضرورت ہے

شام کو آٹھ بجے سے کچھ پہلے جہاز بمبئی میں اتر گیا۔ باہر آیا تو ایرپورٹ پر ایک طرف بھارتیہ دودیا بھون کے نمائندے موجود تھے۔ دوسری طرف بمبئی کے ساتھی بھی آئے ہوئے تھے۔

اب سوال یہ تھا کہ میں کس کے ہمراہ جاؤں اور کہاں قیام کروں۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو ترجیح دی۔ یہی میرا عام اصول ہے۔ مثلاً ۱-۲ اکتوبر کے لیے میرے پاس تین دعوت نامے آئے

[illegible] ایک [illegible] حکومت کی آل انڈیا [illegible]
[illegible] آل انڈیا [illegible] جو [illegible]
ہے۔ تیسرا [illegible] کا پروگرام ساتھ چلا [illegible]
[illegible] کے [illegible] نے [illegible] کرلیا۔ اور اس کا [illegible]
اس [illegible] بھی اور یونس کے احباب سے ملاقات کی صورت پیدا ہو رہی تھی۔

ائیرپورٹ سے روانہ ہو کر پہلے ہمارا قافلہ جناب اقبال احمد صاحب (بانی [illegible]) کے مکان پر پہنچا۔ یہاں کچھ دیر عام مسائل پر گفتگو ہوئی۔

اس کے بعد جناب ہارون شیخ، جناب فاروق [illegible]، جناب ایم اے صدیقی، وغیرہ کے ساتھ روانہ ہو کر جسٹس ایم ایم قاضی کی رہائش گاہ پر پہنچا جہاں مجھ کو قیام کرنا تھا۔ جسٹس قاضی سے تقریباً ۱۲ بجے تک گفتگو ہوتی رہی۔ انھوں نے بتایا کہ کل انھیں ایک اجتماع میں تقریر کرنا ہے یہ [illegible] سوسائٹی کے تحت جج ہاؤس میں ہو رہا ہے۔ اس کا موضوع یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اثرات عرب پر اور سارے عالم پر:

Prophet Muhammad—His influence on the Arab society and on the whole universe.

جسٹس قاضی اپنی قانونی اور عدالتی مصروفیت کے باوجود اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کثرت سے کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے ایک تبصرہ میں کہا: میں نے اکثر مسلم رائٹرس کو پڑھا ہے مگر آپ کے یہاں ریلونٹ اور اررلیونٹ کا جو کورنٹ سنس پایا جاتا ہے وہ کسی اور کے یہاں مجھ کو نہیں ملا۔

جسٹس ایم ایم قاضی ایک ماہر قانون ہیں۔ اس لیے وہ ریلونٹ اور اررلیونٹ کا فرق بخوبی طور پر جانتے ہیں۔ عام مسلم اہل قلم کا حال تو یہ ہے کہ انھوں نے خطابت اور انشا پردازی کی روایات میں پرورش پائی ہے۔ شعر و ادب کے ماحول میں ان کی فکری تشکیل ہوئی ہے۔ اس لیے وہ دونوں کا فرق جانتے بھی نہیں۔ چنانچہ اس فرق کو نبھاتے ہوئے وہ کوئی جاندار تحریر تیار کر سکیں۔

جسٹس ایم ایم قاضی مہاراشٹر ایڈمنسٹریٹو ٹریبونل کے چیرمین ہیں۔ ان کے موجودہ وائس چیرمین مسٹر رام مورتی ہیں جو مہاراشٹر حکومت کے سابق چیف سکریٹری رہے ہیں۔ مسٹر رام مورتی

چنانچہ [illegible] جوش ملیح آبادی کے آخری دنوں میں انھیں ایک نظم ان کے سامنے پیش کرنے کے بعد وہ جوش صاحب سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے ان کے بارے میں کہا کہ میرا تعلیمی عمل اب شروع ہوا ہے :

My process of learning has commenced now.

[illegible] صاحب کو اشعار کثرت سے یاد ہیں۔ ہر بات کے لیے فوری طور پر ایک موزوں شعر ان کے ذہن میں آجاتا ہے۔ ایک گفتگو کے دوران انھوں نے جوش کا یہ شعر پڑھا :

دشمن کی سمت ایک ذرا مسکرا کے دیکھ — اس حربۂ لطیف کو بھی آزما کے دیکھ

یہ سفر ایسے حالات میں ہوا جب کہ پلیگ کی وبا پھیلنے کی خبریں پورے ملک میں گونج رہی تھیں۔ لیکن ہر جگہ میں نے دیکھا کہ لوگ صرف حکومت اور انتظامیہ کو برا کہہ رہے ہیں۔ آج کے ٹائمس آف انڈیا (۳۰ ستمبر) میں بتایا گیا تھا کہ دہلی کا شہر ہر روز چھ ہزار ٹن گاربیج (کوڑا) پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح بمبئی میں ہر روز پانچ ہزار ٹن گاربیج پیدا ہوتا ہے۔ رپورٹ میں مزید بتایا گیا تھا کہ شہری انتظامیہ (civic agencies) اگرچہ اپنی آمدنی کا ۳۵ فی صد حصہ صرف صفائی پر خرچ کرتی ہیں مگر عملاً صرف ۵۰ فی صد کوڑا اٹھایا جاتا ہے۔ باقی یوں ہی آبادیوں میں پڑا رہ جاتا ہے۔

کامرس منسٹر مسٹر پرتاب کرجی نے بتایا کہ پلیگ کی وجہ سے اکتوبر ۱۹۹۴ کے مہینہ میں انڈیا کو ایکسپورٹ کی مد میں جو نقصان ہوا، اس کی مقدار ۴۰۰ ملین ڈالر ہے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ بمبئی میں پانچ کروڑ چوہے ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے، پلیگ چوہوں کے ذریعہ پھیلتا ہے۔ کیوں کہ اس کے جراثیم ہمیشہ چوہوں کے جسم میں پرورش پاتے ہیں۔ حکومت ایک کمپنی کے ذریعہ پچاس ٹن سائنوگیس (cyno-gas) درآمد کررہی ہے تاکہ ان چوہوں کو مارا جاسکے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق، اس وقت بمبئی میں چوہے مارنے کی مہم چلائی جارہی ہے۔ مگر عوام کی غیر سرگرم شرکت کی بنا پر روزانہ صرف ایک ہزار چوہے مارے جارہے ہیں۔ کیونکہ برادرانِ وطن کے عقیدہ کے مطابق، چوہا گنیش دیوتا کی سواری ہے اور اس بنا پر وہ ایک قابل احترام جانور سمجھا جاتا ہے۔

ہندی روزنامہ آنند (۴ اکتوبر) کے پہلے صفحہ کی خبروں میں سے ایک خبر کی سرخی یہ تھی : سورت میں پلیگ کی وجہ سے ہر روز ۵۰ کروڑ روپیہ کا نقصان۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ ۲۲ ستمبر ۱۹۹۴ سے یہ پلیگ

شروع ہوا۔ اس کے نتیجہ میں [illegible] انتظام [illegible] ہو گیا [illegible]
پہنچ سکے۔ اس وقت [illegible] ہزار کروڑ روپے [illegible]

[illegible] نے سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا اگر صرف ایک دن کی رقم [illegible] روپیہ باہر [illegible]
تو [illegible] ہزار کروڑ روپیہ کے نقصان سے بچ جاتا۔ مگر انسانوں میں بہت کم ایسے ہیں جو ایسی
ہوشیاری کا ثبوت دے سکیں۔

بمبئی کے روزنامہ انقلاب (یکم اکتوبر) میں ایک خبر اس عنوان کے تحت تھی "جلوس دفع طاعون"۔
اس عنوان کے تحت بتایا گیا تھا کہ آج گیارہ بجے شب بھیونڈی میں جامع مسجد کو ثر گیٹ سے اذان اور
دعا اور تسبیح اور تہلیل کے ورد کے ساتھ جلوس نکالا جائے گا۔ یہ جلوس بھیونڈی کے مختلف راستوں
سے ہوتا ہوا حافظ جی بابا کی درگاہ پر ختم ہوگا۔ علماء کرام اس جلوس میں شریک رہیں گے۔

اسلام میں دفع طاعون کے لیے جلوس نہیں ہے بلکہ دعا ہے۔ جلوس کی سیاست کی یہ آخری
حد ہے کہ دعا کی چیز کو بھی جلوس کی چیز بنا دیا جائے۔

انگریزی روزنامہ دی ایشین ایج (یکم اکتوبر) میں ایک روسی اکسپرٹ مسٹر اسٹیفن سسٹانووچ
(Stephen Sestanovich) کا تجزیہ چھپا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ اور روس جو ۱۹۱۷ء کے
بعد سے ٹکراؤ کے راستہ پر چل رہے تھے، اس کو بے فائدہ پا کر اب مفاہمت کا راستہ اختیار
کر رہے ہیں۔ اس کا عنوان تھا ——— امریکہ اور روس اس پر اتفاق کر رہے ہیں کہ ان کے درمیان
اختلاف ہے :

America and Russia agree to disagree

موجودہ زمانہ میں جنگ اتنی بے فائدہ ہو چکی ہے کہ "سپر پاور" قومیں بھی آپس میں مصالحت کر رہی
ہیں۔ مگر اسی دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس کوئی پاور نہیں۔ اس کے باوجود وہ ساری دنیا
کے خلاف جنگ چھیڑنے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔

یکم اکتوبر کی شام کو جناب ہارون شیخ صاحب اپنے ایک دوست سے ملانے کے لیے لے گئے۔
ان کا نام بھی ہارون شیخ ہے۔ وہ امپورٹ اکسپورٹ کا بزنس کرتے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ
وہ ایک بڑا کاروبار کر رہے ہیں۔ مگر وہ بینک سے سودی قرض نہیں لیتے [illegible]

کیا کاروبار بلاسود بینک سے قرض لیے بغیر کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یقینی طور پر کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ خیر فروختگی کی بنیاد پر اپنا کاروبار قائم کریں۔ لوگوں کے پاس روپیہ ہے اور وہ اس کو کاروبار میں لگانا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سود کی بنیاد پر شرکت سے زیادہ نفع کی بنیاد پر شرکت کرنا ہے۔ اگر آپ لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کردیں تو آپ بڑی سے بڑی رقم ان سے حاصل کر سکتے ہیں۔

ہارون صاحب کے مکان سے متصل اسی بلڈنگ میں جناب اقبال مسعود صاحب کا مکان تھا۔ یہاں آج "میڈیا واچ" کا ہفتہ وار اجتماع تھا۔ میں نے اس میں بھی شرکت کی۔ ہندستان کے مسلم مسائل پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مسائل بھی زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ بے مسئلہ زندگی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ آپ کو ہر ملک میں اور ہر سماج میں مسائل ہی کے ساتھ جینا ہے۔ کرنے کا کام یہ نہیں ہے کہ آپ مسائل کے خلاف شور و غل کریں۔ اصل کام یہ ہے کہ مسائل کے معاملہ میں اپنی تدبیر کا تعین کیا جائے۔

اقبال مسعود صاحب آئی اے ایس سے ریٹائر ہونے کے بعد اب جرنلزم کے میدان میں کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے ۳۰ سالہ عوامی تجربہ کی روشنی میں کہا کہ ہندوؤں کو خوش کرنا دنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ آسان ہے :

The easiest people to please in the world are Hindus.

دوسری بات انھوں نے یہ کہی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک مستقل کلچرل فرق یہ ہے کہ مسلمان جب ایک رائے قائم کرلے تو اس کو بدلنا سخت مشکل ہے، جب کہ ہندو زیادہ آسانی سے اپنی رائے بدل لیتا ہے :

A permanent cultural difference between Hindus and Muslims is that once a Muslim forms an opinion, it is difficult to change it, whereas a Hindu is more willing to change his opinion about a person.

یہ بے حد اہم بات ہے۔ مگر اس کو صحیح طور پر سمجھنا صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ ہندوؤں سے رقابت کا تعلق ختم کردیا جائے اور اس کے بجائے ان کے ساتھ حقیقی معنوں میں برادرانہ تعلق قائم کیا جائے

[illegible] ممبئی کے [illegible] ماہنامہ [illegible] اپریل ۱۹۹۵ [illegible] [illegible]

[illegible] ملاقات [illegible] (۲۰) کچھ حصہ یہ ہے :

جب میں پہلی بار [illegible] کے [illegible] ہندستانی مسلمانوں کے متعلق [illegible] کرتے وقت کہا تھا کہ ہندستانی مسلمان اپنی [illegible] ہے۔ ابھی باقی لوگ اس کی لیڈری تسلیم نہیں کرتے۔ ان مسلمانوں کی حالت مرتبان میں بند کیکڑوں کی طرح ہے۔ اگر ایک کیکڑا کسی دن جدوجہد کرکے مرتبان سے باہر نکلنے لگتا ہے تو دوسرے کیکڑے اس کو پکڑ کر نیچے گھسیٹ لیتے ہیں --- کچھ دنوں پہلے ممبئی کے ایک اخبار کے دفتر میں اتفاقیہ طور پر میری ملاقات چند سربرآوردہ مسلمانوں سے ہو گئی۔ باتوں باتوں میں ہم نے یہ کہہ دیا کہ ہمارے خیال میں مسلمانوں کو کچھ عرصہ کے لیے سیاست میں پچھلی صف (بیک بنچ) اختیار کر لینی چاہیے۔ ایک مسلمان عالم یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔ انھوں نے ہم پر احساس کمتری اور احساس خوف پھیلانے کا الزام لگایا (صفحہ ۲۴)

یکم اکتوبر کی شام کو بھارتیہ ودیا بھون کے ہال میں اجتماع تھا۔ وسیع ہال پورا بھرا ہوا تھا۔ یہ اجتماع مہاتما گاندھی کے ۱۲۵ ویں جنم دن پر کیا گیا تھا، پہلے ایک ڈرامہ کیا گیا۔ اس میں ایک انگریز جج نے مہاتما گاندھی کے خلاف ایک مقدمہ کی سماعت کی۔ اس کے بعد اس نے ان کے لیے چھ سال کی قید کا حکم سنایا۔ مہاتما گاندھی نے اعلان کیا کہ میں اس فیصلہ کو قبول کرتا ہوں۔ اس کے بعد ہر طرف گاندھی جی کی جے، گاندھی جی کی جے کے نعرے بلند ہونے لگے۔ ۱۹۲۲ میں احمد آباد میں گاندھی جی کے خلاف برٹش عدالت میں حکومت سے بغاوت (sedition) کا یہ مقدمہ چلایا گیا تھا۔ اس کی سماعت ایک انگریز جج برومفیلڈ (R.S. Broomfield) نے کی تھی۔ اس ڈرامہ میں اسی تاریخی واقعہ کو دہرایا گیا۔

برٹش جج اپنا فیصلہ سنا چکا تو مہاتما گاندھی نے کہا —— ہم کو جیلوں میں اس طرح داخل ہونا چاہیے جس طرح کوئی دولہا اپنی دلہن کے کمرہ میں داخل ہوتا ہے :

[illegible] them as a bridegroom enters the [illegible] (p 204)

برٹش حکومت نے مہاتما گاندھی کو مجرم قرار دے کر انھیں جیل میں بند کرنے کا فیصلہ کر رہا تھا مگر تاریخ میں کسی بھی گاندھی کا نام ہیرو کی حیثیت سے اپنے صفحات میں درج کر رہی تھی۔

اس موقع پر مختلف لوگوں نے تقریریں کیں ——— سی ہیرا ایم، آر وینکٹا رمن، وائس اسے پرکاش، ڈاکٹر وسنت پیا ٹاٹر، راج موہن گاندھی، سوامی تمیا نندا جی، سائن کاردینال جیٹے، میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ مہاتما گاندھی کے مشن کے دو فیز تھے۔ پہلا فیز تھا پولیٹکل فریڈم کا حصول۔ یہ ۱۹۴۷ میں پورا ہو گیا۔ دوسرا فیز وہ تھا جس کو سوشل فریڈم کہا جا سکتا ہے۔ اس کا پورا ہونا باقی ہے۔ اس دوسرے فیز کو پورا کرنے کے لیے بھی اسی عزم کی ضرورت ہے جو پہلے کام میں مہاتما گاندھی نے دکھایا تھا۔

میں نے تقریر میں ایک کتاب کا حوالہ دیا۔ یہ ایک برٹش جرنلسٹ ولیم شیرر کی کتاب ہے جس کا نام ہے ——— تھرڈ ریش کا عروج و زوال :

William Shirer, The Rise and Fall of the Third Reich

مصنف نے ۱۹۴۷ سے پہلے کے زمانہ میں مہاتما گاندھی سے ملاقات کی تھی۔ مہاتما گاندھی نے ان کے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ میرے دوست، یاد رکھو کہ میں اپنی موت سے پہلے انڈیا کو آزاد دیکھ لوں گا :

I shall see India free before I die.

میں نے کہا کہ مہاتما گاندھی نے ایک عزم کیا تو وہ عزم تاریخ نے پورا کر دیا۔ آج ضرورت ہے کہ ہم لوگ دوبارہ ایک نیا عزم کریں۔ یہ اس بات کا عزم ہے جس کی آج ہمارے ملک کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ یہ امن کا قیام ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کو دوبارہ یہ کہنا چاہیے کہ میرے بھائی، یاد رکھو کہ میں اپنی موت سے پہلے انڈیا کو ایک پر امن ملک دیکھ لوں گا :

I shall see India a land of peace before I die.

ہم میں سے ہر شخص اگر اس کو اپنا ماٹو بنا لے تو ضرور انڈیا ہماری زندگی ہی میں ایک ایسا ملک بن جائے گا جہاں ہر طرف امن اور ترقی کے مناظر دکھائی دینے لگیں۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں ہے بلکہ وہ ایک سخت ذمہ داری کی بات ہے۔ انڈیا کو آزاد دیکھنے

[illegible] لوگوں [illegible] کی مشترکہ حالت کمزور پڑی ہے۔ [illegible]
[illegible] اس کے لیے ہمارے ہمیں لمبی مدت تک محنت کرنی پڑے گی [illegible]
حاصل ہوا [illegible] کے بغیر دوسرا مقصد حاصل ہو سکتا ہے کسی ملک میں پرامن [illegible]
[illegible] سماج کے افراد ڈسپلن کے تحت زندگی گزارنے پر راضی ہو جائیں [illegible]
ساتھ [illegible] معاملہ کرنا، اپنے حقوق سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں پر نظر رکھنا، دوسروں کی [illegible]
دوسروں کی ناپسندیدہ باتوں کو نظر انداز کرنا، یہی وہ چیزیں ہیں جن کے مجموعہ کا نام ڈسپلن ہے۔ [illegible]
طرح ڈسپلن کے ساتھ زندگی گزارنے لگیں تو اس کے بعد اس کا جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے اسی کا نام پرامن [illegible]

اس مقصد کے لیے ہمیں یہ کرنا ہے کہ لوگوں کو ایجوکیٹ کریں۔ باشعور افراد ہی [illegible]
کی اہمیت کو جانتے ہیں۔ لوگوں کو باشعور بنانے کا یہ کام ہر سطح پر ہونا چاہیے۔ [illegible]
اسکول اور کالج میں، اخبار اور میڈیا میں، غرض ہر جگہ اور ہر سطح پر یہ مہم چلائی جائے [illegible]
تک چلائی جاتی رہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے ملک میں پرامن سماج کو دیکھ سکیں۔

امن کی اہمیت کسی ایک اعتبار سے نہیں ہے بلکہ ہر اعتبار سے ہے۔ [illegible]
اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کے بغیر خود آزادی ہی بے معنی ہو جاتی ہے۔ امن کے بغیر [illegible]
کام نہیں کیا جا سکتا، امن نہیں تو ترقی بھی نہیں، امن نہیں تو ملک کی تعمیر بھی نہیں۔

بہترین منصوبہ بندی، بہترین تعلیمی ادارے، بہترین اقتصادی [illegible]
سب کچھ اس وقت تک بے معنی ہے جب تک ملک میں امن [illegible]
[illegible] بے معنی ہو جاتی ہے۔ [illegible]
[illegible]
اس لیے کی ہے کہ انھوں نے اپنے ملک میں امن و سلامتی کا ماحول [illegible]

ڈاکٹر سوشیلا نائر نے اپنی تقریر میں کہا کہ [illegible] ایک نئی [illegible]
مجھے اس سے اتفاق ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ملک میں نئی جاگ پیدا ہوئی ہے۔ ضرورت ہے
کہ اس کو استعمال کر کے نئے ہندستان کی تعمیر کی جائے۔

بھارتیہ ودیا بھون کی طرف سے جلسہ میں بڑے سائز کا ایک پمفلٹ تقسیم کیا گیا۔

میں خلیفہ حضرت علی … کا ایک واقعہ (حضرت علی کے نام سے) شائع کیا گیا تھا۔ خلیفہ
صاحب اپنے کمرہ میں چراغ کی روشنی میں کچھ سرکاری کام کر رہے تھے۔ اس درمیان میں ایک شخص ذاتی
ملاقات کے لیے آیا۔ انھوں نے سرکاری چراغ کو بجھا کر اپنا ذاتی چراغ جلالیا۔

یہ واقعہ پمفلٹ میں بتایا گیا تھا کہ یہ قابل تعریف واقعہ پربدھا بھارت (Prabuddha Bharata)
کے شمارہ اگست ۱۹۹۴ میں چھپا تھا۔ اس کو خاص طور پر سوامی رنگاناتھننڈا نے حیدرآباد سے بھیجا
تھا تاکہ اسے شائع کیا جائے۔ چنانچہ ان کی فرمائش پر اسے بھارتیہ ودیا بھون کے تعارف نامہ میں شامل
کر کے اسے لوگوں میں تقسیم کیا گیا۔

بھارتیہ ودیا بھون کا قیام ۱۹۳۸ میں مہاتما گاندھی کے مشورہ پر عمل میں آیا۔ اس کے فاؤنڈر
مسٹر کے ایم منشی تھے۔ اس کا مقصد ملک میں اخلاقی کلچر کو رواج دینا تھا۔

جلسہ کے آخر میں تمام حاضرین سے ایک عہد لیا گیا۔ اس کا مضمون انگریزی اور ہندی میں پڑھ
کر سنایا گیا۔ اگلے صفحہ پر اس عہد کا مضمون دیکھا جا سکتا ہے۔

ہارون شیخ صاحب بمبئی کے ایک تجارتی ادارہ میں ڈائرکٹر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی تعلیم
ایک انگریزی اسکول میں ہوئی۔ اس وقت وہ اسلام کے بارہ میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ اور نہ وہ اسلام
کے بارہ میں کچھ سوچتے تھے۔ مگر اسکول میں کچھ غیر مسلم لڑکوں نے انہیں "ٹانٹ کرنا" شروع کردیا۔

Practical Vedanta: Uprighteousness

It so happened that when Khalifa Hazarat Ali was scrutinizing some official papers of his government, a gentleman came to meet him. Finding that the visitor had some personal matter to discuss, Hazarat immediately put out the lamp he was using and in its stead lit another one. This filled the visitor with curiosity, but he somehow suppressed his feelings. Finishing his discussion, Hazarat once again put out the second lamp and lit the first one! This was too much for the visitor to bear any longer, and so he asked the Khalifa the reason for his acting so strangely. Hazarat replied: "Sir, when you came in I was attending to some official work using the lamp supplied by the government. But should we spend government money for our personal matters? So I used my own lamp while talking with you!"

This anecdote relating to a commendable instance of probity in public life which appeared in the August, 1994 issue of "Prabuddha Bharata" was specially sent by Swami Ranganathananda from Hyderabad through a messenger and it was read out at the meeting as desired by Swamiji. (Sadachar Bharati)

SADACHAR BHARATI

For Promotion of
Values & Purity in Public Life and Rural Regeneration
(In Commemoration of the historic occasion of
the 125th Birth Anniversary of Mahatma Gandhi)

PLEDGE

I whole-heartedly welcome the starting of **SADACHAR BHARATI** to promote Values and Purity in Public Life and Rural Regeneration in commemoration of the 125th Birth Anniversary of Mahatma Gandhi, Father of the Nation.

For my own well-being, for the well-being of India and for the well-being of the world I hereby enrol myself as a **SADACHAR SEVAK/SEVIKA** and solemnly pledge:

* to build up the **SADACHAR BHARATI** to promote Values and Purity in Public Life and to eliminate corruption now rampant in every department of human activity in our Motherland, in many and varied forms, threatening to destroy the very foundation of our polity;

* to do my very best to enlist as many **SADACHAR SEVAKS/SEVIKAS** as possible, particularly, from among the youth, to build up **SADACHAR BHARATI** as a constructive, vigorous, effective and all-embracing mass movement to promote Values and Purity in Public Life and to end corruption in every sphere of activity;

* to revitalise the rural economy by promoting rural industries and rural self-employment schemes and to enrich the rural life through institutions like Gram Sabhas, Panchayats and Voluntary Organisations.

* It shall be my conscientious effort to transform our 47-year-old **SWATANTRA BHARAT** into **SADACHAR BHARAT** before Independent India steps on to her Golden Jubilee in 1997, three years from now.

* I shall diligently and perseveringly do my patriotic and democratic duty to expeditiously achieve this goal, lest India of the dreams of Mahatma Gandhi and other stalwarts, architects and builders of Free India and the millions who suffered and sacrificed their lives to win **SWARAJ** should fade and disintegrate within our lifetime.

[illegible] ان کے [illegible] جن کا جواب نہیں ہے پاس ہی جماعت اسلامی والوں کا
[illegible] میں انھوں نے اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اب خدا کے فضل سے [illegible]
[illegible] اسلامی ہے۔ اور خدا کے فضل سے اسلام کے بارے میں ہر قسم کے سوال کا جواب دے
سکتا ہوں۔ بعد کو انھوں نے اردو بھی سیکھ لی۔

یہ تجربہ بتاتا ہے کہ کس طرح ہر شر میں ایک خیر چھپا ہوتا ہے۔ بظاہر ناموافق صورت حال میں بھی موافق حالات موجود رہتے ہیں۔ انگریزی تعلیم کا ادارہ جس کو کچھ لوگ "قتل گاہ" بتا رہے تھے وہ اسلام کا مجاہد تیار کرنے کا ادارہ بن گیا۔

۲ اکتوبر کی صبح کو جسٹس قاضی کے مکان پر جناب ایس زیڈ ایچ قاضی (ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج، تاسلے) اور آر بی قادری ایڈوکیٹ آ گئے۔ ان لوگوں سے دیر تک الرسالہ مشن اور مسلم مسائل پر گفتگو ہوئی۔ انھوں نے اپنے علاقہ میں آنے کی دعوت دی۔

یہاں سے روانہ ہو کر ہم لوگ مسٹر مدھو مہتا کے یہاں آ گئے۔ ان سے دیر تک ملکی مسائل پر گفتگو ہوئی۔ پلیگ کی حالیہ وبا کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ "مولانا صاحب، جو انسان نہیں کر سکتا تھا وہ خدا نے کر دیا۔ ایسا طمانچہ مارا ہے کہ سب کی ہوا نکال دی"۔ انھوں نے بتایا کہ آج کل بے نظمی کا یہ حال ہے کہ الٰہ آباد کے ہائی کورٹ کے جج نے سپریم کورٹ کو یہ درخواست دی کہ مجھے پولیس سے خطرہ ہے، مجھ کو پولیس سے بچاؤ۔ یہ کیس جب سپریم کورٹ میں آیا تو سپریم کورٹ کے جج نے کہا کہ یہ خاتمہ کا آغاز ہے:

This is the beginning of the end.

مسٹر مدھو مہتا (بمبئی) نے بتایا کہ وہ سورت گئے۔ وہاں ٹکسٹائل انڈسٹری کے تحت ہزاروں کارخانے ہیں۔ ان لوگوں کا روزانہ کا ٹرن اوور کروروں بلکہ اربوں روپے تک پہنچتا ہے۔ مگر یہ لوگ شہر یا محلہ کی صفائی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ مسٹر مہتا نے ان سے کہا کہ اگر تم لوگ اختیاریہ ایک فی صد بھی اس کام کے لیے نکالو تو تم نہ صرف اپنے محلہ کی بلکہ سارے شہر کی صفائی کر سکتے ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ سورت میں بھیانک پلیگ کا پھوٹ پڑنا ایک چیلنج ہے۔ اب ہر جگہ لوگوں کو چاہیے کہ وہ کو آپریٹو سوسائٹیاں بنائیں اور کئی ذمہ داریاں جس کو وہ اب تک سرکار پر ڈالتے

[illegible] میں ان کو [illegible] کریں۔ مثلاً شہر کی صفائی، غریب نوجوانوں کی تعلیم [illegible]
کے لیے [illegible]۔ جاپان میں اسی طرح استقامیہ میں شہریوں کی شرکت سے ترقی ہوئی ہے [illegible]
ہندستان میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا کوئی راستہ موجودہ حالات میں ممکن نہیں۔

ہندستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر مسٹر سدھیندر کلکرنی ملاقات کے لیے آئے۔ انھوں نے اپنے اخبار کا شمارہ ۱۳ اگست ۱۹۹۴ دیا۔ اس شمارہ کا اڈیٹوریل خلافت (۱۹۱۹-۱۹۲۴) پر تھا۔ انھوں نے اس کے اڈیٹوریل میں مولانا محمد علی کے اس مشہور جملہ پر تنقید کی تھی کہ میرے مذہب کے نقطۂ نظر سے ایک برا مسلمان بھی گاندھی سے بہتر ہے :

From the point of view of my religion, the worst Muslim is superior to, and closer to me than, Gandhi.

میں نے کہا کہ یہ اسلام کی بات نہیں ہے۔ یہ محمد علی کی اپنی بات ہے۔ اس قول کی بنیاد پر آپ اسلام کے بارہ میں کوئی رائے قائم نہ کریں۔ اس مضمون میں مسلمانوں کی انتہا پسندانہ تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ مسلمانوں میں کب ایک مہاتما پیدا ہوگا جو جنونی مسلمانوں سے لڑے اور ساری دنیا کے مفاد کے لیے اسلام کی سچی روح کو زندہ کرے :

When will a Mahatma be born among Muslims to fight pan-Islamic fanaticism and to revive for the benefit of the whole world, the true spirit of Islam. (p. 16)

مسٹر کلکرنی سے دوسری ملاقات ہوٹل میں ہوئی۔ ان سے مذہب اور عقیدہ کے سوال پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔ انھوں نے تعدد عقیدہ (multiple faith) کے نظریہ کی حمایت کی۔ میں نے کہا کہ عقیدہ کا تعلق سچائی سے ہے۔ اور سچائی (ٹروتھ) کو دی ٹروتھ ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر اس کے ساتھ وہ گہرا تعلق نہیں ہو سکتا جو مطلوب ہے۔

انھوں نے کہا کہ یہ واقعہ کہ اسلام کروروں آدمیوں کو ساری دنیا میں متحرک کر سکا ہے، یہ واقعہ مجھ کو یہ ماننے کی طرف لے جاتا ہے کہ اسلام میں کوئی خاص اندرونی خوبی موجود ہے :

The fact that Islam could inspire and activate millions of ordinary human beings—and that too across vast tracts of the world and in a very short period of time—leads me to believe that there is something intrinsically good in Islam (Sudhendra Kulkarni)

پانڈو کی سڑک سے ہم لوگ گزر رہے تھے کہ ظہر کی نماز کا وقت آگیا۔ گاڑی روک کر پانڈو کی جامع مسجد میں داخل ہوئے۔ وہاں میں پانی کے پاس وضو کے لیے کھڑا ہوا تھا کہ ایک صاحب نے کہا "السلام علیکم، میرے لیے دعا کیجئے"۔ میں نے سمجھا کہ مولوی ہونے کے اعتبار سے وہ مجھ سے ایسا کہہ رہے ہیں۔ مگر اس کے بعد ان کا اگلا جملہ یہ تھا کہ "میں الرسالہ کا قاری ہوں۔ کلثوم کتاب گھر سے ہرماہ الرسالہ خرید کر پڑھتا ہوں۔ میں نے الرسالہ سے بہت کچھ سیکھا ہے"۔ الرسالہ خدا کے فضل سے اتنا عام ہوگیا ہے کہ دہلی سے لے کر بالی اور باربیڈوز تک جہاں بھی میں گیا، ہر جگہ ایسے لوگ مل گئے جو الرسالہ یا انگریزی اور عربی کتاب پڑھے ہوئے تھے اور یقینی طور پر ہمارے مشن سے واقف تھے۔

کل ہوٹل میں ایک میٹنگ ہوئی۔ کچھ لوگوں نے سوال کیا کہ فقہی اختلاف کا معاملہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ جب دین ایک ہے تو اس میں اتنے اختلافات کیوں۔ یہاں میں نے آدھ گھنٹہ کی ایک گفتگو میں اس مسئلہ کی وضاحت کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اختلاف بعض اوقات تنوع کے معنی میں ہوتا ہے۔ آداب عبادت میں اختلاف بھی تنوع کے معنی میں ہے۔ دور نبوت، دور صحابہ اور دور تابعین میں ان کو اسی معنی میں لیا جاتا تھا۔ اس وقت یہ کہا جاتا تھا کہ یہ کرلو تب بھی ٹھیک ہے، وہ کرلو تب بھی ٹھیک ہے۔ مگر تبع تابعین کے زمانہ میں ایک نیا ذہن پیدا ہوا۔ انھوں نے خود ساختہ معیار کے تحت شریعت میں "وحدت" لانے کی کوشش کی۔ انھوں نے چاہا کہ ایک کو قابل اخذ اور دوسرے کو قابل ترک، یا غیر افضل ثابت کریں۔ تنوع کو وحدت بنانے کی اس غیر فطری کوشش نے شریعت میں غیر ضروری اختلافات پیدا کردیے۔

جناب نسیم علی خان صاحب کو عملی کام کرنے کا کافی تجربہ ہے۔ انھوں نے اپنے تجربہ کی روشنی میں ملی اصلاح کے سلسلہ میں کچھ باتیں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ دفاع اسی وقت مفید ہے جب کہ وہ منظم ہو۔ ہمارے نوجوانوں کا حال یہ ہے کہ ہر ایک اپنے کو سردار سمجھ لیتا ہے۔ یہ انتہائی تباہ کن ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر محلہ میں ایک سینیر آدمی امیر ہو۔ اس امیر کے تحت ایک مشاورتی کمیٹی ہو۔ محلہ کے

[illegible] اجازت [illegible]

[illegible] صرف [illegible] مسجد [illegible]

انھوں نے کہا کہ اس کے ساتھ ہر جامع مسجد [illegible] جہاں ابتدائی تعلیم [illegible]

اگر جامع مسجد [illegible] ہے [illegible] لڑکوں کے [illegible]

ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ فجر سے ظہر تک اور ظہر سے عصر تک مسجد خالی رہتی ہے۔ [illegible]

مسجد کو مدرسہ کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح مسجد کا دوہرا استعمال ہوگا۔ [illegible] اخلاق اور

[illegible] کی تربیت کا مرکز بن جائے گی۔ اسی کے ساتھ جو لڑکے بے کار ادھر ادھر گھومتے رہتے ہیں ان کو ایک جگہ لا کر انھیں چھوٹے چھوٹے کام سکھائے جائیں تاکہ وہ روزگار پر لگ سکیں۔

۳ اکتوبر کی صبح کو بمبئی سے پونہ جانا تھا۔ ہوٹل سے جناب فاروق فیصل کے ساتھ روانگی ہوئی۔ انھوں نے دو سیٹ ریزرو کروائی تھی۔ مگر میں نے ان کا ٹکٹ واپس کرا دیا اور اکیلے پونہ گیا۔ میں نے کہا کہ صرف پونہ جانے کے لیے کسی کو میرے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔

ہم لوگ دادر ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ پورا اسٹیشن ایک وسیع کوڑا خانہ کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر انسانوں کا اتنا ہجوم تھا کہ راستہ چلنا مشکل تھا۔ ہر طرف شور اور گندگی کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ ہندستان میں کچھ لوگ تو سب کچھ حاصل کیے ہوئے ہیں مگر بیشتر لوگ ابھی تک بھیڑ بکری کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اس تباہ کن صورت حال کا سبب کرپشن کے سوا اور کچھ نہیں۔

دکن ایکسپریس میں سوار ہو کر جب میں پونہ کی طرف روانہ ہوا تو ریلوے لائن کے دونوں طرف جگی جھونپڑیوں کی قطاریں اس طرح نظر آتی تھیں جیسے کہ یہ بھی ریلوے لائن کا کوئی حصہ ہوں۔ یہ منظر مجھے باہر کے ملکوں میں کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔

سفر قدیم ترین زمانہ سے انسان کی یہ شوق تمنا رہا ہے۔ کیوں کہ سفر میں نئے نئے تجربات حاصل ہوتے ہیں۔ ایک قدیم ناول نگار اپنی کہانی کے ایک کردار کی زبان سے کہتا ہے کہ مجھ کو دنیا کے آخری سرے تک لے جاؤ:

Take me away to the end of the world. (10/1085)

سفر عبرت اور نصیحت کا اہم ذریعہ ہے۔ اسی لیے اسلام میں بھی سفر کی خصوصی تعلیم دی گئی ہے۔ قرآن

میں [illegible] ۱۹۹۳ء [illegible] تاہم تقسیم [illegible] ہندو [illegible] کوئی شخص آل انڈیا [illegible] نہیں
[illegible] حضرت [illegible] علی میاں ندوی [illegible] کی ایک [illegible] کے بعد [illegible] ہوا ہے۔ [illegible]
[illegible] کے [illegible] طویل سفر کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ ان سفروں کے دوران [illegible]
[illegible] کا [illegible] مسلمان [illegible] کتابی مطالعہ کے ذریعہ ممکن نہ تھا۔

[illegible] اسٹیشن پر پہنچا تو جناب عبدالصمد شیخ اور دوسرے ساتھی موجود تھے۔ ان کے ہمراہ روانہ ہوکر ہینویا الاعوں پہنچا۔ یہاں میرا قیام حاجی یونس صاحب کے مکان پر تھا۔

یونین ہیڈ ہسپلیس میں ۲ اکتوبر کو خطاب تھا۔ تعلیم یافتہ افراد جمع ہوئے۔ میں نے سیرت رسول کی روشنی میں اس امر کی وضاحت کی کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں ایک بات یہ عرض کی گئی کہ اسلام میں اصل مطلوب چیز امن ہے۔ جنگ بہرحال میں ایک ناپسندیدہ چیز ہے جو کبھی مجبورانہ طور پر بھی دفاع کے لیے لڑنا پڑے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا مت کرو، اور اللہ سے عافیت مانگو (لاتتمنوا لقاء العدو واسئلوا اللہ العافیۃ)

ایک ملاقات میں محمد اسحاق عثمان خان (ہینویل) نے اپنی سادہ زبان میں کہا: اگر ہم ہندستان میں سچا مسلمان بن کر رہیں اور کاروبار کریں تو ہم کو کوئی بھی تکلیف یا دقت نہیں ہے۔

جناب نسیم علی خان صاحب (۲۵ سال) نے کہا کہ اصل مسئلہ فرقہ پرست ہندو نہیں ہے بلکہ پولیس ہے جس کے پاس ہتھیار ہے اور اختیار بھی۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے پاس نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے ان سے لڑنا خودکشی ہے۔ ہم کو پولس سے نہیں ٹکرانا ہے، حتی کہ اگر وہ نقصان کریں تب بھی ہم کو برداشت کر لینا ہے۔ ابتداءً تھوڑا نقصان ہو سکتا ہے، لیکن اگر اس ابتدائی نقصان کو برداشت کر لیا جائے تو ہم زیادہ بڑے نقصان سے بچ جائیں گے۔

۲ اکتوبر کو مغرب کی نماز پونہ کی مسجد کا غذی پورہ میں پڑھی۔ وہ پہلے ایک چھوٹی سی بوسیدہ مسجد تھی۔ آج وہاں بہت بڑی دو منزلہ عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ وہ ایک بہت بڑے ہال کی صورت میں بنالی گئی ہے۔ آپ ملک کی جس مسجد یا مدرسہ میں جائیے، اس میں اضافہ اور ترقی دکھائی دے گا۔ یہ ایک علامت ہے جو بتاتی ہے کہ خدا کا دین ترقی کی طرف مائل ہے، مگر کچھ لوگ

[illegible] کی [illegible] میں مصروف ہیں۔ [illegible]
[illegible] ایک پہلو کو نظر انداز کیا جائے اور [illegible]
جائے اس سے ایک طرف [illegible] کا جذبہ پیدا ہوگا۔ دوسری طرف اس سے [illegible]
کا فائدہ ملے گی۔

اس کے بعد ہم لوگ جناب عطار صاحب کے دفتر (افا انجینئرنگ ورکس) گئے۔ یہاں ایک مختصر میٹنگ کا انتظام تھا۔ میں نے کچھ احادیث کی روشنی میں بتایا کہ زبان کا ایک صحیح استعمال ہے اور دوسرا اس کا غلط استعمال۔ صحیح استعمال پر آدمی انعام کا مستحق بنتا ہے اور غلط استعمال پر عذاب کا۔ مثلاً کسی کے خلاف آپ کو بولنا ہے تو الزام کی بولی بولنا زبان کا غلط استعمال ہے اور دلائل کی بنیاد پر منصفانہ کلام کرنا زبان کا صحیح استعمال۔

آج عشاء کی نماز میں نے پونہ کی ایک مسجد میں پڑھی۔ یہاں نماز کے بعد خطاب ہوا۔ خطاب کا موضوع تھا بدگمانی۔ احادیث کی روشنی میں بتایا کہ گمان کی بنیاد پر رائے قائم کرنا سخت گناہ ہے۔ اس کو سب سے بڑا جھوٹ کہا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی ظاہری بات کو دیکھ کر ایسی بے بنیاد رائے قائم کر لیتا ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس طرح گمان نتیجۃً جھوٹ تک پہنچ جاتا ہے۔

آج رات کو جناب حاجی یونس صاحب کی قیام گاہ (نیو ایرا کالونی) میں ایک اجتماع ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ مسلمان شریک ہوئے۔ اس موقع پر میں نے اس مسئلہ کو بیان کیا کہ کمزور لوگ بھی طاقتور پر غالب آتے ہیں۔ اور یہ اللہ کے بنائے ہوئے قانون فطرت کے تحت پیش آتا ہے۔ اس اجتماع میں کالونی کے تقریباً دس عرب طلبہ بھی شامل تھے۔ یہ لوگ پونہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے آئے ہوئے ہیں۔

۳ اکتوبر کو فجر کی نماز نیو ایرا کالونی کی مسجد میں پڑھی۔ نماز کے بعد مختصر خطاب ہوا۔ اس میں نماز کی حقیقت کے بارہ میں کچھ حدیثیں پیش کی گئیں۔

۴ اکتوبر کو مہاراشٹرا کاسموپولیٹن ایجوکیشن سوسائٹی (MCES) میں پروگرام تھا۔ ۱۲۲ ایکڑ کے رقبہ میں پھیلی ہوئی اس دنیا میں مختلف ادارے ہیں جن میں تقریباً سات ہزار لڑکے اور لڑکیاں زیر تعلیم ہیں۔

اس کے بعد یہاں کے اسمبلی ہال میں خطاب ہوا۔ ہال پورا بھرا ہوا تھا۔ اس میں سب تعلیم یافتہ افراد شریک تھے۔ اس موقع پر میں نے علم کی اہمیت پر خطاب کیا۔ تقریر کے بعد کچھ تحریری سوالات آئے جن کا جواب دیا گیا۔

یہیں اسی سوسائٹی میں یونانی طب کا بھی ایک شعبہ ہے۔ اس کے ایک کمرہ میں شیشہ کے کیس میں ہر قسم کے مفردات رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک کالے رنگ کی وہ لکڑی تھی جس کو عودِ صلیب کہتے ہیں۔ یہ یونانی طب میں مرگی کی خاص دوا ہے۔ اس کے انچارج حکیم صاحب نے بتایا کہ اس کو عود صلیب اس لیے کہتے ہیں کہ اس کو جب توڑا جائے تو اس کے اندر صلیب کی مانند متقاطع نشان ملتا ہے۔ لکڑی کو یہ نام کس نے دیا، مسلم اطباء نے۔ دورِ عروج میں کسی لکڑی کو عود صلیب کہنے میں مسلمان کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ آج مسلم دانشوروں کی کوشش صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ لکڑی کا نام کسی نہ کسی طرح عود ہلال یا عود اسلام رکھ سکیں۔ دورِ عروج کی علامت حقیقت پسندی ہے اور دورِ زوال کی علامت جذبات پسندی۔

یہاں کی لائبریری میں ابن سینا کی مشہور کتاب القانون دیکھی۔ اس کے مقالہ ۱۲ میں "گردہ کی چربی کے لٹکنے کی علامت" پر بحث ہے۔ اس میں ابن سینا اپنے نزدیک صحیح نقطۂ نظر کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اصل بات وہ ہے جو میں نے لکھی نہ کہ وہ جس کو موجودہ زمانہ کے جاہل طبیب سمجھ رہے ہیں

(کما یعتقدہ الجھلۃ من اطباء عصرنا ھذا) صفحہ ۱۴۸

اس کو پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ابن سینا جیسے ہزاروں دماغ ہیں جنھوں نے ماضی میں اس قسم کے مدعیانہ الفاظ بولنے کی جرأت کی۔ مگر بعد کے زمانہ کی تحقیقات نے خود انھیں کو غلط ثابت کر دیا۔ قدیم کتابوں میں یہ صرف قرآن ہے جو استثنائی طور پر اس کے برعکس ایک مثال ثابت ہوا ہے۔

۴ اکتوبر کو مغرب کی نماز پراوداکی مسجد میں پڑھی۔ یہاں مولانا سید نور صاحب امام اور خطیب ہیں وہ ابھی نوجوان ہیں، مگر نہایت سنجیدہ اور ذہین آدمی ہیں۔ عربی اور انگریزی دونوں زبان پر قدرت رکھتے ہیں۔ تقریر کا بھی اچھا ملکہ ہے۔ صاحب مطالعہ ہونے کی وجہ سے زمانہ کے احوال سے بھی پوری طرح باخبر ہیں۔

نماز کے بعد مسجد میں خطاب ہوا۔ میں نے اپنی تقریر میں نماز کو موضوع بنایا۔ میں نے بتایا کہ نماز محض رسمی پرستش نہیں ہے بلکہ وہ ایک انقلابی عمل ہے۔ نماز آدمی کو اعلیٰ اخلاقی انسان بناتی ہے۔ مسلمانوں میں اگر نماز والے اوصاف آجائیں تو وہی ان کی مکمل فلاح کے لیے کافی ہو۔

عشاء کی نماز کے بعد جناب انعام دار صاحب کے مکان پر نشست ہوئی۔ یہاں شہر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ

[illegible] تعداد میں اکٹھا ہوئے۔ ان کے سامنے تفصیلی خطاب ہوا۔
میں نے کہا کہ ہندستان میں ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہندو اور مسلم کے درمیان [illegible] غلط فہمی کو نہیں ختم کرنا ہے۔ اس کو ختم کیے بغیر کوئی بھی مثبت کام نہیں کیا جا سکتا۔

۵ اکتوبر کی صبح کو پونا کالج دیکھا۔ پہلی بار میں نے اس کو ۱۹۸۲ میں دیکھا تھا۔ اس وقت سے یہاں کافی ترقی ہوئی ہے۔ مجموعی طور پر پونہ میں قابل لحاظ تعلیمی ترقی ہوئی ہے۔ جب کہ شمال کے صوبوں میں مسلمانوں کے اندر ایسی ترقی دکھائی نہیں دیتی۔ اس کی وجہ تاریخی ہے۔ پونہ میں بہت پہلے سے تعلیم کا چرچا تھا۔ ہندو، عیسائی، پارسی فرقے یہاں سو سال سے پہلے سے تعلیم کا کام کر رہے تھے۔ اس کا فائدہ مسلمانوں کو بھی ملا۔ جب کہ دہلی زیادہ تر سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔

یہاں طلبہ اور اساتذہ کے درمیان خطاب ہوا۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم اشیاء دے کر پیدا کیا۔ مگر یہ علم اشیاء بطور امکان انسان کے اندر موجود ہوتا ہے۔ اس امکان کو واقعہ بنانے کے لیے تعلیم کی ضرورت ہے۔ اسی لیے اسلام میں علم کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

جناب انعام دار صاحب نے ایک مجلس میں ہمارے مشن کے بارہ میں بولتے ہوئے کہا کہ "مولانا کا مشن کیا ہے، لوگوں میں کانفیڈنس پیدا کرنا۔ کانفیڈنس سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ اگر لوگوں میں کانفیڈنس آجائے تو اس کے بعد ان کے لیے ہر کام آسان ہو جائے گا۔ کانفیڈنس نہ ہو تو آدمی کوئی کام نہیں کر سکتا۔"

خطاب کے پروگرام کے بعد پرنسپل صاحب کے کمرہ میں نشست ہوئی۔ یہاں ادارہ کے ذمہ داران جمع ہو گئے۔ ان سے سوال و جواب کی صورت میں دیر تک گفتگو ہوئی۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ میرے نزدیک مسلمانوں کے لیے سنگل پوائنٹ فارمولا صرف تعلیم ہے۔ مسلمانوں کو اپنی طاقت صرف تعلیم پر لگا دینا چاہیے۔ ان کا نشانہ یہ ہونا چاہیے کہ ان کے اندر صد فی صد لوگ تعلیم یافتہ ہو جائیں۔ تعلیم کے مقابلہ میں ہر چیز کی حیثیت سکنڈری ہے۔ موجودہ تمام مسائل کا واحد سبب تعلیم میں ان کا پچھڑا پن ہے۔

۵ اکتوبر کو ساڑھے گیارہ بجے گوکلے جوبلی ٹکنکل انسٹی ٹیوٹ میں "نشہ بندی" کا پروگرام منعقد کیا گیا تھا۔ اس میں شرکت کی۔ عمارت کی بیسمنٹ میں نشہ کے نقصانات تصویر کی صورت میں دکھائے

گئے تھے۔ ایک بڑی میز پر نشہ کی تمام قسمیں بطور نمونہ رکھی ہوئی تھیں۔ اس میں سے ایک حقیقت رنگ والی مٹھائی کے متعلق بتایا گیا کہ یہ میٹھا ہوتا ہے۔ ٹھگ اس کو پرشاد کے طور پر کھلا کر مسافروں کو لوٹ لیتے ہیں۔

پونے کے پولیس کے میئر ل بھائی سوجی بھی اس تقریب میں شریک تھے۔ وہ پونہ کے پہلے مسلمان میئر ہیں اور خوجہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ میئر نے مرہٹی زبان میں تقریر کی۔ آخر میں انھوں نے کہا: چھوڑو نشہ ہے ہمارا نعرہ۔

میں نے سوچا کہ نشہ فری زندگی کامیابی کا راز ہے۔ مگر شراب اور بھنگ اور افیون جیسی چیزوں کے علاوہ بھی نشہ پیدا کرنے والی چیزیں ہیں۔ مثلاً دولت، اقتدار، عقل، بھیڑ، سرکاری وغیرہ ہیں۔ نشہ آدمی کو نارمل حالت میں باقی نہیں رکھتا۔ اور تمام ترقیاں نارمل حالت ہی میں ہوتی ہیں۔ اس دنیا میں وہی آدمی پائدار کامیابی حاصل کر سکتا ہے جو اپنے آپ کو ہر قسم کے نشہ سے دور رکھے۔

۵ اکتوبر کی شام کو عشاء کی نماز نیو ایریا کالونی کے بی سکٹر کی مسجد میں پڑھی۔ اس کے بعد عبد الغفار عبد الرحمن (ساگر کنسٹرکشن) کی رہائش گاہ پر اجتماع ہوا۔ میں نے کچھ احادیث کی روشنی میں ایک دینی تقریر کی۔

حاجی یونس صاحب تاجر ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ بزنس میں ترقی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ —— ایک دوسرے کی عزت کر کے چلنا، لوگوں کے ساتھ ایڈجسٹ کر کے رہنا، خدا کا خوف دل میں رکھ کر چلنا۔ یہ سمجھنا کہ جب میں خدا کی نظر میں ہوں تو پھر فکر کیا۔ وہ سب کو دیتا ہے تو مجھ کو کیوں نہیں دے گا۔

حاجی یونس صاحب کی تین لڑکیاں اپنے سسرال میں خوشی کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ میں نے حاجی صاحب کی اہلیہ سے پوچھا کہ اس کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ "میں ہمیشہ اپنی لڑکیوں سے ایسا بولتی کہ دیکھو، ہمیشہ نرمی سے رہنا، کسی کا جواب نہیں دینا، اونچی بات نہیں کرنا، اس لیے عزت کرتے ہیں وہ لوگ"۔

۵ اکتوبر کو نماز ظہر کے بعد فیاض احمد صاحب کے مکان پر ایک میٹنگ تھی۔ عبد القادر یمین صاحب نے بتایا کہ ۲۰ سال پہلے پونہ میں مسلمانوں میں غلط دھندے بہت تھے۔ شراب، جوا وغیرہ۔ مگر اب یہ بہت کم ہو گیا ہے۔ اس تبدیلی میں دوسرے اسباب کے علاوہ تبلیغی جماعت کی کوششوں

[illegible] کا حل ہے۔

۵ اکتوبر کی نماز سے کچھ پہلے جب میں نیو ایرا بی (New Era-B) [illegible] ایک سو قدم کے فاصلے پر کھلے میدان میں نوراتری کا جلسہ ہو رہا تھا۔ آج اس کا پہلا دن [illegible] اور عورتیں جمع ہوکر ناچ اور گانے میں مشغول تھے۔ اس کے ساتھ وہاں لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کے گانے اور باجے کی آواز دور تک پھیل رہی تھی۔ اس کا شور میرے کان سے ٹکرایا تو فوری طور پر میرے اندر سخت ردعمل پیدا ہوا۔ میں نے سوچا کہ شور و غل کے اس ماحول میں ہمارا پروگرام کیسے چل سکے گا۔

عین اس وقت مجھے کسی کا ایک قول یاد آیا جس نے میرے ذہن کو ٹھنڈا کر دیا۔ وہ قول اس طرح ہے کہ پختگی یہ ہے کہ آدمی ان چیزوں کے ساتھ ایڈجسٹ کرکے رہ سکے جن کو وہ بدل نہیں سکتا۔ ہر ایڈجسٹمنٹ کا تعلق قانونِ فطرت سے ہے نہ کہ انسان سے۔

عشاء کی نماز کے بعد اجتماع شروع ہوا۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک تعداد جمع تھی۔ جب میں نے تقریر شروع کی تو ابتداءً محسوس ہوا کہ سو قدم پر ہونے والا ہندوؤں کا پروگرام مسلسل پر شور مداخلت کر رہا ہے۔ مگر جب میں نے اس پر صبر کر لیا تو میرا ذہن منفی رخ سے ہٹ کر مثبت رخ پر سوچنے لگا۔ یہاں تک کہ اس شور و غل نے مجھے اپنی تقریر کے لیے بہترین موضوع دے دیا۔

میں نے کہا کہ عربی کا ایک مثل ہے کہ چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں (تعرف الاشیاء باضدادہا) میں نے کہا کہ اس وقت صرف سو قدم کے فاصلہ پر یہاں لاؤڈ اسپیکر کا شور ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود ہم اپنا اجتماع کامیابی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اس شور نے نہ ہمارا جلسہ منتشر کیا اور نہ ہماری جان و مال کو کوئی نقصان پہنچایا۔

لیکن اب سے پہلے ۱۴ اپریل ۱۹۸۷ کو میرٹھ میں ٹھیک اسی طرح کے واقعہ پر زبردست فساد ہوگیا۔ وہاں مسلمانوں کا جلسہ بھی منتشر ہوگیا اور ان کے جان و مال کو بھی سخت نقصان پہنچا۔ اس فرق کا سبب یہ تھا کہ ہم اس شور کو نظر انداز کرکے اپنا جلسہ کر رہے ہیں، مگر میرٹھ کے مسلمان لاؤڈ اسپیکر کے شور کو جو کہ ایک مندر سے آ رہا تھا نظر انداز نہ کر سکے۔ انھوں نے وہاں [illegible] کی کوشش کی اور جب وہ لوگ لاؤڈ اسپیکر بند کرنے پر راضی نہیں [illegible]

پیدا ہوئی جس کے نتیجہ میں زبردست فساد ہوا اور مسلمانوں کو ناقابل بیان جانی اور مالی نقصان برداشت کرنا پڑا (تفصیل کے لیے دیکھئے الرسالہ نومبر ۱۹۸۸)

اس مسئلہ میں ضروری تفصیلات عرض کرنے کے بعد میں نے کہا کہ اس دنیا میں صبر و اعراض سے کامیابی ملتی ہے۔ اور بے صبری اور مشتعل مزاجی صرف تباہی تک لے جانے والی ہے۔ پونہ اور میرٹھ کا تقابل اس کو سمجھنے کے لیے بالکل کافی ہے۔

میں نے کہا کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات سازش کے تحت ہوتے ہیں۔ مگر یہ ایک بے بنیاد بات ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ سازش کرنے والے سازش نہیں کرتے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بذات خود سازش میں فساد کرنے کی طاقت نہیں۔ سازش کو فساد تک پہنچنے کے لیے ایک اور چیز درکار ہے۔ اگر یہ مددگار چیز اسے فراہم نہ کی جائے تو محض سازش کی بنا پر کبھی کوئی فساد نہیں ہو سکتا۔

یہ دوسری چیز ہے سازش کرنے والوں کے ایگو کو بھڑکانا۔ سازش کرنے والے اپنی ایگو کو خود سے بھڑکا نہیں سکتے، جس طرح پٹرول خود سے اپنے کو آگ نہیں لگا سکتا۔ سازشیوں کی ایگو کو بھڑکانے کا کام دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ دوسرے لوگ اگر ماچس کا کام نہ کریں تو فساد کا پٹرول بھڑکنے والا بھی نہیں۔

میں نے کہا کہ آپ میں سے کسی کو اگر اس میں شک ہو تو ابھی وہ اس کا تجربہ کر سکتا ہے۔ ہمارے جلسہ سے دو آدمی اٹھ کر جائیں اور شیوراتری والوں سے ان کا لاؤڈ اسپیکر بند کرنے کے لیے کہیں اور جب وہ بند نہ کریں تو ان کا لاؤڈ اسپیکر توڑ کر پھینک دیں اور اس کے بعد دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہی ہوگا جو ۱۹۸۷ میں ٹھیک اسی سبب سے میرٹھ میں پیش آیا۔

میں نے کہا کہ میں نے یہ نظریہ قرآن سے اخذ کیا ہے۔ قرآن میں ہے کہ اگر تم صبر کرو اور تقوی اختیار کرو تو ان کی سازش تمہیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچائے گی (آل عمران ۱۲۰) اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ صبر و تقوی سازش کا توڑ ہے۔ یہ آیت ہمیں یہ پیغام دیتی ہے کہ اگر کوئی تمہارے خلاف سازش کر رہا ہو تو تم اس کے پیچھے نہ دوڑو بلکہ خود اپنے اندر صبر اور تقوی کی صفت پیدا کر لو۔ اس کے بعد یقینی طور پر تم ان کے شر سے محفوظ رہو گے۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ [illegible] کی جرم [illegible] غلطی کا نتیجہ ہوتے ہیں [illegible]
اس کے دونوں فریق برابر کے شریک قرار پاتے ہیں۔ یہ جو [illegible] ہے جس کو [illegible]
میں مشترک غفلت (contributory negligence) کا نتیجہ کہا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک آدمی سڑک پر گاڑی چلا رہا ہے۔ اسی وقت دوسرا آدمی سامنے سے گاڑی چلاتا ہوا آگیا۔ اب یہ دونوں کی ذمہ داری ہے کہ ہر ایک موقع کے لحاظ سے عمل کرے (care) کرے۔ مثلاً اگر وہ تیز رفتار تھا تو وہ اپنی رفتار کو کم کرے۔ وہ اپنی گاڑی کو کنارے کی طرف لے جائے، وغیرہ۔ اگر دونوں ہی بے احتیاطی کے ساتھ اپنی اپنی گاڑی دوڑاتے رہیں تو ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔ ایسی حالت میں قانونی اعتبار سے دونوں برابر کے قصوروار سمجھے جائیں گے۔

اسی کا نام مشترک غفلت ہے۔ زندگی کے اکثر حادثات اسی قسم کی مشترک غفلت کے نتیجہ میں واقع ہوتے ہیں —— دوسرے کی غلطی میں حصہ دار نہ بنئے، دوسرے کی غلطی میں حصہ دار بننا خود اپنے آپ کو غلط کار ثابت کرنا ہے۔

۶ اکتوبر کو ظہر کی نماز ایک مسجد میں پڑھی۔ یہاں کی ایک چیز مجھے پسند آئی۔ وہ اوقات نماز کی گھڑی کا طریقہ ہے۔ انھوں نے دیوار پر ایک بڑا سا گھڑی کا ماڈل لگا دیا ہے۔ اس کی سوئی ہر نماز کے بعد گھما دی جاتی ہے۔ مثلاً اس وقت وہ ڈیڑھ بجے کا وقت بتا رہی تھی، یعنی ظہر کی نماز کا وقت۔ نماز کے بعد اس کو عصر کے وقت پر کر دیا گیا۔

نماز کے بعد کچھ لوگ اکٹھا ہو گئے۔ آدھ گھنٹہ تک ان سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ دعوت کا کام ہمیشہ قربانیوں پر چلتا ہے۔ مگر ہندستان میں دعوت کے عمل کو زندہ کرنے کے لیے اصل قربانی جو مطلوب ہے وہ ابھی تک مسلمانوں نے دی نہیں۔ اسی لیے یہاں دعوت کا عمل بھی جاری نہ ہو سکا۔ یہ قربانی ہے ہندو نفرت کو اپنے دل سے نکال دینا۔ مسلمان اگر چاہتے ہیں کہ ان کو دعوت کا ثواب دیا جائے تو اس کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ وہ اپنے دل سے ہندو نفرت کو یک طرفہ طور پر نکال دیں۔ نفرت کو نکال کر وہ ہندو کے لیے ہدایت کی دعا کریں۔ جب وہ ایسا کریں گے تو ان کے اور ہندوؤں کے درمیان نارمل فضا میں اختلاط ہونے لگے گا اور پھر دعوت کا عمل اپنے آپ چل پڑے گا۔ یہی دعوت حق کے لیے خدا کا مقرر کیا ہوا طریقہ ہے۔

چھوٹی سڑکوں پر سفر کرتے ہوئے بار بار اسپیڈ بریکر کے جھٹکے لگتے ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ موجودہ [illegible] پہلے پوڈ آئے تھے۔ اس وقت راتوں رات ان کی گزرگاہ کے تمام اسپیڈ بریکر توڑ دیے گئے اور سڑک راتوں رات ہموار کردی گئی۔

جس ملک کے حکمراں اس طرح صرف ہموار سڑکوں پر سفر کرتے ہیں ان کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہاں کے عوام کو سڑک کے جھٹکوں کو برداشت کرتے ہوئے سفر کرنا پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نہایت ضروری ہے کہ حکمراں بھی انھیں تجربات سے گزریں جن تجربات سے عوام گزر رہے ہیں۔ اس کے بغیر ملک کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔

بمبئی میونسپل کارپوریشن کے معطل ڈپٹی میونسپل کمشنر جی آر کھیرنار کا چرچا پونہ تک میں سنائی دیا۔ یہاں بھی کچھ لوگ ان کے بارہ میں گفتگو کرتے ہوئے نظر آئے۔ آج کل وہ عوامی جلسوں میں حکومت کی بدعنوانیوں کے خلاف پرجوش تقریریں کر رہے ہیں اور ہیرو بنے ہوئے ہیں۔ ایک تقریر میں انھوں نے کہا کہ ملک کی تمام اپوزیشن پارٹیاں میرے ساتھ ہیں۔

میں نے ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ ماضی کے تجربات سے سبق نہیں لیتے۔ آپ کھیرنار سے بڑی بڑی امیدیں قائم کیے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ اس سے پہلے ہم کئی سپر کھیرنار کا تجربہ کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا ایک سپر کھیرنار تھے۔ انھوں نے نان کانگریس ازم کی تحریک چلائی۔ اور اس میں انتخابی کامیابی بھی حاصل کی۔ مگر وہ سراسر بے نتیجہ رہی۔ اسی طرح جے پرکاش نرائن ایک سپر کھیرنار تھے۔ انھوں نے ٹوٹل ریولیوشن (سمپورن کرانتی) کی دھواں دھار تحریک چلائی۔ اور کانگریس حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ مگر دوبارہ نتیجہ صفر رہا۔ ایسی حالت میں موجودہ کھیرنار کون سا کارنامہ انجام دے سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ منفی سرگرمیوں سے کبھی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

پونہ میں بمبئی کا اخبار انقلاب کافی پڑھا جاتا ہے۔ اس کے شمارہ ۲۰ ستمبر ۱۹۹۴ میں لندن کے اخبار ٹائمس (۴ ستمبر) کی ایک رپورٹ نقل کی گئی تھی۔ اس میں مذکورہ اخبار کے نامہ نگار لیزلی تھامس نے بتایا ہے کہ برطانوی خواتین اسلام میں ایک نئی اخلاقیات دریافت کر رہی ہیں۔ رپورٹ میں بشیرہ روسر اوین (Bashira Rosser Qwen) اور مائرا کولمین (Moira Ni Cholman) کا انٹرویو ہے جس میں انھوں نے بتایا کہ ہم نے اسلام قبول کر کے مسلمان سے شادی کرلی ہے اور ہماری زندگی نہایت خوشگوار

ہے۔ رپورٹ کے مطابق برطانیہ میں ایسی خواتین کی تعداد دس ہزار ہو چکی ہے۔ اور زیادہ
اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

ویلز یونی ورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کے نومسلم صدر معشوق ابن علی نے برطانیہ میں
اسلام کے بڑھتے ہوئے رجحان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ مجھ کو خاص طور پر یہ دیکھ کر تعجب ہے
مسلمان ہونے والی بیشتر خواتین اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ رجحان اس حقیقت کے
باوجود جڑ پکڑتا جا رہا ہے کہ مغرب میں میڈیا کے علاوہ آزادیٔ نسواں کے لیے کام کرنے والی تنظیمیں
اسلام کی منفی تصویر پیش کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہیں۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو سے گفتگو ہوئی۔ وہ اس نظریہ کی حمایت کر رہے تھے کہ سچائی متعدد ہو سکتی
ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ فلاں مذہب ہی سچا مذہب ہے۔ میں نے اس نظریہ کی تردید کی۔ تقریباً آدھ گھنٹہ
کی گفتگو کے بعد انھوں نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ اس نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لیے میں زیادہ اہل
نہیں ہوں:

May be I am unable to explain the point.

اس کے بعد میں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

پونہ میں ایک نئی خوب صورت مارکٹ وہاں کی ایک خاص سڑک پر بنائی گئی ہے۔ ایک صاحب
یہ مارکٹ دکھانے کے لیے لے گئے۔ یہاں انسانوں کا ہجوم تھا۔ ہر طرف تجارتی سرگرمیاں جاری تھیں
یہاں میں نے ایک کپڑے کی دکان دیکھی۔ اس دکان کا کرایہ ۶۵ ہزار روپے مہینہ تھا۔ اس
کے باوجود جن صاحب نے اس کو کرایہ پر لیا ہے، وہ اس سے صرف کرایہ کے طور پر پندرہ ہزار روپے
مہینہ نفع کما رہے ہیں۔ انھوں نے یہ کیا کہ دکان کے سامنے چند میزیں بچھا دیں۔ اس کو الگ الگ افراد
کو روزانہ کی بنیاد پر کرایہ پر دے دیا۔ اس کے بعد دکان کے بیچ میں لوہے کا اسٹینڈ کھڑا کر کے دو
بھی ایک درمیانی دکان قائم کر دی۔ اس طرح انھوں نے ایک دکان میں آٹھ دکانیں بنا دیں اور اس
کے ایک حصہ میں اپنی دکان بھی رکھ لی۔

یہ سب کی سب سلے ہوئے کپڑے (گارمنٹ) کی دکانیں تھیں۔ وہ ہر کرایہ دار سے یومیہ
بنیاد پر کرایہ لیتے ہیں۔ یہ رقم مجموعی طور پر ۸۰ ہزار ہوتی ہے۔ ۶۵ ہزار روپے ماہانہ وہ مالک

دیتے ہیں اور پندرہ ہزار روپے مہینہ خود لے لیتے ہیں۔ اپنی "دکان" سے جو فروخت ہوتی ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔

اس کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ اوسط درجہ کی ایک دکان کو مذکورہ شخص ۱۵ ہزار روپے ماہوار کرایہ پر لینے کے لیے کیسے راضی ہو گیا۔ جب کہ ایک عام آدمی اس کو اتنی بھاری قیمت پر لینے کے لیے کبھی راضی نہ ہوتا۔ ایک غیر تجارتی آدمی سمجھ نہیں سکتا تھا کہ یہ کوئی نفع کا سودا ہے۔ مگر تجارتی راز کو جاننے والے آدمی نے سمجھ لیا کہ یہ یقینی طور پر ایک نفع بخش سودا ہے، اور آگے بڑھ کر اسے لے لیا۔

یہی معاملہ دین کے لیے قربانی دینے کا بھی ہے۔ خدا کا مطالبہ ہے کہ دین کے لیے اپنا سب کچھ پیش کر دو۔ اب جو لوگ یہ یقین کر لیتے ہیں کہ دنیا میں کم دے کر آخرت میں زیادہ پانا ہے وہ بڑھ کر اپنا سب کچھ دین کے لیے پیش کر دیتے ہیں۔ مگر جن لوگوں کے اندر یہ یقین نہیں ہوتا وہ اس خدائی پکار کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دنیا کی کامیابی بھی صاحب معرفت کو ملتی ہے اور آخرت کی کامیابی بھی صاحب معرفت کے حصہ میں آئے گی۔

پونہ میں ایک پبلک پارک ہے جس کو ایمپرس گارڈن (Empress Botanical Garden) کہتے ہیں۔ ڈیڑھ سو سال پہلے وہ برطانی فوجیوں کے لیے بنایا گیا تھا اور سولجرس پارک کہا جاتا تھا۔ ۱۸۹۷ میں اس کو از سر نو درست کیا گیا اور کوئن الیزبتھ کے نام پر اس کا نام ایمپرس گارڈن رکھا گیا۔ اب دوبارہ اس کو زیادہ بہتر بنایا گیا ہے۔ گارڈن کمیٹی کی خاتون چیرمین سومن کرلوسکر کے الفاظ میں عمارتی جنگل جیسے اس شہر میں یہ وسیع پارک لوگوں کے لیے تازہ ہوا حاصل کرنے کا ذریعہ ہوگا:

It will prove to be the retreat for a breath of fresh air, in a city that is rapidly turning into a concrete jungle.

۳۹ ایکڑ میں واقع یہ پارک گویا فطرت کی ایک سرسبز دنیا ہے۔ اس طرح کے قدرتی پارک انسان کو انسانی دنیا سے نکال کر خدا کی دنیا میں لے جانے کا ذریعہ ہیں۔ آج کل ان مقامات کو صرف تفریح کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر ان کو تدبر کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ معرفت رب کے حصول کے مقامات بن جائیں۔ (اگلے صفحہ کے نیچے تصویر ملاحظہ ہو)

سید امتیاز الدین دسنوی ایک انجینیر ہیں۔ وہ نہایت سنجیدہ مزاج کے آدمی ہیں۔ انھوں نے

چنانچہ ۱۹۹۶ میں وہ سروس کے تحت ضلع پونہ کے ایک مقام لوناولا (Lonavla) میں [illegible]
مقیم تھا، وہ وہاں کی ایک مسجد میں تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے۔ اس درمیان سڑک سے شور و غل کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ ہندوؤں کا ایک جلوس مسجد سے ملی ہوئی سڑک سے گزر رہا ہے۔ جلوس جب عین سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا۔ باجے اور نعرے کی پرشور آواز مسجد کی دیواروں سے ٹکرانے لگی۔

یہ دیکھ کر نمازی مشتعل ہو گئے۔ کچھ لوگ اٹھے کہ جا کر جلوس والوں سے کہیں کہ یہ مسجد ہے یہاں شور و غل کرنا بند کرو۔ سید امتیاز الدین نے ان مسلمانوں کو سمجھایا اور کہا کہ آپ لوگ چند منٹ بیٹھ کر ذکر کر لیجئے۔ جلوس والے اپنے آپ آگے چلے جائیں گے۔ امتیاز الدین صاحب کے سمجھانے پر وہ لوگ مان گئے اور خاموش ہو کر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ سید امتیاز الدین صاحب نے بتایا کہ مشکل سے تین منٹ گزرے ہوں گے کہ آواز کم ہونے لگی اور تھوڑی دیر میں بالکل سکون ہو گیا۔ جلوس والے صرف تین منٹ تک مسجد کے سامنے ٹھہرے۔ اس کے بعد اپنے آپ ہی آگے بڑھ گئے۔

میں نے کہا کہ اگر ایسا ہوتا کہ کچھ مسلمان سڑک پر آکر جلوس والوں کو روکتے تو وہ لوگ ضد میں پہنچتے۔ اب دونوں طرف سے اصرار بڑھتا۔ یہاں تک کہ جو مسئلہ ابتداءً صرف جلوس کا مسئلہ تھا، وہ بڑھ کر دونوں کے لیے وقار کا مسئلہ بن جاتا۔ اس کے بعد معاملہ اور آگے بڑھتا اور آخرکار وہ المیہ ظہور میں آتا جس کو فرقہ وارانہ فساد کہا جاتا ہے۔ اب ایک طرف مسجد کی نماز درہم برہم ہو جاتی اور دوسری طرف پوری بستی آگ اور خون میں نہا اٹھتی۔ حقیقت یہ ہے کہ امن اور فساد کے درمیان صرف تین منٹ کا فاصلہ ہے۔ اگر آپ تین منٹ کی ناخوش گواری کو برداشت کر لیں تو ہر طرف امن ہی امن ہوگا، اور اگر آپ تین منٹ کی ناخوش گواری کو برداشت نہ کریں تو ہر طرف فساد ہی فساد۔

ہر جگہ ایسے سبق آموز واقعات ملتے ہیں جن میں عمومی نصیحت ہوتی ہے۔ میں ہر جگہ اس قسم کے واقعات کو معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پونہ میں بھی اس طرح کے کئی واقعات معلوم ہوئے۔

۲۳ ستمبر ۱۹۹۱ کو پونہ میں گنیش چترتھی کا سالانہ جلوس نکلنے والا تھا۔ اسی دن ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ بھی تھی۔ اور اس کی نسبت سے مسلمان اپنا میلاد النبیؐ کا جلوس نکالنا چاہتے تھے۔ اگر دونوں جلوس ایک ہی دن نکلتے تو عام تجربہ کے مطابق سخت اندیشہ تھا کہ دونوں میں ٹکراؤ اور فرقہ وارانہ فساد کی نوبت آجائے۔ اور پھر خوشی کا دن پونہ والوں کے لیے غم کا دن بن جائے۔

پونہ کی سیرت کمیٹی نے اس خطرہ کو محسوس کر کے اپنا ایک مشاورتی اجتماع کیا۔ مشورہ میں برکت ہے۔ چنانچہ مشورہ کے بعد ایک عمدہ تدبیر سمجھ میں آگئی۔ اور وہ یہ کہ دونوں جلوس دو الگ الگ دنوں میں نکلیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ کیا کہ دوسروں کے خلاف مطالباتی تجویز پاس کرنے کے بجائے خود اپنی تاریخ بدل دی۔ انھوں نے میلاد النبیؐ کا جلوس چند دن کی تاخیر کے ساتھ ۲۷ ستمبر کو نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح ہندو جلوس اور مسلمان جلوس دونوں الگ الگ تاریخوں میں کامیابی کے ساتھ نکلے اور شہر کی پر امن فضا بحال رہی۔

اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں اعراض ہے۔ اعراض کوئی بے عملی یا پسپائی نہیں۔ اعراض حسن تدبیر کا دوسرا نام ہے۔ اعراض فطرت کا ایک آفاقی اصول ہے جو آسمان کے ستاروں سے لے کر جنگل کے جانوروں تک ہر جگہ رائج ہے۔ اسی فطری اصول میں انسان کی کامیابی کا راز بھی چھپا ہوا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ آر ایس ایس کی میٹنگوں میں جاتے ہیں اور ان کے جلسوں میں جاتے رہتے ہیں۔ وہ تو اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ یہ نہ دیکھئے کہ میں کہاں جاتا ہوں۔ بلکہ یہ دیکھئے کہ کس لیے جاتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں دشمنوں کے اجتماعات میں جاتے تھے۔ مگر آپ کا جانا اس لیے ہوتا تھا کہ خود اپنی بات دوسروں تک پہنچائیں۔ ہمیں بھی اسی سنت رسولؐ پر عمل کرنا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ نے میری سرگرمیوں کی رپورٹ اردو اخبارات میں پڑھی ہوگی جو سنسنی خیز صحافت کے اصول پر چلائے جاتے ہیں۔ اگر آپ خود آر ایس ایس کے اخبارات کو دیکھتے تو آپ کو یہ غلط فہمی نہ ہوتی۔ پھر میں نے ان کو ایک عملی مثال دی۔

میں نے کہا کہ نئی دہلی سے آر ایس ایس کے دو ہفت روزہ اخبار نکلتے ہیں۔ پانچ جنیہ (ہندی) اور آرگنائزر (انگریزی)۔ اس کے ذمہ داروں نے ۷ جولائی ۱۹۹۰ کو اپنے دفتر (رانی جھانسی مارگ) میں ایک مشترک میٹنگ کی۔ ان کی دعوت پر میں اس میٹنگ میں شریک ہوا اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک اسلام کے موضوع پر گفتگو کی۔ اس واقعہ کی رپورٹ اردو اخبار میں چھپی تو اس کا عنوان اس نے ان الفاظ میں قائم کیا :

مولانا وحید الدین خان ——— مسلم دشمن طاقتوں کے کیمپ میں

اب آپ دیکھئے کہ وہ ہندو صاحبان جو اس میٹنگ میں موجود تھے اور جنھوں نے میری باتوں کو سنا ان کی نظر میں میری تقریر کیا تھی۔ آرگنائزر کے اڈیٹر مسٹر وی پی بھاٹیا نے اپنے اخبار کی دو قسطوں (۵ اگست، ۱۹ اگست ۱۹۹۰) میں اس پروگرام کا تفصیلی جائزہ شائع کیا۔ وہ خود اس پروگرام میں شروع سے آخر تک موجود تھے۔ انھوں نے میری تقریر اور گفتگو کے بارہ میں جو لکھا وہ یہ تھا کہ میں نے وہاں اسلام کی تبلیغ کی اور میرا مشن تبدیلیٔ مذہب (proselytisation) ہے۔ چنانچہ انھوں نے آرگنائزر کی شائع شدہ رپورٹ کا عنوان ان لفظوں میں قائم کیا :

A Missionary Maulana

مذکورہ مسلمان نے کہا کہ پھر تو آپ دینی کام کر رہے ہیں۔ یہ تو ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کے پیغام کو تمام لوگوں تک پہنچائے۔ اور خود ہندو سامعین یہ گواہی دے رہے ہیں کہ آپ ان

لیے اجتماعات میں بھی دینی کام کر رہے ہیں۔

یہاں کے مقامی اخبار اسعد ٹائمز (۲ اکتوبر) کے آخری صفحہ پر ایک خبر کی سرخی یہ تھی: فرانس میں اسلام پرستی کی نئی لہر، حکومت پریشان۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ "فرانس میں یہ خوف پایا جا رہا ہے کہ اس کی چار لاکھ مسلم آبادی میں کہیں اسلامی بنیاد پرستی نہ پھیل جائے۔ الجیریا میں جو الجیریائی قیادت اور مسلم دہشت گردوں کے درمیان خوں ریز لڑائی چل رہی ہے۔ اس کی وجہ سے الجیریا میں مقیم کئی فرانسیسی مارے جا چکے ہیں۔ یہ اس سمت میں ایک وارننگ ہے"

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ دنیا میں کوئی بھی اسلام سے خائف نہیں۔ جو بھی خائف ہے وہ اسلام کے نام پر کی جانے والی دہشت گردی سے خائف ہے۔ یہ نام نہاد انقلابی لوگ کوئی فائدہ تو اسلام کو نہ پہنچا سکے۔ البتہ انھوں نے اسلام کو بدنام کرکے لوگوں کو غیر ضروری طور پر اس سے متوحش کر دیا۔

پونہ میں افریقہ کے اور عرب ملکوں کے طلبہ سیکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ آج صبح فجر کی نماز کے بعد تقریباً دس طالب علم جمع ہو گئے۔ یہ سب اریٹیریا کے تھے۔ ان سے دیر تک گفتگو ہوئی۔ وہ سب یہاں کمپیوٹر سائنس کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ اریٹیریا کی آزادی کے بعد وہاں مسلمانوں نے کیا کیا ترقیاں کی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کچھ نہیں۔ حکومت بھی وہاں نصرانی ہے۔ چند مسلم وزیر حکومت میں ہیں۔ لیکن رئیس ایک نصرانی ہے۔ اور سارا ایڈمنسٹریشن نصرانی لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ اسلامی تحریک چلانے کی اجازت نہیں۔

میں نے پوچھا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اریٹیریا کے مسیحی اگرچہ عددی اعتبار سے اقلیت میں ہیں۔ مگر ان میں تعلیم، تجارت، اتحاد، ڈسپلن، شعور زمانہ ہر چیز مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ اس لیے آزادی کے بعد بھی وہی لوگ تمام شعبوں پر قابض ہیں، جیسا کہ وہ پہلے تھے۔

حاجی یونس صاحب کی رہائش گاہ پر لوگ مسلسل آتے رہے۔ اور ان سے دینی اور ملی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ بمبئی کے ٹائمس آف انڈیا (۴ اکتوبر) میں صفحہ اول پر ایک کارٹون تھا۔ ایک عرب داڑھی ٹوپی لیے ہوئے ایک کرسی پر پریشان حال کھڑا ہوا ہے۔ کرسی پر لکھا ہے ہوائی جہاز، سمندری جہاز، ہر قسم کے غذائی اشیاء وغیرہ کی درآمد پر پابندی۔ عرب شیخ ٹیلی فون پر کہہ رہا ہے:

May be there's nothing to panic. But we are only taking maximum precautions.

میکسیمم پریکاشن لینا بہت اچھا ہے۔ اگر یہی طریقہ مسلمان دوسرے معاملات میں بھی اختیار کر لیں تو بے شمار نقصانات اپنے آپ ختم ہوجائیں۔

پونہ میں قیام کے دوران مجلس کی صورت میں مسلسل لوگوں سے بات ہوتی رہی۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں میں ہر معاملہ کی وضاحت کرتا رہا۔ ایک صاحب نے حضرت علیؓ کی نماز کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ لوگ ایسی نماز پڑھتے تھے کہ ایک بار ان کے جسم میں تیر لگ گیا۔ انھوں نے کہا کہ جب میں نماز میں کھڑا ہوں تو نکال لینا۔ چنانچہ نماز کے وقت تیر کھینچا گیا اور ان کو محویت کی وجہ سے اس کا احساس ہی نہیں ہوا۔

میں نے کہا کہ محویت کا یہ مطلب نہیں ہے۔ تیر جب نکالا جائے گا تو ہر آدمی کو تکلیف ہوگی، خواہ وہ کتنا ہی مخلص اور متقی کیوں نہ ہو۔ اصل یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے یہ بات توجہ ہٹانے کے معنی میں کہی تھی۔ اس وقت نماز میں مشغولیت کا مطلب توجہ کو ہٹا لینا تھا۔ جیسے ہم لوگ انجکشن لگوانے کے وقت یا خون نکلوانے کے وقت آنکھ بند کر لیتے ہیں یا منہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگتے ہیں۔

۶ اکتوبر کی شام کو انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۸۵۰ کے ذریعہ پونہ سے دہلی کے لیے روانگی ہوئی۔ اس کا مقرر وقت آٹھ بجے تھا۔ مگر جہاز کسی قدر تاخیر کے ساتھ روانہ ہوا۔

راستہ میں ہندی اخبار سانددھیہ ٹائمس (۶ اکتوبر) دیکھا۔ پہلے صفحہ کی نمایاں خبر کا عنوان تھا:

تہاڑ کے قیدی کی موت۔

بنگلور سے نکلنے والے دکن ہیرالڈ (۶ اکتوبر) کے ایڈیٹوریل کے صفحہ کے اوپر البرٹ شیوٹزر (Albert Schwietzer) کا ایک قول نقل کیا گیا تھا:

The tragedy of life is what dies inside a man while he lives.

یعنی موت آنے پر اندر کے انسان کا مر جانا زیادہ بڑا المیہ نہیں۔ زیادہ بڑا المیہ یہ ہے کہ آدمی جسمانی طور پر زندہ ہو مگر اس کے اندر کا انسان مر چکا ہو۔

انڈین ایرلائنز کا فلائٹ میگزین سواگت (اکتوبر ۱۹۹۴) دیکھا۔ اس کے ہندی شعبہ میں ایک مضمون کا باتصویر عنوان یہ تھا: گاندھی، آج کے پاگل کے۔ اس کے رائٹر مسٹر پنکج شرما نے گاندھی جی

کی [illegible] تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "انہیں سنتے یا انھیں دیکھنے سے لوگ ان کے شریر کو ایک [illegible] بھول جاتے تھے۔ اس لیے وہ جہاں بیٹھتے تھے وہ مندر بن جاتا تھا اور وہ جہاں چلتے تھے وہ بھومی پوتر بن جاتی تھی" (صفحہ ۴۵)

اسی قسم کے الفاظ مسلم رائٹر بھی اپنے قومی بڑوں کے لیے لکھتے رہتے ہیں۔ کوئی اس سوال کا جواب نہیں دیتا کہ جب اتنے زیادہ مقدس لوگ ملک میں پیدا ہوئے اور انھوں نے کروروں کی تعداد میں یہاں اپنے معتقد بھی پیدا کر لیے تو ملک کی یہ تباہی کیوں۔ ان بڑوں کی بڑائی اپنی ساری مقبولیت کے باوجود قوم کی طرف منتقل کیوں نہیں ہوئی۔

۶ اکتوبر ۱۹۹۴ کی رات کو میں دوبارہ دہلی واپس آگیا۔

[illegible]	
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	50/-
عظمت قرآن	35/-
عظمت اسلام	50/-
عظمت صحابہ	11/-
دین کامل	50/-
الاسلام	45/-
ظہور اسلام	50/-
اسلامی زندگی	30/-
احیاء اسلام	30/-
رازِ حیات	65/-
صراط مستقیم	40/-
خاتون اسلام	60/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروان ملت	45/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	25/-
حدیث رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	[illegible]
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	70/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
عظمت مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	4/-
منزل کی طرف	3/-
فکر اسلامی	30/-
خواتین اسلام میں	3/-
وحدت امت	60/-

[illegible]	40/-
مطالعہ سیرت	–
ڈائری جلد اول	90/-
کتاب زندگی	50/-
انوار حکمت	–
اقوال حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	25/-
عقلیات اسلام	35/-
مذہب اور سائنس	–
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	7/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیر ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	8/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	8/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحاد ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	8/-
پیغمبر اسلامؐ	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
[illegible] اور انسان	[illegible]
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	7/-
امہات المومنین	20/-
تصویر ملت	85/-
دعوت اسلام	50/-
دعوت حق	40/-
نشری تقریریں	85/-

اسفار ہند	–
اسلام ایک تعارف	–
حیات طیبہ	7/-
باغ جنت	7/-
نار جہنم	7/-
[illegible] ڈائری	40/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	–
تعدد ازدواج	7/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	7/-
علم کلام	–
اسلام کا تعارف	4/-
علماء اور دور جدید	8/-
سیرت رسولؐ	–
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	8/-
الاسلام یتحدی (عربی)	85/-
یکساں سول کوڈ	5/-
اسلام کیا ہے	8/-
ھندی	
سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلامؐ	4/-
سچائی کی کھوج	–
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے جیون ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	7/-
اتہاس کا سبق	8/-
اسلام ایک سوابھاوک دھرم	8/-
[illegible]	8/-
[illegible]	8/-

[illegible]	75.00
[illegible]	45.00
[illegible]	–
[illegible]	–
The Life of the Prophet Muhammad	75.00
Sayings of Muhammad	55.00
The Beautiful Commands of Allah	125.00
The Beautiful Promises of Allah	175.00
The Soul of the Qur'an	125.00
The Wonderful Universe of Allah	95.00
Presenting the Qur'an	165.00
The Muslim Prayer Companion	–
Indian Muslims	65.00
Islam and Modern Challenges	95.00
Islam: The Voice of Human Nature	30.00
Islam: Creator of the Modern Age	55.00
Woman Between Islam and Western Society	95.00
Woman in Islamic Shari'ah	65.00
Islam As It Is	55.00
Religion and Science	45.00
The Way to Find God	20.00
The Teachings of Islam	25.00
The Good Life	20.00
The Garden of Paradise	25.00
The Fire of Hell	25.00
Man Know Thyself	8.00
Muhammad: The Ideal Character	8.00
Tabligh Movement	40.00
Polygamy and Islam	7.00
Hijab in Islam	20.00
Concerning Divorce	7.00
Uniform Civil Code	10.00

DUE DATE

Acc. No.

Late Fine Ordinary books 25 p. per day, Text Book Re. 1/- per day, Over night book Re. 1/- per day.
